ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
اپریل 2017
نگران اعلیٰ
معراج رسول

جلد 47 • شمارہ 04 • اپریل 2017 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 فیکس (021) 35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من...... السلام علیکم......!

اپریل 17ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ اس دکھ کے ساتھ کہ گزرتے وقت اور ہر نئی خبر کے ساتھ خوش گمانی پر اُوس سی پڑتی جارہی ہے۔ معاشی حالات میں بہتری کی خبریں جہاں اُمید افزا ہیں وہیں معاشرتی بگاڑ ایک خوفناک سوالیہ نشان بنتا جارہا ہے۔ سیاسی میدان میں کم وبیش ہر سیاست کار دوسروں پر بھانت بھانت کے الزامات لگا رہا ہے جن میں کرپشن کا الزام سرِفہرست ہے۔ الزام تراشی کے اس طوفان میں سب سے بڑی لہر پی ایس ایل کے میدان سے اٹھی ہے جہاں سے اسپاٹ فکسنگ جیسے نعرے بلند ہوئے ہیں۔ کھلاڑی کھیل کے بجائے کمائی پر دھیان دینے لگے ہیں...... یہ بات بحیثیت قوم ہمارے لیے باعثِ شرم ہے۔ الزامات ثابت ہوں یا نہ ہوں، ان خبروں نے سب کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ سیالکوٹ کی ایک خاتون پر اپنے سوشل میڈیا کے دوست کو گجرانوالہ سے بلا کر لوٹنے اور قتل کرنے کا الزام ہے۔ فیصل آباد میں زمین کے زیرِ ساعت تنازعے میں دو بھائیوں نے اپنے دو خالہ زاد بھائیوں کو عدالت جاتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ عوام کے ٹیکسوں سے لاکھ دو لاکھ ماہانہ پانے والے اہم سرکاری اہل کاروں کے گھروں سے کروڑوں کی نقدی اور بھاری مالیت کے اثاثے برآمد ہونے کی خبریں چل رہی ہیں۔ ایسی تمام اعصاب شکن خبریں اب معمول بنتی جارہی ہیں اور ان میں بنیادی عنصر حرص و ہوس کا ہوتا ہے۔ مال و زر کے لالچ نے پورے معاشرے کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس قسم کی تمام تر وارداتوں کے ملزمان نے عاقبت کے ساتھ ساری تہذیبی، اخلاقی، معاشرتی اور انسانی اقدار کو اپنی حریصانہ خواہش کے مدفن میں دبا دیا ہے اور صرف مالِ زر کے جائز و ناجائز حصول کو اپنی فانی زندگی کا مرکز و محور بنا لیا ہے۔ رواداری، تحمل اور برداشت کے نازک انسانی جذبات کو اس موذی ہوسِ زر نے بے رحمی سے نگل لیا ہے۔ دہشت گردی اور خوں ریزی کے ساتھ اس عفریت کا خاتمہ بھی ناگزیر ہو چلا ہے۔ اقتدار کے ایوانوں سے اس بارے میں کوئی بلند آہنگ آواز آنی چاہیے...... اب چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں آوازیں ہی آوازیں ہر مکتوب میں بول رہی ہیں۔

محمد قدرت اللہ نیازی کا حکیم ٹاؤن خانیوال سے بھرپور تبصرہ ''یکم مارچ کو ہی جاسوسی کا دیدار ہو گیا۔ غصے بھری آنکھوں والی حسینہ سرورق پر چھائی رہی۔ گال کے ساتھ لگا پسٹل اس کے غصے کو بڑھاتا نظر آیا۔ بائیں جانب ایک عاشق نامراد بانسری بجاتا ملا جبکہ ایک کونے میں سازشی شخص اپنی کامیابی پر مسکراتا ہوا نظر آیا۔ (سوچیے یہ کون ہوسکتا ہے؟) سرورق سے سیدھی چھلانگ انگارے پر لگائی، جاناں قیمتی معلومات دے کر راہی عدم ہوئی۔ شاہ زیب کو جب ڈی پیلس کے گیٹ پر سے آقا جان دوبارہ گھسیٹ کر لے جارہا تھا اور انیق وغیرہ نے حملہ کر کے شاہ زیب کو چھڑایا۔ شاہ زیب کا یہ کہنا ''لگتا ہے میرے ساتھی پہنچ چکے ہیں'' بہت جذباتی کر گیا۔ جزیرے کی جنگ زدہ فضا سے اب اکتاہٹ شروع ہو گئی ہے۔ پلیز اب تحریر کو جزیرے سے دوبارہ پاکستان منتقل کیا جائے۔ آوارگرد میں شہزی دشمنوں سے گھرے ماحول میں اپنے بچھڑے ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے نبرد آزما ہے۔ اجے سنگھ کی مکارانہ چال سے تو بچ گیا لیکن آخر میں لگتا ہے بلراج اور ایڈ وانی کی نظر میں مشکوک ہو گیا ہے۔ ان دونوں نے شاید یہ سوچا ہو کہ اتنی اہم معلومات ایک عام سے غنڈے نے کیسے حاصل کر لیں۔ آئندہ قسط شاید براہِ راست ٹکراؤ کی ثابت ہوگی۔ رنگوں میں پہلا رنگ سلیم فاروقی کی اونچی اڑان کو تقلید سے ہٹ کر مرحوم کی تحریر کو عقیدت کے ساتھ پڑھا۔ تحریر ان کے مخصوص انداز میں رنگی ہوئی پائی۔ آخر میں گھر کا بھیدی ہی مجرم نکلا۔ دولت کی ہوس اور اونچی اڑان کی خواہش میں غزالہ نے مراد اور شیرین کی زندگیاں تک داؤ پر لگا دیں لیکن ناکامی مقدر ٹھہری۔ کسی اور کے اکاؤنٹ میں تاوان منگوانے کا طریقہ کاشف زبیر مرحوم کی تحریر میں سب سے پہلے استعمال کیا گیا تھا۔ دوسرے سرورق کے رنگ شناخت کی مصنفہ زویا اعجاز تھیں جن کے قلم کی روانی متاثر کن رہی۔ اف! اس قدر بے بسی، تکالیف، لفظ لفظ خون ٹپکتا محسوس ہوا، انوکھا موضوع۔ الفاظ کا بہترین چناؤ۔ معاشرتی رویوں اور بیمار ذہنیت کی عمدہ عکاسی نے حقیقتاً تحریر کو چار چاند لگا دیے۔ ابتدائی صفحات پر اقبال کاظمی کی راہ گزیدہ، تنگ آمد بجنگ آمد کی تشریح محسوس ہوئی۔ ایک ایسا نوجوان جو محنت کر کے حق حلال کی روزی کمانا چاہتا تھا۔ اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے جب تنگ کیا تو اس نے بھی تنگ آ کر انہی سکوں میں ادائیگی شروع کر دی۔ مصنف نے نشے کی تباہ کاریوں کو اجاگر کرنے کی سعی کی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہے۔ مختار آزاد کی کان چور بھی خاصی دلچسپ تحریر تھی۔ ملزم نفسیاتی مرض کا شکار بیوی کی وجہ سے ہوا اور اس کا غصہ بے چارے دوسرے لوگوں پر نکلا۔ چوکیدار کی قسمت اچھی تھی کہ عین وقت پر پولیس پہنچ گئی ورنہ وہ کن کٹا ہی کہلاتا۔ محمد یاسر اعوان کی گم گشتہ میں جانسن کی چالاکیاں اور اس کی معصومیت [illegible] وقت رو بہ عمل رہیں۔ یادداشت کا کھو جانا یقیناً ایک عذاب ہی ہوتا ہے۔ مہربان دوست اور ہتھیار نے خاص مزہ نہیں دیا۔ کبیر عباسی کی تحریر پہلا کیس جدیدیت کے ہتھیاروں سے لیس نظر آئی۔ ایک تصویر کی مدد سے جس طرح مقتول کا سراغ لگایا گیا اور قاتل تک پہنچا گیا، وہ اکثر قارئین کو سمجھ ہی نہیں آیا ہوگا کیونکہ بہت کم لوگ ان چیزوں کو استعمال کرتے ہیں جن کی مدد سے مقتول کا سراغ ملا بہرحال بہتر کاوش رہی۔ ڈاکٹر سلیم عادل کی رہائی میں جس طرح پیر بابا نے مجیب ضیا، ملک بشیر اور پرویز ترین کو استعمال کیا وہ تقریباً اپنے مقصد میں کامیاب ہی رہا۔ اس نے ان لوگوں کے غصے اور نفرت کو اس طرح انتہا تک پہنچایا کہ کئی نوجوانوں کو اس نے خون میں نہلا دیا۔ سائیں بابا کی بدقسمتی کہ جب آخر میں پرویز نے اسے پہچان لیا۔ اس تحریر نے والدین کی بے احتیاطی کو بھی اجاگر کیا کہ وہ اس قدر کام میں مصروف نہ

رہیں کہ اولاد کو باغی ہونے پر کوئی ورغلا سکے، سبق آموز تحریر تھی۔ شمارہ جب مکمل پڑھ لیا تو چینی دان میں جا گھسے۔ منصور حبیب پلیجو جو کہ ابتدائی تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ محفل پر پوسٹ مارٹم ٹائپ تبصرہ پرمزاح اور جامع تھا۔ تمام کہانیاں بھی ان کے قلم کی زد میں تھیں۔ 007 جاسوس اعظم میڈم اور کبیل دادا کی شادی کے لیے بھٹی صاحب کی منتیں کرتے نظر آرہے تھے۔ شاید انہوں نے پہلے تبصرے کی اشاعت پر واقعی چھلانگ لگا دی تھی جوان کو کبیل دادا کی ٹوٹی ٹانگ یاد آرہی تھی۔ محمد صفدر معاویہ اپنے طویل اور بہترین تبصرے سے محظوظ کرتے رہے۔ محفل اور کہانیوں پر یکساں تجزیہ تبصرے کو اہم بنا گیا۔ وارث علی کی سہمی سہمی خوشی اچھی لگی۔ پہلی بار تبصرہ شائع ہو تو ہر تبصرہ نگار کا یہی حال ہوتا ہے۔ کھاریاں سے بابر عباسی تیز گام کی طرح آئے اور تبصرہ نگاروں کو چھیڑتے ہوئے بھاگ لیے۔ احسان سحر کا جنونِ وفا پر تبصرہ بے حد پسند آیا۔ کراچی کے رضوان تنولی کا تبصرہ شاعرانہ رنگ لیے ہوئے تھا۔ انگارے میں اگر انیق کی بات کا یقین کیا جائے تو سجاول خود لالچ میں آقا جان سے جا ملا ہے۔''

افتخار حسین اعوان کی مظفر آباد آزاد کشمیر سے پسندیدگی ''مارچ 2017ء کا جاسوسی جلد ہی مل گیا۔ نہ صرف اس بار بلکہ پچھلے کچھ ماہ سے بروقت ہی مل جاتا ہے۔ اس حوالے سے ادارے کی پوری ٹیم کے شکر گزار ہیں۔ ٹائٹل دیکھ کر مجھے بچپن کی ایک فلم یاد آگئی جس میں دلن کی چلائی گئی گولی ہیروئن کیچ کر لیتی ہے۔ دراصل وہ ناگن ہوتی ہے۔ اس ٹائٹل گرل کی آنکھیں مجھے ہو بہو ناگن جیسی لگیں۔ پستول بردار کو دیکھ کر جیسے کہہ رہی ہو چلاؤ گولی۔ تیری گولی کارآمد ہے یا میری آنکھ کا شارہ۔ بانسری بجانے والے کا انداز تو بالکل ایسے ہے جیسے بچپن میں میرا ہوتا تھا۔ بے ڈھنگا سا۔ بانسری، ہم کشمیریوں کی ثقافت ہے۔ یہ الگ بات کہ اب اس پر عمل خال خال ہی نظر آتا ہے۔ البتہ بچپن میرا بھی بانسری سیکھنے میں گزرا ہے۔ پر آس پڑوس کی گائے بھینسوں کے احتجاج کرنے اور ان کے برا منانے پر اپنی بانسری بجانے کی کوشش ترک کر دی۔ ادار یہ، رلانے کو کافی تھا۔ جانے کس کی نظر کھا گئی ہمارے ملک پاکستان کو۔ جہاں چین کی بانسری بجائی جاتی تھی اب وہاں خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ خدا پوچھے ان بے حسوں کو۔ چینی نکتہ چینی کی محفل میں کھاروے سے منصور حبیب پلیجو سے ملاقات ہوئی۔ خوب صورت اور دلکش انداز۔ 007، نے اپنے نام کا تجسس پھیلا رکھا ہے۔ بڑا منجھا ہوا انداز۔ ویسے پاجی چھت سے چھلانگ نہ لگایئے گا ورنہ ہم اتنے پیارے پیارے تبصروں سے محروم ہو جائیں گے۔ محمد صفدر معاویہ کا مفصل اور جامع تبصرہ بھی اچھا لگا۔ مودی اور ٹرمپ پر خوب غصہ جھاڑا۔ پر محترم، لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ احسان سحر اور بابر عباس کا تبصرہ بھی شاندار رہا۔ نمرہ خان، جنوری کی شامیں سریلی اور رسیلی کب سے ہونے لگیں؟ ہمیں تو یہ شامیں یخ بستہ اور ہڈیوں کے گودوں میں قلفی جماتی لگتی ہیں۔ (آپ آزاد کشمیر کی شاموں میں وقت گزارتے ہیں) سید عبادت کاظمی بھی اپنے شوخ تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ ایمانے زارا شاہ کو محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ جے ڈی پی گروپ کی شوخ و چنچل ممبر ہیں۔ آتی رہا کریں مس یہاں کارٹونوں کی کمی ہے۔ (کہاں! آپ آتے تو رہتے ہیں) کہانیوں میں سب سے پہلے اپنے دوست بھائی کبیر عباسی کی پہلا کیس پڑھی۔ موصوف نے ایک پیچیدہ کیس کو بڑے سہل انداز میں حل کر دیا۔ پر اس میں پولیس کو حد درجہ روایتی دکھایا گیا ہے۔ حالانکہ آج کے دور میں پولیس، اتنی بھی ست نہیں۔ زویا اعجاز کا دوسرا رنگ پڑھا۔ انتہائی نازک اور معاشرے کا اہم پہلو، اہم موضوع۔ تیسری صنف کے گرد گھومتی یہ کہانی ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ہم مخنث جیسی صنف کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں یا پھر محض دل بستگی کا سامان سمجھتے ہیں۔ اس لمحہ یہ ذرا بھی نہیں سوچتے کہ ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ سوچوں کے در وا کرتی خوب صورت تحریر تھی۔ اونچی اڑان، سلیم فاروقی کا پہلا رنگ بھی بہترین رہا۔ اغوا کی اتنی بڑی واردات و منصوبہ بندی کے پیچھے ایک عام سی لڑکی غزالہ کا ہاتھ اناڑی پن لگا۔ شہباز اتنا بے وقوف نکلا کے ایک لڑکی پر اعتماد کر بیٹھا۔ حالانکہ اس نے کیش ڈلیوری کا بڑا جاندار منصوبہ بنایا تھا۔ پر مجرم اگر غلطی نہ کرے تو پکڑا کیسے جائے۔ شہباز نے بھی غزالہ کو شامل کر کے غلطی کی اور اس ساری کہانی کا ڈراپ سین ہو گیا۔ ہتھیار، جرم و سزا پر اچھی تحریر رہی۔ ان لوگوں کے لیے بطور خاص جو دوسروں کی دولت پر نظریں جمائے رکھتے ہیں اور اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ رہائی مختصر مگر انتہائی تیز رفتار، محبت کی پیاسی شرمین والد کو چھوڑ کر ماں کے پاس جاتی ہے اور ماں تو پہلے ہی اس سے تنگ تھی۔ یہی پیاس اسے بابا سائیں جیسے شخص کی پناہ میں لے جاتی ہے مگر...... بیٹی کو باپ سے زیادہ تحفظ کون دے سکتا ہے۔ ایکشن سے بھرپور یہ کہانی بہت مزے کی رہی۔ سلسلے وار میں آوارہ گرد کی یہ قسط بہترین لگی۔ گم گشتہ، کچھ خاص متاثر نہیں کر سکی۔ ایک ذہنی مریض کی کہانی جسے چارے کے طور پر استعمال کیا گیا پر اس کی قسمت اچھی تھی کہ مرض جاتا رہا۔ انگارے کی گزشتہ کئی اقساط سنسنی خیز اور فاسٹ رہی ہیں۔ یہ قسط بھی تیز ترین رہی۔ ابتدائی صفحات پر راہ گزیدہ، جاسوسی طرز کے عین مطابق انتہائی فاسٹ ٹیمپو اور تیز رفتار ناول۔ فریدی کی دلیری و چالاکی بے مثال تھی۔ اب کی بار ایک بار پھر ماضی میں غوطہ زن ہوا۔ اس کہانی میں ہیروئن کا ذکر ماضی میں لے گیا۔ جب انہی صفحات پر احمد اقبال کی شکاری سجا کرتی تھی۔ ان صفحات کی زینت ہوا کرتی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی سنسنی خیز، سسپنس و تھرل سے بھرپور یادگار کاوش۔ کترنیں بھی اس ماہ خوب رہیں۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بہت بیسٹ رہا۔''

چشمہ بیراج، میانوالی سے ساگر تلوکر کی فیاضی ''جاسوسی کا سرورق منفرد سا لگا۔ ایک عاشق بانسری پر سر بکھیر رہا تھا۔ دوسرے کو غالباً نزلے کی شکایت تھی۔ لڑکی آنکھوں میں سپنے سجائے کھڑی تھی۔ کیا پستول دکھانا ضروری تھا۔ (جی ہاں) محفل میں اپنا خط نہ پاکر مایوسی اور دکھ ہوا۔ اقبال کاظمی کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ریت کے دریا پر آپ نے کہا تھا یہ ان کی آخری کہانی ہے۔ (جی گم گشتہ خزانے سے ہمیں یہ تحریر مل گئی) کان چور، خود گرفتہ اور بھول بھلی کہانیاں تھیں۔ انگارے تو دہکتے ہی جارہے ہیں۔ آنچ تھوڑی کم کریں۔ آقا جان، حلمی اور سجاول غدار نکلے۔ شاہ زیب خوب جنگ لڑ رہا ہے۔ دل میں میٹھے میٹھے درد لیے۔ عشق ایک پہیلی ہے۔ کوئی سمجھ نہیں پایا۔ تاجور کی سمجھ نہیں آتی۔ یہ عشق کیونکر ہوا۔ دل منکر ہوا، کی عملی تفسیر بنی ہوئی ہیں۔ پہلوان کے خط سے وہ لطف پائے ہیں کہ جی جانتا ہے۔ پہلوان کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرا خط یقیناً تاجور کا سیف کے لیے ہوگا۔ گم گشتہ یاسر پھر چھا گئے۔ مہربان دوست عام کہانی ثابت ہوئی۔ آوارہ گرد، شہزی نے ہشیاری سے بلراج اور جنرل ایڈوانی کی آنکھوں میں دھول جھونکی۔ شلپا کا نا کام لوٹنا اچھا

شگون نہیں لگ رہا۔ آوارہ گرد شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوگئی ہے۔ جلد مکمل کریں۔ کبیر عباسی، جانشین کاشف زبیر پہلا کیس بہت دلچسپ تحریر تھی۔ حنان نے ذہانت سے کیس حل کردیا۔ چار لاکھ نوّے ہزار پہلے ہی کیس میں کمالیے۔ اونچی اڑان اغوا برائے تاوان کی زبردست کہانی تھی۔ مراد اور ثمرین ڈاکوؤں کے گھیرے سے دلیری سے نکل آئے۔ سجاد نے اغوا کاروں کو پکڑا تو سہی مگر بہت دیر لگادی۔ شناخت، خواجہ سراؤں کے ساتھ معاشرتی رویوں کی عکاس۔ زویا کے قلم میں بہت کاٹ تھی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔"

احسان سحر کی میانوالی سے مہربانی "کبھی کبھی خواہشوں سے لڑنا بہت مشکل ہوجاتا ہے، زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے پریشانیوں سے دامن بچانا ضروری ہے اور یہ کام زیادہ مشکل نہیں بس غیر ضروری خواہشوں کو دل میں پیدا مت ہونے دیجیے۔ جاسوسی ہاتھوں میں ہے، دل گہری یادوں میں ہے، ٹائٹل تھوڑا سا مختلف ہے۔ منصور حبیب کی بادشاہت ہے۔ تنولی سرکار نے کیا جی کو خوش، مری اسلام آباد والوں کو کردیا بے ہوش۔ باقی تبصرے بھی اچھے رہے، کچھ بہار کے حوالے سے، زندگی سے جو دل لگایا ہے، بہار کو ہی اپنے اندر پایا ہے، پھولوں کا مجھ سے گہرا ناتا ہے۔ راہ گزیدہ، معاشرے میں پائے جانے والے ناسوروں کا ستایا ہوا انسان، جب اندر سے اپنی شرافت کو توڑتا ہے تو پھر چلتا پھرتا سراپا انتقام بن جاتا ہے۔ ستایا ہوا انسان پتھر بن جاتا ہے۔ فریدی بھی ایسا ہی پتھر تھا جس سے ٹکرانے والے تمام وجود شیشے کی طرح کرچی کرچی ہوکر بکھر گئے۔ کان چور، ایک نفسیاتی مریض کی روداد، جسے ایسے کام کرکے سکون ملتا تھا۔ بھول، ثرمین نے کھڑے کھڑے ہی پولیس کا کیس حل کرلیا، خوب۔ گم گشتہ، جانسن کا سفر مختلف پیچیدہ مراحل سے گزرتا ہوا آخر کامیاب ٹھہرا۔ مہربان دوست، ریٹا نے کافی چالاکی سے کلارا سے اپنی جان چھڑائی۔ آوارہ گرد کی یہ قسط کافی پھیلاؤ لیے ہوئے تھی۔ شہزی کا جنرل ایڈ وانی کے روبرو ہونا، ہیروں کا دریافت ہونا اور اینڈ پرسن شلپا کا خطرناک صورتِ حال سے دوچار کرنا شہزی کو، آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ رہائی، سائیں بابا کے بہروپ میں شہباز خان کا انجام جیسا ہونا چاہیے تھا بالکل ویسا ہی ہوا۔ کون کب تک بچ سکتا ہے۔ رہائی ایک پوری تحریر رہی۔ بھول اور خودگرفتہ دونوں مختصر مگر اچھی کاوشیں ثابت ہوئیں۔ انگارے کی یہ قسط جنگ و جدل میں گھری نظر آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ عجیب صورتِ حال سے دوچار نظر آنے لگی ہے کہانی۔ یعنی سخت بوریت اور مایوس کن۔ جزیرے کے بدحواس لوگوں سے اب جان چھڑائیں۔ بوریت ہی بوریت ہے۔ رنگ پڑھنے تو چھوڑ چکا ہوں جب تک مطلب کی کہانیاں (انگلش) نہیں لگتیں پر سلیم فاروقی کا نام دیکھ کر پہلا رنگ پڑھا۔ عجیب طریقے سے فراڈ کیا گیا۔ دولت کے لالچ میں غزالہ، ساجد کے خواب بکھر گئے۔ جب ایسے خواب گناہوں کے کاموں سے شروع کیے جائیں تو بھلا کب پورے ہوتے ہیں، بہت اچھا رنگ رہا۔"

سعودی عرب سے پرویز لانگاہ کی لفاظی "ماہِ مارچ کے سرورق پہ ترچھی نظر سے گھائل کرتی حسینۂ عالم آمادۂ قتال نظر آئی۔ پسِ پردہ باوا آدم کے دور کا رانجھا سکھ چین کی بانسری بجانے کی تگ و دو میں مبتلا نظر آرہا ہے جبکہ اوپر موجود جوان اپنی ہنسی کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش میں برسرِ پیکار ہے۔ تسلسل کے ساتھ سرورق پر ہتھیار کی موجودگی نئے پن کے تاثر کو گہنانے کے ساتھ ساتھ ذہنی کوفت میں مبتلا کرنے کا سبب بنتی جارہی ہے۔ چینی نکتہ چینی میں مدیرِ اعلیٰ ملک کی بگڑتی صورتِ حال اور دگرگوں ہوتے حالات سدھرنے اور پھر سے امن کا گہوارہ بننے کے لیے پُرامید نظر آئے۔ مسندِ صدارت پر منصور پلیجو اپنے نٹ کھٹ سے انداز سے سب کو یاد رکھتے اچھے لگے، مبارک ہو پلیجو بھائی۔ جاسوسی 007 اپنی شناخت ہنوز چھپانے میں کامیاب ہیں۔ صفدر معاویہ کہانیوں پہ عقاب کی نظر رکھتے ہیں۔ رضوان بھائی کیا آئے بہار آگئی گویا سنتوری لگاکے۔ رانا ایاز کی کرکٹ سے چاہ ان کے تبصرے کے لفظ لفظ سے گواہی دے رہی ہے۔ اور مومنہ کشف دھمال آپ کے بس کی بات نہیں فی الحال ڈانڈیا پر گزارا کریں۔ ایما نے صرف تنقید نہیں کچھ تعریف بھی کریں۔ اب بات ہوجائے کہانیوں کی۔ راہ گزیدہ، ذوق کی تسکین میں الجھن زدہ اور ٹھنڈا اُٹھا رہی کہ یہ مار دھاڑ اور فلمی اسٹائل صفحات پر سب اتنا دلکش نہیں رہا۔ کبیر بھائی حنان کو متعارف تو کراچکے اب اگر آئندہ اور بھی کچھ کیسز حل کروائیں تو ان کی سیریز چل سکتی ہے۔ انگارے کے غیر متوقع حالات اور جھٹکے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دے رہے اور اب سجاول کی قہرناک انٹری برائی کے خمیر سے برائی حاصل کے مصداق ٹھہری۔ اب سیفی کی شہادت کا دھڑکا دل کو دامن گیر ہے۔ آوارہ گرد پڑھنا چھوڑ دی ہے۔ ڈاکٹر عادل کی رہائی، جذبات اور احساسات سے گندھی تحریر جس میں سادہ لوح لوگوں کا استحصال دکھایا گیا، سوچ میں مبتلا کرگئی۔ مرحوم سلیم فاروقی کی اونچی اڑان حسبِ معمول تیز رفتاری سے الجھنیں نمٹاتی خاتمہ بالخیر تک آن پہنچی اور برائی کے بدلے سزا کے تصور کو واضح کرگئی۔ زویا اعجاز تسلسل کے ساتھ اپنے قلم سے چن چن کرنت نئے موضوعات کو تختۂ مشق بنارہی ہیں۔ اس بار ہمارے معاشرے کے نظر انداز کیے تاریک گوشے کو قابلِ تعریف اور اپنے معیاری انداز میں پیش کرکے تلخ حقیقتوں کو آشکار کردیا ہے۔ ترجمہ شدہ کہانیوں میں بھول، کان چور اور گم گشتہ بہترین رہیں۔"

ہزاری جتوئی سے جواد رشید کی روداد "مجھے پہلی بار اپنے خیالات کے اظہار کا موقع مل رہا ہے۔ وہ بھی مظہر سلیم ہاشمی اور دوستوں کے بے حد اصرار سے۔ جب سے ہوش سنبھالا، ابو کو ہر وقت کسی نہ کسی کتاب کے مطالعے میں پایا۔ اس لیے سوچتا تھا کہ ابو کیا پڑھتے ہوں گے۔ جب کچھ پڑھنا سیکھا تو پتا چلا کہ یہ تو رسالے ہوتے ہیں جن میں سر دیے ابو گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں۔ خیر آج کل میں بھی ابو والی خصوصیات پر پورا اترنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ ابو نے تو کبھی تبصرہ نہیں بھیجا مگر میں یہ جسارت کرکے انہیں سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ جاسوسی کا شمارہ دو مارچ کی سہ پہر کو ملا تو میں نے ابو کو بغیر بتائے اپنی نصابی کتابوں میں چھپا کر رکھ دیا۔ ویسے نصابی کتابوں میں جاسوسی چھپا کر پڑھنے میں کتنا مزہ ہے، یہ پڑھنے والے ہی جانتے ہیں۔ شام کو موقع ملتے ہی میں نے سرورق کی حسینہ کو توجہ سے دیکھا جس کی آنکھیں شاید نیند کی کمی کی وجہ سے سرخ تھیں۔ اس کے چہرے کے ساتھ ہی ایک پسٹل تھا۔ قریب ایک آدمی چین کی بانسری بجارہا تھا اور ایک شاید اپنی پتلون کی بیلٹ کو چبا رہا تھا۔ اس کے بعد دوستوں کی محفل میں معمول کی طرح دوڑ لگائی تو

ابتدا میں حبیب بلیجو کو براجمان پایا۔ بہت ہی جامع اور بھرپور تبصرہ تھا۔ جاسوس 007، لگتا ہے اس بار بیزار تھے۔ احسان سحر کا تبصرہ پسند آیا۔ مومنہ کشف کچھ زیادہ معصومیت ظاہر کرتی نظر آئیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ لگتا ہے انگارے اب آگ کے شعلوں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ شاہ زیب کا آقا جان کو تھپڑ مارنا اچھا لگا۔ جاناں کی قربانی رائگاں نہیں جائے گی۔ آوارہ گرد بھی اب بہت بھرپور ہوگئی ہے۔ رنگوں میں مرحوم سلیم فاروقی کی کہانی اچھی لگی۔ آخرکار غزالہ پکڑی ہی گئی۔ زویا اعجاز کی کہانی پڑھ کر سبق حاصل ہوا کہ ہمیں ان ادھورے انسانوں کی تذلیل نہیں کرنی چاہیے۔ کبیر عباسی کی مختصر تحریر پسند آئی۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ امید ہے حوصلہ افزائی کے لیے میرا خط ضرور شاملِ اشاعت ہوگا۔'' (یقیناً! شرط یہ ہے کہ آئندہ بھی یہ جسارت ہوتی رہنی چاہیے)

مظفر گڑھ سے شعیب عباس کی حیرانیاں ''محفل میں پہلی بار حاضری دے رہا ہوں۔ امید ہے جی آیاں نوں، پخیر راغلے، خوش آمدید ضرور کیا جائے گا۔ جاسوسی مارچ کا شمارہ فروری کی آخری تاریخ کی شام کو میرے ہاتھ میں تھا اور میں سرورق کی قاتل حسینہ کو دیکھنے میں مگن تھا جو کہ خوبصورت ہونے کے باوجود بانسری والے شخص کی وجہ سے چہرے پر کرخت تاثر لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرورق پر موجود دوسرے صاحب جو شکل سے ہی پاگل معلوم ہوتے تھے، ٹھوڑی پر ہاتھ دھرے کچھ سوچنے میں مگن تھے۔ سرورق چونکہ ہمیشہ سے میری سمجھ سے باہر رہا ہے (کیوں یہ کوئی حساب کا گوشوارہ ہے؟) اس لیے میں جلد ہی محفل گلستان چینی نکتہ چینی میں داخل ہوا۔ وہ گلستاں جہاں ہر کونے میں کوئی نہ کوئی جاسوس چھپا ہوا ہوتا ہے۔ سب سے پہلا تبصرہ دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ (اس میں حیرت کی کیا بات تھی؟) بلیجو صاحب کا بہت شاندار تبصرہ تھا۔ احسان سحر کا اپنے تبصروں میں سحر پھونکنا بہت پسند آیا۔ سید شکیل کاظمی ان دنوں خال خال ہی نظر آرہے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں، کوئی جائے ذرا انہیں ڈھونڈ کے لائے نہ جانے کیوں میرا ان کی باتوں میں دل کھو گیا۔ (ہاں، لگتا ہے کہ کسی ضخیم ناول کی تکمیل میں مصروف ہیں) باقی دوستوں کے تبصرے بہت پسند آئے۔ اس بار فہرست میں بہت اچھی کہانیوں کے نام نظر آرہے تھے اور میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ پہلے کونسی پسندیدہ کہانی پڑھی جائے۔ آخر میں نے پھر فیصلہ کر ہی لیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر بھٹی کی آوارہ گرد کا منظر چل رہا تھا۔ جس میں اب شہزی اپنے ساتھیوں سے ملنے کے بعد نئے ہنگامے کھڑے کرنے پر تیار تھا۔ یہ قسط مجموعی طور پر بہت اچھی رہی کیونکہ انگارے کی طرح آوارہ گرد میں ٹرننگ پوائنٹ آچکا ہے۔ آوارہ گرد کے بعد انگارے پڑھی۔ انگارے اب پوری طرح دہکنے پر آمادہ نظر آرہے تھے۔ انگارے میں جاناں کی موت سے کچھ دکھ ہوا کہ طاہر جاوید مغل کاش اس امریش پوری سجاول کو ہی جاناں بخش دیتے۔ مطلب سجاول کو جاناں کی محبت کا شکار کر دیتے تو بہت مزہ آتا۔ شناخت بائے زویا اعجاز ایک منفرد انداز کی لکھی پُراثر داستان تھی۔ اس بار تراجم بہتر تھے مگر ابھی تک ایک دو ہی پڑھے ہیں۔ کبیر عباسی کا پہلا کیس اچھی تحریر تھی۔ آخر میں مرحوم سلیم فاروقی کی اونچی اڑان پڑھی۔ اللہ تعالیٰ فاروقی صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔''

سعدیہ قادری کی کراچی شہر سے اُڑان ''نرم گرم سی شام میں جاسوسی وصول کیا تو امیدی اور نا امیدی کے مابین ڈولتے ہوئے نکتہ چینی کے صفحات کھولے، ارے واہ، میرا تبصرہ پہلے نمبر پہ شائع ہوا، یہ اور بات ہے کہ آخری جانب سے پہلا نمبر تھا، تبصرہ شامل کرنے کا بہت شکریہ۔ اس بار میں نے سوچا کہ محفل کی روایت کے مطابق پہلے سرورق پہ تبصرہ کروں، کم و بیش دس منٹ تک سرورق کو گھورا تو صرف یہ سمجھ آیا کہ حسینہ صاحبہ نے کاجل، مسکارا اور آئی لائنر کا دل کھول کے استعمال کیا ہے وہ بھی نہایت پھوہڑپن سے جبھی بیک گراونڈ میں انکل اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں بے حال ہو رہے ہیں۔ اور ایک صاحب پاکستان کے حالات پر نیرو کا کردار ادا کرتے ہوئے بانسری بجا رہے ہیں۔ اداریے میں ہر بار کی طرح اس بار بھی ملکی حالات پر فکرمندی حاوی رہی۔ کاش وہ دن بھی آئے جب وطنِ عزیز میں مکمل طور پر امن و خوش حالی کی بہار ہو۔ منصور صاحب کا تبصرہ اچھا تھا۔ جاسوس اعظم کے شہر میں برفباری کا پڑھ کر حسرت بھری آہ نکل گئی، تھوڑی ٹھنڈی ہوائیں کراچی کی طرف بھی بھیج دیں۔ بابر عباس اور حسنین عباس، آپ بزرگوں کی رہنمائی شاملِ حال رہی تو ان شاء اللہ خط بہتر اور پھر بہترین ہو جائے گا، ابھی تو شروعات ہے۔ احسان سحر، آپ کی چائنا کلر والی بات پہ حیرت ہوئی کیونکہ ہمارے ہاں چائنا کی چیزیں ناپائیداری کی بنا پہ مشہور ہیں، ہوسکتا ہے آپ کا تجربہ اچھا ہو چائنا کی چیزوں کے معاملے میں۔ تبصرے سارے ہی کمال تھے خاص کر لڑکیوں کے۔ مریم، تانیا، لیلیٰ اور اعتزاز کا نام بلیک لسٹ میں دیکھ کر بہت افسوس ہوا، پہلی بار جب میرا تبصرہ شائع نہیں ہوا تھا تو میں بہت مایوس ہوگئی تھی پھر اعتزاز کے حوصلہ دلانے پر دوبارہ کوشش کی تھی۔ انگارے کی یہ قسط بھی نہایت سنسنی خیز رہی۔ شاہ زیب زخموں سے چور ہونے کے باوجود جس مخلصی سے جزیرے والوں کا ساتھ نبھا رہا ہے، وہ قابلِ تعریف ہے، شاہ زیب سے درخواست ہے کہ جزیرے سے فارغ ہو کر پاکستانی پولیس جوائن کرلے۔ کان چور کا عنوان پڑھ کر نک ویلوٹ کی یاد آ گئی لیکن یہ مغربی نفسیاتی کی داستان نکلی۔ بھول میں ذرا سی حاضر دماغی دکھا کر کھڑے کھڑے کیس سلجھا لیا، کبیر عباسی کی پہلا کیس نہایت دلچسپ تھی، پتنگ لگی نہ پھکری اور رنگ بھی چوکھا آیا۔ رہائی، ایک اور کہانی عجلت کی نذر ہوئی، موضوع نہایت حساس اور توجہ کا متقاضی تھا۔ اگر تھوڑا اور گہرائی میں جا کر لکھا جاتا تو بہترین رنگ جما دیتا۔ سلیم فاروقی مرحوم کی اونچی اُڑان بھی بہت اچھا سبق دے گئی، اپنی ذاتی معلومات کبھی کسی کو نہیں دینی چاہئیں۔ زویا اعجاز ایسا موضوع لے کر آئیں جس پر بہت کم لکھا جاتا ہے، اور اس مرتبہ بھی قلم کا حق ادا کر دیا۔ زویا خواتین لکھاریوں میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اولین صفحات کی سوغات چکھنے کے لیے بطورِ خاص فرصت نکالی، فریدی بھی بالآخر روم میں رومن بن گیا، ڈینی کی طرح برائی سے ٹکر لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، خودگرفتہ، گم گشتہ اور مہربان دوست بھی اوسط درجے کی رہیں، آپ سے پرانی کہانیاں دوبارہ شائع کرنے کی درخواست کی تھی اس کا کیا بنا۔ کاروبارِ زندگی سے فرصت ملی تو اگلے ماہ پھر حاضری لگانے آؤں گی۔''

اسلام آباد سے سیدہ ایمانے زارا شاہ کی شاہانہ باتیں ''مارچ کی رم جھم بارش میں جاسوسی ہاتھ آیا۔ ٹائٹل پہ براجمان خاتون کافی معقول دکھائی دی۔ بالوں کو زبردستی سیدھا کر کے بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے جس میں کامیاب بھی رہی ہے۔ البتہ خوبصورت سی .... آنکھوں سے نہ جانے کس

بجلیاں گرانے والی لگی۔ عقب میں موجود شخص چیخ چیخ کے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے کہ صرف ہر کامیاب مرد کے پیچھے ہی ایک عورت کا ہاتھ نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی آگے بھی ایک عورت ہوتی ہے۔ مینو دیکھ لو۔ نکتہ چینی میں اپنا نام دیکھ کے اچھا سا محسوس ہوا۔ باقی منصور بلیجو کے الفاظ کے داؤ پیچ میں کھو کے رہ گئے۔ اردو لغت کی اشد ضرورت محسوس ہوئی، سعدیہ قادری اتنا ٹھنڈا میٹھا تبصرہ اچھا لگا۔ 007 تھوڑا سا 007 کا کوئی کلیو تو دیتے، ہم بھی قیاس کے گھوڑے دوڑا سکتے۔ زویا آپی کی پہلی تحریر تاوان تھی جس نے بہت ہی اچھا تاثر قائم کیا تھا۔ شناخت اس لحاظ سے بالکل مختلف لکھی! انتہا حساس موضوع پہ قلم اٹھانا ہی بہادری ہے اور ان کے مسائل کا احاطہ کرنا ویلڈن! شمارے کی بہترین کہانیاں راہ گزیدہ اور اونچی اُڑان رہیں۔ راہ گزیدہ کا پلاٹ نہایت اسٹرونگ، کہانی اور کردار ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی حقیقت تھے۔ خاص کر فریدی۔ ایسے کتنے ہی فریدی حالات کے گنجلک رویّے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اونچی اُڑان میں گھسا پٹا موضوع تھا مگر خوبصورتی سے پیش کیا گیا اور سسپنس آخر تک برقرار رہا۔ اسی طرح رہائی بھی اچھی کہانی ثابت ہوئی۔ بہت حیرت ہوئی شہباز ہی سائیں نکلا......! مختصر کہانیوں میں کان چور اور بھول اچھی رہیں۔ گم گشتہ، مہربان دوست صفحات اور وقت کا زیاں ثابت ہوئیں۔''

مردان سے بصیر غضنفر شاہ کی بصیرت ''جاسوسی سے ناتا کافی پرانا ہے لیکن تبصرہ لکھنے کی جسارت پہلی مرتبہ کر رہا ہوں۔ امید ہے شمولیت کا موقع مل سکے گا۔ اس مرتبہ قلم اٹھانے کی وجہ انگارے بنی۔ مغل صاحب کہانی کو عروجِ بام پہ لے گئے ہیں۔ اس وقت انگارے اپنے جوبن پہ ہے۔ برونائی میں جنگی حالات و واقعات مغل صاحب اتنی روانی اور تسلسل کے ساتھ بیان کر رہے ہیں کہ پڑھتے ہوئے بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فلمی مناظر دیکھ رہے ہوں۔ اس مرتبہ سجاول کی جھلک بھی دکھائی گئی لیکن یہ جان کر دل کھٹا ہو گیا کہ وہ مخالف پارٹی کی طرف سے لڑ رہا ہے۔ اس تبدیلی کی کوئی گمبھیر وجہ ضرور ہوگی۔ آقا جان کی منافقت کھل کر ظاہر ہو گئی ہے اور میدانِ جنگ سے اس کا فرار یہی ظاہر کرتا ہے کہ آئندہ کہانی اسی کے تعاقب پہ گھوم رہی ہوگی۔ تاہم قسطینا کا کردار کیا ہوگا؟ یہ طے ہونا ابھی باقی ہے۔ میں اسے شاہ زیب کے ہمراہ پاکستان کی سڑکوں پر ایکشن کے جلووں میں ابھی سے دیکھنے لگا ہوں، اللہ کرے زورِ قلم اور بھی زیادہ۔ آوارہ گرد میں شہزی بھی دھوم مچائے ہوئے ہے اور اتفاق سے یہاں بھی جزیرے پہ کشمکش اپنے عروج پہ ہے۔ اس کے بعد رنگوں کی باری آئی۔ مرحوم سلیم فاروقی کی اونچی اڑان نے خوب اڑان بھری لیکن مراد کے اغوا نے کہانی کو نیا رنگ دیا اور سسپنس ختم ہوتا رہا۔ دوسرا رنگ زویا اعجاز کا تھا۔ ایک شناخت ہماری اپنی ہوتی ہے، ایک شناخت ہمیں معاشرہ دیتا ہے،، لوگ دیتے ہیں۔ معاشرے کی دی ہوئی شناخت کبھی کبھی کتنی اذیت ناک ہوتی ہے اس کا اندازہ زویا اعجاز کی تحریر شناخت پڑھ کر ہو جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ ساتھ رہنے والے ان انسانوں کا احوال جنہیں جانوروں سے بھی کم تر سمجھا جاتا ہے۔ کہانی کے اختتام نے پلکیں بھگو دیں۔ آپ کی مزید کہانیوں کا انتظار رہے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابیاں عطا فرمائے۔ مختصر کہانیوں میں کبیر عباسی کی پہلا کیس اور کان چور بہترین رہیں۔''

فیصل آباد سے سیمل چوہدری کی روانی ''جاسوسی ڈائجسٹ جلد ہی ہاتھوں میں آ گیا۔ خوفزدہ سی ٹائٹل گرل سے عجلت میں علیک سلیک ہوئی جو چور نگاہوں سے پتا نہیں کہاں دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد ریس لگاتے ہوئے سب سے پہلے انگارے تک پہنچے۔ مغل صاحب نے جتنے پے در پے کٹ اس ناول میں ہمارے اکلوتے ہیرو کو کچھ دن میں ہی لگوائے ہیں، ریکارڈ بن گیا ہے۔ شاہ زیب بھائی آخر کار جاناں کی مدد سے باہر آ ہی گئے اور او کے سو کے اپنی بات قسطینا تک پہنچا دی۔ وہاں سب عقل سے پیدل ہی ہیں جو اپنی صفوں میں موجود کالی بھیڑوں کو پہچان نہیں پائے آخر تک۔ کہانی ایک جگہ اٹکی ہوئی ہے۔ سیف کے کرداری بھی ابھی تک کوئی خاص جگہ نہیں بن سکی، سوائے اس کے کہ ہیرو کو تاجور کے ساتھ انچ دکھانے کے لیے بس ایک کردار کا اضافہ کیا گیا۔ ورنہ اس کے موبائل فون میں تاجور کے ویڈیوز کی کوئی تک نہیں بنتی۔ اللہ کرے اگلی قسط میں کہانی کچھ آگے بڑھ جائے۔ پھر آوارہ گرد تک دوڑ لگائی۔ جہاں حسبِ معمول شہزی کی بھاگ دوڑ اپنے عروج پہ تھی۔ چلتے چلتے ایک ڈرامائی سی کہانی پہ پہنچے۔ ایک بندہ جو قاتل ہے، کتنی بیوقوفی سے اپنے دوستوں کو وہاں تک لے جاتا ہے جہاں اس نے قتل کیا اور جہاں لاشیں پڑی تھیں۔ ذرا حیرت ہوئی اور واپس پلٹ کر رائٹر کا نام دیکھنا پڑا۔ اپنے کبیر عباسی صاحب نظر آئے۔ ان کا نام دیکھ کر کہانی دوبارہ پڑھنی شروع کی۔ زعفران قتل کر کے اتنے آرام سے بیٹھا رہا کہ آؤ بھی پکڑ لو مجھے۔ یہ بات عجیب سی لگی۔ عموماً قتل کو ''ہضم'' کرنا مشکل ہو جاتا ہے قاتل کے لیے۔ ڈاکٹر صاحب کی رہائی تک پہنچتے پہنچتے تھکن طاری ہونے لگی تھی لیکن ہمت کر کے اسے بھی نمٹا دیا۔ کہانی کوئی خاص تاثر جما نہ سکی۔ زویا اعجاز کی کہانی تک پہنچتے پہنچتے دوڑ تمام کر دی۔ شناخت میں ہمارے معاشرے کے کئی رنگ نظر آئے۔ ہم بہت غلط رویّہ روا رکھتے ہیں ان لوگوں کے ساتھ جن کا ''ایسا'' ہونے میں ان کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ رباب کو وہیں جانا پڑا جو شاید اس کی اصل جگہ، اصل پہچان تھی۔ اس کی ماں کی اتنی بڑی قربانی بھی اس کے کسی کام نہ آ سکی۔ واپسی ابتدائی صفحات کے راہ گزیدہ پہ ہوئی۔ جہاں فریدی کو بھی نمک کی کان میں نمک ہو جانا ہی پڑا۔ مختصر تحریروں میں کان چور اور خود گرفتہ بہت تیز رفتار اور مزے کی کہانیاں رہیں۔''

اعتزاز اینڈ زریاب وصلی کی تاندلیانوالہ سے مہربانیاں ''بہار کے دن کھلتی کلیاں اور جاسوسی کی آمد، مارچ کا آغاز شاندار طریقے سے ہوا۔ سب سے پہلے ٹائٹل پہ نگاہ دوڑائی۔ ٹائٹل اس بار عجب امتزاج کا شکار تھا۔ پستول کی [illegible] جائیں اور بانسری کی دھن کے درمیان گھری حسینہ پھر بھی مطمئن دکھائی دیتی تھی۔ اوپر ایک بدتہذیب شخص غالباً اپنی ناک صاف کر رہا تھا۔ [illegible] پہ غور و فکر کے بعد ہم پہنچے اپنی پیاری محفل میں۔ اداریے میں مدیر اعلیٰ وطنِ عزیز میں ہونے والی حالیہ دہشت گردی سے ہونے والے نقصانات پر خون کے آنسو بہاتے دکھائی دیے۔ محفلِ یاراں اس بار منصور حبیب بلیجو کے نام رہی۔ تبصرہ شاندار رہا، مبارکباد۔ پردے میں چھپے جاسوس 007 کا تبصرہ پڑھ کر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ محمد صفدر معاویہ کا طویل تبصرہ اور وارث علی کی خوشی نے خوب مزہ دیا۔ کھاریاں کے بابر عباس مشورہ مفت ہے کی عملی تصویر بنے ہوئے تھے۔ عبادت کاظمی آپ کو بھول جائیں ہم اتنے تو بے وفا نہیں۔ رانا بشیر احمد ایاز کا تبصرہ دل کو چھو گیا۔ مومنہ کشف آنٹی کا معصومانہ تبصرہ اچھا رہا۔ سیدہ ایمان نے زارا شاہ اور نمرہ خان کو محفل میں خوش آمدید۔ اس کے علاوہ طلعت مسعود، سعدیہ قادری اور ماہ تاب سمیع رانا کے تبصرے پسند آئے۔ ہمارا محنت سے لکھا گیا تبصرہ پوری شان و شوکت کے ساتھ بلیک لسٹ میں

موجود تھا۔ کہانیوں میں آغاز کیا دہکتے انگاروں سے جو اب آگ پکڑ رہے ہیں۔ آقا جان کو پڑنے والے تھپڑ نے دل کو سکون پہنچایا۔ افغانی کی شہادت دکھی کر گئی۔ سجاول کی آمد کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں۔ جنگی ماحول کی منظر نگاری اتنی کمال کی تھی کہ یوں محسوس ہوا ہم بھی اس کا حصہ ہیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ آوارہ گرد کی قسط بور کر گئی۔ شہزی کا دیال داس کا روپ بھرنا حقیقت سے کافی دور محسوس ہوا۔ جنگل میں بننے والی ریاست کچھ منفرد محسوس ہوئی۔ دیکھتے ہیں شہزی اسے کیسے روک سکتا ہے۔ رنگوں میں اونچی اڑان پھیکا پکوان ثابت ہوئی۔ پرانے پلاٹ کی تحریر میں دلچسپی کے عناصر کم کم ہی تھے۔ دوسرا رنگ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ مصنفہ کا منفرد انداز، اچھوتا پلاٹ اور جذباتی اینڈ کے ساتھ اس تحریر نے دل پہ اثر کیا۔ پلوشہ کی بناوٹ سے پاک محبت اور رباب کا کردار زویا اعجاز نے کمال کر دیا۔ ویلڈن! اولین صفحات پہ اقبال کاظمی کچھ خاص متاثر نہ کر سکے۔ سسپنس اور جذبات سے عاری تحریر میں دلچسپی کا سامان صرف منشیات فروشوں کی لڑائی تھی۔ فریدی اپنے والدین کے قاتلوں کو بھی بھول گیا۔ چھوٹی کہانیوں میں ڈاکٹر سلیم عادل کی رہائی ایکشن اور سسپنس سے بھرپور مگر افسانوی تحریر تھی۔ کبیر عباسی کی پہلا کیس متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ ہیرو کی خود غرض سوچ نے مایوس کیا۔ مہربان دوست، بھول اور گم گشتہ دلچسپ تحریریں تھیں۔ مجموعی طور پر مارچ کا شمارہ درمیانے درجے کا تھا۔‘‘

کورنگی کراچی سے محمد خواجہ کی درجہ بندی ’’مارچ 2017ء کا شمارہ بڑی آب و تاب سے طلوع ہوا۔ ایک عورت غصہ اور آنکھوں سے چالاکی اور فریب کاری ساتھ ہی پستول کی نال، ایک شخص منہ پر رومال رکھے پریشان حال اور ایک بانسری کی دھن میں مگن۔ ایک ملا جلا تاثر سرورق پر۔ چینی نکتہ چینی بہت مختصر لیکن حالاتِ حاضرہ کا بھرپور تصور۔ جن کو مہمان بنا کر حفاظت کی مہمان نوازی کی وہی قاتل نکلے۔ خدارا اسلام اور تعلیمات کا صحیح استعمال کرو۔ ورنہ ہم گھروں میں بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ دوستوں کے خطوط کی محفل ستاروں کی طرح جگمگاتی ہے۔ ہر طرح کے خیالات، تبصرے کھٹے میٹھے۔ کھارو سے منصور حبیب کا خط قابلِ توجہ تھا۔ محمد صفدر معاویہ کا قلم بھی خوب چلتا ہے۔ ہر ڈائجسٹ پر تبصرہ اور خیالات معمولی بات نہیں، آفرین۔ کھاریاں سے بابر عباس، وارث علی ملاح کیا کشتی میں بیٹھ کر ہی لکھ لیتے ہیں۔ احسان سحر اور تمام کے خطوط بہت اچھے، ہر خط میں ایک لائن ایسی ہوتی ہے جو پورے خط کی جان ہوتی ہے۔ کہاں تک تعریف کروں۔ راہ گزیدہ، پہلی ہی کہانی نے بڑا مزہ دیا۔ انسان کی زندگی کو بھی کہیں پناہ نہیں ملتی۔ وہ شریف تھا۔ رہنا چاہتا ہے مگر زندگی کے لٹیرے جینا ہی چھین کر لے گئے۔ وہ اتنا بے بس ہوا کہ حوصلہ کر بیٹھا۔ ایک مجبور انسان کی دلیری اور دانش مندی کا واقعہ، بہت عمدہ تحریر۔ بھول، ایک بہت چھوٹی جرم و سزا کی کہانی۔ چھوٹے چھوٹے مشاہدات بہت نتیجہ خیز ثابت ہوتے ہیں اور مجرم کے گلے کا پھندا بن جاتے ہیں۔ کہانی درمیانے درجے کی۔ انگارے ایک اچھوتا اور دل موہ لینے کا سلسلہ، کہانی کے کرداروں اور واقعات کو بہت زیادہ پھیلا دیا گیا۔ ایک گاؤں یا شہر کی کہانی اب انٹرنیشنل طور پر پھیل گئی ہے۔ واقعات اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں لیکن لکھاری کی معلومات اور اسلحہ سے متعلق جانکاری کا جواب نہیں۔ ویسے قاری کی دلچسپی کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔ ایک شخص کو کیا سے کیا بنا کر پیش کیا گیا۔ یہ لکھاری کا کمال ہے اور زورِ قلم ہے بہت عمدہ۔ گم گشتہ، ایک عجیب کہانی، کسی کی مدد کی، وہ مجرم نکلا اور پھر مجرم کی مدد کی وہ مجرمانہ حرکت سے باز نہ آیا پھر وہ ایک اہم مرد نکلا۔ یہ کہانی ریمبو سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ شاید میرا خیال غلط ہو لیکن کہانی منفرد انداز لیے ہوئے تھی۔ اس کو بہت خاص کہانی کا نمبر نہیں دیا جا سکتا۔ مہربان دوست، ایک عورت کی دوسری عورت سے دشمنی، مددگار بھی ایسا چنا جو خود مفاد پرست۔ خیر انجام ایک عورت اپنی ذہانت اور چالاکی سے اپنا دامن بچا گئی۔ کچھ دلچسپ اور کچھ پھیکی کہانی۔ آوارہ گرد، دوسرا دلچسپ ترین سلسلہ، حقیقت ہے مجھے ان دونوں سلسلہ وار اقساط کی وجہ سے ڈائجسٹ کا انتظار رہتا ہے۔ اس کہانی کو بھی کہاں سے موڑ کر انٹرنیشنل کہانی بنا دی گئی۔ کئی کہانیوں کو ملا لیا گیا۔ لیکن لکھاری کی چابکدستی کہیں بھی بور نہیں ہونے دیتی اور ایک نئی داستان رقم کر دی جاتی ہے۔ منظر کشی بھی قابلِ تعریف ہے۔ پہلا کیس، ایک عجب حالات کی کہانی۔ اس میں موبائل فون کی معلومات کا خزانہ ہے۔ کہانی میں مجرم ساتھ ساتھ ہے اور اس کو پکڑوانے کا سلسلہ موبائل فون ہے۔ بے مزہ کہانی۔ ابتدا دلچسپ اور پھر بوریت۔ کترنیں، حکایتیں، لطائف، کارٹون بہت لاجواب۔ بالکل کھانے کے ساتھ۔ اچار اور چٹنی کا مزہ اور چٹخارے۔ اونچی اڑان، ہمارے معاشرے میں دولت مند بننے کا شارٹ کٹ بہت زور پکڑ چکا ہے۔ اس میں سے ایک اغوا برائے تاوان بھی ہے۔ ایک خدا کا عذاب ہے جو دولت مندوں پر نازل ہے۔ یہ کہانی بھی ایسی ہی ایک واردات کی ہے۔ اس میں ذہین اور ایماندار پولیس والے کی مدد اور ذہانت نے حیرت انگیز پھرتی دکھائی اور اصل مجرم جو ایک لڑکی تھی جو سارے کیس کی بنیاد تھی مگر پکڑی گئی۔ اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ مجرموں کی ذہانت دھری کی دھری رہ گئی۔ شناخت، عام ڈگر سے ہٹ کر لکھی گئی کہانی۔ زندگی بھی عجیب کھیل دکھاتی ہے۔ کسی کی زندگی جنت کا نمونہ اور کسی کی زندگی مسلسل کرب اور عذاب میں گزارتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے۔ جہالت مرد کی عقل چھین لیتی ہے اور وہ ایسا کام کر بیٹھتا ہے جو اپنوں کو جہنم میں دھکیل دیتا ہے۔ یہ تو جہالت ہے جو ہمارے اردگرد پھیلی ہے، بعض تعلیم یافتہ بھی جو مذہب سے دور ہیں وہ کام کر جاتے ہیں کہ روح کانپ جاتی ہے۔ بہت دل گرفتہ کہانی۔ شمارے کی کہانیوں کا بہت بہترین انتخاب ہے۔ ادارے کو مبارک باد، امید ہے آئندہ بھی بہت عمدہ انتخاب رہے گا۔‘‘

کراچی سے ادریس احمد خان کی تحسین ’’ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کے درشن بروقت ہو گئے۔ سرورق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ذاکر صاحب کو بہت مبارک۔ اس کے بعد اداریے میں جا وارد ہوئے۔ موجودہ حالات میں صرف اور صرف افسوس ہی کر سکتے ہیں۔ بہتر حالات کی جو امیدیں وابستہ کر لی تھیں وہ سب خواب و خیال ثابت ہوئیں اور پھر آگ اور خون کا کھیل جاری ہے۔ انسانیت سوز واقعات کا تسلسل جاری ہے۔ جو پتا نہیں کب ختم ہوگا۔ سب سے پہلی کہانی ’’راہ گزیدہ‘‘ بہت اچھی لگی جو جرم و سزا پر مشتمل تھی۔ کان چور، خود گرفتہ، بھول اچھی اور پُراثر کہانیاں تھیں۔ پھر باری آئی انگارے کی تو بلاشبہ اس قسط میں مزہ آ گیا جس میں جنگ کا حال احوال پیش کیا گیا۔ گم گشتہ بھی اچھے انداز میں لکھی گئی کہانی تھی۔ مہربان دوست بھی دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد کے کیا کہنے، تحریر کا مزہ ہی کچھ اور ہے اور قاری تحریر کی روانی، سلاست اور ایڈونچر میں کھو سا جاتا ہے اور پھر اینڈ پر ہی رکتا ہے۔ پہلا کیس، رہائی، ہتھیار، اونچی اڑان یہ سب اچھی کہانیاں ثابت ہوئیں۔‘‘

ساہیوال سے امجد اقبال خان کی مدح سرائی ”مارچ کا شمارہ موصول ہوا۔ سب سے پہلے دو مختصر کہانیاں پڑھیں۔ کبیر عباسی کی کہانی پہلا کیس عمدہ کہانی ہے۔ فضول لفاظی اور بے جا تمہید و تعارف کے بجائے کہانی کو ایک سلیقے سے آگے بڑھنا چاہیے اور بلاشبہ رائٹر نے اس پہلو کو ملحوظ خاطر رکھا۔ دوسرے نمبر پر ڈاکٹر سلیم عادل رہائی کے ساتھ تشریف لائے، زبردست کہانی ہے۔ مزہ آیا پڑھ کے۔ ملک بشیر کے اس ڈائیلاگ نے خصوصاً متاثر کیا ”خبیث...... گھٹیے کے پلے! خون چوسنے والی جونکیں! ہم ان بچوں پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتے ہیں اور یہ ہماری جان کے دشمن بن گئے ہیں۔“ اس کے بعد سلیم فاروقی مرحوم کی اونچی اُڑان پڑھی۔ متوسط درجے کی کہانی ہے۔ کہانی پڑھ کر لطف آیا۔ انگارے بھی ٹھیک ہی جا رہی ہے۔ رومانس ایک بار پھر سے کہانی کی رگوں میں دوڑنے لگا ہے۔ یہ اچھا شگون ہے مگر لگتا یہ ہے کہ کہانی شاہ زیب کی روایتی خوئے دست برداری پر منتج ہوگی۔ دیکھیں مصنف کیا رخ دیتے ہیں۔ میں برسوں سے جاسوسی ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ طبیعت لکھنے کی طرف راغب ہے، دو مختصر کہانیاں لکھی تھیں جو آپ کو ارسال کر رہا ہوں، پلیز یہ ضرور بتائیے گا کہ آپ کے پرچے میں شائع ہونے کے قابل ہیں کہ نہیں؟“ (پڑھنے میں تھوڑا وقت لگتا ہے، انتظار کیجیے)

رانا بشیر احمد ایاز کی آمد رحیم یار خان سے ”28 فروری کی ایک خوش گوار اور سنہری سہ پہر کو جاسوسی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ آغازِ بہار کی نوید دیتے ہوئے جلوہ گر ہوا۔ سرورق نے قدم جکڑ لیے۔ ٹائٹل گرل گولڈن کلر کے بہترین ڈیزائن کے سوٹ میں ملبوس سیاہ زلفیں بکھیرے غزالی آنکھوں میں حیرت اور کسی کے انتظار کے تاثرات لیے نظر آئی۔ ساتھ میں بابر عباس بھائی امن کی بانسری بجانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے اور اوپر والے صاحب نے ان کی بانسری سن کر منہ چھپایا ہوا تھا۔ جاسوسی کے معیار کے عین مطابق شاندار ٹائٹل ذاکر انکل کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا، ویلڈن انکل جی۔ چینی نکتہ چینی میں قدم رکھا تو جناب منصور حبیب پلیجو کو مسندِ صدارت پر شاہانہ کروفر سے ٹیک لگائے بیٹھے پایا، مبارکاں سائیں۔ بھائی محمد صفدر معاویہ نے کافی عرصے بعد طویل اور جامع تبصرہ لکھا۔ بہت خوب صورت انداز میں حالِ دل بیان کیا آپ نے۔ معاویہ بھائی، عبدالجبار رومی بھائی اس دفعہ بہت زیادہ جلدی میں لگ رہے تھے۔ شاید سندیلیا نوالی جانے والی فلائنگ کوچ پکڑنا تھی۔ مختصر تبصرہ بھی اچھا لگا۔ عبادت کاظمی بھائی میں خود آپ کے تبصرے کا انتظار کرتا ہوں کیونکہ آپ اور آپ جیسے دوسرے تمام تبصرہ نگاروں کو دیکھ کر ہی تبصرہ کرنا سیکھا ہے۔ آپ خود بہترین الفاظ منتخب کرتے ہیں۔ کہانیوں کا آغاز خلافِ معمول انگارے کے بجائے اقبال کاظمی کی راہ گزیدہ سے کیا۔ وہی معاشرے میں ناانصافی اور کچھ لوگوں کی سنگدلی اور ضمیر فروشی کی داستان تھی۔ وکیل اسلام الدین نے فریدی کے ماں باپ کو قتل کرنے کے بعد فریدی کو جیل بھجوا دیا اور مکان پر سانپ بن کر بیٹھ گیا۔ پولیس کی غنڈہ گردی کی وجہ سے فریدی بھی ہیروئن کا اسمگلر بن گیا۔ مناسب کہانی رہی۔ انگارے کا ٹیمپو اس مرتبہ کچھ اور بڑھ گیا ہے۔ ایسٹرن کنگ کی قربت میں رہ کر جاناں نے بھی اپنے جوہر دکھا ہی دیے۔ تین بندوں کو واصلِ جہنم کرنے کے بعد موت کو گلے لگانے سے پہلے شاہ زیب کو قید خانے سے بھی نجات دلا دی۔ ایسٹرن ایک ہاتھ سے نہایت بہادری سے مقابلہ کر رہا ہے۔ آقا جان جیسے غدار کو تھپڑ پڑنے سے کہانی میں نیا ٹوئسٹ آیا ہے اور تو اور تاجور کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو ہی گیا۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے آگے۔ شاید دونوں دوبارہ مل جائیں، ابراہیم اور زینب کی طرح۔ ڈاکٹر بھٹی صاحب کے سنگ آوارہ گردی کی۔ نوشابہ نے اب سیاسی چالیں چل کر زہرہ بیگم اینڈ کمپنی کے لیے مشکلات بڑھا دی ہیں۔ ان کے مقابل اب زبیر خان بھی آ گیا ہے۔ ادھر شہزی نے نہ صرف اجے سنگھ کی گھٹیا چال اس پر الٹ دی بلکہ تینوں پر قابو پانے کے بعد بلراج سنگھ اور جنرل ایڈوانی کو چکما دینے میں کامیاب رہا اور پوہ بارہ بھی مل گئے۔ گبیل دادا نے طلسم نور ہیرے کے بارے میں معلومات اچھی حاصل کیں۔ ڈارک کیسل کی تعمیر کیا گل کھلانے والی ہے یہ آگے پتا چلے گا۔ کبیر عباسی اس دفعہ پہلا کیس حل کرتے نظر آئے۔ حنان نے شوقیہ سراغ رسانی کی اور پروفیشنل پولیس اہلکار ارشد علی سے پہلے کیس حل کر لیا۔ ہمیں پہلے ہی زعفران پر شک اس وقت ہو گیا تھا جب اس نے حنان سے سیل فون کا سیکیورٹی کوڈ مانگا اور پھر گیلری سے چاروں تصویریں غائب تھیں۔ آخر میں حنان نے پہلے کیس سے ہی پانچ لاکھ کما کر زعفران کو بھی ہمیشہ کے لیے اپنا احسان مند بنا لیا۔ ڈاکٹر سلیم عادل کا نام پہلی دفعہ نظر سے گزرا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بابا سائیں کے چنگل سے اپنے پیاروں کی رہائی کے لیے کوشش کرنے والوں کے بارے میں تحریر کیا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بابا سائیں جیسے لوگ ہمارے ملک کی نوجوان نسل کو کس طرح منشیات اور جنسی بے راہ روی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ ان کے پاس کسی با اثر گھرانے کے ایک دو افراد بھی ہوں تو ہماری ساری سرکاری مشینری کو مکمل طور پر زنگ لگ جاتا ہے اور کسی کے خلاف ایکشن نہیں ہوتا۔ بابا نے شہباز کا روپ دھار کر اپنے سارے مریدوں کو ختم کرا دیا اور آخر میں پرویز کے ہاتھ سے واصلِ جہنم ہوا۔ خس کم جہاں پاک۔ سرورق کی پہلی کہانی اونچی اُڑان میں سلیم فاروقی صاحب بلند پرواز کر رہے تھے۔ کافی تیز رفتار کہانی رہی۔ مراد اور ثمرین کو اغوا کرنے کے بعد شہباز ملک صاحب کے بہروپ میں غضنفر کے شوروم میں گاڑی خریدنے پہنچ گیا اور اغوا کی رقم غضنفر کے اکاؤنٹ میں منگوا کر اس کو پھنسا دیا۔ ذہین ایس ایس پی کی کارکردگی اچھی رہی۔ فاروقی صاحب کی یہ پہلی کہانی ہے جس میں ہیرو نے ایک بھی قتل نہ کر کے اپنا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ دوسرے رنگ میں سابق تبصرہ نگار اور نئی رائٹر زویا اعجاز نے شناخت کے موضوع پر قلم کے جوہر دکھائے۔ جابر خان کے سب ظلم و ستم سہنے کے بعد پلوشہ نے جابر کو ٹھکانے لگا کر آزادی حاصل کر لی اور دارالامان میں نئی زندگی کا آغاز کیا۔ رباب کے ساتھ زندگی بھر شناخت کا مسئلہ رہا۔ حسن کا انجام بہت دل گرفتہ کر گیا۔ جتنا عرصہ گناہ آلود زندگی گزاری اور گناہ کے اڈے چلائے اس کا خمیازہ بہت بھاری بھگتنا پڑا۔ آخر میں رباب اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں اپنی اصل کی طرف لوٹ گئی۔ ملک مقصود کی فتح کی خوشی کا جشن شمع اینڈ پارٹی کو مہنگا پڑ گیا۔ ہماری پولیس کا ایک اور شرمناک پہلو سامنے آیا۔ باقی شمارے میں چھوٹی کہانیاں بھی مناسب رہیں۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔
محمد اقبال، کراچی۔ میمونہ عزیز، لاہور۔ کاشف رفیق، کوٹری۔ انصار احمد، کراچی۔ وقار الحسن، میرپور خاص، سونیا جنید، حیدرآباد۔

امجد رئیس

طلب ہو... جستجو ہو تو یادگار لمحوں کو دل و دماغ میں سمیٹ لینے کو جی چاہتا ہے... ایسے ہی بکھرے بکھرے لمحوں کی کڑیاں جوڑتے ہوئے طائرِ خیال دور... بہت دور بلکہ اس سے بھی دور نکل جانے کی خواہش میں کہیں ٹھہرتا نہیں... شام و سحر کی باریکیاں اور دھند میں لپٹی سحر آگیں شامیں آنکھوں میں خواب ہونے لگتی ہیں... پیچ در پیچ راستوں میں کھو جانے والی کہانیاں ایک بار پھر نئے سرے سے ابھرنے لگتی ہیں... وہ موڑ آتے ہیں جہاں ایک اَن ہونی اور پُراسرار سی آگ دلکش و حسین محبت سمیت بہت سے نازک رشتوں کو چاٹ جاتی ہے... بس راکھ رہ جاتی ہے... جس میں کچھ ادھ جلے رشتے... کچھ سراغ، کچھ موہوم سے نشان رہ جاتے ہیں... جنہیں جوڑ کر ماضی کی تصویر بنانا کسی خوں ریز معرکے سے کم نہیں ہوتا... اسی تناظر میں ڈوبتا ابھرتا... بکھرتا پھر سمٹتا... سنسنی اور تجربے سے لبریز ایک مغربی شاہکار کا دل فریب اردو جامہ...

پیرس کے گلی کوچوں میں کھو جانے والے ماضی کی تلاش کا پرتجسس اور دل ربا احوال......

پیرس، 1973ء

وہ خود تاخیر سے پہنچا تھا۔ میڈیلن، وقت کی پابند تھی۔ تاہم اس روز وہ بھی پابندیِ وقت کا ریکارڈ توڑ چکی تھی۔ برنارڈ ٹراوسٹوک نے دوسری کریم کافی کا آرڈر دیا۔ وہ دھیرے دھیرے چسکیاں لے رہا تھا۔ گاہے گاہے وہ آؤٹ ڈور کیفے کے اطراف میں نظر دوڑا لیتا۔ سیاحوں کی چہل پہل تھی لیکن اس کی گہرے سیاہ بالوں والی بیوی کی جھلک تک دکھائی نہیں دی...... میڈیلن، طے شدہ وقت سے نصف گھنٹا تاخیر کا شکار ہو چکی تھی۔ ٹریفک میں پھنسنے کا جواز اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔ برنارڈ بے دھیانی میں سطحِ زمین کو جوتے کی ایڑی سے رگڑ رہا تھا۔ بے چینی غیر محسوس انداز میں اس کے جسم میں سرایت کر رہی تھی۔ دونوں کی شادی کو خاصا عرصہ گزر چکا تھا۔ میڈیلن شاذ ہی طے شدہ وقت سے اِدھر اُدھر ہوئی تھی اور نصف گھنٹے سے زیادہ......؟ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ شادی کو پندرہ برس سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا تھا۔ اس کے باوجود میڈیلن کی خوب صورتی اور اصول پسندی دونوں جوں کے توں تھیں۔ برنارڈ کے سر کی گردش کے ساتھ بے قراری میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اندیشوں اور سوالات نے یلغار شروع کر دی۔ کوئی حادثہ؟ کوئی تصادم؟ یا فرنچ خفیہ محکمے کے رابطہ کار کلاڈ

نے آخری لمحات میں کوئی اشارہ کیا ہے؟ گزشتہ دو ہفتوں سے حالات برق رفتاری سے کروٹ بدل رہے تھے۔ افواہیں اُڑی ہوئی تھیں کہ نیٹو انٹیلی جنس میں کوئی بیرونی جاسوس بیٹھا ہوا ہے...... یا پھر اندر والا باہر والوں سے مل گیا ہے۔ ہر کوئی ایک سائے سے بدکتا پھر رہا تھا۔

کئی روز گزر گئے تھے۔ میڈیلن، ایم آئی سکس، لندن سے ہدایات کی منتظر تھی۔ اگر اسے کوئی ہدایت ملی تھی تو وہ خود کہاں تھی اور برنارڈ کیونکر بے خبر تھا؟ اس کا ذہن سوالات واوہام کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ معاً اس نے ویٹر ماریو کو ہاتھ ہلاتے دیکھا جو بھری پُری میزوں کے درمیان راستہ بناتا آرہا تھا۔

''مسٹر ٹراوسٹوک، میڈم کا فون پر پیغام آیا ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''وہ لنچ پر نہیں آسکتیں اور آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''کہاں؟''

ویٹر نے ایک پرزہ پکڑایا۔ ''یہ پتا لکھوایا ہے۔''

برنارڈ نے پنسل سے لکھے مختصر الفاظ دیکھے۔

66، ریو میراج، نمبر 5۔

برنارڈ کی پیشانی سکڑ گئی۔ ''کیا یہ پیگالی نہیں ہے؟ پیگالی کے آس پاس وہ کیوں جائے گی؟''

ماریو نے بے بسی سے شانے اچکائے۔ ''جو پتا میڈم نے لکھوایا، وہ میں نے لکھ لیا۔''

''ہاں، ٹھیک ہے، شکریہ۔'' برنارڈ نے اس کی ہتھیلی پر اضافی فرانک بطور ٹپ رکھے۔ ماریو کی باچھیں کھل گئیں۔ برنارڈ اپنی مرسیڈیز کی طرف چل دیا۔

وہ پیگالی کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ علاقہ کسی طرح ایک عورت کے لیے محفوظ جگہ نہیں ہوسکتا۔ جبکہ ماریو نے کاغذ کا جو پرزہ دیا تھا، اس پر پتا اسی علاقے کا لکھا تھا۔ پیرس کا ایک بدنام علاقہ۔ عام آدمی بھی اُدھر کا رخ کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ برنارڈ کو صرف یہ اطمینان تھا کہ میڈیلن اپنی حفاظت کرنا جانتی تھی۔

ریوڈی چیپل پر آتے ہی اس کا منہ بن گیا۔ خستہ حال سڑکیں...... سڑکوں کے کونوں پر نیم عریاں طوائفیں۔ سستے نائٹ کلبس۔ مرسیڈیز کو دیکھ کر عورتوں نے معنی خیز اشارے بازی شروع کردی۔

ایسا کیا ہے؟ مختلف خیالات میں غلطاں برنارڈ ''بولیوارڈ بے'' سے ہو کر ''ریو میراج'' پر رک گیا۔ وہ نمبر 66 کے بالمقابل رکا تھا۔ گاڑی سے نکل کر اس نے سر اٹھایا۔

تین منزلہ عمارت کا پلاسٹر جگہ جگہ سے اُدھڑا ہوا تھا۔ بالکونیاں یوں جھکی تھیں، جیسے سجدہ ریز ہونا چاہتی ہوں۔ برنارڈ نے کار لاک کی اور سہ منزلہ عمارت میں داخل ہوگیا۔ اس نے سوچا وہ خوش نصیب ہوگا اگر واپسی پر اسے گاڑی جگہ پر ملی...... وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ فضا میں تلی ہوئی پیاز اور سگریٹ کی بو مستقل طور پر بس گئی تھی۔ وہ ٹاپ فلور تک چلا گیا۔ برنارڈ نے فلیٹ نمبر 5 کے دروازے پر دستک دی۔ ردِعمل نہ ملنے پر اس نے نام پکارا۔ دوسری مرتبہ بھی جواب نہ آنے پر اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ لاک نہیں تھا۔

برنارڈ اندر داخل ہوگیا۔ ٹوٹی پھوٹی ونڈو بلائنڈ کی وجہ سے اندر سائے، روشنی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ بڑا سا بستر تھا جس کی چادر استعمال کی وجہ سے بکھری ہوئی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر بیڈ کے ساتھ دو گندے گلاس اور شیمپین کی ایک خالی بوتل رکھی تھی۔ کمرے میں الکحل اور انسانی بدن کے پسینے کی بو رچی بسی تھی۔ منظر نامہ وہاں ہونے والی سرگرمی کی عکاسی کررہا تھا۔ برنارڈ کی اُلجھی ہوئی، گھومتی نظریں بیڈ کے بالائی پائے کی جانب گئیں۔ اس نے دو قدم آگے بڑھ کر دیکھا اور زمین نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ سرہانے کے قریب سرخ لہو میں ڈوبا ایک زنانہ سینڈل پڑا تھا...... اس کی بیوی فرش پر پڑی تھی۔ زلفیں بکھری ہوئی اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ سفید بلاؤز پر خون کے دھبے تھے۔ برنارڈ گھٹنوں کے بل گر گیا۔

''نہیں...... ل......'' اس کے حلق میں پھندا لگ گیا۔

اس نے بیوی کے رخسار کو چھوا۔ خفیف سی گرمی کا احساس ہوا۔ برنارڈ نے کان اس کے سینے پر رکھا۔ دھڑکن کی آواز معدوم تھی۔ سانسوں کی آمدورفت بھی منقطع تھی۔ برنارڈ نے ہچکی لی۔ ''میڈیلن!'' رنج والم نے اس کی رگ رگ کو توڑ ڈالا۔

لفظ میڈیلن کی بازگشت ختم نہیں ہوئی تھی کہ عقب میں دبے قدموں کی آہٹ ابھری۔ برنارڈ گھوما اور ششدر رہ گیا۔ وہ اپنی جانب اٹھے پسٹل کو گھور رہا تھا۔ پسٹل میڈیلن کا تھا...... ہتھیار بدست کو دیکھ کر وہ دریائے حیرت میں ڈوب گیا۔

''کیوں؟'' اس نے سوال کیا۔

جواب گولی کی شکل میں آیا۔ خاموش فائر تھا۔ وہ میڈیلن کے قریب جا گرا۔ دم توڑتے ہوئے اس نے اپنی محبوب بیوی کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔

☆☆☆

بکنگھم شائر، انگلینڈ/بیس برس بعد

جارڈن ٹراوسٹوک، انکل ہیو کی آرام دہ نشست میں شیری کا جام لیے بیٹھا تھا۔ مینٹل پیس پر ارل آف لووٹ کا پورٹریٹ تھا۔

جارڈن کے لیے اس قسم کی دعوتیں غیر دلچسپی کا باعث تھیں۔ وہ جانتا تھا، کس قسم کا اجتماع ہے...... لیکن انکل ہیو اس قسم کی دعوتوں کے دلدادہ تھے۔ آج کا اجتماع سر ریگی اور لیڈی ہیلن وان کے اعزاز میں تھا۔ وہ دونوں پہلے سے ہی انکل ہیو کی جاگیر پر مہمان بنے بیٹھے تھے...... خاص خاص لوگ مدعو کیے گئے تھے جن کی آمد کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ متوقع مہمانوں کے عہدوں کے پیشِ نظر ایک یادگار رات سر پر تھی۔ انکل ہیو، ایم آئی سکس سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ انکل کے سابقہ ساتھیوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ چند اہم شخصیات پیرس سے آرہی تھیں۔ لندن کی معاشی کانفرنس میں شرکت کے باعث وہ لندن پہنچ چکی تھیں۔ خفیہ کے اہلکاروں کی موجودگی بھی لازم تھی۔ نیز ڈپلومیٹس کے بغیر پارٹی مکمل نہیں ہوسکتی تھی۔

''جارڈن، میری مدد کرو۔'' انکل ہیو نے اسٹڈی میں قدم رکھا۔ انہوں نے ٹکسیڈو سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا اور نک ٹائی سے الجھ رہے تھے۔ جارڈن نے اٹھ کر ٹائی کی ناٹ درست کی۔

''تمہاری بہن کہاں ہے؟'' انکل نے استفسار کیا۔

''آپ جانتے ہیں، وہ ایسی پارٹیوں سے بھاگتی ہے پھر نکل گئی باہر کہیں شہسواری میں مگن ہوگی۔'' جارڈن نے جواب دیا۔

''ڈیوس کو بھیجو، اُسے لے کر آئے۔'' انکل نے کلاک پر نگاہ ڈالی۔

اسی وقت سر ریگی اسٹڈی میں نظر آئے۔ ریگی کی بیوی ہیلن گویا اس کے تعاقب میں پیچھے پیچھے آئی تھی۔ دونوں کے منہ بنے ہوئے تھے۔ جارڈن سمجھ گیا کہ پھر کوئی کھٹ پٹ ہوئی ہے۔ وہ ڈیوس کے لیے باہر نکل گیا۔ سر ریگی اور لیڈی ہیلن کی جوڑی خاصی غیر متوازن تھی۔ جارڈن کے نزدیک اسے متوازن بنانے میں ہیلن کی وراثتی دولت نے منتر کی طرح کام کیا تھا۔ وہ دونوں انکل ہیو کے پرانے دوستوں میں شامل تھے۔

باہر نکلتے ہوئے جارڈن نے کھڑکی سے ڈرائیو وے پر نظر ڈالی۔ پہلی لیموزین پہنچ گئی تھی۔ شوفر دروازہ کھول رہا تھا۔ دو مہمان پہنچ گئے تھے...... نینا سدرلینڈ اور اس کا بیٹا۔

☆☆☆

برنیڈا ٹراوسٹوک اپنی سرکش لیکن پالتو گھوڑی فروگی کی پشت پر اُڑی جارہی تھی۔ اس کا گداز لچک دار بدن آگے کی جانب جھکا ہوا تھا۔ چہرہ، گھوڑی کے ایال کو چھورہا تھا۔ فروگی سرکش تھی تو اکیس سالہ برنیڈا بھی منہ زور اور خودسر......

برنیڈا مہمانوں کی فہرست دیکھ چکی تھی۔ اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اگرچہ وہ آگاہ تھی کہ اسے پارٹی میں شریک ہونا پڑے گا۔ جتنی دور جاسکتی تھی، جانے کے بعد وہ چکر کاٹ کر واپس آئی اور چرچ کے قریب پہنچتے پہنچتے فروگی کی رفتار کم کردی۔ چرچ کے قریب پلاٹ پر آبائی قبرستان تھا۔ وہ گھوڑی سے اتر گئی اور اسے کھلا چھوڑ دیا۔ دھیرے دھیرے وہ ان دو قبروں کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں اس کے ماں باپ پہلو بہ پہلو زیرِ زمین ابدی نیند سو رہے تھے۔

قبروں کے سرہانے ماربل کی تختیاں نقش و نگار سے عاری تھیں۔ وہاں محض چند سطور موجود تھیں:

بہشت کے مانند ہم زمین پر بھی ساتھ ہیں۔

برنیڈا گھٹنوں کے بل گھاس پر بیٹھ گئی۔ وہ یہاں سیکڑوں بار آچکی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے ماں باپ کے ناموں کو گھورتی رہی۔ یادداشت مرتعش تھی۔ حافظہ دھوکا دے جاتا تھا...... اس وقت جارڈن اور وہ بچے ہی تو تھے۔ مٹی مٹی یادیں، دھندلے نقوش۔ ماما کے پرفیوم کی خوشبو۔ ڈیڈی کے پائپ کی مہک...... مسکراہٹیں، قہقہے۔ فرانس کی گڑیا، اٹلی کا میوزک باکس...... مسکراہٹیں، قہقہے...... برنیڈا نے آنکھیں بند کرلیں۔ وقت گزرتا رہا۔ وہ ماضی میں سفر کررہی تھی۔ وقت کا احساس کھو بیٹھی تھی۔ غالباً فروگی نے مالکن کی گردن پر پھونک ماری تھی۔ اس نے ہڑبڑا کے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ درختوں کے سائے لمبے ہوگئے تھے۔

برنیڈا نے کاٹھی اور لگام پر ہاتھ ڈالا، جست بھر کے سوار ہوئی اور فروگی کو ایڑ لگائی۔ فروگی نے رفتار پکڑنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ برنیڈا، گھوڑی کے جسم کا حصہ بن گئی تھی...... لگ رہا تھا، گھوڑی سوار کے بغیر دوڑ رہی ہے۔ تاخیر ہو گئی تھی۔ شارٹ کٹ کے لیے برنیڈا نے راستہ تبدیل کیا۔ مجبوراً جلد ہی اسے سڑک پر آنا پڑا۔ ٹاپوں کی آواز تبدیل ہو گئی۔ ایک موڑ مڑتے ہی برنیڈا کی آنکھوں میں سرخی لہرائی۔ فروگی نے ہنہنا کر رخ پھیرا اور دونوں پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہوگئی۔ ساتھ ہی گاڑی کے ٹائر چیخے تھے۔ جھٹکا کھا

کر برنیڈا سنبھلتے سنبھلتے بھی نیچے جا گری۔ اس کا ردعمل متاثر کن تھا۔ وہ لوٹ لگا کر گیند کے مانند اچھل کے کھڑی ہو گئی اور بھڑکی ہوئی گھوڑی کی لگام تھام لی۔

گاڑی کا دروازہ کھل کر بند ہوا۔

''قریب مت آنا۔'' برنیڈا پھنکاری۔

''تم ٹھیک ہو؟'' ایک شائستہ مردانہ آواز آئی۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ تڑخی۔ اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔

''اور تمہارا گھوڑا؟''

''گھوڑا؟''

''یہ گھوڑا ہے نا؟'' مرد کی آنکھوں میں شرارت نظر آئی۔

برنیڈا نے پہلی مرتبہ اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں، وہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن......''

''لیکن وہ گھوڑی ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔'' اس نے شریر لہجے میں کہا۔

برنیڈا نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔ سیاہ آنکھیں، سیاہ بال، عمر چالیس کے لگ بھگ۔ لہجہ امریکی، چوڑے شانے...... سیاہ ٹائی، ٹکسیڈو جیکٹ۔ آنکھوں میں شرارت اور اعتماد۔ وہ ایک وجیہہ شخص تھا۔

''میں معذرت خواہ ہوں...... میں عجلت میں تھا۔''

''یہ سڑک کار بھگانے کے لیے نہیں ہے۔ کسی کو نہیں معلوم ہوتا کہ اگلے موڑ پر کیا چیز ہے۔'' برنیڈا نے گھوڑی کی گردن تھپکتے ہوئے نخوت سے کہا۔

''ٹھیک کہتی ہو۔ کم از کم اس موڑ کے بارے میں، میں جان گیا ہوں۔'' وہ دلچسپی سے سبز آنکھوں والی طرح دار حسینہ کو یک ٹک دیکھے جارہا تھا۔ ''دراصل چیٹ ونڈ جاتے ہوئے مجھے دیر ہوگئی تھی۔''

برنیڈا چونک اٹھی۔ ''چیٹ ونڈ جارہے ہو؟''

''ہاں، کیوں؟ بیٹھ جاؤں کیا؟'' اس نے گھوڑی کی طرف اشارہ کیا۔

برنیڈا اندر ہی اندر اس کے انداز بے پر حیرت زدہ رہ گئی۔ اس نے گھوڑی کی طرف پھر اجنبی کو دیکھا۔ ''یہ تمہیں گرادے گی۔''

''خود تو گر کے اٹھ گئی ہو۔ میں کھڑے کھڑے گرا جارہا ہوں۔'' وہ بڑبڑایا۔

''خود کلامی بند کرو۔''

''وہ چیٹ ونڈ؟''

''واپس جاؤ، تم نصف میل پہلے ہی مڑ کر اس طرف آگئے ہو۔'' وہ اچھل کر فردگی پر سوار ہوگئی۔ ''موڑ پر دیودار کے درخت لگے ہیں۔''

''تمہیں یقین ہے، تم زخمی نہیں ہو؟'' اس نے ہانک لگائی۔

''میں اتنی نازک نہیں ہوں۔''

''کتنی نازک ہو؟''

جواباً برنیڈا نے مسکرا کر گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ جاتے جاتے وہ ہاتھ ہلانا نہیں بھولی تھی۔

☆☆☆

رچرڈ وولف، کرائے کی سرخ ''مورس گیرج'' کے پاس کھڑا اس پارا صفت، آفت کی پرکالہ کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ سرپٹ دوڑتی گھوڑی پر دوشیزہ کی سیاہ زلفیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ آناً فاناً وہ غائب ہوگئی۔ رچرڈ اس کا نام بھی نہ جان سکا تھا۔ وہ لارڈ لووٹ سے معلوم کرے گا کہ اس کی جاگیر پر یہ کون جادوگر حسینہ دندناتی پھر رہی ہے۔ لباس سے وہ کوئی دیہاتی لڑکی ہی معلوم ہوتی تھی لیکن انداز اور تیور...... نخوت، بانکپن...... عشوہ طرازی۔ وہ کوئی اور ہی چیز تھی۔ رچرڈ، اول سمجھا کہ وہ اسے زخمی کر بیٹھا ہے لیکن وہ گرتے ہی گیند کے مانند ٹپا کھا کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ٹھیک کہتی تھی، وہ اتنی نازک نہیں تھی۔ اس کی شہ سواری میں بھی کلام نہیں تھا۔ البتہ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ گری تو سیدھی رچرڈ کے دل کے آنگن میں آن گری تھی۔ پینتالیس سالہ زندگی میں رچرڈ وولف کبھی کسی سے اس طرح متاثر نہیں ہوا تھا۔

اس نے مورس گھمائی۔ ہر موڑ پر وہ محتاط تھا۔ کوئی بکری یا گائے نہ سامنے آجائے یا پھر شہ سوار ایک اور جادوگرنی......

بالآخر وہ اس موڑ تک پہنچ گیا جس کی نشاندہی سبز آنکھوں والی قاتل ادا لڑکی نے کی تھی۔ وہاں دیودار کے درختوں کی قطار تھی۔ وہ محسوس کررہا تھا کہ اس کی پُرخطر زندگی میں ایک نرم رُو خوشبودار جھونکا در آیا ہے۔

وہ سڑک پر مکان کی جانب جارہا تھا۔ مکان کیا، حویلی یا قلعہ تھا۔ سڑک کے دونوں جانب درختوں کی قطار تھی۔ حویلی ہیوٹراوسٹوک کی جاگیر کا ایک چھوٹا سا حصہ تھی۔ ہیوٹراوسٹوک نے ایم آئی سکس کے قلب میں چالیس سال گزارے تھے۔ وہ خاندانی رئیس تھا۔ اب ریٹائرمنٹ کے مزے اُڑا رہا تھا۔ ضرورت نہ ہونے کے باوجود ایم آئی

سکس میں وہ اپنی افتادِ طبع کے باعث گیا تھا۔

☆☆☆

بال روم میں رچرڈ وولف نے متعدد شناسا چہرے دیکھے۔ ایک درجن سے زیادہ مہمان پہنچ چکے تھے۔ آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ امریکی سفیر کو اس نے فوراً پہچان لیا تھا۔ فرنچ وزیر مالیات فلپ سینٹ پیری، ریگی وان کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ ریگی وان، لندن بینک کے پیرس ڈویژن کا سربراہ تھا۔ قریب ہی اس کی بیوی ہیلن وان بے نیازی کا مظاہرہ کررہی تھی۔ گویا شوہر کو نظر انداز کررہی تھی۔ رچرڈ حیران تھا کہ وہ اس عورت کو کب اپنے شوہر کے ساتھ خوش و خرم دیکھ سکے گا۔ ایک نسوانی قہقہے نے اس کی توجہ کھینچی۔ وہ فرنچ سفیر کی بیوہ نینا سدرلینڈ تھی۔ وہ گردن سے ٹخنوں تک قیمتی سبز ریشمی لبادے میں جھلمل کررہی تھی۔ عمر تریپن کے قریب ہونے کے باوجود اس نے نسبتاً خود کو فٹ رکھا ہوا تھا۔ ہمراہی میں اس کا بیس سالہ بیٹا انتونی تھا۔ انتونی کے بارے میں افواہ تھی کہ وہ آرٹسٹ ہے۔

رچرڈ کسی کو متوجہ کیے بغیر بوفے ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔ بیسٹیل ڈے کی مناسبت سے ٹیبل پر ایفل ٹاور کا مجسمہ رکھا تھا (بیسٹیل ڈے۔ فرانس کا قومی دن۔ جب انقلابِ فرانس کا آغاز ہوا) آج کی رات ہر چیز میں فرنچ کی آمیزش تھی۔ میوزک، شیمپئن، چھت کا فانوس، طعام وغیرہ۔

"کیسا انتظام ہے۔ انکل ہیو بھی رنگ بھر دیتے ہیں۔" ایک آواز آئی۔ رچرڈ نے گردن موڑ کے سنہرے بالوں والے نوجوان کو دیکھا۔ وہ ہاتھ میں شیمپئن کا گلاس لیے مسکرا رہا تھا۔

"تم رچرڈ وولف ہو؟" اس نے دوسرا گلاس رچرڈ کو پکڑایا۔

رچرڈ نے گلاس لیتے ہوئے سر ہلایا۔ "اور تم......؟"

"جارڈن ٹراوسٹوک، انکل ہیو نے مجھے اشارہ کردیا تھا۔ انہوں نے تمہیں آتے دیکھ لیا تھا۔"

دونوں نے ہاتھ ملایا۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد جارڈن نے سوال کیا۔ "تم ڈپلومیٹ یا بینکر تو نظر نہیں آتے۔ کہیں تم جاسوس تو نہیں ہو؟"

رچرڈ ہنس دیا۔ "مجھے توقع تھی اس قسم کے سوال کی۔"

"میری ذاتی دلچسپی ہے ایسے لوگوں میں...... کیسی زندگی ہوتی ہے ان کی؟ کیسے سوچتے ہیں؟ کیا کیا چھپا کے رکھتے ہیں؟ یہاں اس پارٹی میں متعدد لوگ ایسے ہوں گے، انکل ہیو بھی انہی میں سے ایک تھے۔"

"تمہارا اپنا اندازہ کیا ہے؟" رچرڈ نے کہا۔

"ہونہہ، تم امریکن ہو......"

"ٹھیک ہے۔"

"کارپوریٹ ایگزیکٹو کے برعکس تم لیموزین کے بجائے اپنی گاڑی پر اور شاید کرائے کی گاڑی پر آئے ہو۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"تم اپنے سراغ رسانی کے کام کو کاروبار کہتے ہو؟"

"شاید ایسا ہے۔"

"پھر میرا اندازہ ہے کہ تمہارا تعلق سی آئی اے سے ہے؟"

رچرڈ نے نفی میں سر ہلایا اور مسکرانے لگا۔ "میں پرائیویٹ سیکیورٹی کنسلٹنٹ ہوں۔ سکاروف اینڈ وولف، انک۔"

جارڈن بھی مسکرایا۔ "یہ ایک اچھا پردہ ہے۔"

"نہیں، یہ پردہ نہیں ہے، حقیقت ہے۔ یہاں جتنے ایگزیکٹو نظر آرہے ہیں، ان کو تحفظ درکار ہے۔ آئی آر اے کا ایک بم سب کچھ تباہ کردے گا۔"

"اوہ، تو تمہیں اس مقصد کے لیے ہائر کیا گیا ہے۔"

"ہاں، ایسا ہی ہے۔" رچرڈ نے سرسری انداز میں اطراف کا جائزہ لیا۔ اسے اپنے مشاہدے پر ناز تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ برنارڈ اور میڈیلن کے لڑکے سے بات کررہا ہے۔ ویسی ہی آنکھیں اور نقوش...... پارٹی کا مقام، ہیو ٹراوسٹوک کی موجودگی۔ جارڈن نے جو نام بتایا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا تعلق ٹراوسٹوک فیملی سے ہے۔

دفعتاً جارڈن کی توجہ نئے مہمان کی طرف مبذول ہوگئی۔ رچرڈ نے بھی رخ پھیرا۔ اس نے نوٹ کیا کہ بال روم میں ہونے والی سرگوشیوں کو بریک لگ گیا تھا۔ سب ہی ایک...... طرف متوجہ تھے۔ وہ قیامت، سبک خرام...... بجلیاں گراتی چلی آرہی تھی۔ رچرڈ دنگ رہ گیا۔ وہی طنطنہ، وہی نخوت...... ہر قدم گویا وہاں موجود مردوں کے دلوں پر تھا۔ ریشمی زلفیں اور آسمانی لباس کی سجاوٹ سونے پر سہاگا کا کام کررہی تھی۔

"یہاں کیسے؟" رچرڈ نے سرگوشی کی۔

"مطلب؟ تم دونوں مل چکے ہو؟" جارڈن نے سوال کیا۔

"وہ حادثہ تھا" رچرڈ نے اختصار سے بتایا۔

لڑکی نے قریب سے گزرتے ہوئے باوردی ملازم کی

ٹرے سے شیمپین کا جام اٹھایا۔ اس کی چال میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ بس ٹرے میں سے ایک جام کم ہو گیا تھا۔ اس کی آمد نے محفل کا رنگ ہی بدل دیا تھا۔

''وہ خوش لباس بھی ہے۔'' رچرڈ نے تبصرہ کیا۔

''اچھا...... میں بتاتا ہوں اُسے، تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''ارے نہیں، کیا ضرورت ہے۔'' رچرڈ نے جارڈن کو ٹوکا۔

''آؤ تمہارا ٹھیک سے تعارف کراؤں۔'' جارڈن نے حرکت کی۔

قریب پہنچنے سے قبل ہی لڑکی نے دونوں کو دیکھ لیا۔ پہلے جارڈن پھر نگاہ رچرڈ پر گئی۔ شناسائی کی جھلک ابھری اور ڈوب گئی۔ اس کی جگہ محتاط تاثر ابھر آیا۔

اچھی بات نہیں ہے۔ رچرڈ نے سوچا۔ لڑکی کو یاد ہے کہ میری وجہ سے وہ نیچے گری تھی۔

''تو ہم پھر مل رہے ہیں۔'' اس کے انداز میں تہذیب کی جھلک تھی۔

''مجھے امید ہے، تم نے بھلا دیا ہوگا۔''

''نہیں، کبھی نہیں۔'' اس نے کہا اور مسکرا اٹھی۔ کیا دلکش مسکراہٹ تھی۔

''ڈارلنگ، یہ رچرڈ وولف ہے۔'' جارڈن نے تعارف کرایا۔ لڑکی نے ہاتھ بڑھایا جسے رچرڈ نے بلا تامل تھام لیا۔ وہ رچرڈ کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد رچرڈ پر انکشاف ہوا کہ وہ میڈیلن کی بیٹی کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہے...... ہاں وہ آنکھیں میڈیلن ٹراوستوک کی تھیں۔

''رچرڈ، یہ میری بہن برنیڈا ٹراوستوک ہے۔''

☆☆☆

وہ حویلی اور اس کے ہنگامے سے دور باغ میں ٹہل رہے تھے۔

''تم انکل ہیو کو کیسے جانتے ہو؟'' برنیڈا نے سوال کیا۔

''برسوں پہلے پیرس میں ملاقات ہوئی تھی۔ پھر طویل عرصے رابطہ منقطع رہا۔ چند سال قبل میں نے اپنی کنسلٹنگ فرم قائم کی تو ایک بار پھر تمہارے انکل سے رابطہ قائم ہو گیا۔''

''جارڈن نے سکاروف اینڈ وولف کے بارے میں بتایا تھا۔ اس کی اصل نوعیت کیا ہے؟''

''کیا مطلب ہوا اس سوال کا؟'' رچرڈ ٹھٹک گیا۔

''سرکاری یا غیر سرکاری؟''

رچرڈ ہنسنے لگا۔ ''تم دونوں بہن بھائی بہت باریک چھیلتے ہو۔''

''ہم نے سیکھا ہے۔ سرسری اور رسمی باتوں میں سچ چھپ جاتا ہے۔'' برنیڈا نے کہا۔

''تمہیں سچ کی تلاش ہے؟''

''ہم سب ہی سچ جاننا چاہتے ہیں۔''

''میں نے سچ بتایا ہے۔ میرے پارٹنر کا نام نکی سکاروف ہے۔''

''نکی؟ نکولائی سکاروف؟''

''تم جانتی ہو؟''

''پہلے وہ KGB میں تھا۔ عجیب بات ہے، اب وہ تمہارے ساتھ ہے۔'' کچھ دیر کے لیے خاموشی رہی۔

''کیا تم اب بھی سی آئی اے کے لیے کام کرتے ہو؟''

''میں نے کب کہا، میں سی آئی اے کے لیے کام کرتا تھا؟''

''اندازہ لگانا دشوار تو نہیں۔ تمہارا راز میرے پاس راز رہے گا۔''

''مجھے تفتیش پسند نہیں ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔

''اگر تمہیں زیرِ تشدد رکھا جائے تو تفتیش کیسی رہے گی؟''

رچرڈ پھر رک گیا۔ ''یہ اس بات پر منحصر ہے کہ تشدد کی نوعیت کیا ہے اور کون کر رہا ہے؟''

''فرض کرو وہ میں ہوں۔'' برنیڈا نے اندازِ دلربائی سے کہا۔

''پھر میں ہر نا کردہ جرم بھی قبول کرلوں گا۔''

''دیکھوں گی، سوچوں گی...... تم خطرناک آدمی لگتے ہو۔''

''ابھی دیکھ لو، ابھی سوچ لو...... تمہارے لیے بے ضرر ہوں۔''

''نہیں صبر کرو۔ آؤ باہر چلتے ہیں۔''

''یہاں بیٹھتے ہیں کچھ دیر۔'' رچرڈ نے سنگی بینچ کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم دونوں کو انکل نے پالا ہے؟'' ساتھ ہی اس نے سوال کیا۔

''ہاں...... ماں باپ کے بعد...... اس وقت ہم بہت چھوٹے تھے۔'' برنیڈا نے جواب دیا۔ ''تم کیا جانتے ہو اُن کے بارے میں؟''

''کچھ خاص نہیں۔ وہ اس وقت پیرس میں تھے......''

''انکل ہیو کہتے ہیں کہ وہ ایک خفیہ مشن تھا۔ وہ دونوں فرائض کی انجام دہی کے دوران......'' برنیڈا رک گئی۔
''اس کے علاوہ انکل نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ کسی نے نہیں بتایا۔'' برنیڈا کی آواز میں درد اور شکوہ نمایاں ہو گیا۔ ''ان دنوں میں، والدین کے بارے میں بہت سوچتی رہی ہوں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ ان کی موت وہاں پندرہ جولائی کو آج سے بیس برس پہلے ہوئی تھی اور آج چودہ جولائی ہے۔ تم کچھ بتاؤ گے؟''

''میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ جب انہوں نے یہ دنیا چھوڑی، اس وقت وہ پیرس میں تھے۔''

''تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟''

''سکاروف اینڈ وولف، انک۔'' رچرڈ نے نرمی سے کہا۔

''غلط کہتے ہو۔'' برنیڈا کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

پیرس میں اس وقت پونے نو بجے تھے۔ ماری سینٹ پیری اپنے بستر میں تھی۔ ریموٹ کنٹرول کی مدد سے ٹی وی پر وہ اپنا پسندیدہ پروگرام تلاش کر رہی تھی۔ محبت، نفرت، اذیت، سکون، حسد، انتقام، وفا اور بے وفائی...... پروگرام کی کہانیاں انہی موضوعات کے گرد گھومتی تھیں۔ ماری کو علم تھا کہ محبت، اذیت، وفا اور بے وفائی کیا ہوتی ہے۔ غصہ جب اسے انتقام کی طرف دھکیلتا تو وہ بے بس ہو جاتی۔ نتائج اسے ڈرا کر پسپا کر دیتے تھے۔ وہ فلپ سے بہت پیار کرتی تھی۔ دونوں نے ساتھ خاصا وقت گزارا تھا۔ ایک کے بعد دوسری وزارت...... انہوں نے سیاست میں ایک کامیاب سفر طے کیا تھا۔

پروگرام تلاش کرتے کرتے وہ خبروں پر رک گئی۔ لندن کی معاشی کانفرنس کا منظر محض پانچ سیکنڈ کا تھا۔ وہ پھر سوچنے لگی کہ اسے فلپ کے ساتھ لندن جانا چاہیے تھا۔ اگرچہ وہ فضائی سفر سے خوف کھاتی تھی پھر بھی یہ بہت اچھا ہوتا۔ دونوں ہوٹل میں ایک ہی کمرے میں ٹھہرتے۔ اچانک دوسرے خیال نے اسے پریشان کر دیا۔ اس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ وہ یہاں تھی اور فلپ لندن میں۔

کیا وہ وہاں اکیلا ہے؟ ماری اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ امکانات کا جائزہ لے رہی تھی۔ بالآخر وہ خود کو روک نہ سکی اور فون اٹھا لیا۔ اس نے پیرس میں نینا سدرلینڈ کے اپارٹمنٹ کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بجتی رہی، کسی نے نہیں اٹھایا۔ اس نے پھر نمبر ملایا...... پھر ملایا...... اور بند کر دیا۔ وہ فون کو گھورتی رہی۔ تو وہ فلپ کے ساتھ لندن میں ہے۔ ماری کی جگہ وہ فلپ کے ساتھ ہوٹل میں رہے گی۔ ٹی وی پروگرام اس کے ذہن سے نکل گیا۔ اسے نینا کا اپارٹمنٹ چیک کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے، اس کا وہم ہو...... بالآخر اس نے نینا کا اپارٹمنٹ چیک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جلدی جلدی لباس تبدیل کیا، چابیاں اٹھائیں۔ خواب گاہ سے نکل کر سیڑھیاں طے کیں اور نیچے لیونگ میں آ گئی۔ بیرونی دروازہ کھولتے ہی باہر کی نیم سرد ہوا چہرے سے ٹکرائی۔ ٹھیک اسی وقت سماعت شکن دھماکا ہوا۔ وہ دروازے سے باہر کی جانب گری۔ سامنے پھیلے ہوئے ہاتھوں نے اس کا سر بچا لیا۔ شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اس پر برس رہے تھے۔ آہستہ سے کروٹ لے کر وہ پشت کے بل لیٹ گئی۔ اوپر خواب گاہ کو سرخ، نارنجی شعلے چاٹ رہے تھے۔

وہ بم میرے لیے تھا۔ میرا محبوب جانتا تھا کہ میں اپنا پسندیدہ پروگرام کتنے بجے دیکھتی ہوں......

آگ بجھانے والی گاڑیوں کے سائرن کے ساتھ پولیس ہوٹر کی آواز بھی بلند ہو رہی تھی۔

☆☆☆

انگلینڈ

معزز مہمانانِ گرامی کی گفت و شنید مدھم ہوتے ہوئے سرگوشیوں میں ڈھل گئی۔ دو آوازیں نمایاں تھیں۔ ریگی وان اور ہیلن وان...... ریگی نے حسبِ عادت زیادہ چڑھا لی تھی۔ ہیلن تنبیہ کرتی رہی۔ پھر دونوں میں حسبِ معمول کھٹ پھٹ شروع ہو گئی۔ ریگی خاصا تُن تھا اور مزید جام کی خواہش میں مرا جا رہا تھا۔ ہیلن نے صاف انکار کر دیا۔

''ہوش میں رہو، کیوں اپنا مذاق بنا رہے ہو......''

''مم...... میں...... ہوش میں ہوں، ہنی...... لاؤ اِدھر لاؤ۔''

اس وقت برنیڈا وہاں پہنچی۔ اس کے عقب میں رچرڈ تھا۔

''اچھا تم اپنا منہ بند رکھو۔'' ہیلن نے غصے سے کہا۔

''میں نے کیا غلط کہہ دیا...... برنارڈ کو میڈل ملنا چاہیے تھا۔''

''تم کچھ نہیں جانتے، لہٰذا خاموش رہو۔''

''میں جانتا ہوں...... یہاں سب جانتے ہیں۔''

ریگی نے ہاتھ لہرایا۔
''ضروری نہیں ہے کہ ہر کسی کو میڈل دیا جائے۔'' نینا نے مداخلت کی۔
''لیکن ممی اور ڈیڈی نے فرائض کی انجام دہی کے دوران جان قربان کی تھی۔ انہیں اعزاز سے محروم نہیں رکھنا چاہیے تھا۔'' برنیڈا نے تنی ہوئی آواز میں کہا۔
''ان دی لائن آف ڈیوٹی؟'' ریگی بولا۔ ''ایسا نہیں تھا۔'' اس نے بہکی ہوئی آواز میں کہا اور پینڈورا باکس کھل گیا۔ وہاں یک دم سکوت چھا گیا تھا۔ جارڈن نے بہن کو اور برنیڈا نے جارڈن کی طرف دیکھا۔
''کیا بک رہے ہو؟'' برنیڈا نے شستگی کا دامن چھوڑ دیا۔
ریگی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''ہیو کو چاہیے تھا کہ تم دونوں کو بتا دے۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔
''کیا بتا دینا چاہیے تھا؟'' جارڈن بھی ضبط نہ کرسکا۔
''پیرس کے اخبارات میں سب چھپ چکا ہے۔ یہ پبلک ریکارڈ کا حصہ ہے، وہ ڈیوٹی کے دوران میں نہیں......''
''ریگی......!'' جارڈن اس کے قریب چلا گیا۔
''ہمارے والدین کو پیرس میں گولی ماری گئی تھی۔ یہ مرڈر تھا۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟'' اس نے آہستہ آہستہ الفاظ چباتے ہوئے سوال کیا۔
''ہاں......وہ...... ہاں ایک مرڈر تھا۔''
''ایک مرڈر۔'' جارڈن نے قطع کلامی کی۔
''کیا ہوا تھا وہاں؟'' برنیڈا نے دانت پر دانت جمائے۔
ہیلن نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''میں نے ہیو سے کہا تھا کہ حقائق دفنانے سے بہتر ہے کہ بتا دیا جائے۔''
برنیڈا، ہیلن کو گھورنے لگی۔ ''انکل نے کیا دفنایا ہے؟''
ہیلن نے ہونٹ سی لیے۔ سکوت کا پردہ نینا نے چاک کیا۔ ''پولیس کے مطابق ایک مرڈر تھا اور دوسری خودکشی......''
''نہیں......ں......!'' برنیڈا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ پلٹی اور بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔
''دعوت میں شرکت کا بہت شکریہ۔'' جارڈن نے سرد لہجے میں کہا اور بہن کے پیچھے نکل گیا۔ اس نے برنیڈا کو سیڑھیوں کے قریب جالیا۔

''جارڈن، یہ جھوٹ ہے۔''
''ہاں میری بہن، یہ لوگ بکواس کررہے ہیں۔''
''لیکن کیوں؟''
''افواہیں......''
''انکل ہیو، کہاں ہیں؟''
''دوسری منزل پر ہوں گے۔'' جارڈن نے جواب دیا۔
''آؤ، ہمیں اس معاملے کو سیدھا کرنا ہے۔'' برنیڈا کی آواز میں ارادے کی صلابت تھی۔
سیڑھیاں چڑھ کر وہ انکل کی اسٹڈی میں چلے گئے۔ انکل ہیو ہنگامی انداز میں کسی سے فون پر بات کررہے تھے۔ برنیڈا کی آواز پر انہوں نے توجہ نہیں دی۔ پشت ان دونوں کی جانب تھی۔
''کلاڈ، ٹائمنگ حیرت انگیز ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ حادثہ نہیں ہے؟''
''ہاں......ٹھیک ہے۔''
''کیسے ہوسکتا ہے؟ اوہ گاڈ، میں فلپ کو بتاتا ہوں۔ اسے واپس جانا پڑے گا۔'' ہیو نے فون بند کردیا۔ وہ پلٹے تو تاثرات بکھرے ہوئے تھے۔
''کیا بات ہے؟''
''کیا آپ ممی اور ڈیڈی کے بارے میں سچائی بتائیں گے؟'' برنیڈا نے ابتدا کی۔
انکل ہیو کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ ''کیا باتیں کررہے ہو؟''
''آپ نے کبھی نہیں بتایا کہ دونوں میں سے کسی نے خودکشی کی تھی؟''
''تمہیں کس نے بتایا؟'' انکل کا موڈ بدل گیا۔
''نینا سدرلینڈ، ریگی، ہیلن...... بلکہ لگتا ہے ہم دونوں کے علاوہ ساری دنیا جانتی ہے۔''
انکل ہیو نے خاموشی اختیار کی اور دروازے کا رخ کیا۔
''انکل یہ جھوٹ ہے؟''
''ہم پھر بات کریں گے اِس موضوع پر۔''
''انکل بتائیں، یہ جھوٹ ہے۔'' برنیڈا روہانسی ہوگئی۔ ہیو کے قدم تھم گئے۔ ''میں نے بھی اس بات پر یقین نہیں کیا۔'' ہیو نے کہا۔ ''برنارڈ، میڈیلن کو خراش تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔'' انکل کی آواز بوجھل سی ہوگئی۔ ''پلیز، ہم پھر بات کریں گے جب سب چلے جائیں گے۔'' وہ باہر نکل

گئے۔

بہن، بھائی ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

''ڈیئر گاڈ، جارڈی...... یہ سچ ہے۔'' برنیڈا کا رنگ فق تھا۔

☆☆☆

رچرڈ بال روم میں ہی تھا۔ اس نے برنیڈا اور جارڈن کو آگے پیچھے روانہ ہوتے دیکھ لیا تھا۔ کچھ گڑبڑ تھی لیکن وہ صحیح ادراک نہ کر سکا۔ وہ ان دونوں کے پیچھے جانے کا ارادہ باندھ رہا تھا، جب اس نے ہیلن کو اپنی طرف حرکت کرتے دیکھا۔ اس کا سر دائیں بائیں ہل رہا تھا۔

''بہت برا ہوا۔'' وہ بڑبڑا رہی تھی۔ ''خود پر قابو نہ ہو تو زیادہ نہیں پینا چاہیے۔''

''کیا برا ہو گیا؟''

''ان دونوں کو برنارڈ اور میڈیلن کی حقیقت معلوم ہو گئی ہے۔''

''کس نے بتایا؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔

''نینا، لیکن غلطی ریگی کی ہے۔ وہ ہوش میں نہیں تھا۔''

''مجھے جارڈن اور برنیڈا سے بات کرنی چاہیے۔'' رچرڈ نے دروازے کی طرف دیکھا۔

''نہیں۔ یہ ان کے انکل کی ذمے داری ہے۔ انہیں کرنے دو۔''

رچرڈ نے کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک کہتی ہو۔ اس کے بجائے مجھے نینا کا گلا گھونٹنا چاہیے۔''

''میرے شوہر (ریگی) کی گردن دباؤ، اجازت ہے۔'' ہیلن نے کہا۔

رچرڈ گھوما اور ہیوٹراوسٹوک نے بال روم میں قدم رکھا۔ وہ رچرڈ کی طرف ہی آ رہا تھا۔ رچرڈ کی چھٹی حس نے ٹھوکا دیا۔

''فلپ کہاں ہے؟'' ہیو نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ گارڈن میں ہو گا۔'' ہیلن نے کہا۔ ''خیریت ہے؟''

''ساری شام برباد ہو گئی...... پیرس سے کال آئی ہے۔ فلپ کی رہائش گاہ پر بم پھٹا ہے۔''

رچرڈ چونک اٹھا۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' ہیلن کی دہشت آمیز سرگوشی سنائی دی۔ ''کیا ماری......''

''ماری، اسپتال میں ہے۔ ٹھیک ہے۔''

''قاتلانہ حملہ؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔

ہیو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

آدھی رات کے بعد انکل اور جارڈن نے برنیڈا کو تلاش کر لیا۔ وہ ایک غیر استعمال شدہ بند کمرے میں تھی۔ وہ اس کی ماں کا کمرا تھا۔ ماں کا ٹرنک کھول کر اس نے تمام اشیا بکھیر دی تھیں۔ بیشتر اشیا غیر اہم تھیں۔ وہ ان کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ باتیں کر رہی تھی۔

انکل ہیو اُس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئے۔

''برنیڈا۔'' انہوں نے نرمی سے کہا۔ ''وقت آ گیا ہے۔''

''وقت بہت پہلے آ جانا چاہیے تھا۔''

''تم دونوں اس وقت بہت چھوٹے تھے اور حقائق تکلیف دہ تھے۔''

''اب زیادہ اذیت ہو گی۔'' برنیڈا نے انکل کی طرف نہیں دیکھا۔ ''ڈیڈی، ممی سے بہت پیار کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی ممی کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ مجھے یاد ہے۔'' اس نے اچانک نظریں اٹھائیں۔ اس کی نگاہوں میں آگ تھی۔ انکل نے نظریں چرائیں۔

''مجھے بھی یاد ہے۔'' جارڈن نے کہا۔

انکل نے عینک اتار کر آنکھیں مسلیں اور تھکے تھکے انداز میں بولے۔ ''سچائی اور بھی زیادہ تلخ ہے۔''

''ایک مرڈر اور ایک خودکشی...... اس سے زیادہ تلخ اور کیا ہو گی۔''

''میرے آفس میں پہلے تم فائل دیکھ لو، چلو اٹھو۔''

وہ ایم آئی سکس کی کلاسیفائڈ فائل تھی۔ جس پر برنارڈ اور میڈیلن ٹراوسٹوک کا نام لکھا تھا۔

''مجھے اس پر یقین نہیں ہے، نہ میں تمہیں یہ دکھانا چاہتا تھا۔'' انکل نے اداسی سے کہا۔ وہاں گہرا سکوت چھا گیا۔ اسی خاموشی میں برنیڈا نے فائل کھولی۔ جارڈن بھی دیکھ رہا تھا۔ پیرس پولیس رپورٹ کی نقول تھیں۔ گواہان کے بیانات اور تصاویر...... مرڈر سین۔ اخذ کردہ نتائج کے مطابق برنارڈ نے کلوز رینج سے میڈیلن کو تین گولیاں ماری تھیں۔ پھر گن اپنے سر پر رکھ کے ٹریگر دبا دیا تھا۔ خوفناک تصاویر کا مشاہدہ ناقابلِ برداشت تھا۔ برنیڈا تیزی سے آگے بڑھتی گئی۔ پھر ایک رپورٹ پر رک گئی۔ رپورٹ فرنچ

خفیہ محکمے کی جانب سے تھی۔
''ناممکن!'' وہ بڑبڑائی۔
رپورٹ کے مطابق برنارڈ کے ساتھ بریف کیس تھا جس میں نیٹو کی خفیہ فائلز تھیں۔ فائلز میں اتحادی افواج کے ہتھیاروں کی تفصیل تھی۔ ان فائلز کو سفارت خانے کی حدود سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔
''یہ کیسے تصدیق ہوا کہ فائلز ڈیڈی نے نکالی تھیں؟''
''برنارڈ کو رسائی حاصل تھی۔ وہ نیٹو اور ہماری ایجنسی کے درمیان رابطہ تھا۔ کئی ماہ سے ایسی دستاویزات مشرقی جرمنی میں پہنچائی جارہی تھیں۔ پہنچانے والے کا کوڈ نیم ''ڈیلفی'' تھا۔ ہمیں علم ہوگیا تھا لیکن ہم کالی بھیڑ تک پہنچنے میں ناکام رہے پھر دستاویزات برنارڈ کی باڈی کے قریب دریافت ہوئیں۔''
''اور آپ نے سوچا کہ ڈیڈی ہی دراصل ''ڈیلفی'' تھے۔'' جارڈن نے کہا۔
''نہیں، یہ نتیجہ فرنچ خفیہ نے اخذ کیا تھا۔ مجھے اتفاق نہیں تھا۔ تاہم میں اسے متنازعہ بھی نہیں بنا سکتا تھا۔''
''لیکن آپ نے کبھی اس پر دل سے اعتبار نہیں کیا؟'' برنیڈا نے کہا۔
''میں ثبوت وشواہد کو چیلنج نہیں کرسکتا تھا جو کہہ رہے تھے کہ ڈیلفی کو پہچان لیا گیا ہے اور برنارڈ نے بے عزتی پر موت کو ترجیح دی۔ ہاں، میں نے کبھی اسے بطور ڈیلفی تسلیم نہیں کیا۔ ڈیلفی کی تلاش بھی رک گئی۔ ایم آئی سکس میں میرے چند سال بچے تھے۔ میں برنارڈ کا بھائی تھا۔ میں نے کیریئر کی وجہ سے خاموشی اختیار نہیں کی تھی بلکہ کوئی راستہ ہی نہیں بچا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ایم آئی سکس میں کتنے ہی لوگ رپورٹ سے خاموش اختلاف رکھتے تھے۔ برنارڈ کے خون میں غداری شامل نہیں تھی۔ یہ گہری سازش تھی۔ کسی نے سچائی چھپانے کے لیے ان دونوں کو ختم کردیا۔'' ہیو کی آواز بھرا گئی۔
''آپ نے کچھ بھی نہیں کیا؟''
''وہ میرا بھائی تھا جو کرسکتا تھا، میں نے کیا۔ کلاڈ ڈامیر پیرس آپریشن کا چیف تھا۔ اس وقت وہ آئی ایم سکس کے ساتھ رابطے میں تھا۔ میں نے اس سے تبادلہ خیال کیا اور اسے قائل کیا کہ وہ نئے زاویے سے تفتیش کرے۔ تاہم دوسری بار بھی کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔''
''یقیناً کلاڈ ڈامیر ایک ایڈیٹ ہے۔ اور یہ میں خود جاکر اُسے بتاؤں گی۔'' برنیڈا جنگلی بلی کے مانند غرائی۔

''کہاں جارہی ہو؟''
''سامان پیک کرنے...... جارڈی تم چل رہے ہو؟''
''کہاں جاؤ گی؟'' انکل ہیو نے پریشانی سے کہا۔
''پیرس۔''

☆☆☆

صبح چھ بجے فون کی گھنٹی نے رچرڈ وولف کی نیند میں خلل ڈال دیا۔
''وہ دوپہر کی فلائٹ پر پیرس کے لیے بک ہیں۔'' کلاڈ کی آواز آئی۔ ''میرے دوست نئی مصیبت کھڑی ہونے والی ہے۔''
رچرڈ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ ''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟ کون پیرس جارہا ہے؟''
''برنیڈا اور جارڈن۔ ہیو کی کال آئی تھی۔''
''وہ بالغ ہیں۔ کہیں بھی جاسکتے ہیں۔'' رچرڈ دوبارہ لیٹ گیا۔
''وہ دونوں برنارڈ اور میڈیلن کے لیے آرہے ہیں۔''
''بہت خوب! ہیو نے روکا نہیں؟'' رچرڈ نے پوچھا۔
''کوشش کی تھی لیکن وہ لڑکی...... بہت ضدی ہے، تم تو مل چکے ہو؟''
''ہاں خاصی اڑیل ہے۔ ماں پر گئی ہے۔ بہرحال وہ کتنا جان گئی ہے؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔
''اس نے میری رپورٹ دیکھ لی ہے اور ڈیلفی کے بارے میں پڑھ لیا ہے۔ ظاہر ہے وہ خطروں کو دعوت دے رہے ہیں، ہیو دونوں بچوں کے تحفظ سے متعلق فکرمند ہے...... میں خود بھی پریشان ہوں۔''
''اچھا فلپ کے گھر پر دھماکے کا کیا ہوا؟''
''ماری فلپ کی قسمت اچھی تھی۔ وہ بچ گئی ہے۔''
''کسی نے ذمے داری قبول کی ہے؟'' رچرڈ نے جاننا چاہا۔
''ہاں، ایک گروپ کی جانب سے کال آئی تھی جو خود کو کاسمک سولیڈیرٹی کا نام دیتا ہے۔''
''نیا نام ہے۔'' رچرڈ نے تبصرہ کیا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ انکل کے بچوں کے لیے کیا کرسکتے ہو؟''
''وہ مجھ پر بھروسا نہیں کریں گے۔ وہ فائل میں میری رپورٹ دیکھ چکے ہیں۔ لیکن یہ کام تم کرسکتے ہو۔''
''باڈی گارڈ بن جاؤں؟''

''میں جانتا ہوں۔تم کچھ نہ کچھ کرسکتے ہو۔''

''کیوں؟ انکل نے کہا ہے کچھ؟'' رچرڈ نے استفسار کیا۔

''نہیں' میں کہہ رہا ہوں۔''

''ایک ہی بات ہے۔''

☆☆☆

واپسی کے سفر میں ریگی اور ہیلن وان، نینا سدرلینڈ اور اس کے بیٹے انتھونی کے ساتھ ائرفرانس میں تھے۔ موضوع گفتگو ٹراوسٹوک فیملی ہی تھی۔ دونوں خواتین ایک دوسرے کو موردِالزام ٹھہرا رہی تھیں جبکہ ریگی وان نے چپ سادھ لی تھی۔ اصل ذمّے داری اسی پر تھی۔

''بہرحال ایک دن تو ان دونوں کو پتا چلنا ہی تھا۔ اچھا ہی ہوا۔'' نینا نے موضوع بدلنا چاہا۔

''لیکن رزلٹ کیا نکلا۔ وہ دونوں پیرس جارہے ہیں۔'' ہیلن کراہی۔

نینا نے شانے اچکائے۔ ''کیا حاصل؟ عرصہ بیت گیا ہے۔''

''عرصہ بیت گیا...... لیکن کچھ نکل آیا تو متاثر تم کو ہونا ہے۔'' ہیلن بڑبڑائی۔

نینا نے آنکھیں دکھائیں۔ ''کیا مطلب ہے؟''

''اوہ، نہیں...... کچھ نہیں۔''

''نہیں، بتاؤ...... کیا کہہ رہی تھیں تم؟''

''کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔ دفن کرو۔'' ہیلن بھی چیخ پڑی۔

نینا، اسے گھورتی ہوئی اٹھی اور دوسری طرف چلی گئی۔ انتھونی بھی اٹھ گیا۔

''مادر، تم ٹھیک ہو؟''

نینا کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے۔ ''مردود ریگی کا کیا دھرا ہے...... وہ کتیا بھی ٹھیک کہتی ہے۔ کچھ ہوا تو میں ہی پھنسوں گی۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟ بیس برس بعد؟'' انتھونی نے کہا۔

''کیا کہہ سکتے ہیں؟''

☆☆☆

برنیڈا، پیرس رٹز کے سویٹ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہ، پیرس اپنی دو سہیلیوں کے ہمراہ آٹھ سال پہلے آئی تھی...... دروازے کی آواز پر وہ مڑی۔ متصل سویٹ کی کنکٹنگ ڈور سے جارڈن اندر آرہا تھا۔

''کلاڈ ڈامیر نے بالآخر کال ریٹرن کی ہے۔ وہ دھماکے کی تفتیش میں لگا ہوا ہے۔ تاہم وہ ملنے کے لیے تیار ہے۔''

''کب؟''

''ایک گھنٹے میں۔''

سات بجے، دونوں لی پٹٹ زنک کے بوتھ میں بیٹھے تھے۔ کلاڈ ڈامیر بیس منٹ تاخیر سے پہنچا تھا۔ کانوں کے قریب اس کے بال سفید تھے۔ ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ برنیڈا نے اپنی حیرانگی کو چھپالیا۔ دوسرا آدمی رچرڈ وولف تھا۔

''ہیلو رچرڈ۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔ ''تم یہاں کیسے؟''

''بس اتفاق ہی ہے۔ کل تک مجھے بھی نہیں پتا تھا۔''

چاروں آپس میں متعارف ہونے کے بعد بیٹھ گئے۔ کلاڈ نے آرڈر دیا۔

''جب مجھے علم ہوا کہ رچرڈ لندن میں ہے تو مجھے خیال آیا کیوں نا اس کے تجربے سے مستفید ہوا جائے۔'' کلاڈ نے بتایا۔

''اس کا مطلب فلپ کی رہائش گاہ پر دھماکے سے ہے۔'' رچرڈ نے وضاحت کی۔ ''میں کئی برسوں سے دہشت گرد تنظیموں کا مشاہدہ کرتا رہا ہوں۔''

''یہاں کون ملوث ہے؟'' جارڈن نے سوال کیا۔

''یہ نیا نام ہے۔ کاسمک سولیڈیریٹی۔ بہرحال میرا وزٹ ضائع نہیں گیا۔ تم لوگوں سے ملاقات ہوگئی۔''

''مطلب پر آتے ہیں۔'' برنیڈا نے کلاڈ کو دیکھا۔

''انکل نے بتایا ہوگا کہ ہم یہاں کیوں ہیں؟''

''میں واقف ہوں۔ فائل پڑھ لی؟''

''کورٹو کور۔'' جارڈن نے جواب دیا۔ کچھ دیر تینوں کے درمیان سوال جواب ہوتے رہے۔ کلاڈ نے مضبوط شواہد کے ساتھ وضاحت پیش کی تھی۔

''محرک کہاں گیا؟'' برنیڈا نے سوال کیا۔ ''ڈیڈی اپنی محبت کا خون کیوں کریں گے؟''

''محبت محرک ہوسکتی ہے۔ محبت یا پھر کھوئی ہوئی محبت...... ممکن ہے میڈیلین کسی اور کو......''

''ناممکن......'' برنیڈا کے جبڑے بھنچ گئے۔ ''ممی، صرف ڈیڈی سے محبت کرتی تھیں...... اور بہت زیادہ۔''

کلاڈ نے نگاہ نیچی کرکے کہا۔ ''تم نے مالک مکان ریڈ کا بیان نہیں پڑھا۔''

برنیڈا اور جارڈن نے اُلجھن سے ایک دوسرے کو

دیکھا۔

''ریڈو؟ فائل میں ایسا کچھ نہیں تھا۔''

''میں نے اسے فائل میں شامل نہیں کیا تھا۔ میری صوابدید تھی۔''

صوابدید۔ برنیڈا نے سوچا۔ کچھ چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔

''وہ فلیٹ، ریڈو کی ملکیت میں تھا۔ اس نے اسکارلیٹی کو کرائے پر دیا ہوا تھا۔ میڈیلن وہاں ہفتے میں ایک یا دو بار ضرور آتی تھی۔ وہاں آنے کا مقصد.....'' کلاڈ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''آنے کا مقصد آشنا سے ملنا تھا۔'' جارڈن نے کھردرے لہجے میں جملہ مکمل کیا۔

''فلیٹ کے مالک کے بیان کے مطابق میڈیلن اور اسکارلیٹی ایک ہی عورت کے دو نام تھے۔ یہ حقیقت باڈی دریافت ہونے پر ریڈو پر منکشف ہوئی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میڈیلن نے فلیٹ اسکارلیٹی کے نام سے کرائے پر لیا ہوا تھا جسے وہ ملاقات کے لیے.....'' وہ پھر چپ ہو گیا۔

''میرے پاس ریڈو کا تحریری بیان موجود ہے۔''

''ہمیں ریڈو سے بالمشافہ ملنا پڑے گا۔'' برنیڈا نے بمشکل خود پر قابو پایا۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' کلاڈ نے کہا۔ ''وہ عمارت کئی مرتبہ فروخت ہو چکی ہے۔ ریڈو بھی ملک چھوڑ چکا ہے۔ نہیں معلوم کہاں ہوگا۔''

دونوں بہن بھائی سکتے کی حالت میں گنگ بیٹھے تھے۔ دونوں کا ذہن اذیت ناک خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ ماں کا کوئی آشنا تھا جس سے وہ ریومیراج کے نمبر پانچ فلیٹ میں ملاقات کرتی تھی۔ باپ کو پتا چلا تو اس نے اپنی محبت کا خون کر کے خودکشی کر لی...... برنیڈا کے دماغ کا ہر خلیہ چیخ رہا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے رچرڈ کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں ہمدردی کی خفیف سی رمق تھی۔ کیا وہ بھی یقین کر بیٹھا ہے؟ معاً اسے غصہ آیا کہ وہ ان کے خاندان کے ایک شرمناک راز سے آگاہ ہو گیا ہے۔

بیپ کی آواز پر کلاڈ نے پیجر نکالا۔ ''معذرت خواہ ہوں، مجھے جانا پڑے گا۔ دھماکے والا کیس وقت مانگ رہا ہے۔''

''تم نے ڈیلفی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی؟'' جارڈن نے اعتراض کیا۔

''جلد ہی میں اس پر بات کروں گا۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

''اس نے چند خوفناک باتیں کیں اور بم کا بہانہ کر کے نکل گیا۔ بظاہر اس نے ہمیں خوف زدہ کر دیا ہے کہ ہم اپنی تفتیش روک دیں۔ مزید یہ کہ مالک مکان بھی غائب ہے۔ ہم کہاں سے شروع کریں گے؟ کیا میں غلط سوچ رہی ہوں؟'' برنیڈا نے رچرڈ کو سوالیہ نظر سے دیکھا۔

''تم یہ سوال مجھ سے کیوں کر رہی ہو؟''

''کیونکہ تم دونوں ایک دوسرے کو بہتر جانتے ہو۔''

''کلاڈ خفیہ باتیں ظاہر نہیں کرتا۔ لیکن وہ اپنے دوستوں کو بھولتا بھی نہیں ہے اور تمہارے انکل اس کے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کلاڈ تمہیں گمراہ نہیں کرے گا۔''

'رچرڈ بھی انکل کا پرانا دوست ہے۔' برنیڈا نے سوچا۔

''تمہیں کلاڈ نے بلایا تھا؟''

''ہاں، لیکن وہ دوسرا معاملہ ہے۔ میں بتا چکا ہوں۔ یعنی کاسمک سولیڈیریٹی۔''

☆☆☆

ایمل فوش کا فون ساڑھے سات بجے بولنا شروع ہوا۔

''تمہارے لیے نیا کام ہے۔'' دوسری جانب سے آواز آئی۔ ''ارجنٹ معاملہ ہے اور تمہیں کامیابی سے اسے نمٹانا ہے۔''

ایمل فوش نے خود کو ردِعمل سے روکا۔ وہ اپنا کام مہارت اور کامیابی سے ہی کرتا تھا۔ وہ اپنے میدان میں پچیس سال سے سرگرم تھا۔ ''میں نے ڈیوائس ٹھیک جگہ لگائی تھی اور وقت بھی وہی تھا جو تم نے بتایا تھا۔ بم اپنے وقت پر پھٹا تھا۔ اس وقت وہ بیڈروم میں نہیں تھی۔ اس میں میری کوئی غلطی نہیں تھی۔''

''اس کی قسمت یاوری کر گئی۔ اس وقت دوسرا کام ہے.....ایک لڑکی، دوسرا لڑکا۔''

''نام بتاؤ۔''

''دونوں بہن بھائی ہیں۔ برنیڈا ٹراوسٹوک اور جارڈن ٹراوسٹوک۔ وہ رٹز میں ٹھہرے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی نگرانی کرو۔ کہاں جاتے ہیں؟ کس سے ملتے ہیں......؟''

''بس؟''

''فی الحال اتنا ہی۔ لیکن صورتِ حال تبدیل بھی ہو سکتی ہے۔''

''ماری فلپ کا کیا کرنا ہے؟'' ایمل فوش نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں۔ بعد میں دیکھیں گے۔ اس وقت دونوں بہن بھائیوں سے پہلے نمٹنا ہے۔''

☆☆☆

رچرڈ نے اختصار کے ساتھ اپنا پس منظر بتایا اور لندن میں موجودگی کی وجہ ظاہر کی۔ لندن کانفرنس میں کئی امریکی فرمز کے ایگزیکٹو کو سیکیورٹی مطلوب تھی۔ انہوں نے سکاروف اینڈ وولف کی خدمات حاصل کی تھیں۔

''لندن میں بس یہی مصرف تھا تمہارا اور تم اکیلے تھے؟''

''مصرف تو یہی تھا مگر ظاہر ہے میں تنہا نہیں تھا، تمہارے انکل کو خبر ملی تو انہوں نے مجھے چیٹ وِنڈ مدعو کر لیا۔''

برنیڈا سوچ رہی تھی کہ وہ کتنا جھوٹ اور کتنا سچ بتا رہا ہے۔ وہ جس میدان کا کھلاڑی تھا۔ وہاں ہر بات سچ نہیں بتائی جاتی۔ تاہم اس کا مجموعی تاثر اچھا تھا۔ برنیڈا صاف محسوس کر رہی تھی کہ وہ غیر محسوس انداز میں اس کی طرف کھنچ رہی ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے دونوں کو رٹز تک چھوڑنے کی پیشکش کی، جارڈن عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ برنیڈا آگے رچرڈ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کار میں خاموشی تھی۔

اچانک وہ بولا۔ ''ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا۔ کیا تم واقعی ہوٹل جانا چاہتی ہو؟''

''اور کہاں جاؤں؟''

''ڈرائیو، واک...... جو تم پسند کرو۔ تم پیرس میں نئی ہو۔''

''جورڈی کیا خیال ہے؟'' برنیڈا نے گردن گھما کر جارڈن سے پوچھا۔

جواب میں خراٹوں کی آواز نے اسے حیرت میں ڈال دیا۔ جارڈن ٹانگیں پھیلائے سو رہا تھا۔ ایک رت جگا اور دو گلاس وائن کے اس کے لیے کافی ثابت ہوئے تھے۔

برنیڈا کی ہنسی نکل گئی۔

''چلو ہم دونوں تھوڑی چہل قدمی کر لیتے ہیں۔''

رچرڈ کی تجویز پر برنیڈا کا دل عجیب انداز میں دھڑکا۔

''پہلے جورڈی کو ہوٹل چھوڑ دینا چاہیے۔''

''ہاں اسے نیند کی ضرورت ہے۔'' رچرڈ نے اتفاق کیا۔

☆☆☆

دونوں ایک باغ سے دوسرے باغ میں ٹہلتے رہے۔ باتیں، سرگوشیاں، رات بھیگنے لگی تھی۔ گھاس، پودوں اور درختوں کی خوشبو، باتوں کا نشہ، برنیڈا کی جلد کی مہک...... بے خود کرنے والی تنہائی۔ کیفیت خود فراموشی بڑھنے لگی۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دونوں ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ زبان کی حرکت کم ہوتی جا رہی تھی۔ لمس اور احساس ہمکلام ہونے لگے۔ کیف و سرور دل کی دھڑکن میں تھا۔ برائے نام فاصلہ بھی مٹا۔ سانس سے سانس ٹکرانے لگی۔ آنکھیں بند تھیں اور زبان خاموش......

اور پھر...... دفعتاً وہ برف کے مانند جم گیا۔ برنیڈا کے حسین چہرے پر اس کے ہاتھوں کا نرم لمس کرختگی اختیار کر گیا۔ اس نے الگ ہونے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم اس کا بدن تن گیا۔ ہونٹ پھسل کر کان کی طرف چلے گئے۔

''چلنا شروع کرو۔''

''کیا؟''

''چلو، کوئی تبدیلی ظاہر مت کرو...... ہاتھ پکڑے رہو۔'' رچرڈ کے ہاتھ کی گرفت بتا رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ برنیڈا نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بجائے رچرڈ کے فراخ سینے میں چہرہ چھپا لیا اور چلتے ہوئے لڑکھڑانے لگی۔ دونوں گرد و پیش سے بے نیاز ایک دوسرے میں ڈوبے ہوئے چل رہے تھے۔ ایسے ہی کئی اور جوڑے بھی وہاں موجود تھے۔ آہستہ آہستہ برنیڈا کا خوف کم ہوتا گیا۔ رچرڈ وقفے وقفے سے ہاتھ دبا کر اسے اطمینان دلا رہا تھا۔ وہ پارک سے نکل گئے۔

تب برنیڈا نے محسوس کیا کوئی ان کے تعاقب میں تھا۔ قدموں کی چاپ بہت مدھم تھی۔ رچرڈ نے رفتار بڑھا دی۔ پارک سے نکل کر وہ ریوڈی ریوالی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ٹریفک کی آواز نمایاں ہونے لگی۔ تاریکی پیچھے رہ گئی تھی۔ لہٰذا خطرہ زیادہ تھا۔ برنیڈا نے سوچا کہ سڑک کی روشنیوں کی طرف بھاگے۔ رچرڈ کے اشارے کی دیر تھی۔ وہ ریوڈی ریوالی پر آ گئے۔ برنیڈا کی نبض اعتدال پر آنے لگی۔ اس نے رچرڈ کے چہرے پر نظر ڈالی۔ تاثرات میں تناؤ کی کیفیت تھی۔ سڑک پار کر کے وہ دوسرے بلاک میں آ گئے۔

''ایک منٹ رکو۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''اس کھڑکی کے شیشے میں دیکھو۔'' دونوں ایک چاکلیٹ شاپ پر رک گئے تھے۔

وہ شیشے کے عکس میں عقب میں دیکھ رہی تھی۔ کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔

''آؤ چلیں۔'' رچرڈ نے ریوڈی ریوالی کے مغربی کونے کا رخ کیا۔ رفتار میں اعتدال تھا۔ جہاں دو سڑکیں کراس کر رہی تھیں، وہاں اس نے برنیڈا کو کھینچا۔ ''بھاگو۔''

دونوں بھاگتے ہوئے ''مونٹ تھابور'' کے قریب ایک قوس کے نیچے سے گزر کر شیڈ کے سائے میں دبک گئے۔ رچرڈ نے سختی سے برنیڈا کو ساتھ لپٹایا ہوا تھا۔ دھڑکنیں دھڑکنوں میں دھڑک رہی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد بھاگتے قدموں کی چاپ بلند ہوئی جو قریب آتی گئی پھر تھم گئی۔ برنیڈا نے آنکھیں بند کر لیں۔

''آنکھیں کھولو، نکلو یہاں سے۔'' دونوں کیٹیگ لیون اسٹریٹ پر آئے۔ وہ بھاگنے کے انداز میں چل رہے تھے۔

☆☆☆

''کیا ہوا تھا؟'' برنیڈا اپنے سوئٹ میں تھی۔

''یقین سے نہیں کہہ سکتا۔''

''کیا وہ ہمیں لوٹنا چاہتا تھا؟ پولیس کو فون کرنا چاہیے؟''

''نہیں، وہ لٹیرا نہیں تھا۔''

''کیا؟''

''ذرا سوچو، ریوڈی ریوالی جیسی پُرہجوم جگہ پر بھی وہ ہمارے پیچھے تھا۔ وہ کوئی لٹیرا ہوتا تو پارک میں واپس جا کر دوسرا شکار تلاش کرتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔''

''مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔''

''درمیانی عمر، پستہ قد، گٹھا ہوا جسم...... عام سا چہرہ، ایسا چہرہ جسے یاد رکھنا مشکل ہے۔''

''مطلب، وہ خاص طور پر ہمارا تعاقب کر رہا تھا؟''

''ہاں۔''

''لیکن کیوں؟'' برنیڈا اُلجھ گئی۔ ''کسی کو مجھ میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

''سوچو تم پیرس کیوں آئی ہو؟''

''مگر یہ فیملی افیئر ہے۔''

''بظاہر ہے...... ورنہ کوئی تعاقب میں کیوں آتا؟''

''مجھے کیسے معلوم ہو کہ وہ تمہارا تعاقب نہیں کر رہا تھا؟ آخر تم سی آئی اے کے لیے کام کرتے رہے ہو؟''

''غلط، میں اپنے لیے کام کرتا ہوں۔''

''اوہ، نو۔ تم بھول رہے ہو کہ میں کس ماحول میں پلی بڑھی ہوں اور میرے کتنے ہی رشتے دار ایم آئی سکس میں ہیں۔ یار ہے ہیں...... جیسے انکل ہیو۔''

''تو تم تعاقب سے خوف زدہ نہیں تھیں؟''

برنیڈا خاموش رہی۔

رچرڈ زخمی درندے کے مانند چکرا رہا تھا۔ اس نے کھڑکیاں بند کر کے پردے برابر کیے۔

''میرے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ کوئی میرے پیچھے بھی آ سکتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ آدمی تمہارا تعاقب کر رہا تھا۔''

''تم کیسے کہتے ہو؟''

''کیونکہ تم بارودی سرنگ پر قدم رکھ چکی ہو۔ تم اُن معاملات کو کھودنے کی کوشش کر رہی ہو جو بیس برس سے دفن ہیں۔ جنہیں دفن رہنا چاہیے...... وہ محض ایک سیکس اسکینڈل نہیں تھا۔ متعدد افراد ملوث تھے۔''

''ایک منٹ رکو...... تم کتنا کچھ جانتے ہو یا کہانی سنا......''

''آرام سے بیٹھ جاؤ۔'' رچرڈ نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ برنیڈا سچ کی توقع نہیں کر رہی ہے۔ اس نے الفاظ کو تولا اور بولا۔

''میں ان دونوں کو جانتا تھا۔ مذکورہ حادثے کے وقت، میں یہیں تھا۔'' اس نے سچ بول کر برنیڈا کی توقعات پر پانی پھیر دیا۔ جو ایک نئی کہانی کی توقع کر رہی تھی۔

''وہ پیرس میں میری پہلی پوسٹنگ تھی۔ سرکاری نوکری اور پیرس سے ابتدا...... میں خود کو خوش قسمت محسوس کر رہا تھا...... پھر میری ملاقات برنارڈ اور میڈیلن سے ہوئی۔'' رچرڈ نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم اپنی ماں کی کاربن کاپی ہو...... ویسے ہی بال، سبز آنکھیں...... برنارڈ تمہاری ماں کا دیوانہ تھا۔ کوئی بھی دیوانہ ہو سکتا تھا۔ تمہاری ماں تھی ہی ایسی......'' رچرڈ گویا خود کلامی کر رہا تھا۔ ماضی میں جھانک رہا تھا۔

''تم بھی دیوانے ہو گئے تھے؟''

''میں اس وقت محض بائیس برس کا تھا اور اس وقت میں اُس کی بیٹی سے نہیں ملا تھا۔'' دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ معاً وہ کھڑی ہو گئی۔

''اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ مخلص نہیں ہیں تو ساتھ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کو الوداع کہہ دینا چاہیے۔''

''بالکل بھی نہیں۔ اب جبکہ میں جان گیا ہوں کہ کوئی

شیر

ایک اخبار کے بچوں کے صفحے میں جنگل کے بادشاہ یعنی شیر کا انٹرویو شائع ہوا۔ اس انٹرویو سے متاثر ہو کر جنگل کے بادشاہ کا ایک انٹرویو میں نے بھی کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

''آپ کو جنگل کا بادشاہ کیوں کہتے ہیں؟''

''تم انٹرویو کرنے آئے ہو یا میری بادشاہی کو چیلنج کرنے...... مابدولت کو اس قسم کے سوال بالکل پسند نہیں۔''

''جہاں پناہ، آپ یونہی بُرا مان گئے۔ میرا مطلب ہے آپ الیکشن کے ذریعے منتخب ہوئے تھے یا آپ کو اپنی بے پناہ طاقت کی وجہ سے بادشاہ تسلیم کیا گیا ہے؟''

''تم گستاخ بھی ہو اور بے وقوف بھی، بادشاہ بھی کبھی الیکشن کے ذریعے منتخب ہوئے ہیں؟''

''حضور والا...... جاپان اور برطانیہ میں اگرچہ بادشاہت موروثی ہے مگر اس کے باوجود......!''

''بس بس غیر ملکی نظام کے حوالے دینے کی ضرورت نہیں۔ ہم جنگل کے بادشاہ ہیں۔ جنگل کے قانون کے حوالے سے بات کرو۔''

''بندہ معافی کا خواست گار ہے۔ آپ سے ایک سوال پوچھنے کی جسارت کروں گا۔ اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں؟''

''تمہاری جان بخشی جاتی ہے۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے؟''

''حضور کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے بیس گھنٹے تو آپ سوئے رہتے ہیں۔ تو کیا اس نظامِ حکومت میں کوئی خلل نہیں پڑتا؟ کیا آپ کو تختہ الٹ جانے کا خطرہ نہیں ہوتا؟''

''خطرہ کیسے ہو سکتا ہے جنگل میں ہم سب شیر اپنا اپنا شکار کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی شکار گاہوں میں دخل نہیں دیتے۔ مابدولت اکیلے جنگل کے بادشاہ نہیں، ہم شیروں کو پورا گروہ جنگل کا بادشاہ ہے۔''

''اس کی کیا وجہ ہے کہ جنگل کے سب جانور اکٹھے ہو کر آپ کے خلاف محاذ آرا نہیں ہوتے؟''

''تم بہت بھولے ہو نوجوان...... ان میں سے بہت سوں کی روزی ہماری ذات سے وابستہ ہے۔ ہم جب سیر ہو جاتے ہیں تو بچا کھچا شکار ان کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔''

''میں آپ کی فراست سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ اب جہاں پناہ ایک بات یہ بتائیں کہ آپ کا شمار بسیار خوروں میں نہیں ہوتا بلکہ میری معلومات کے مطابق آپ اپنے شکار مثلاً ہرن وغیرہ کا چوتھائی حصہ بھی نہیں کھا پاتے تو اتنی تھوڑی سی خوراک کے لیے آپ نے پورے جنگل کا ناک میں دم کیوں کیا ہوا ہے؟''

''تم اگر جنگل کے باسی ہوتے تو ہم تمہیں بتاتے کہ ہمیں دیکھ کر جب جانور ادھر ادھر چھپ جاتے ہیں تو اس وقت کس قدر سُرور حاصل ہوتا ہے۔''

''میں حضور کی اعلیٰ ظرفی کا مزید قائل ہو گیا ہوں۔ تو جہاں پناہ جان کی امان پاؤں تو ایک سوال عرض کروں؟''

''کرو کرو عرض کرو۔''

''حضور میں نے ایک دفعہ جنگل کی ایک فلم دیکھی تھی۔ اس میں ایک سین یہ تھا کہ آپ ایک بارہ سنگھے کو شکار کے لیے منتخب کرتے ہیں اور پھر جھاڑیوں میں پیٹ کے بل رینگتے ہوئے اچانک حملے کے لیے آپ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تک سنائی نہ دے لیکن اچانک بارہ سنگھا خطرے کی بُو سونگھ لیتا ہے اور پھر وہ بجائے بھاگنے کے آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے سینگ سیدھے کر کے جوابی حملے کی پوزیشن لے لیتا ہے۔ آپ ایک نظر اس پر ڈالتے ہیں جیسے اس کے عزم اور ہمت کا اندازہ کر رہے ہوں اور پھر دوسرے ہی لمحے آپ چپ چاپ دُم لپیٹ کر واپس چلے جاتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟''

''اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نوجوان ہم بہادروں کی قدر کرتے ہیں اور ان سے جھگڑا مول نہیں لیتے خواہ بارہ سنگھا ہی کیوں نہ ہو۔ بہادروں کے سامنے پسپائی اختیار کرنا بھی کسی بہادر شخص کا ہی کام ہے۔''

''بجا فرمایا آپ نے۔ سوال تو اور بھی ذہن میں بہت تھے مگر اب باقی سوالوں کی ضرورت نہیں رہی، آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

عطاء الحق قاسمی کی کتاب وصیت نامے سے ایک اقتباس

تمہارے پیچھے ہے تو میں گڈ بائے نہیں کہہ سکتا۔‘‘
’’تم میرے باڈی گارڈ ہو؟‘‘
’’کیا نہیں ہونا چاہیے؟‘‘
’’میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔‘‘
’’یہ لندن نہیں ہے۔‘‘
’’میں تنہا نہیں ہوں۔‘‘ برنیڈا نے قدم بڑھائے اور جارڈن کے سوئٹ کا دروازہ کھولا۔ ’’جارڈن...... اٹھو جارڈی!‘‘
’’تمہارا باڈی گارڈ سو رہا ہے۔‘‘ رچرڈ نے کہا۔
’’جارڈی؟‘‘ برنیڈا نے سوئچ آن کیا اور پلکیں جھپکانے لگی۔ جارڈن کا بستر خالی تھا۔

☆☆☆

جارڈن نے کپ میں شکر ملاتے ہوئے سرسری انداز میں بھورے بالوں والی لڑکی کو دیکھا جس نے فوراً ہی نگاہ پھیر لی تھی۔ جارڈن کپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ان دونوں کے درمیان تین میزیں حائل تھیں۔ وہ لڑکی کافی پُرکشش تھی۔ عمر لگ بھگ پچیس برس ہوگی۔ بال لڑکوں کے مانند تراشے گئے تھے۔ سیاہ سویٹر، سیاہ اسکرٹ اور سیاہ رنگ کے اسٹاکنگ۔ یہ فیشن تھا یا کیموفلاج؟ جارڈن نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ لڑکی پھر اسے دیکھ رہی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اسے خوشی ہوتی کہ ایک حسینہ اس پر فریفتہ ہوگئی ہے لیکن وہ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

رچرڈ اور برنیڈا کے رخصت ہونے پر وہ زیادہ دیر سوئٹ میں نہیں رکا تھا...... باہر نکلنے کے بعد اس نے پلیس وینڈوم کا رخ کیا۔ پھر اولیپیا میوزک ہال گیا۔ بعدازاں کیفے ڈی لا پیکس...... وہاں سے نکل کر وہ پیدل ریو ڈی لا پیکس کی طرف چل پڑا تھا۔ نصف بلاک جانے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ سیاہ لباس والی اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ ڈسپلے ونڈوز کے آگے وہ کئی بار رکا اور تصدیق کر لی کہ لڑکی اس کے پیچھے ہے۔ وہ اکتا گیا۔ اگر لڑکی فلرٹ ہے تو اب تک وہ قریب کیوں نہیں آئی۔ یہ کھیل ختم کرنا چاہیے...... براہِ راست اچھا رہے گا۔ فیصلہ کر کے اس نے نصف بلاک مزید طے کیا۔ سڑک کے دوسری جانب لڑکی ساتھ ساتھ تھی۔ وہ ایک دکان کے سامنے رکا۔ مخالف سمت میں لڑکی بھی رک گئی۔

’’ٹھیک ہے، بے بی‘‘...... وہ بڑبڑایا اور اچانک رخ پھیر کے سڑک پار کرنے لگا۔ وہ سیدھا دکان کی طرف لڑکی کے سر پر پہنچا۔

’’میموزیل۔‘‘ وہ بولا۔ لڑکی پلٹی، اس کی آنکھوں میں حیرت اور بیگانگی تھی۔
’’میموزیل، کیا میں پوچھ سکتا ہوں، آپ میرا پیچھا کیوں کر رہی ہیں؟‘‘
لڑکی نے منہ کھولا اور بند کر لیا۔ وہ اپنی براؤن آنکھوں سے مستقل جارڈن کو دیکھے جا رہی تھی۔ خوب صورت آنکھیں تھیں۔
’’شاید آپ سمجھی نہیں؟ پارلے وہ اینگلے (انگلش سمجھ آتی ہے؟)‘‘
’’ہاں۔‘‘ وہ آہستہ سے بولی۔ ’’میں انگلش سمجھتی ہوں۔‘‘
’’تو آپ سمجھائیں گی...... کیوں میرا تعاقب کر رہی ہیں؟‘‘
’’لیکن میں ایسا نہیں کر رہی ہوں۔‘‘
’’ایسا ہی ہے۔‘‘
’’ایسا نہیں ہے...... میں واک کر رہی ہوں، موسیو۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔‘‘ وہ رخ پھیر کر چل دی۔ اس کے چہرے پر خفگی کے اثرات تھے۔ اداکاری کر رہی ہے، جارڈن نے سوچا اور واپس چل پڑا۔ رٹز کی لابی میں جانے سے پہلے نامعلوم خواہش کے تحت اس نے پلٹ کر دیکھا اور بھورے بالوں والی لڑکی کی جھلک دیکھ لی۔ لڑکی نے پھرتی سے آڑ لے لی تھی۔

☆☆☆

کلاڈ نے پانچویں رنگ پر جواب دیا۔
’’کلاڈ، میں رچرڈ ہوں۔ تم نے کسی کی ڈیوٹی لگائی ہے ہمارے پیچھے؟‘‘
’’ہم سے کیا مراد ہے؟‘‘
’’میرے اور برنیڈا کے تعاقب میں؟‘‘
کلاڈ کے ہنسنے کی آواز آئی۔ ’’تم برنیڈا کے ساتھ ہو، یہ کافی نہیں ہے؟‘‘
’’کلاڈ ایک آدمی ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔‘‘
’’چہرہ دیکھا تم نے؟‘‘ کلاڈ نے سوال کیا۔
’’نہیں۔‘‘ رچرڈ نے حلیہ بتایا۔
’’ٹھیک ہے، میں چیک کر لوں گا۔‘‘
’’دوسری بات یہ کہ جارڈن ہوٹل میں نہیں ہے۔‘‘
دوسری جانب کچھ دیر خاموشی رہی۔ ’’یہ تشویش کی بات ہے۔‘‘
’’تمہارے آدمیوں کے پاس کوئی اطلاع ہے؟‘‘

''ابھی رپورٹ نہیں ملی۔'' کلاڈ نے جواب دیا۔
''مطلب، جارڈن کی نگرانی کروا رہے ہو؟''
''ہاں، احتیاط۔''
''نگرانی یا حفاظت؟''
''ظاہر ہے حفاظت۔ وہ ہیو کا بھتیجا ہے۔ وہ لڑکی زیادہ تجربہ کار نہیں ہے۔ تاہم کافی ہوشیار ہے۔''
''لڑکی؟''
''ہاں، جارڈن کے پیچھے میں نے اپنی ایجنٹ کو بھیجا ہے۔''
''کیا نام ہے؟''
''کولیٹ۔'' کلاڈ نے کولیٹ کا حلیہ بتایا۔
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ رچرڈ نے گھومتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''میں پھر فون کرتا ہوں۔ اس نے برنیڈا کو دیکھا جو ساکت کھڑی تھی۔ دستک پھر ہوئی۔
''جاؤ، معلوم کرو...... کون ہے؟'' رچرڈ نے اشارہ کیا۔
''کون ہے؟'' برنیڈا نے لرزاں آواز میں سوال کیا۔
''تم ٹھیک ہو، یا صبح میں آؤں۔'' جارڈن کی آواز میں معنی خیز شوخی تھی۔
''جارڈن!'' وہ خوشی سے چیخی اور دروازہ کھول دیا۔
''کہاں چلے گئے تھے؟''
رچرڈ کو دیکھ کر جارڈن تھم گیا۔ ''آئی ایم سوری، میں مخل ہوا ہوں۔''
''کچھ نہیں، ہم تمہاری وجہ سے پریشان تھے۔''
''میں ذرا چہل قدمی کے لیے نکل گیا تھا...... ایک لڑکی نے میرا تعاقب شروع کر دیا۔ خوب صورت تھی......
''بھورے بال، سیاہ لباس، پانچ فٹ چھ انچ...... عمر پچیس برس۔''
جارڈن نے حیرت سے رچرڈ کو دیکھا۔ ''اب نام بھی بتا دو۔''
''کولیٹ۔ فرنچ خفیہ کی اہلکار ہے۔'' رچرڈ نے نام بتا کر اپنے تعاقب کا احوال بتایا۔
''وہ بھی فرنچ خفیہ کا آدمی ہوگا؟''
''نہیں وہ کوئی اور تھا۔''
وہاں خاموشی چھا گئی۔ ''کون ہو سکتا ہے؟''
''فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' رچرڈ نے جواب دیا۔
''جارڈی، رچرڈ ہمارے ساتھ مخلص نہیں ہے۔''
برنیڈا نے خشک لہجے میں کہا۔
''کس معاملے میں؟''
''اس نے پہلے نہیں بتایا کہ وہ 1973ء میں پیرس میں تھا۔ جب ممی اور ڈیڈی......''
جارڈن نے رچرڈ کی طرف دیکھا۔ ''اس لیے تم یہاں ہو کہ ہمیں سچائی تک پہنچنے سے روک سکو؟''
''میں اس لیے یہاں ہوں کہ سچائی کی تلاش میں تم دونوں کو مرنے سے بچا سکوں۔''
''کیا سچائی اتنی خطرناک ہے؟'' جارڈن نے کہا۔
''نہ ہوتی تو تمہاری آمد کے ساتھ ہی تعاقب شروع نہ ہو جاتا۔''
''یعنی تم اس بات پر یقین نہیں رکھتے کہ یہ مرڈر اور خودکشی کا کیس تھا؟''
''یہ اتنا ہی سادہ ہوتا تو لوگ کب کا بھول چکے ہوتے لیکن کسی کو فکر ہے...... اور جس کو ہے اس نے تم دونوں پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ وہ کون ہے؟ یہ سوال بیک وقت سادہ اور پیچیدہ ہے......''
برنیڈا اس دوران میں خاموش رہی۔ رچرڈ نے اُسے دیکھا اور فیصلہ کر کے بولا۔ ''میں نے کبھی یقین نہیں کیا...... ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔ برنارڈ نے میڈیلن پر گولی نہیں چلائی نہ اُس نے خودکشی کی۔''
دھیرے سے برنیڈا نے پلکیں اٹھائیں۔ اس کی نظر میں بے یقینی تھی...... بے اعتباری تھی۔ ''پھر ٹریگر کس نے دبایا؟''
رچرڈ اٹھ کر بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ نرمی سے اس کے چہرے کو چھوا۔ ''مجھے نہیں معلوم لیکن میں تمہارے ساتھ مل کر حقیقت معلوم کروں گا۔''

☆☆☆

کلاڈ، چالیس برس سے فرنچ خفیہ محکمے میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ فلپ سینٹ پیری کی رہائش گاہ پر ہونے والے دھماکے کی رپورٹ کچن ٹیبل پر پڑی تھی۔ رچرڈ صبح ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔
''یہ معما بن گیا ہے میرے لیے۔'' کلاڈ نے ہاتھ لہرایا۔ دھماکا خیز مواد بیڈ کے نیچے نصب کیا گیا تھا۔ 9:10 کا وقت سیٹ کیا گیا تھا۔ ماری اس وقت اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھتی ہے جس کی بھی حرکت ہے، وہ اندر کا آدمی ہے۔ ماری اتفاقاً بچ گئی...... ایک بات سمجھ نہیں آ رہی، فلپ اس وقت لندن میں تھا۔ اگر اسے اُڑانا مقصود تھا تو اتنی بڑی

غلطی کیسے ہو سکتی ہے؟''

''ہاں، دہشت گرد ایسی غلطی نہیں کرتے۔'' رچرڈ نے کہا۔ ''میری دانست میں یہ ایک وارننگ ہو سکتی ہے کہ ہم جب چاہیں تم تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''نہ ہی ''کاسمک سولیڈیریٹی'' کا کوئی اتا پتا ہے..... تفتیش کیا کریں؟''

''تو پھر دوسری جانب توجہ دو۔'' رچرڈ نے کہا۔

''ٹراوسٹوک؟ میرے خیال میں ان کے لیے تم کافی ہو۔''

''تم معلوم کرو کہ میرے اور برنیڈا کے پیچھے کون تھا؟''

''جو بھی تھا، ممکن ہے اسے کسی اور نے ہائر کیا ہو۔'' کلاڈ نے کہا۔ ''دوسرے وہ جانتا تھا کہ بہن بھائی پیرس آرہے ہیں۔''

''میرے علم کے مطابق ہونے ریگی وان اور لیڈی وان کو بتایا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے دوسروں کو بتایا ہو۔'' رچرڈ سوچنے لگا۔ ''کافی لوگ تھے، وہاں پر۔ فلپ، نینا، انتھونی یا شاید کسی اور کو بتایا ہو..... لسٹ اتنی مختصر نہیں ہے کہ ہم اس پر وقت ضائع کریں۔''

''کیا اس مشن پر کام کرنا ٹھیک رہے گا۔ کیا تم بھول گئے کہ برسوں پہلے سچائی دفن کرنے کی باقاعدہ ہدایت دی گئی تھی۔'' کلاڈ نے نکتہ اٹھایا۔

رچرڈ کیسے بھول سکتا تھا۔ واشنگٹن سے ہدایت آئی تھی کہ کیس کلوز ہو چکا ہے۔ تفتیش بند کر دی جائے۔ اسی قسم کی ہدایت کلاڈ نے فرنچ خفیہ محکمے سے وصول کی تھی۔ لہٰذا ڈیلفی کی تلاش اچانک روک دی گئی۔ تاہم رچرڈ اپنی جگہ پر ہمیشہ مشکوک رہا..... ایک ماہ بعد ہی اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا جب امریکی سفیر اسٹیفن سدرلینڈ پیرس میں برج سے کود کر خودکشی کر بیٹھا تھا۔ وہ ایک سیاسی مہرہ تھا۔ اگر وہ جاسوس کی حیثیت سے بے نقاب ہو جاتا تو خود امریکی صدر کو شدید کوفت کا سامنا کرنا پڑتا۔

اصل غدار کون تھا؟ سرکاری طور پر یہ راز کبھی حل نہ ہو سکا۔ اس کے بجائے برنارڈ کو ڈیلفی تصور کیا گیا۔ مردہ شخص کب تردید کرتا ہے؟ اب بیس برس بعد ڈیلفی کا بھوت پھر سے نامعلوم افراد کی نیند اڑانے کے لیے نمودار ہو گیا تھا۔

''اس مرتبہ میں نہیں چھوڑوں گا۔'' رچرڈ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''واشنگٹن بھی مجھے نہیں روک سکتا۔ اب میں سرکاری ملازم نہیں ہوں۔''

''بیس سال گزر گئے، رچرڈ۔ وقت بدل گیا، سیاست بدل گئی..... شواہد مٹ گئے.....''

''ایک چیز نہیں بدلی۔ ملزم۔ ہو سکتا ہے امریکی سفیر سدرلینڈ ''ڈیلفی'' نہ ہو، ممکن ہے ہم غلط ہوں..... لیکن یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ڈیلفی زندہ ہو اور کام بھی کر رہا ہو۔''

''اور اس وقت ..... بہت زیادہ پریشان ہو۔'' کلاڈ نے اضافہ کیا۔ دو امکان اور ہیں، ڈیلفی کے بجائے کوئی اور ہو یا پھر جو کیس فائل میں لکھا ہے وہی سچ ہو۔''

☆☆☆

برنیڈا کی آنکھ دستک پر کھلی..... دستک دینے والا رچرڈ تھا۔ وہ حیرت سے پلکیں جھپکا رہی تھی۔ ''ہمارا اپائنٹمنٹ ہے، تیار ہو جاؤ..... ناشتا گاڑی میں کر لینا۔'' رچرڈ نے کاغذ میں لپٹا ہوا ناشتا اسے پکڑایا۔ ''جارڈن پہلے ہی نیچے انتظار کر رہا ہے۔''

''کیسا اپائنٹمنٹ؟''

''چیف انسپکٹر بروسرڈ..... اس وقت وہی تمہارے والدین کا کیس دیکھ رہا تھا۔''

''ہمارا کوئی اپائنٹمنٹ نہیں ہے۔'' برنیڈا نے ناک بھوں چڑھائے۔

''نہیں ملنا تو میں چلتا ہوں۔''

''رکو۔'' برنیڈا نے اسے گھورا۔ ''دس منٹ دو۔'' اس نے دروازہ رچرڈ کے منہ پر بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد تینوں روانہ ہو چکے تھے۔ گاڑی رچرڈ ڈرائیو کر رہا تھا۔

''تم بروسرڈ سے مل چکے ہو؟'' برنیڈا نے خاموشی کا قفل توڑا۔

''ہاں، اس وقت، جب دورانِ تفتیش پولیس نے میرا انٹرویو کیا تھا۔''

''کیوں؟''

''وہ ان سب سے مل رہے تھے جو تمہارے والدین کو جانتے تھے۔''

''تمہارا نام پولیس فائل میں نہیں تھا؟''

''فائل میں کئی نام نہیں تھے۔''

''مثلاً؟''

''فلپ سینٹ پیری، ایمبیسیڈر سدرلینڈ.....''

''سدرلینڈ؟ نینا کا مرحوم شوہر؟''

''ہاں، وہ حساس نام تھے۔ ایک وزیرِ مالیات، دوسرا سفیر اور وہ مشتبہ بھی نہیں تھے۔ لہٰذا ان کا نام فائل میں

نہیں تھا۔‘‘

’’تمہارا نام کیوں نہیں تھا؟‘‘ برنیڈا کے سوالات جاری تھے۔

’’میری کوئی اہمیت نہیں تھی۔ مجھ سے صرف ان دونوں کے تعلقات پر تبصرہ لیا گیا تھا...... کیا وہ خوش و خرم تھے؟ کیا وہ آپس میں بدمزہ رہتے تھے......‘‘

’’یہ بتاؤ کہ تم کیوں ملوث ہو رہے ہو؟‘‘

’’جارڈن اور تمہاری وجہ سے۔ کلاڈ کی وجہ سے...... تمہارے انکل کی وجہ سے اور اس لیے کہ تمہارا باپ ایک اچھا آدمی تھا۔ میں خود کو ان کا مقروض سمجھتا ہوں......‘‘

’’بس یا کچھ اور؟‘‘

’’ہاں ایک بات اور......‘‘ رچرڈ نے گردن گھما کر سبز آنکھوں میں جھانکا اور بولتے بولتے چپ ہو گیا۔

’’مت کہو...... میں سمجھتی ہوں۔‘‘ وہ زیرِ لب مسکرائی۔

’’وولف۔‘‘ عقبی نشست سے جارڈن کی آواز آئی۔ ’’تمہیں پتا ہے ہمارا تعاقب ہو رہا ہے؟‘‘

’’کون سی گاڑی ہے؟‘‘

’’دو گاڑیوں کے پیچھے، نیلے رنگ کی پیجو۔‘‘

’’ہاں، وہ ہوٹل سے ہی ہمارے پیچھے ہے۔‘‘

’’تم جانتے تھے؟‘‘ برنیڈا نے کہا۔

’’غور سے ڈرائیور کو دیکھو۔‘‘ رچرڈ نے کہا۔

’’اوہ...... نو...... وہ تو کولیٹ ہے۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ رچرڈ نے کہا۔ ’’سڑک کے دوسری جانب اس عمارت کو دیکھو۔‘‘

برنیڈا نے پتھریلی عمارت کو دیکھا۔ عمارت پر کچھ لکھا تھا۔

’’یہ کیا ہے؟‘‘

’’نرسنگ ہوم...... انسپکٹر بروسرڈ یہاں رہتا ہے۔ کئی سال ہو گئے۔‘‘ رچرڈ کی آواز میں ہلکا سا تاسف در آیا۔

☆☆☆

ایکس چیف انسپکٹر کے کمرے میں ایک دیوار پر اس کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ تصویر اسٹیشن کے باہر سیڑھیوں پر اتاری گئی تھی۔ تصویر میں وہ ایک وجیہہ اور تندرست شخص دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے کے بستر پر جو شخص لیٹا تھا، اس کا سکڑا ہوا نصف مفلوج جسم کسی طرح تصویر سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

مسز بروسرڈ بھی وہاں موجود تھی، وہ متواتر بول رہی تھی۔

’’بروسرڈ کی یادداشت اچھی ہے۔ اسے ہر بات یاد ہے۔ ہر کیس، ہر نام۔ لیکن وہ بول نہیں سکتا، نہ قلم پکڑ سکتا ہے۔ یہی چیز اسے پریشان کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ملاقاتیوں کو نہیں آنے دیتی۔ گنتی کے افراد ملنے آتے ہیں...... تھوڑی دیر کے لیے۔ تم لوگ کم سے کم سوال کرنا۔ اگر وہ پریشان ہونے لگے تو فوراً چلے جانا۔‘‘ مسز بروسرڈ نے بریف کیا۔

’’میں سمجھ گیا۔‘‘ رچرڈ نے ایک کرسی بستر کے قریب رکھی۔ جارڈن اور برنیڈا خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ رچرڈ نے پولیس فائل نکال کر کرائم سین کے فوٹو نمایاں کیے۔

’’اگر تم پہچان لو تو صرف سر ہلا دینا۔‘‘ رچرڈ نے فوٹو دکھائے۔ مسز بروسرڈ نے ترجمہ کیا۔

بروسرڈ نے لرزتی انگلی میڈیلن کے چہرے پر رکھ کر کچھ کہا۔

’’حسین عورت۔‘‘ مسز بروسرڈ نے ترجمہ کیا۔

بروسرڈ دوسری تصاویر دیکھ کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

’’ہم یہ رپورٹ پڑھ چکے ہیں...... ایک مرڈر اور ایک خودکشی ہے۔‘‘ برنیڈا نے کہا۔ ’’کیا چیف کو یقین ہے کہ ایسا ہی تھا؟‘‘

مسز بروسرڈ نے پھر ترجمہ کیا۔ بروسرڈ نے پہلی مرتبہ برنیڈا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کا عنصر نظر آیا۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ کسی جانی پہچانی شخصیت کو دیکھ رہا ہو۔ مسز بروسرڈ نے برنیڈا کا سوال پھر دہرایا۔ جواب میں بروسرڈ نے آہستہ سے سر کو نفی میں جنبش دی۔

’’کیا انسپکٹر نے سوال سمجھ لیا تھا؟‘‘ جارڈن نے استفسار کیا۔

’’کیوں نہیں۔‘‘ مسز بروسرڈ نے قدرے غصے سے کہا۔ ’’میں نے بتایا تھا کہ وہ ہر بات سمجھتا ہے۔‘‘

اچانک بروسرڈ بے چین ہو گیا۔ وہ ایک تصویر کے کونے کی جانب انگلی مار رہا تھا۔ اس کا جسم کلبلا رہا تھا۔ وہ کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جس طرف اشارہ کر رہا تھا۔ وہاں کسی میں خالی فرش نظر آ رہا تھا۔ اس کی بیوی اس پر جھک گئی......

’’ناقابلِ فہم۔‘‘ وہ بڑبڑائی۔

’’وہ کیا کہہ رہا ہے؟‘‘ برنیڈا نے سوال کیا۔

’’سروی ایٹ...... تیسکن یا تولیا، میں سمجھی نہیں۔‘‘ وہ

سنک کے قریب سے تولیالے کر آئی۔ بروسرڈ نے ناراضگی سے سردائیں بائیں ہلایا۔

''مجھے کوشش کرنے دو۔'' رچرڈ نے کہا اور بروسرڈ کے مزید قریب ہو گیا۔ ''پوفتے ڈوکومنٹ؟'' اس نے پوچھا۔

بروسرڈ نے اطمینان کی سانس لی اور تھک کر سر تکیے پر ڈال دیا۔

''وہ بریف کیس کہنا چاہتا تھا۔''

''مطلب وہ بریف کیس جس میں خفیہ فائلیں تھیں۔'' برنیڈا نے کہا۔ رچرڈ نے سر ہلا کر نحیف ونزار انسپکٹر بروسرڈ کی طرف دیکھا۔ جو ذراسی دیر میں نڈھال ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ مسز بروسرڈ فوراً حرکت میں آئی اور شوہر کے سامنے ڈھال بن گئی۔ ''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تم لوگ جاؤ۔''

''میم، ہم نے کچھ اور سوالات کرنے تھے لیکن ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ایک سراغ رساں اور تھا...... اینٹی گلگور، ہم کیسے اینٹی سے مل سکتے ہیں؟'' برنیڈا نے درخواست کی۔

''کیا؟ تمہیں نہیں معلوم؟''

''کیا نہیں معلوم؟''

''انیس برس قبل وہ ایک کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا...... ہٹ اینڈ رن کیس۔ ڈرائیور بھی نہیں مل سکا تھا۔''

برنیڈا کی مایوس کن نظریں جارڈن کی حیرت زدہ نگاہ سے ٹکرائیں۔

''آخری سوال؟'' جارڈن نے کہا۔ ''آپ کے شوہر کو برین ہیمبرج کب ہوا تھا؟''

''1974ء۔''

''انیس سال پہلے۔'' وہ دنگ رہ گیا۔ یہ کیا اتفاقات ہیں؟

☆☆☆

تینوں نرسنگ کے باہر خاموش کھڑے تھے۔

''چلتے ہیں۔'' رچرڈ نے اشارہ کیا۔ تینوں نے کچھ فاصلے پر ''پیجو'' کو دیکھ لیا تھا۔ تاہم کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ دریائے سین کے شمال کی طرف جا رہے تھے۔

اچانک جارڈن کی آواز بلند ہوئی۔ ''وولف، مجھے یہاں بولیوارڈ سینٹ جرمن پر اتار دو۔''

''یہاں کیوں؟'' رچرڈ نے گاڑی روکی۔

''میں ہوٹل میں ملوں گا...... ٹیکسی پر آجاؤں گا۔''

گاڑی سے اتر کے وہ پیچھے کی طرف گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آؤٹ ڈور کیفے ''ہیوگو'' میں تھا۔ وہاں کافی رش تھا۔ ویٹرز بھی کافی تعداد میں تھے۔ بیس سال قبل برنارڈ یہیں آتا تھا۔ فائل میں پولیس رپورٹ اور انٹرویوز جارڈن کی یاد میں تازہ تھے۔ لیکن اس سانحے کو عرصہ بیت گیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس کا مطلوبہ شخص ابھی تک ''ہیوگو'' میں کام کر رہا ہو۔ لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اگرچہ وہ زیادہ پُرامید نہیں تھا۔ تاہم یہ معلوم کر کے اسے مسرت آمیز حیرت کا سامنا کرنا پڑا کہ ماریو کاسینی ابھی تک ''ہیوگو'' میں ملازم تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ اسے متوجہ کرنے میں جارڈن کو زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا......

''ہاں...... ہاں...... مجھے یاد آگیا۔ پولیس نے تین چار مرتبہ میرا انٹرویو کیا تھا۔ ہر مرتبہ میں نے ایک ہی بیان دیا تھا۔ مسٹر برنارڈ ہر صبح کافی یہیں پیتے تھے۔ کبھی مسز بھی ساتھ ہوتی تھیں۔ وہ ایک حسین عورت تھی لیکن اس روز مسٹر برنارڈ تنہا تھے۔ وہ مسز کا انتظار کرتے رہے۔''

''اور وہ نہیں پہنچیں؟''

''نہیں۔ پھر ان کی کال آئی۔ انہوں نے پیغام لکھا کر فون بند کر دیا۔'' ماریو نے آگے کا حال بھی مختصراً سنا دیا۔

''کیا برنارڈ اس دن ناراض معلوم ہو رہے تھے؟''

''نہیں۔ پریشان تھے۔ وہ مسز کی وجہ سے پریشان تھے کہ وہ پیگالی جیسی خطرناک جگہ پر کیوں گئی تھیں۔ پھر وہ ادائیگی کر کے چلے گئے۔ باقی دہشت ناک تفصیل میں نے دوسرے روز اخبار میں پڑھی تھی۔''

جارڈن کھڑا ہوتے ہوتے رک گیا۔ ''کیا تمہیں یقین تھا کہ تم مسز راوسٹوک کی آواز سن رہے تھے؟''

''انہوں نے نام بتایا تھا......''

''تم نے آواز پہچانی تھی؟''

ماریو نے فوراً جواب نہیں دیا۔ ''ہاں۔''

جارڈن سمجھ گیا کہ وہ سو فیصد پُریقین نہیں ہے۔ سوچوں میں گم جارڈن کیفے سے نکل گیا۔ رٹز ہوٹل نصف بلاک دور تھا۔ جارڈن نے پیدل چلنا شروع کر دیا۔ معاً اس کی نظر نیلے رنگ کی پیجو پر پڑی۔ دفعتاً اس نے پیجو کا رخ کیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

''امید ہے، ذرا رٹز تک ڈراپ کر دو گی؟'' وہ مسکرایا۔

کولیٹ نے غصے سے اُسے دیکھا۔ ''نکلو میری گاڑی

سے ..... یہ ٹیکسی نہیں ہے۔''

''اوہ، کم آن، بے بی ..... بس اب چلو۔''

''کون ہو تم؟ میں تمہیں نہیں جانتی۔''

''لیکن میں تمہیں جانتا ہوں۔ تمہارا نام کولیٹ ہے۔ تم کلاڈ کے لیے کام کرتی ہو۔ اس کے کہنے پر تم نے میرے اوپر نظر رکھی ہوئی ہے۔ تمہارے لیے یہ ڈیوٹی دل خوش کن ہے۔ کیونکہ میں بہت خوب صورت ہوں، تمہاری طرح .....''

کولیٹ نے مسکراہٹ دبانے کی کوشش کی۔ ''دروازہ بند کرو اور یہ بتاؤ کہ تمہیں کس نے بتایا کہ تم خوب صورت ہو؟''

''تمہاری حسین آنکھوں نے۔''

''اداکار ہو؟''

''نہیں صداکار ہوں، گلوکار ہوں، بے کار ہوں، خوار ہوں ..... اور .....''

''بس چپ ہو جاؤ، میں سمجھ گئی۔'' وہ ہنس پڑی۔

''کیا سمجھ گئیں؟''

''دیوانے ہو، پاگل ہو۔''

''ہائے، کیا ہنستی ہو..... یہ بتاؤ، کلاڈ کے ساتھ کب سے ہو؟''

''تین سال۔''

''اور اس نے تمہیں مردوں کے پیچھے لگایا ہوا ہے۔ یہ کیا کام ہوا؟''

''میں ہدایات کی تعمیل کرتی ہوں۔''

''بہت فرمانبردار ہو؟ میرے ہی پیچھے کیوں؟''

''تمہاری بہن رچرڈ کے ساتھ تھی اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ تم پر نگاہ رکھی جائے لیکن تم ایک مشکل آدمی ہو۔''

''ایسا بھی نہیں ہوں۔''

''تم نے دو مرتبہ غیر متوقع طور پر مجھے پکڑ لیا۔''

''یہ کام کیوں کر رہی ہو؟''

''پیٹ کے لیے۔''

''محبت کی ہے؟''

''سوری۔''

''سوچو، کھانے پر سوچتے ہیں۔''

''چلو اترو، ہوٹل آ گیا ہے۔''

''میں ڈیوٹی پر ہوں۔''

جارڈن، ہوٹل میں جاتے ہوئے ماریو کے بارے میں سوچ رہا تھا..... اچانک اسے خیال آیا کہ ایک سوال رہ گیا۔ اسے پوچھنا چاہیے تھا کہ ''لہجہ انگریز عورت کا تھا؟'' وہ پلٹا اور پھر ہوٹل سے باہر آ گیا۔ پارکنگ میں اسے کولیٹ کی گاڑی نظر آئی ..... وہ اسی طرف چلا گیا۔ ڈارک شیشوں کے پیچھے اسٹیئرنگ کے عقب میں کولیٹ کی شبیہ نظر آ رہی تھی۔

جارڈن نے پسنجر ڈور کی جانب سے شیشے پر دستک دی۔

''کولیٹ ..... کیا ایک بار پھر لفٹ دو گی؟''

جواب نہ ملنے پر جارڈن دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ''کولیٹ؟''

وہ بے حس و حرکت، سامنے دیکھ رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے جارڈن کچھ نہ سمجھ سکا۔ پھر اس نے بالوں میں خون دیکھا جو ٹپکتا ہوا ٹرٹل نیک سویٹر میں جا رہا تھا۔ بدحواسی میں اس نے کولیٹ کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ ''کولیٹ!'' وہ پھسلتی ہوئی اس کی گود میں آن گری۔ کنپٹی میں گولی کا سوراخ صاف نظر آ رہا تھا۔

جارڈن گرتا پڑتا گاڑی سے نکلا۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ شاید وہ چیخ چلا رہا تھا۔ پیدل چلنے والے بھی چلانے لگے۔ بیشتر گاڑی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ جہاں کھلے دروازے سے کولیٹ کا ایک ہاتھ باہر جھول رہا تھا۔ جارڈن نے دہشت سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جو خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔

☆☆☆

بھیڑ لگنا شروع ہو گئی تھی۔ ایمل فوش بھی بھیڑ میں شامل تھا۔ دوسروں کے مانند وہ بھی دیکھ رہا تھا کہ پولیس جارڈن کو ہتھکڑی لگا رہی تھی جو کچھ ہوا، خلاف توقع وارادہ تھا۔ نہ اس کے گمان میں تھا کہ کولیٹ سے مڈبھیڑ ہو گی اور وہ اسے پہچان بھی لے گی۔

کولیٹ کے ساتھ ایمل فوش نے صرف ایک بار کام کیا تھا۔ تین سال پہلے قبرص میں۔ فرنچ خفیہ کے نزدیک ایمل مردہ تھا۔ جب وہ سر جھکائے، شانے لٹکائے ..... کولیٹ کی گاڑی کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے پہچان نہیں سکے گی۔ تاہم جب کولیٹ نے اسے آواز دی تو وہ ششدر رہ گیا۔ متوجہ ہوئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ [illegible] قدموں کے ساتھ اس کی گاڑی کے قریب ہو گیا۔ کولیٹ مردہ ساتھی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ عالمِ حیرت نے اسے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ادھر ایمل فوش کے پاس کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کی جانب آیا اور سائیلنسر لگی گن ... نکال کر فائر کیا۔ اسے افسوس ہوا تھا لیکن وہ کیا کرتا نہ وہ اسے شناخت کرتی نہ

ماری جاتی...... کھسکتے وقت اس نے گن گندی نالی میں پھینک دی۔ جارڈن کا بچنا ناممکن تھا...... چند بلاک آگے جا کر اس نے فون ملایا۔

''جارڈن ٹراوسٹوک کو قتل کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا ہے۔''

''کس کا قتل؟''

''وہ لڑکی تھی۔ کلاڈ کی ایجنٹ۔''

''جارڈن نے اُسے مارا؟''

''نہیں، میں نے۔''

دوسری طرف سے قہقہے کی آواز آئی۔ ''جواب نہیں۔ مزہ آ گیا۔ میں نے نظر رکھنے کے لیے کہا تھا اور تم نے اسے مرڈر کیس میں پھنسا دیا۔ کمال کردیا...... اب دیکھنا ہے، اس کی بہن کا کیا کرتے ہو تم۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' ایمل فوش نے سوال کیا۔ وقفے کے بعد جواب ملا۔ ''میرے خیال میں مسئلہ ختم کرو۔''

''لڑکی کا کام ہو جائے گا لیکن جارڈن کے لیے ضروری ہے کہ میں جیل کے اندر جاؤں اور یہ ممکن نہیں، انگلیوں کے نشانات کی مدد سے مجھے پہچان لیا جائے گا۔ یہ کام کسی اور کو کرنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے، ایک وقت میں ایک کام۔ لڑکی کو ٹھکانے لگاؤ۔''

☆☆☆

ریومیراح اب ایک ترک شخص کی ملکیت تھی۔ اس نے عمارت کی حالت درست کرنے کے لیے رقم خرچ کی تھی۔ تاہم وہ اطراف کے ماحول اور سڑکوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کا نام ضمیر تھا۔ ضمیر نے برنیڈا اور رچرڈ کو بتایا کہ وہاں چار خاندان آباد ہیں لیکن پانچ نمبر فلیٹ ہمیشہ غیر آباد ہی رہا۔

''تمہارے پاس یہ عمارت کب سے ہے؟'' برنیڈا نے سوال کیا۔

''ایک سال ہوگیا۔'' اس نے نمبر پانچ کا تالا کھولا۔ طویل عرصے سے بند کمرے میں عجیب سی باس تھی۔ برنیڈا کے سینے میں ہوک سی اٹھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بھاری قدموں کے ساتھ اندر گئی۔ وہاں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کھڑکی کے قریب ایک جگہ وہ رک گئی۔ شاہ بلوط کے تختوں کے فرش پر مدھم خاکی دھبا تھا۔ دھبا بمشکل دکھائی دے رہا تھا۔

کس کے خون کا دھبا ہے؟ ممی اور ڈیڈی؟ یا دونوں کا خون ہمیشہ کے لیے ایک ساتھ مل گیا ہے......

''میں نے اسے مٹانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ چوبی شہتیروں میں جذب ہوگیا ہے۔'' ضمیر نے بتایا۔

برنیڈا نے تھوک نگلا۔ اس سڑک پر...... اس جگہ...... اس کمرے میں؟ تمام پیرس چھوڑ کر انہیں یہاں جان دینی پڑی......؟

''مسٹر ضمیر، پہلے یہاں کا مالک کون تھا؟''

''متعدد افراد تھے، میں نے ایم روزنتھال سے یہ جگہ خریدی تھی۔ روزنتھال سے پہلے یہ جگہ ڈیوڈو کے پاس تھی۔''

''کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''سوری، پرانی بات ہے۔ تم لوگ بات کرنا چاہو تو میں کچھ دیر کے لیے نیچے نمبر تین میں چلا جاتا ہوں۔'' ضمیر وہاں سے ہٹ گیا۔

برنیڈا نے رچرڈ کو دیکھا۔ وہ ایک کونے میں چوبی فرش کو گھور رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' برنیڈا اس کے قریب چلی گئی۔

''بروسرڈ کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔ وہ جس طرف اشارہ کررہا تھا وہ یہی مقام ہے۔''

''لیکن تصویر میں یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔''

''یہی بات قابلِ تشویش ہے اور یہی چیز بروسرڈ کو بھی پریشان کررہی تھی۔ بریف کیس کے بارے میں کوئی بات ہے۔''

''نیٹو فائل؟''

''تم ڈیلفی کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''اتنا جانتی ہوں کہ ممی اور ڈیڈی میں سے کوئی ڈیلفی نہیں تھا۔'' برنیڈا نے یقین سے کہا۔

''یہ تمہاری محبت بول رہی ہے۔''

''یقین تو تمہیں بھی نہیں۔'' برنیڈا نے منہ بنایا۔

''میری اور بات ہے۔ میرا زاویۂ نگاہ محض محبت پر مبنی نہیں ہے۔''

''یعنی تم ابھی تک پورے کھلے نہیں ہو؟''

''ہمارا مقصد ایک ہی ہے لیکن شاید ہم ایک ٹیم نہیں بن سکے۔''

''تم ایک ہی بار سب کچھ کیوں نہیں بتا دیتے؟''

''میں بھی فیصلہ نہیں کرسکا کہ کتنی آگہی تمہارے لیے

بہتر رہے گی؟'' رچرڈ پُرسوچ انداز میں ٹہل رہا تھا۔ ''ڈلینگلے میں ٹریننگ ختم ہونے کے بعد میرا پہلا ٹاسک تھا۔''

''ڈلینگلے...... سی آئی اے؟''

''ہاں۔ اگرچہ سی آئی اے میرا پہلا انتخاب نہیں تھا۔ میں نے یونیورسٹی میں جو مقالہ لکھا تھا، وہ مشرقِ وسطیٰ کے ایک ملک کی حربی صلاحیتوں سے متعلق تھا۔ حیران کن طور پر وہ سی آئی اے کی نظر میں آگیا۔ وہ یہ بھی جان گئے کہ میں کئی زبانوں پر عبور رکھتا ہوں، مجھے اسٹوڈنٹ لون کے ضمن میں خاصا قرض دیا گیا۔ یہ دراصل گاجر دکھانے والی بات تھی۔ یوں میرے کئی مسائل حل ہو رہے تھے بلکہ بطور انٹیلی جنس اینالسٹ کام کرنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔''

''یوں تم میرے والدین سے ملے؟''

رچرڈ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''نیٹو کو سیکیورٹی لیک کا علم ہوا تھا، جس کا مرکز پیرس تھا۔ ہتھیاروں کا ڈیٹا مشرقی جرمنی پہنچایا جا رہا تھا۔ میں تازہ تازہ پیرس پہنچا تھا۔ لہٰذا میری پوزیشن صاف تھی۔ مجھے فرنچ خفیہ کے کلاڈ ڈامیر کے ساتھ کام کرنا تھا۔ مجھے ایک ڈمی رپورٹ تیار کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ اصل کے مانند تھی۔ اسے کوڈ شکل میں پیرس میں منتخب سفارت خانوں میں پہنچایا گیا۔ مقصد ڈیلفی کو دھوکے سے پکڑنا تھا۔''

''میرے والدین کا کیا تعلق؟''

''وہ پیرس کی برٹش ایمبیسی میں تھے۔ برنارڈ کمیونیکیشن میں اور میڈیلن پروٹوکول میں۔ دونوں ایم آئی سکس کے لیے کام کرتے تھے۔ برنارڈ ان چند افراد میں سے ایک تھا جن کی رسائی خفیہ فائلوں تک تھی۔''

''یوں وہ مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل تھے؟''

رچرڈ نے سر ہلایا۔ ''وہی نہیں، ہر ایک تھا...... برٹش، امریکن، فرنچ، سفیر تک مشکوک تھے...... ڈمی فائل پہنچانے کے بعد انتظار شروع ہو گیا کہ وہ کب مشرقی جرمنی پہنچتی ہے۔ لیکن ڈمی فائل مشرقی جرمنی کے بجائے بریف کیس میں وہاں ملی...... جہاں تمہارے والدین کو مارا گیا۔''

''مارا گیا؟''

''ہاں میں یہی سمجھتا ہوں۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ تمہارے والدین کی ہلاکت کے ایک ماہ بعد امریکی سفیر سدرلینڈ نے خودکشی کر لی تھی اور واشنگٹن سے براہِ راست تفتیش روکنے کے احکامات آئے تھے...... نیز تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ ریومیراج کے مالکان بدل چکے ہیں۔ بروسرڈ اکیس سال پہلے ناکارہ ہوا، سراغ رساں ایٹنی بھی ایک سال پہلے مارا گیا......''

''تم نے سچائی جاننے کی کوشش نہیں کی؟'' برنیڈا نے اعتراض کیا۔

''مجبوری تھی۔ میں سرکاری ملازم تھا۔ حتیٰ کہ کلاڈ کو بھی روک دیا گیا۔ اسے براہِ راست فرنچ پرائم منسٹر نے آرڈر کیے تھے۔ یوں ڈیلفی کی فائل بند ہو گئی۔''

''کتنا آسان تھا سب۔ انہیں غدار تسلیم کر لیا گیا۔'' وہ مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔

''میں نے بتایا کہ میرے لیے آرڈرز تھے۔'' رچرڈ، برنیڈا کے پیچھے گیا۔

''اور تم آرڈرز پر چلنے والے آدمی ہو؟''

''مجھے واشنگٹن بلا لیا گیا تھا۔ میں چاہتا بھی تو کچھ نہ کر پاتا۔''

وہاں سے نکل کر دونوں کوچن اسپتال پہنچے۔ دورانِ سفر خاموشی چھائی رہی۔ ماری سینٹ پیری تک پہنچنے میں کوئی وقت نہیں ہوئی۔ درجن بھر پولیس مین وہاں موجود تھے۔ ماری تک اطلاع پہنچائی گئی کہ لارڈ لووٹ کی بھتیجی ملنے آئی ہے۔ دونوں پولیس اسکارٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ اندر جا کر معلوم ہوا کہ نینا سدرلینڈ اور ہیلن وان بھی عیادت کے لیے پہنچے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ مختصر سی ٹی پارٹی ہو رہی ہے۔ ماری تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز حالت میں بیٹھی تھی۔ رچرڈ نے اندازہ لگایا کہ اسے دھماکے سے جسمانی سے زیادہ ذہنی صدمہ پہنچا تھا۔

نینا نے چائے کے دو کپ برنیڈا اور رچرڈ کو پکڑائے۔

''تم لوگ پیرس کب پہنچے؟''

رچرڈ نے جواب دیتے ہوئے وہی سوال کیا۔

''ہم ریگی اور ہیلن کے ساتھ واپس آئے تھے۔''

''کیس میں کوئی پیش رفت ہوئی؟'' برنیڈا نے سوال کیا۔

''دہشت گردی بتائی جا رہی ہے۔'' ماری نے سرد آہ کھینچی۔ ''ہاں...... اور کیا ہو سکتا ہے؟ کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ کسی سیاست داں کے بستر کے نیچے بم رکھ دے۔''

''میں ریلیز ہوتے ہی شاید آج ہی فلپ کے ساتھ سوئٹزرلینڈ چلی جاؤں۔'' ماری نے ارادہ ظاہر کیا۔

''ویری گڈ آئیڈیا۔'' ہیلن نے حمایت کی۔ ''تم

دونوں کچھ دن اکیلے اچھی جگہ گزار آؤ۔''
''ہاں تاکہ دہشت گردوں کو لائن مل جائے۔ وہ یہی چاہتے ہوں گے۔'' نینا نے کہا۔
''تمہارے لیے یہ کہنا آسان ہے، بمباری تمہارے گھر پر نہیں ہوئی ہے۔'' ہیلن نے غصہ دباتے ہوئے کہا۔
''اگر ہوتی بھی تو میں اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہلتی۔'' نینا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
''ہاں تم اپنی جگہ سے کہاں ہلتی ہو۔''
''وہاٹ؟''
''کچھ نہیں۔'' ہیلن دوسری جانب دیکھنے لگی۔
''ہیلن، کیا بڑبڑا رہی ہو؟'' ماری نے کہا۔
''تمہارے لیے پیرس سے نکلنا بہت اچھا رہے گا۔ کوئی بھی دوست اس کی مخالفت نہیں کرے گا۔'' ہیلن نے کہا۔
''کیا میں اس کی دوست نہیں ہوں؟'' نینا بھڑکنے لگی۔
''میں نے کب کہا......؟''
''اوہ پلیز......بس کرو۔'' ماری کراہ اٹھی۔
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ بحث میں از خود ہی بریک لگ گیا...... نینا کا جواں سال بیٹا انطونی اندر داخل ہوا۔ ''ماما تیار ہیں چلنے کے لیے؟''
جواب میں نینا نے اٹھنے میں سیکنڈ نہیں لگایا۔ جاتے جاتے اس نے ماری کو دیکھا۔ ''ایک دوست کی حیثیت سے میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ تمہیں پیرس میں رکنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔
''تھینک گاڈ، تم اِسے کیسے برداشت کرتی ہو؟'' ہیلن نے ماری سے کہا۔ برنیڈا سوچ رہی تھی کہ دونوں خواتین ایک دوسرے سے کتنا ملتی ہیں۔ دونوں کی عمریں اور حسن زوال پذیر تھا۔ دونوں کے شوہر ان میں دلچسپی کھو چکے تھے۔
''کبھی میں سوچتی ہوں کہ تم ایک راہبہ ہو جو اس کتیا کو برداشت کر لیتی ہو۔'' ہیلن نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''اگر میں ہوتی......''
اس وقت فلپ اندر داخل ہوا۔ ماری نے کسی قسم کی مسرت کا اظہار نہیں کیا۔ فوراً بعد ہی کلاڈ کی آمد ہوئی۔
''تم دونوں یہاں پر۔'' کلاڈ نے اظہارِ حیرت کیا۔
''ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔''

''اور میں تم دونوں کی تلاش میں تھا۔''
رچرڈ اور برنیڈا دونوں چونک اٹھے۔ ''کوئی مسئلہ؟''
''نازک مسئلہ ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔'' وہ ہال وے کے نسبتاً سنسان کونے میں آ گئے۔
''کچھ دیر پہلے پولیس کی کال آئی ہے۔ کولیٹ کو کار میں گولی ماردی گئی ہے۔''
''اوہ مائی گاڈ......جارڈن۔'' برنیڈا کا منہ کھل گیا۔
''وہ محفوظ ہے......لیکن جو کولیٹ کو دن دہاڑے مار سکتا ہے۔ وہ جارڈن کو...... لہٰذا جارڈن کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔''
''حفاظت کے لیے...... یا مرڈر چارج میں؟'' برنیڈا چیخ اٹھی۔ اس نے کلاڈ کی آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک دیکھ لی تھی۔

☆☆☆

دونوں اسپتال میں تنہا تھیں۔ تنہائی اچھی تھی۔ اس دوران میں دونوں نے بہت کم بات کی تھی۔ بالآخر ہیلن سے رہا نہ گیا۔
''یہ ناقابلِ برداشت ہے۔''
''میں کیا کر سکتی ہوں۔ اس کے بہت سے دوست ہیں۔ اس کے تعلقات ہیں۔ اثر و رسوخ ہے۔ وہ فلپ کو بھی میرے خلاف کر سکتی ہے۔''
''کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ تم اس سے بات کرنا بند کر دو۔''
''کس بنیاد پر؟ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔''
''کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔'' ہیلن نے کہا۔
''کیا تمہاری آنکھیں کافی نہیں ہیں۔ دونوں کس طرح ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں...... فلپ تمہیں کس طرح نظرانداز کرتا ہے۔ کتنی بار وہ اسپتال آیا ہے وہ بھی چند منٹ کے لیے۔''
ماری روہانسی ہونے لگی۔
''اچھا دل چھوٹا مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' ہیلن نے اس کا رخسار تھپتھپایا۔ دونوں سہیلیاں ایک جیسے حالات سے گزر رہی تھیں۔ فرق صرف ہمت کا تھا۔ ماری کے برعکس ہیلن، ریگی وان کے حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔

☆☆☆

جیل سیل میں جارڈن جس بینچ پر بیٹھا اسی پر ایک اور قیدی بھی براجمان تھا۔ اس کا حلیہ اور جسم سے اٹھنے والی

ناگوار بُو جارڈن کو پریشان کررہی تھی۔ وہ جارڈن کے لباس، جوتوں اور قیمتی گھڑی کو گھورے جارہا تھا۔

''کیا پریشانی ہے؟'' تنگ آکر جارڈن نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''سونے کی ہے؟'' اس نے گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں، پھر......''

وہ اٹھ کر اور قریب آگیا۔ ''اٹالین ہیں؟'' اس نے جوتوں کو دیکھا۔

''ہاں، اٹلی کے ہیں۔''

اس نے لباس کی طرف دیکھتے ہوئے دانت نکالے۔

''لیس موا تراسکیل (مجھے تنہا چھوڑ دو)۔'' جارڈن نے فرنچ میں کہا۔

قیدی نے اپنے جوتوں کی طرف اشارہ کیا جو سخت گتے کے بنے تھے۔ ''یولائک؟''

''ویری نائس۔'' جارڈن نے بھی دانت نکالے۔

سیل کے دروازے پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ چابی گھومنے کی آواز آئی اور دروازہ کھلا۔ کونے میں دوسرا قیدی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

دروازے میں سے کسی نے جارڈن کا نام پکارا۔

''یس؟'' جارڈن کھڑا ہوگیا۔

''میرے ساتھ آؤ، ملاقاتی ہیں۔''

جارڈن اُس کے پیچھے چل پڑا۔ دوسرے اہلکار نے دروازہ دوبارہ مقفل کردیا۔

''اوہ، برنیڈا۔''

برنیڈا بھاگتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ ''جورڈی، تم ٹھیک ہو؟''

''ڈارلنگ، آئی ایم فائن۔'' جارڈن نے برنیڈا کے شانے پر رچرڈ کو دیکھا۔ اس کے ساتھ کلاڈ کھڑا تھا۔

''کیا خبر ہے؟''

''سر میں نو ایم ایم کی ایک گولی۔ کوئی گواہ نہیں۔'' کلاڈ نے جواب دیا۔

''گن کہاں ہے؟ میں کیسے ملزم ہوگیا؟''

''گن گاڑی کے قریب گندی نالی سے مل گئی ہے۔''

''لیکن گواہ؟'' برنیڈا نے کہا۔

''گواہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' جارڈن نے کہا۔

''میں نے کولیٹ سے لفٹ لی تھی۔ گاڑی میں جگہ جگہ میری انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ میں دوبارہ بولیورڈ سینٹ جرمن جانا چاہتا تھا...... باہر آکر میں نے پھر کولیٹ سے لفٹ لینا چاہی...... آگے جو ہوا وہ کلاڈ کے علم میں ہے۔''

''تم نے وہاں کوئی مشکوک آدمی دیکھا تھا؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔

''نہیں، لیکن کولیٹ نے شاید......''

''تمہیں یقین نہیں ہے۔''

''ہاں، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔'' جارڈن نے جواب دیا۔

''وہ بچی نہیں تھی۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے تیار تھی۔'' کلاڈ نے کہا۔

''یہ بات میری بھی سمجھ میں نہیں آرہی۔ وہ اتنی آسانی سے......''

''کلاڈ، وہ دھوکے میں ماری گئی ہے جس نے اُسے نشانہ بنایا ہے، وہ اسے جانتی تھی اسی لیے اس نے دفاع کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔'' رچرڈ نے اندازہ ظاہر کیا۔

''مجھے سینٹ جرمن جانا چاہیے۔ جو بھی ہے وہ میرے پیچھے آئے گا۔'' جارڈن نے تجویز دی۔

''جارڈی یہ ممکن نہیں ہے۔'' برنیڈا نے نرمی سے کہا۔

''کیا مطلب ہے، اس بات کا؟''

''پولیس تمہیں آزاد نہیں کرے گی۔''

''لیکن یہ قتل میں نے نہیں کیا۔'' جارڈن نے کلاڈ کی طرف دیکھا۔

رچرڈ نے کہا۔ ''جارڈن تم تسلی رکھو، ہم تمہیں ہر قیمت پر یہاں سے نکال لیں گے۔''

''کسی نے انکل ہیو کو فون کیا؟''

''وہ چیٹ ونڈ میں نہیں ہیں۔ کوئی نہیں جانتا، وہ کہاں ہیں؟'' برنیڈا نے بتایا۔ ''ہمیں ریگی اور ہیلن سے بات کرنی پڑے گی۔ ان کے تعلقات ہیں۔ شاید وہ سفارت خانے میں ڈوریاں ہلاسکیں۔''

''پولیس مجھے ملزم سمجھ رہی ہے؟''

''ہاں۔'' کلاڈ نے کہا۔

''اور تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ہم میں سے کوئی بھی تمہیں قاتل نہیں سمجھتا۔''

''جورڈی ہمیں کچھ وقت درکار ہے۔'' برنیڈا نے کہا۔

جارڈن، بہن کو دیکھتا رہا۔ پھر گھڑی اتار کر اسے پکڑا دی۔

''یہ کیا کررہے ہو؟''

''شاید یہاں مجھے زیادہ دیر رکنا پڑے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ میں چاہتا ہوں کہ اگلی فلائٹ سے تم گھر واپس جاؤ، سمجھ گئیں؟''

''میں کہیں نہیں جارہی۔''

''ہاں، تم جارہی ہو۔''

''تمہیں یہاں میری ضرورت ہے۔'' برنیڈا نے کہا۔

جارڈن نے اس کے دونوں شانے پکڑ لیے۔ ''ہوش سے کام لو۔ ایک ایسا ایجنٹ مارا جاچکا ہے جو تربیت یافتہ تھا۔''

''اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگلی باری میری ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ خوف زدہ ہیں اور کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ تمہیں جانا پڑے گا۔''

''تمہیں یہاں سڑنے کے لیے چھوڑ کر بھاگ جاؤں؟''

''میرے ساتھ کلاڈ ہے، ریگی ہے......''

برنیڈا نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ ''کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ میں چلی جاؤں گی؟''

''اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔''

''میں تم سے محبت کرتی ہوں، لہٰذا میں یہیں رہوں گی...... چلو رچرڈ۔''

☆☆☆

''تمہارا بھائی درست کہتا ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔ ''تمہیں گھر جانا چاہیے۔''

''اب تم مجھے سبق نہیں سکھاؤ۔'' برنیڈا اتر خی۔

''تمہیں کسی کی تو سننی چاہیے...... سچ کی تلاش میں براہِ راست پیرس میں چھلانگ لگانا غلط تھا۔ میں جانتا ہوں، تم کیا چاہتی ہو لیکن حالات تیزی سے تبدیل ہورہے ہیں۔ ابھی دو دن نہیں گزرے اور ایک فرنچ ایجنٹ مارا گیا ہے جو کھیل بیس برس قبل شروع ہوا تھا، وہ رنگ بدل کر پھر سے شروع ہورہا ہے...... تم دونوں کا اپنے والدین سے کوئی موازنہ نہیں ہے اور وہ خود کو نہ بچاسکے۔ ہر کام جذبات سے نہیں ہوتا۔''

''یعنی مجھے جارڈن کو یہاں چھوڑ دینا چاہیے؟'' برنیڈا کی آواز کا زور کم ہوگیا۔

''میں اس کا خیال رکھوں گا۔ ریگی سے بات کروں گا۔ بہترین وکیل کا بندوبست کروں گا۔''

برنیڈا، جارڈن کی دی ہوئی گھڑی کو گھور رہی تھی۔

''اگر اسے کچھ ہوا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کرسکوں گی۔''

''اگر تمہیں کچھ ہوا تو جارڈن خود کو معاف نہیں کرسکے گا۔ اور...... اور میں بھی۔''

''میں تمہاری ذمّے داری نہیں ہوں۔''

''تم ہو!''

''یہ فیصلہ کس نے کیا؟''

''میں نے۔'' رچرڈ اس کے قریب ہوگیا۔

''دور رہو...... کار میں بیٹھ جاؤ۔'' برنیڈا کی دھڑکنیں ناہموار ہوگئیں۔ رچرڈ کی قربت سے وہ ڈرنے لگی تھی۔

☆☆☆

''صورتِ حال بدنما ہے۔'' ریگی نے کہا۔ ''چوری، ڈاکے، تشدد کا معاملہ ہوتا تو بات دیگر تھی لیکن مرڈر؟ مجھے ڈر ہے کہ ڈپلومیٹک مداخلت بے سود ہوگی۔''

وہ ریگی وان کی شاندار اسٹڈی میں بیٹھے تھے۔

''سفیر محترم اتنے بے اختیار نہیں۔ نہ یہ کسی عام آدمی کا مسئلہ ہے۔ وہ میرا بھائی اور انکل کا بھتیجا ہے۔ سب سے بڑھ کر اسے ناکردہ جرم میں پھنسایا گیا ہے۔ وہ قاتل نہیں ہے۔'' برنیڈا نے زور دے کر کہا۔ ''ایمبیسیڈر کچھ کرسکتا ہے۔''

''یقیناً وہ قاتل نہیں ہوسکتا۔ میری اس سے بات ہوئی ہے۔ سفیر بھی زیادہ پُرامید نہیں ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو وہ ایک سیکنڈ بھی وہاں نہ رہتا۔ میں ایک اچھے وکیل کا بندوبست کرتا ہوں۔ وہ خاصا قابل ہے۔''

''فرنچ انٹیلی جنس کیا کررہی ہے؟'' رچرڈ نے کہا۔

''گن پر انگلیوں کے نشانات نہیں ہیں۔ لارڈ لووٹ کے بھتیجے کی حیثیت سے ہم کچھ مراعات لے لیں گے۔ تاہم آخر میں یہ مرڈر چارج ہی رہے گا۔ مصیبت یہ ہے کہ مقتولہ خود فرانسیسی شہری ہے۔ اخبارات میں اسٹوری آتے ہی نئی مشکلات کھڑی ہوجائیں گی۔''

رچرڈ نے ریگی کو بتایا کہ برنیڈا واپس جانے سے انکاری ہے۔ دونوں نے کچھ دیر اپنی سی کوشش کی۔ تاہم برنیڈا کو قائل کرنے میں ناکام رہے۔ دونوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تاہم انہیں کوئی حیرانگی نہ تھی۔ برنیڈا اپنی ماں کی طرح ہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی اور ہیلن اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے میں بسکٹ اور چائے تھی۔

''ریگی، تم کچھ نہیں کرسکتے؟''

''میں کوشش کررہا ہوں۔''

''وکیل سے کام نہیں چلے گا۔ کچھ اور بھی سوچنا

چاہیے۔'' ہیلن نے کہا۔
''وہ کیا؟'' ریگی نے سوال کیا۔
''یہ محض ایک مرڈر نہیں ہے۔ سازش ہے جس کی جڑیں ماضی میں دفن ہیں اور بیس سال پہلے کا مرڈر آج بھی کسی کے لیے خطرے کا باعث ہے۔'' ہیلن نے جواب دیا۔
''ڈیلفی...... تمہیں یاد ہے؟ اس کے بارے میں ہیو نے بتایا تھا۔''
''ہاں، ڈیلفی۔ ایم آئی سکس کبھی اس تک نہیں پہنچ سکی تھی؟'' ہیلن نے رچرڈ کو دیکھا۔
''ہاں، لیکن ان کو شبہات تھے۔''
''سدرلینڈ کی بات کر رہے ہو؟''
''ہاں، وہ مذکورہ سانحے کے ایک ماہ بعد پل سے کود گیا تھا۔''
''پتا نہیں وہ کیوں کودا تھا لیکن اگر میں مرد ہوتی اور میری شادی نینا سے ہو جاتی تو میں بہت پہلے کود چکی ہوتی۔'' ہیلن نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔
''ہمیں اپنی توجہ مسئلے کی طرف رکھنی چاہیے۔'' ریگی نے پائپ ٹھونکا۔
''میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔''
''میں آپ کی بہت مشکور ہوں۔'' برنیڈا نے کہا۔
''ڈیئر مسکراؤ، میں پریشان ہو جاتا ہوں...... ہیو کو کیا جواب دوں گا۔'' ریگی نے برنیڈا کی پیشانی پر بوسہ دیا۔
''تم اس کا بہت خیال رکھنا۔'' وہ رچرڈ کی طرف مڑا۔
''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

☆☆☆

''ہیلن اور ریگی ایک دوسرے کی ضد ہیں؟''
''مطلب؟''
''یوں لگتا ہے، مجبوراً گزارا کر رہے ہیں۔'' برنیڈا نے وضاحت کی۔
''ہاں ایسا ہی ہے۔ یہ رشتہ ہیلن کی دولت کے باعث نبھ رہا ہے اور یہ بات ریگی وان کے لیے خلش کی طرح ہے۔ وہ بینکر بھی نہیں بننا چاہتا تھا۔ ہیلن نے اسے مجبور کیا۔ ان کی بدمزگی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ میں عادی ہو گیا ہوں۔ اس کے برعکس تمہارے والدین تھے۔ ایک دوسرے کی چاہت میں ڈوبے ہوئے۔ خوش و خرم۔ کتنا پیارا اور ہم آہنگ جوڑا تھا...... کاش میرے والدین بھی ایسے ہوتے۔''
''کیا ہوا تھا؟''
''طلاق...... یہ علیحدگی خاصے خراب انداز میں ہوئی تھی۔ بعدازاں میں شادی کے خیال سے ہی بدظن ہو گیا۔''
کچھ دیر کے لیے کار میں خاموشی چھا گئی۔
''تو شادی نہ کرنے کی یہ وجہ تھی؟'' برنیڈا نے کہا۔
''ہاں یہ ایک وجہ تھی۔ دوسری کوئی مطلب کی لڑکی ملی ہی نہیں۔ تم نے کیوں شادی نہیں کی؟'' رچرڈ نے برنیڈا پر نظر ڈالی۔
اس نے شانے اچکائے۔ ''کوئی ملا ہی نہیں۔''
''خوب، آئیڈیلسٹ ہو؟''
''شاید۔'' وہ ہنس پڑی۔
ہوٹل پہنچ کر وہ کار سے اترے اور لابی کی طرف چل پڑے پھر ایلیویٹر میں...... ایلیویٹر سے نکل کر وہ سوئٹ میں داخل ہو گئے اور دروازہ بند کر دیا۔
''تم کہاں گھسے آ رہے ہو؟''
''کہاں جاؤں؟''
''میں کیا جانوں؟'' برنیڈا نے بے نیازی سے کہا۔
''واقعی تمہارا کوئی اسکرو ڈھیلا ہے۔''
''تمہیں معلوم ہے تو اسے کس کیوں نہیں دیتے؟'' برنیڈا کی آنکھوں میں شوخی نظر آئی۔
''سنجیدہ ہو؟''
''تم بھی احمق ہو۔''
''احمق تو نہیں ہوں، لارڈ کی بھتیجی کا خیال کر جاتا ہوں...... آؤ اِدھر بیٹھ کے باتیں کرتے ہیں۔''
''صرف باتیں؟''
رچرڈ نے برنیڈا کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''چھوڑو ابھی آتی ہوں۔'' وہ جارڈن کے سوئٹ کی طرف جاتے ہوئے کھڑکی کے پاس سے گزری۔
''وہاں کہاں......؟''
برنیڈا رک کر جواب دینے کے لیے پلٹی اور دھماکا ہوا، کھڑکی کے شیشے ٹوٹ گئے۔ اضطراری طور پر برنیڈا کچھ اور پیچھے ہٹ گئی۔ رچرڈ نے جست لگائی اور اسے لے کر زمین بوس ہو گیا۔ دوسرا فائر ہوا۔ ''لیٹی رہو، میں روشنی بند کر رہا ہوں۔'' وہ سوئچ بورڈ کی طرف رینگ رہا تھا۔ تیسرا دھماکا ہوا اور دوسری کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا۔ اتنی دیر میں رچرڈ نے سوئچ آف کر دیا۔ ''خاموش رہنا، اٹھنا مت...... وہ سامنے والی بلڈنگ پر ہے۔ دوربار رائفل سے فائرنگ ہوئی ہے۔ ممکن ہے انفراریڈ اسکوپ لگی ہو...... میں فون کرتا ہوں۔''
''اوہ نو...... فون لائن کٹی ہوئی ہے۔''

برنیڈا لرز اٹھی۔ ''کیا مطلب، کوئی یہاں آیا تھا؟''

''شا......ا......شا......'' رچرڈ نے ساعت پر زور دیا۔

برنیڈا کا دل سینے میں بری طرح اچھل رہا تھا۔

ایلیویٹر کی مدھم آواز آرہی تھی جو تیسری منزل پر خاموش ہوگئی۔

''برنیڈا حواس بحال رکھنا۔ ہم مصیبت میں ہیں۔''

☆☆☆

''کوئی اندر نہیں آسکتا۔'' برنیڈا نے کہا۔ ''دروازہ مقفل ہے۔''

''ان کے پاس ماسٹر کی ہوگی...... وہ پہلے یہاں آئے تھے تو اب بھی آسکتے ہیں۔''

''کیا کریں؟''

''جارڈن کا کمرا......''

دونوں چاروں ہاتھ پیروں کے بل کنکٹنگ ڈور تک گئے۔ معاً برنیڈا کو احساس ہوا کہ وہ اکیلی ہے۔ ''کہاں ہو تم؟''

''تم اندر جاؤ، میں انہیں روکتا ہوں۔''

''کیا؟''

''وہ پہلے اس کمرے کو چیک کریں گے۔ تم جارڈن کے سوئٹ سے نکل کر سیڑھیوں پر جانا اور مڑے بغیر بھاگتی رہنا۔''

''یہ خودکشی ہے۔ تمہارے پاس اسلحہ نہیں ہے۔'' برنیڈا نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔ رچرڈ کا سایہ دروازے کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔

''برنیڈا، تم نکلو......'' رچرڈ نے بے چینی سے کہا۔

برنیڈا پر سکتہ طاری تھا۔

دستک ہوئی۔ ''مس ٹراوسٹوک؟'' مردانہ آواز آئی۔

برنیڈا خاموش رہی۔ آواز پھر آئی۔

رچرڈ اضطراب کے عالم میں ہاتھ سے اشارہ کررہا تھا کہ وہ نکل جائے۔

دروازہ کسی وقت بھی کھل سکتا تھا۔ سوچنے، حرکت کرنے کا وقت گزر گیا تھا۔ برنیڈا نے بیڈ سائڈ سے لیمپ اٹھایا اور رچرڈ کے قریب آگئی۔

''کیا کررہی ہو؟'' رچرڈ نے برہم سرگوشی کی۔

''شٹ اپ۔'' وہ آہستہ سے غرائی۔

دروازہ کھولا۔ دو سائے نظر آئے۔ رچرڈ قریب ترین سائے پر جا پڑا...... دونوں نیچے گرے۔ برنیڈا نے لیمپ دوسرے بن بلائے مہمان کے سر پر بجایا۔ وہ ڈکراتا ہوا منہ کے بل گرا۔ برنیڈا نے بیٹھ کر بغل کے پاس ہاتھ مارا۔ ہولسٹر؟ اس نے پشت کے بل گر کے اسے سیدھا کر کے ہولسٹر پر ہاتھ ڈالا...... تب باہر سے آنے والی روشنی کی لکیر آدمی کے چہرے پر پڑی اور برنیڈا کو غلطی کا احساس ہوا۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' وہ بولی۔ ''رچرڈ اسے چھوڑ دو۔''

''کیا بکواس ہے؟''

''یہ دونوں دوست ہیں۔'' برنیڈا نے اٹھ کر سوئچ آن کیا۔

رچرڈ نے حیرت سے دیکھا اور منیجر کو چھوڑ دیا۔ دوسرا آدمی کلاڈ ڈامیر تھا۔

''تم نے میرا سر ہی کھول دیا تھا۔ اینٹ ماری تھی کیا؟'' وہ چاروں منیجر کے آفس میں بیٹھے تھے۔

''لیمپ تھا، آئی ایم سوری۔'' برنیڈا بیگ میں لپٹی برف سے کلاڈ کے سر کی ٹکور کررہی تھی۔ منیجر کی ایک آنکھ سیاہی مائل ہورہی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً رچرڈ کے داہنے پنچ کو دیکھ رہا تھا۔ دروازے پر دستک کے بعد ایک پولیس مین اندر آیا اور کلاڈ سے باتیں کر کے چلا گیا۔

''کیا کہہ رہا تھا؟'' برنیڈا نے سوال کیا۔

''گولیاں ہوٹل کے مخالف سمت کی عمارت سے چلائی گئی تھیں۔ وہ ایک پلازا ہے۔ چھت پر سے گولیوں کے خول ملے ہیں...... حملہ آور غائب ہے۔''

''اس کا مطلب ہم نہیں جانتے کہ اب وہ کب کہاں حملہ آور ہوگا؟''

''وہ کیوں مجھے مارنا چاہتا ہے؟'' برنیڈا نے استفسار کیا۔

''اچھا سوال ہے؟'' رچرڈ نے جواباً کہا۔ ''میں پہلے بتا چکا ہوں کہ تم کیا کررہی ہو اور کیا نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے کہ ڈیلفی زندہ ہے۔'' رچرڈ، کلاڈ کی طرف مڑا۔ ''ہمیں ایک سیف ہاؤس چاہیے۔''

''تم ایکس سی آئی اے ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں مارنے کی کوشش کی گئی ہو؟'' برنیڈا نے نیا سوال اٹھایا۔

''کھڑکی کے سامنے سے تم گزری تھیں، میں نہیں۔ ڈیلفی کے لیے خطرہ میں نہیں، تم ہو...... مزید یہ کہ تم سوال بہت کرتی ہو۔ ہم سیف ہاؤس جائیں گے اور کل تم ہوائی جہاز میں ہوگی۔''

اس مرتبہ برنیڈا خاموش رہی۔ وہ خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

کلاڈ نے ایک سیمی آٹومیٹک نکال کر رچرڈ کے حوالے کیا۔ ''ادھار دے رہا ہوں۔''

''اور تم؟''

''میرے پاس دوسرا ہے۔'' اس نے جواب دے کر چند ضروری کالز کیں اور رچرڈ کو بتایا کہ کچھ دیر بعد گاڑی آئے گی جو پاسی کے سیف ہاؤس تک پہنچا دے گی۔

☆☆☆

''ہم یہاں محفوظ ہیں۔ کم از کم آج کی رات۔''

رچرڈ نے دروازے میں ڈبل بولٹ لگایا اور فلیٹ کا جائزہ لیا، کھڑکیاں چیک کیں......عمارت کے سامنے ایک گارڈ تھا اور ایک عمارت کی پشت کی نگرانی کر رہا تھا۔ رچرڈ نے پردے برابر کر دیے۔

''تم گن استعمال کرتے ہو؟''

''مرڈر کے لیے نہیں، حفاظت کے لیے۔'' رچرڈ نے جواب دیا۔ اس نے کلاڈ کا دیا گلاک نکالا۔ ''یہ سیمی آٹومیٹک ہے، نو ایم ایم، سولہ کارٹریڈج......میگزین کے لیے۔ ایسی چیزیں میں انتہائی ضرورت کے وقت استعمال کرتا ہوں۔''

''کیا تم نے کبھی آتشیں ہتھیار استعمال نہیں کیا؟''

''وہ اور بات تھی۔ انکل ہیو کے ساتھ پرندوں کا شکار۔''

''اس وقت کیا موضوع لے کر بیٹھ گئیں۔ دیکھو کچن میں کیا ہے؟ کچھ کھا کر سونے کی تیاری کرتے ہیں...... بہت بھاگ دوڑ کر لی۔''

☆☆☆

جارڈن نے وکیل کو دیکھ کر کوئی اچھا تاثر نہیں دیا تھا۔ انگریزی اچھی تھی نہ اس کی شکل وصورت۔ جارڈن نے خود کو تسلی دی کہ برنیڈا نے اسے ہائر کیا ہے تو وہ پیرس میں کوئی بہترین وکیل ہی ہوگا۔ وکیل کا نام ایم جارمی تھا۔

''فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ کاغذات اسٹڈی کرنے کے بعد ہم اگریمنٹ کر لیں گے۔''

''تفتیش کا کیا ہوا؟''

''رفتار بہت دھیمی ہے۔'' جارمی نے بتایا۔ تم صبر کا مظاہرہ کرو۔ پولیس کے پاس کام زیادہ ہے۔''

''کیا میرے انکل سے تمہارا رابطہ ہوا؟''

''وہ میری منصوبہ بندی سے مطمئن ہیں۔''

''کیا وہ پیرس آرہے ہیں؟'' جارڈن نے استفسار کیا۔

''وہ مصروفیت میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ جلد آئیں گے۔''

جارڈن سوال کرتے کرتے رہ گیا۔ کیسی مصروفیت؟ برنیڈا کے مطابق وہ توچیٹ ونڈ میں ہیں ہی نہیں......

جارمی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں پولیس کو ہدایت کر دوں گا کہ تمہیں کسی دوسرے بہتر سیل میں منتقل کر دیں۔''

''شکریہ۔'' وہ سوچ رہا تھا کہ جارمی کی ملاقات یا رابطہ انکل سے کہاں پر ہوا۔

''میرے انکل نے اور کیا بات کہی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''بات چیت جاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں خود بتائیں گے۔'' وکیل جارمی نے مبہم جواب دیا۔

وکیل جارمی سے متعلق جارڈن عدم اطمینان کا شکار ہو چلا تھا۔ نیا سیل کچھ بہتر تھا۔ وہاں بھی دو قیدی موجود تھے۔ دونوں جارڈن کے قیمتی اٹالین جوتوں کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

''ہیلو۔'' جارڈن کو کوئی اور لفظ نہیں سوجھا۔

''اونگلے؟'' ایک نے سوال کیا۔ اونگلے (انگریز)

''اونگلے۔'' جارڈن نے کہا۔

''وہ تمہاری ہے۔'' سوال کرنے والے نے انگریزی میں بینچ کی طرف اشارہ کیا۔ بینچ پر پتلا سا میٹرس بھی تھا۔ جارڈن کے ذہن میں پھر وکیل کا چہرہ گھومنے لگا۔ اس نے جھوٹ کیوں بولا۔ انکل ہیو چیٹ ونڈ میں نہیں تھے۔ کہاں تھے؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔

اتنے میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ دروازہ کھلا، ایک اور قیدی اندر داخل ہوا۔ وہ چوتھی اور آخری خالی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کا سر بالوں سے بے نیاز تھا۔ رخسار ابھرے ہوئے تھے۔ چہرہ، وکیل جارمی سے بہتر ہی تھا۔ وہ مجرم سے زیادہ بیکری والا لگ رہا تھا۔ اس کا نام فرانکو تھا۔

چھت پر کھانا آیا تو جارڈن کی روح تڑپ اٹھی۔ اس نے بمشکل تھوڑا سا کھایا اور لیٹ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے جان چھوٹتے ہی سب سے پہلے کسی بہترین ریسٹورنٹ کا رخ کرے گا۔ بینچ پر لیٹ کر اس نے کمبل کھینچ لیا۔ سونے کی ہر کوشش ناکام رہی۔ ایک وجہ وہ خراٹے تھے جو اس کے ساتھی قیدی تواتر کے ساتھ نشر کر رہے تھے......

دوسرے دن میں گزرے ہوئے حالات کے پریشان کن خیالات کی یلغار...... کولیٹ کا خوب صورت چہرہ بار بار اس کے تصور میں گھوم جاتا۔ وہ خود کو کولیٹ کی موت کا ذمے دار سمجھ رہا تھا۔ بار بار اندر سے اشتعال کی لہر اٹھتی...... اسے کیوں اور کس نے مارا؟ کیا اس نے کسی کو دیکھا تھا یا کسی نے اسے دیکھا تھا...... جارڈن خیالات میں ڈوبا ہوا نئی تھیوریز ایجاد کررہا تھا کہ وہ ایک بینچ سے ابھرنے والی معمولی سی چرچراہٹ پر دھیان نہ دے سکا۔ اسے احساس اس وقت ہوا جب کوئی اٹھ کر دبے پاؤں اس کی طرف آنے لگا۔

تاریکی میں ہیولا سا دکھائی دے رہا تھا۔ جارڈن ساکت پڑا رہا۔ کوئی اُچکا اس کی جیبیں صاف کرنے آرہا ہے۔ جارڈن کا سینہ ہولے ہولے پھول پچک رہا تھا جیسے وہ گہری نیند میں ہو۔ آنے دو اسے سبق سکھاتا ہوں۔ ہیولا قریب تر ہوتا گیا۔ چھ فٹ...... پانچ فٹ۔ جارڈن کی دھڑکن بڑھ گئی۔ عضلات تن گئے۔ جارڈن کی جیکٹ قدموں کی طرف دیوار پر لٹک رہی تھی۔ لیکن ہیولا اس کے سر کی جانب آیا۔ ضرب لگانے کے لیے اس کا ہاتھ بلند ہوا، اسی وقت جارڈن کا ہاتھ حرکت میں آیا، اس نے حملہ آور کی کلائی تھام لی۔ حملہ آور کے حلق سے حیرت زدہ آواز برآمد ہوئی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے حملہ کیا۔ جارڈن نے اس وار کو بھی بلاک کیا اور بینچ پر اٹھ بیٹھا۔ جارڈن نے سختی سے اس کی کلائی مروڑی۔ جارڈن نے حملہ آور کی کراہ سنی۔ وہ خود کو چھڑانے کے لیے جدوجہد کررہا تھا لیکن جارڈن سبق سکھائے بغیر اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس نے اٹھ کر ہیولے کو دھکیلا، دونوں دیوار کی طرف گئے۔ بھد کی آواز کے ساتھ حملہ آور دیوار سے ٹکرایا۔ کشمکش جاری تھی۔ جارڈن نے پھر دھکا دیا۔ دونوں لڑکھڑا کر سوئے ہوئے قیدی پر گرے۔ جو فرنچ میں مغلظات بکتا ہوا اٹھا۔ اسی دوران جارڈن نے محسوس کیا کہ حملہ آور کی مزاحمت ختم ہورہی ہے۔ باہر سے بھاگتے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ باہر سے کوئی فرنچ میں چلّایا اور اندر روشنی ہوگئی۔ جارڈن نے اپنے نیم جاں حریف کو چھوڑ دیا۔ وہ حیران تھا کہ حملہ آور کو کیا ہوا؟ نیز روشنی ہونے پر اس نے دیکھا کہ وہ گنجے سر والا فرانکو تھا۔ جو عجیب انداز میں مچھلی کی طرح بل کھارہا تھا۔ اس کی آنکھیں اوپر چڑھ گئی تھیں۔ ہاتھ پیر پھینکتے ہوئے اس نے حلق سے اذیت ناک آواز نکالی اور آناً فاناً دم توڑ دیا...... چند سیکنڈ تک وہاں موجود افراد اس کی حرکت کا انتظار کرتے رہے۔ تاہم انتظار فضول ہی ثابت ہوا۔

گارڈ نے چیخنا شروع کردیا۔ ذرا دیر میں وہاں مزید گارڈ پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے فرانکو کا جائزہ لیا پھر جارحانہ انداز میں جارڈن کا رخ کیا۔

”ایٹ مورٹ (یہ مرگیا ہے)۔“

”یہ ناممکن ہے۔ میں کیسے مار سکتا ہوں؟ نہ میرے پاس کوئی ہتھیار ہے۔“

گارڈز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باقی دونوں قیدی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے جارڈن سے دور ہوگئے۔ پتا نہیں یہ عزت تھی یا خوف؟

”تمہیں ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔“ گارڈ نے کہا۔

”میں نے اسے نہیں مارا۔“ جارڈن جھلاّ اٹھا۔

”دیکھ لو وہ زندہ نہیں ہے۔“

معاً جارڈن کی نگاہ باریک سرخ لکیر پر گئی۔ لکیر فرانکو کے رخسار پر تھی۔ جارڈن قریب جاکر جھکا۔ سوئی جیسی ڈارٹ فرانکو کی کھوپڑی میں کنپٹی کے قریب تھی۔ جہاں سیاہ سفید بالوں کے درمیان اس کی موجودگی مبہم تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ بڑبڑایا۔ جارڈن نے فرش پر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سرنج اور ڈارٹ گن وہیں کہیں ہونی چاہیے تھی۔ فرش اور بینچ کے میٹرس پر اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اس کی گھومتی ہوئی نظر مردہ آدمی کی بائیں مٹھی پر گئی۔ اس نے مٹھی کھولی تو کوئی شے نکل کر نیچے گری...... وہ بال پوائنٹ تھا۔

”چلو۔“ گارڈ نے اسے باہر کی طرف دھکا دیا۔

”کہاں، لے جارہے ہو؟“

”ایسی جگہ، جہاں تم کسی اور کو نقصان نہ پہنچا سکو۔“

اسے جس سیل میں منتقل کیا گیا، وہ خطرناک قیدیوں کے لیے تھا۔ کوئی کھڑکی نہ کوئی فرنیچر...... دوہری سلاخیں۔ لیٹنے کے لیے کنکریٹ کا سلیب۔ وہاں تیز روشنی مستقل جلتی رہتی تھی۔

جارڈن سر پکڑ کر سلیب پر بیٹھ گیا۔ کیا ہورہا ہے؟ ایک اور حملہ؟ ایک اور بحران؟ بھیانک خواب کے سائے مزید گہرے ہوگئے تھے۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ سونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ دفعتاً دروازے پر کھٹر پٹر نے کسی کی آمد سے مطلع کیا۔ جارڈن نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گارڈ کے ساتھ ٹائی لگائے ایک معقول آدمی اندر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔

”مسٹر ٹراوسٹوک؟“ وہ بولا۔

”یہاں اور کوئی نہیں ہے لہٰذا جارڈن ٹراوسٹوک میں

ہی ہوں۔''

آنے والے نے سیل کا جائزہ لیتے ہوئے ناگواری کا اظہار کیا۔

''اس کا ذمے دار میرا اٹارنی ہے۔'' جارڈن نے کہا۔

''اٹارنی؟ میں تمہارا وکیل ہوں۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''ہنری لورینٹ۔ میں جلدی آجاتا لیکن ریگی وان کا پیغام مجھے بروقت نہیں مل سکا تھا۔ پیغام کے مطابق یہ ایک ایمرجنسی ہے۔''

جارڈن نے ہاتھ ملایا اور اُلجھن سے کہا۔ ''ریگی وان نے تمہیں بھیجا ہے؟''

''ہاں، تمہاری بہن نے ریگی کے ذریعے میری فوری خدمات حاصل کرنے کی درخواست کی تھی۔''

''برنیڈا...... ؟ کیا جنجال ہے...... پہلے آنے والا کون تھا؟ مسٹر لورینٹ۔ چند گھنٹے قبل ایک وکیل میرے پاس آیا تھا۔ اس کا نام ایم جارمی تھا۔''

لورینٹ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ''میرے پاس ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے۔''

''اس کا دعویٰ تھا کہ میری بہن نے اسے ہائر کیا ہے۔''

''میری ریگی وان سے براہِ راست بات ہوئی ہے جس کے مطابق تمہاری بہن نے درخواست کی تھی...... کیا نام بتایا تم نے وکیل کا؟''

''ایم جارمی۔''

''میں اس نام کے کسی کرمنل اٹارنی سے ناواقف ہوں۔''

جارڈن کچھ دیر خاموش رہا۔ ''میرا خیال ہے کہ پہلی فرصت میں تم ریگی وان سے رابطہ کرو۔''

''لیکن کیوں؟''

''کیونکہ آج رات مجھے مارنے کی کوشش کی گئی ہے...... یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تو صبح تک تمہیں میری لاش ملے گی۔''

☆☆☆

وہ جنگل میں بکھرے ہوئے خشک پتوں پر بے تحاشا بھاگ رہی تھی۔ سیاہ رنگ کے خونخوار کتے اس کے تعاقب میں تھے۔ درمیانی فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا۔ یکایک کہیں سے فروگی نمودار ہوئی۔ تاہم وہ بھڑکی ہوئی تھی۔ برنیڈا نے اس کی لگام تھام کر اسے پُرسکون رکھنے کی کوشش کی...... کوشش ناکامی سے دوچار ہوئی اور لگام چھوٹ گئی۔ کتوں کے غول نے ہلا بولا۔ چند ایک فروگی کی گردن سے لپٹ گئے۔ ان کے بھیڑیے نما دانت فروگی کی گردن اُدھیڑ رہے تھے۔ گھوڑی کی دردناک آوازیں جنگل کے سناٹے کو چیر رہی تھیں۔ وہ اچھل اچھل کر جان بچانے کی کوشش کررہی تھی۔

دہشت نے آہنی زنجیروں کے مانند برنیڈا کو جکڑ لیا تھا۔ وہ کس طرح فروگی کو بچائے۔ فروگی نے گھٹنے ٹیک دیے۔ پھر وہ گر گئی۔ کتوں کے منہ پر خون لگا ہوا تھا۔ وہ اب برنیڈا کو گھور رہے تھے۔

برنیڈا چیخ مار کر اٹھی، وہ ہانپ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ حواس میں آئی۔ چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ رچرڈ کی آواز سن کر اس کا خوف کم ہوگیا۔ اس نے گردن موڑی۔ کمرے میں روشنی ہوگئی تھی۔ رچرڈ دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔

''برنیڈا؟'' وہ بولا۔

''میں خواب دیکھ رہی تھی۔ شاید جارڈن خطرے میں ہے۔'' برنیڈا کا جسم ابھی تک لرز رہا تھا۔

''تمہارا او ہم، اسے کچھ نہیں ہوگا...... تم تیار ہوجاؤ۔''

''کیا وقت ہے؟''

''صبح کے پانچ بج رہے ہیں، کلاڈ کا فون آیا تھا۔ ہمیں پولیس اسٹیشن جانا ہے۔''

''جارڈن ٹھیک ہے؟'' وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اسے کسی نے مارنے کی کوشش کی تھی۔ تاہم وہ محفوظ ہے۔''

☆☆☆

''حیرت انگیز، غیر معمولی چیز ہے۔'' کلاڈ نے بال پوائنٹ پین میز پر رکھ دیا۔ ''یہ پریشرائزڈ سرنج ہے...... ہائیڈرمک نیڈل۔ بڑی آسانی سے جان لیوا دوا انجیکٹ کی جاسکتی ہے۔''

''کون سی دوا؟'' برنیڈا نے سوال کیا۔

''ابھی تجزیہ ہورہا ہے۔ آٹوپسی بھی ہوگی۔ تاہم وجۂ ہلاکت سرنج والی دوائی ہی ہے اور کوئی وجہ سمجھ نہیں آئی۔''

''یعنی جارڈن پر الزام نہیں لگایا جاسکتا ہے۔'' برنیڈا نے کہا۔

''بہت مشکل ہے۔'' کلاڈ نے جواب دیا۔

کانفرنس روم کا دروازہ کھلا۔ جارڈن دو گارڈز کی ہمراہی میں اندر داخل ہوا۔

''اوہ گاڈ، یہ کیا حالت ہورہی ہے تمہاری......'' برنیڈا

اس سے لپٹ گئی۔
''میں ٹھیک ہوں۔ کوئی خراش تک نہیں۔'' وہ بولا۔
اس نے وکیل کے بارے میں استفسار کیا۔
''ناممکن...... وہ فراڈ تھا۔ میں نے ریگی کے ذریعے لورینٹ کو ہائر کیا تھا۔ ریگی کے مطابق وہ بہترین ہے۔'' برنیڈا نے وضاحت کی۔
''مجھے ڈر ہے کہ اس مصیبت سے بہترین وکیل بھی میری جان نہیں چھڑا سکتا۔ لگتا ہے مجھے لمبے عرصے کے لیے یہاں سکونت اختیار کرنی پڑے گی۔ جب تک یہاں کا کھانا مجھے ہلاک نہ کردے۔''
''جارڈی، ایسی باتیں نہیں کرو۔'' برنیڈا، کلاڈ کی طرف مڑی۔ ''وہ مردہ آدمی کون تھا؟''
''اریسٹ ریکارڈ کے مطابق اس کا نام فرانکو پرامنٹر تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے چوکیدار تھا۔ اس کے خلاف تشدد اور خراب رویّے کی رپورٹ تھی۔'' کلاڈ نے جواب دیا۔
''وہ جارڈن کے سیل میں کیسے پہنچا؟'' رچرڈ نے استفسار کیا۔
''جاری نامی جعلی وکیل، فرانکو کی وکالت بھی کررہا تھا...... اس نے خصوصی درخواست کی تھی کہ اس کے دونوں موکلان کو ایک ہی سیل میں رکھا جائے۔'' کلاڈ نے انکشاف کیا۔
''یہ درخواست نہیں تھی۔'' رچرڈ نے رائے دی۔ ''وکیل نے رشوت کا سہارا لیا ہوگا۔ نیز فرانکو اور وکیل جاری ٹیم کے طور پر کام کررہے تھے...... ٹارگٹ جارڈن تھا۔''
''کس کے کہنے پر؟'' جارڈن نے سوال اٹھایا۔
''وہی، جس نے برنیڈا پر حملہ کروایا۔''
''وہاٹ؟'' جارڈن کا رنگ بدل گیا۔
''ہوٹل کے سامنے والی بلڈنگ سے ہائی پاور رائفل کے ذریعے برنیڈا پر فائرنگ کی گئی تھی۔''
''اور وہ ابھی تک پیرس میں ہے؟'' جارڈن، برنیڈا کی طرف مڑا۔ ''بہت ہوگیا۔ تم گھر جارہی ہو اور فوراً روانہ ہورہی ہو۔''
''میں پہلے ہی زور لگا چکا ہوں مگر اس کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔'' رچرڈ نے کہا۔
''ہاں وہ نہیں سنے گی۔ مائی ڈارلنگ لٹل سسٹر، کسی کی نہیں سنتی۔'' جارڈن نے تلخی سے کہا۔ ''مگر اس بار اس کے پاس کوئی چوائس نہیں ہے۔''
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو جارڈی، کوئی چوائس نہیں ہے۔ اسی لیے میں رکی ہوئی ہوں۔''
''تم ماری جاؤ گی۔'' جارڈن تڑخا۔
''اور تم؟''
دونوں رُوبرو تھے۔ ڈیڈلاک۔ کوئی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھا۔ جارڈن، بہن کو گھورتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''رچرڈ، اس کا خیال رکھنا......'' رچرڈ نے سر ہلایا۔
وہاں خاموشی تھی۔
''سوال یہ ہے کہ کون تم دونوں کو مروانا چاہتا ہے؟'' رچرڈ نے کہا۔
''اس معمے کی چابی فرانکو کے پاس تھی۔'' جارڈن نے کہا۔ ''اور وہ مرچکا ہے...... کلاڈ تم اس کی فیملی یا فرینڈز کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''
''پیرس میں اس کی ایک بہن ہے۔ اس کی صحت کافی خراب ہے۔ وہ بھی نرسنگ ہوم میں ہے۔''
''تم نے بتایا تھا کہ فرانکو چوکیدار تھا، کہاں پر؟'' رچرڈ نے پوچھا۔
''انیکا آرٹ گیلری۔ گیلری کی اچھی ساکھ ہے۔''
''فرانکو کے بارے میں وہ لوگ کیا کہتے ہیں؟'' رچرڈ نے دوسرا سوال کیا۔
''انیکا سے میری مختصر بات ہوئی ہے۔ اس کے مطابق فرانکو قابلِ بھروسا اور کم گو شخص تھا۔ تاہم تفصیلی بات چیت ضروری ہے۔ اس سے قبل ہمیں چند گھنٹے کی نیند لے لینی چاہیے۔''
''جارڈن کا کیا ہوگا؟'' برنیڈا نے کہا۔
''اسے پرائیویٹ سیل میں رکھا جائے گا۔ مکمل آئسولیشن......''
''یہ غلطی ہوگی۔'' رچرڈ بولا۔ ''اگر کچھ ہوا تو کوئی گواہ نہیں ہوگا۔''
جارڈن نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''رچرڈ کا کہنا ٹھیک ہے۔ میں ایسے سیل میں زیادہ محفوظ رہوں گا جہاں ایک سے زیادہ قیدی ہوں۔''
''لیکن وہ کسی اور ہارڈ کلر کو وہاں بھیج سکتے ہیں۔'' برنیڈا نے خدشہ ظاہر کیا۔
''نہیں۔ کلاڈ وہاں بے ضرر قیدیوں کو رکھے گا۔''
کلاڈ نے سر ہلایا۔ ''خیال برا نہیں ہے۔''

☆☆☆

وہ پاسی کے سیف ہاؤس میں تھے۔ وہ ایک فلیٹ تھا۔ رچرڈ پانچ گھنٹے کی نیند لے کر اٹھا تھا۔ دن چڑھ گیا تھا۔

شاور، ٹوسٹ اور انڈوں نے اسے تازہ دم کر دیا تھا۔ اس نے برنیڈا کے کمرے میں جھانکا۔ وہ ابھی تک سو رہی تھی۔

''گڈ۔'' وہ بڑبڑایا۔ جب تک وہ اٹھے گی میں کچھ کام نمٹا لوں گا...... احتیاطاً اس نے ایک نوٹ لکھ کر نائٹ اسٹینڈ پر رکھ دیا۔ ''باہر جا رہا ہوں، تین بجے آؤں گا۔ آر۔''

گن اس نے نوٹ کے ساتھ چھوڑ دی۔ اس نے تصدیق کی کہ دونوں گارڈ فلیٹ پر ڈیوٹی دے رہے تھے۔ بعدازاں ڈور لاک کر کے وہ نکل گیا۔ رچرڈ سب سے پہلے ماما، ریو میراح پہنچا۔ وہ پیرس پولیس کی رپورٹ اور عمارت کے مالک کا بیان دوبارہ پڑھ چکا تھا۔ سانحے کے وقت مالک ری ڈیو تھا۔ اس نے برنارڈ اور میڈیلن کے اجسام جولائی 15، 1973ء کو دریافت کیے تھے اور فی الفور پولیس کو مطلع کر دیا تھا۔ پولیس کی تفتیش کے مطابق مذکورہ فلیٹ اس نے اسکارلیٹی کو کرائے پر دیا تھا جو کبھی کبھار فلیٹ استعمال کرتی تھی۔ البتہ کرایہ پابندی سے ادا کرتی تھی۔ ری ڈیو کے بیان کے مطابق اس نے کئی بار فلیٹ سے جنسی آوازیں سنی تھیں۔ تاہم وہ اس بات کی تصدیق نہیں کر سکا کہ وہاں اس نے میڈیلن کو دیکھا تھا۔ البتہ اسکارلیٹی کو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا...... ری ڈیو نے اتنا ضرور کہا کہ برنارڈ کے ساتھ میڈیلن نامی جس عورت کی لاش وہاں سے ملی تھی ...... عورت وہی تھی جس کا نام اسکارلیٹی تھا۔ ری ڈیو نے برنارڈ کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ تین ماہ بعد ری ڈیو عمارت فروخت کر کے چلا گیا تھا۔ وہ فیملی کے ساتھ ملک ہی چھوڑ گیا تھا۔ پولیس رپورٹ میں اس حوالے سے فوٹ نوٹ پر لکھا تھا۔ ''لینڈ لارڈ مزید پوچھ گچھ کے لیے مہیا نہیں ہے وہ ملک چھوڑ چکا ہے۔''

رچرڈ کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ری ڈیو ایک نہایت اہم کلیو ہے۔ اگر وہ کسی طرح اس تک پہنچ جائے تو پیش رفت کی امید کی جا سکتی ہے۔ اس نے ہر فلیٹ کو کھٹکھٹایا، سوال جواب کیے...... تاہم کچھ ہاتھ نہ آیا۔ بیس برس کا طویل عرصہ رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ رچرڈ عمارت سے نکل کر سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ گھڑی دیکھی۔ اسے برنیڈا کی طرف جانا چاہیے تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک گیند اس کی ٹانگوں سے ٹکرائی۔ گیند کے پیچھے پانچ سات بچے بھاگے چلے آرہے تھے...... رچرڈ کی نظر بھٹک کر ایک عمر رسیدہ عورت پر پڑی۔ عورت کی عمر ستر سال کے قریب ہوگی۔ وہ بالکونی سے بچوں کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ رچرڈ عورت کو نظرانداز کرتے کرتے رہ گیا۔ اگر وہ یہیں کی رہنے والی ہے تو بیس برس پرانی بات یاد کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

وہ نئی امید کے ساتھ خاتون کے پاس چلا گیا۔ ''گڈ آفٹرنون۔''

وہ مسکرائی۔ منہ میں اِکا دُکا دانت تھے۔

''میں پرانے شناسا کو ڈھونڈتا ہوا یہاں آیا ہوں۔ کیا آپ جیکوئس ری ڈیو کو جانتی ہیں۔ کافی عرصے پہلے وہ یہاں سے چلا گیا تھا؟'' رچرڈ نے نرمی سے کہا اور 66، ریو میراح کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ عمارت اسی کی تھی۔''

''وہ چلا گیا۔'' بڑی بی نے کہا۔

''تم جانتی تھیں اس کو؟''

''اس کا لڑکا میرے گھر بہت آتا تھا۔''

''میں سمجھتا ہوں، پوری فیملی فرانس چھوڑ گئی ہے۔''

''ایسا ہی ہے۔ وہ یونان شفٹ ہو گئے، اچھی جگہ پر...... پرانی کار اور پرانے کپڑے استعمال کرنے والے کیسے وہاں چلے گئے۔'' بڑی بی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''اور میں یہیں، سڑ رہی ہوں۔'' بڑی بی نے حسرت بھرا تبصرہ کیا۔

''یونان میں کہاں؟ تمہیں کچھ یاد ہے؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔

''سمندر کے کنارے ولا میں۔ بس یہی معلوم ہے۔''

''کچھ اتا پتا؟''

''اس کا لڑکا میرا بوائے فرینڈ نہیں تھا...... اور میں کیا بتا سکتی ہوں...... اب تو وہ مر کھپ گئے ہوں گے۔''

رچرڈ مایوسی سے جانے کے لیے مڑا۔ اچانک کسی خیال کے تحت وہ رک گیا۔ ''وہ لڑکا تمہارے گھر آتا تھا...... تمہاری بیٹی کا دوست تھا؟''

''میری نواسی کا۔''

''وہ فون کرتا ہوگا۔ وہاں سے خط لکھتا ہوگا؟'' رچرڈ کو ڈر تھا کہ بڑی بی چڑ نہ جائیں۔

وہ ہنس پڑی۔ ''ہاں وہ خط تو لکھتا تھا اور میری احمق نواسی نے خطوط کو سنبھال کر بھی رکھا ہوا ہے پھر اس نے خط لکھنے بند کر دیے۔''

نواسی سے ملنے کے لیے رچرڈ کو کچھ تگ و دو کرنی پڑی۔ بہرحال وہ بڑی بی کو راضی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بڑی بی اسے اندر لے گئی۔

''یہ آدمی جیرارڈ کے خطوط دیکھنا چاہتا ہے۔'' بڑی بی نے دوسری خاتون سے کہا جو عمر میں اس سے کم تھی۔ خاتون

نے مشکوک نظروں سے رچرڈ کو دیکھا۔

''یہ بہت ضروری ہے۔ امید ہے تم مدد کرو گی۔'' رچرڈ نے نرمی سے کہا۔

''اس کا باپ نہیں چاہتا کہ کوئی اسے ملے۔'' خاتون نے جواب دیا اور گود میں موجود بے بی کو فیڈ کرانے لگی۔

''کیوں؟''

''مجھے کیا پتا...... جیرارڈ نے مجھے نہیں بتایا۔''

''کیا اس کا تعلق مرڈر سے ہے...... وہاں دو انگریزوں کا مرڈر ہوا تھا؟''

خاتون کی توجہ بے بی پر سے ہٹ گئی۔ ''تم انگریز ہو؟''

''نہیں، امریکن...... کیا تمہیں وہ واردات یاد ہے؟''

''عرصہ ہو گیا۔ اس وقت میں پندرہ برس کی تھی۔''

''جیرارڈ نے تمہیں خط لکھنا کیوں بند کر دیے؟''

خاتون بدمزگی سے ہنس پڑی۔ ''اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

''ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ وہ تمہیں خط لکھنا چاہتا ہو۔ تمہیں بغیر تصدیق کے ناامید یا بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ وہ سمندر کے کنارے یونان میں کہاں ہے۔ مجھے اتا پتا مل جائے تو میں اس سے تمہارے بارے میں بھی بات کروں گا۔''

خاتون نے غیر یقینی نظروں سے رچرڈ کو دیکھا۔ پھر ان دو بچوں کو دیکھا جو الگ سے کھیل رہے تھے۔

''یقین کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد وہ کھڑی ہو گئی۔ دوسرے کمرے میں گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں خطوط کا ایک نحیف پلندا تھا جو اس نے میز پر رکھ دیا۔ خطوط لفافوں کے ساتھ تھے۔ تعداد صرف چار تھی۔ متن چاروں کا ایسا ہی تھا جیسا اظہارِ محبت میں ہوتا ہے۔ جیرارڈ نے واپسی کا یقین بھی دلایا تھا۔ تاہم چوتھے خط میں رچرڈ نے بین السطور میں سرد رویّہ صاف پڑھ لیا...... واپسی کا پتا بھی ندارد تھا۔ البتہ ایک لفافے پر رچرڈ نے مہر دیکھی: پاروس، گریس۔

رچرڈ نے خطوط واپس کر دیے۔ خاتون نے خاموشی سے خطوط لیے...... وہ ماضی کی یادوں میں کھو گئی تھی۔ رچرڈ بھی خاموش تھا۔ اس نے خاتون کے لیے ہمدردی محسوس کی۔

''اگر جیرارڈ تمہیں مل جائے...... اگر وہ زندہ ہو۔'' وہ بولی۔ ''اس کو پوچھنا......'' وہ چپ ہو گئی۔ ''پوچھنا...... مجھے کیوں بھول گئے؟'' اس کی آواز ٹوٹنے لگی۔

''میں پوچھوں گا...... ضرور پوچھوں گا۔''

☆☆☆

وہاں سے نکل کر رچرڈ نے فرانکو کی بہن کے نرسنگ روم کا رخ کیا۔ یہ نرسنگ روم پہلے والے سے زیادہ بدتر حالت میں تھا۔ قریب قریب قید خانہ ہی تھا۔ فرانکو کی بہن کی حالت خاصی ابتر تھی۔ ذہنی حالت بھی خستہ تھی۔ ایک بیلٹ کے ساتھ اسے اس طرح باندھا گیا تھا کہ وہ ہل تو سکتی تھی لیکن اٹھنے سے قاصر تھی۔ دونوں کلائیوں پر بھی فیتے تھے۔ بات کرنا تو دور کی بات تھی، وہ کسی کو پہچاننے تک سے قاصر تھی...... نرس کے ذریعے معلوم ہوا کہ بارہ سال کی عمر میں درخت سے گرنے پر اس کے سر پر چوٹ آئی تھی۔ تب سے وہ معذور تھی۔ بعدازاں اس کی حالت مزید بگڑ گئی تھی۔ فرانکو اسے دیکھنے کے لیے روز پابندی سے صبح نو بجے آتا تھا۔ نرس فرانکو کی اچانک گرفتاری اور موت سے آگاہ تھی۔

''اب اس کا خیال کون رکھے گا؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اسے گردوں کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ وہ ایک دو ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہے گی۔''

فرانکو کے علاوہ یہاں کون آتا تھا؟''

''کوئی نہیں۔''

☆☆☆

''تمہیں علم ہونا چاہیے، وہ کہاں گیا ہے؟'' برنیڈا بضد تھی۔

''میموزیل، اس نے صرف فلیٹ اور آپ کی حفاظت کا کہا تھا۔''

برنیڈا بڑبڑاتی ہوئی واپس فلیٹ میں چلی گئی۔ رچرڈ کا چھوڑا ہوا نوٹ دوبارہ پڑھا۔ نوٹ کا گولا بنا کر اس نے ایک طرف پھینک دیا۔ کیا وہ سارا دن بیٹھ کر انتظار کرے؟ جارڈن کا کیا ہوگا؟ تفتیش...... لنچ کیا کرے؟

اس نے فریج کھول کے دیکھا۔ رات کی باسی چیزیں پڑی تھیں...... اس نے لباس منتخب کیا اور تیار ہو کر باہر نکل گئی۔ فلیٹ کے سامنے والے گارڈ نے ٹوکا۔

''میموزیل، آپ کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

''لیکن وہ کیسے چلا گیا؟ میں انڈوں اور ٹوسٹ پر

گزارہ نہیں کرسکتی۔''

''آپ اکیلی نہیں جاسکتیں۔'' گارڈ خوف زدہ ہو گیا۔

''میں جارہی ہوں۔ چلنا ہے تو ساتھ چلو۔''

کچھ دیر بعد وہ، دونوں گارڈز کی ہمراہی میں قریبی ریسٹورنٹ پہنچ گئی۔ کھانا برنیڈا کے معیار کے مطابق نہیں تھا، تاہم فلیٹ کے فریج میں موجود اشیا سے بہتر تھا۔ واپسی پر برنیڈا کی نظر انیکا گیلری پر پڑی...... اسے یاد آیا کہ فرانکو اسی گیلری پر چوکیداری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ وہ خود بھی آرٹ کا ذوق رکھتی تھی۔ گارڈز کی جھجک ختم ہوگئی تھی۔ انہوں نے گیلری کا وزٹ کرنے پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔

☆☆☆

''یہ پاگل پن ہے۔ تم عمداً خطرات کو دعوت دے رہی ہو۔'' رچرڈ برہم نظر آرہا تھا۔

''تمہیں بھی یہاں رکنا چاہیے تھا۔'' برنیڈا نے دلیل دی۔

''میں کام سے نکلا تھا۔ تم محض پیٹ پوجا کے لیے۔''

''کیا کام کرلیا تم نے؟''

''کچھ نہ کچھ کیا ہی ہے۔'' رچرڈ نے اسے بتایا۔

''میں بھی خالی ہاتھ نہیں آئی۔'' برنیڈا نے پرس میں سے ایک کارڈ نکال کر رچرڈ کو دیا۔ رچرڈ نے کارڈ دیکھا۔

''انیکا آرٹ گیلری کی پیشکش...... کانسی کے مجسمے انتھونی سدرلینڈ کی فنکاری......

''یہ کیا ہے؟''

''انتھونی سدرلینڈ کو نہیں جانتے؟''

''جانتا ہوں، پھر؟''

''پھر یہ کہ جب میں وہاں گئی تو مختلف چیزیں دیکھنے کے ساتھ چند کانسی کے مجسمے بھی دیکھے۔ ایک مجسمہ میڈونا اور چائلڈ کے تھیم پر بنایا گیا تھا...... میں متاثر ہوکر قریب گئی تو میڈونا کے سینے سے لپٹا ہوا بچہ انسانی نہیں تھا۔ وہ بندر کا بچہ تھا۔ میرے استفسار پر میزبان نے بتایا کہ ایک نوجوان آرٹسٹ پیرس میں نام پیدا کررہا ہے۔ یہ مجسمے اس کے تخیل کے نمونے ہیں۔ آرٹسٹ کے اعزاز میں انیکا نے ایک دعوت کا انتظام کیا ہے۔ میزبان نے مجھے کارڈ دیتے ہوئے دعوت میں مدعو کیا...... مجھے نہیں معلوم تھا کہ آرٹسٹ کون ہے۔ کارڈ پر نگاہ پڑی تو احتیاط سے رکھ لیا۔''

''پھر تم نے کیا سوچا؟''

''رچرڈ ہم فرانکو کے بارے میں جتنا جان سکتے تھے، جان گئے ہیں۔ وہ اسی گیلری میں ملازم تھا۔ اس کی بہن سے تم مل آئے...... نرس نے فرانکو کے بارے میں اچھی رائے دی ہے۔ وہ روزانہ بہن کو دیکھنے جاتا تھا۔ اس کی بہن کی دیکھ بھال اور فرانکو کی تنخواہ...... سوچو اسے رقم چاہیے تھی، جس کے بغیر وہ بہن کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ رقم کے لیے کچھ بھی کرسکتا تھا اور وہ کر گزرا۔ سوال یہ ہے کہ رقم کس نے دی؟ جس نے بھی دی، اس کا تعلق انیکا گیلری سے ہے...... جو جارڈن کو مروانا چاہتا ہے۔ وہی مجھے بھی زندہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ مردہ فرانکو ہماری آخری کڑی ہے۔''

''بس، بس...... میں سمجھ گیا۔ اچھی منطق ہے۔ تم وہاں جاؤ گی۔ کوئی تمہیں ختم کرنے آئے گا اور خود پھنس جائے گا۔ معمولی جان ہے تمہاری کہانی میں لیکن خطرہ بہت بڑا ہے۔''

''شکریہ، شکریہ...... میں تو جاؤں گی۔ خیال غلط بھی نکلا تو وہاں بڑے بڑے لوگوں سے تو ملاقات ہوجائے گی۔ کیا حرج ہے۔ تُکّا بھی لگ سکتا ہے۔''

''تُکّا لگنے کی صورت میں تم ایک آسان ٹارگٹ ہوگی اور ماری جاؤ گی۔ اس سے جارڈن کو کیا فائدہ ہوگا؟''

''میرے لیے دو باڈی گارڈز ہیں اور تیسرے تم ہو۔''

''مجھے خود پر بھروسا نہیں۔'' رچرڈ نے کہا۔

''مجھے ہے...... رچرڈ، جارڈن قید ہے۔ میری حفاظت کی ضمانت کوئی نہیں لے سکتا۔ یہاں ہمارے لیے ایک چانس ہے۔''

''تم خود کو چارے کے طور پر پیش کررہی ہو؟''

''تم بتاؤ کیا کروں؟'' واپس میں جاؤں گی نہیں......''

رچرڈ اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر نائٹ اسٹینڈ کی طرف جاکر گلاک اٹھالیا۔

☆☆☆

آرٹ کے دلدادہ، معززین شہر اور شائقین آرٹ گیلری کی رونق میں اضافہ کررہے تھے۔ انتھونی سدرلینڈ [illegible] ڈیانا والے کانسی کے مجسمے کے قریب ایستادہ تھا۔ ڈیانا کے مجسمے کے مانند اس کے دیگر مجسمے بھی ایب نارمل زاویے اور سوچ کے حامل تھے۔ اسی مناسبت سے متنوع تبصرے کیے جارہے تھے۔

برنیڈا، رچرڈ کے ہمراہ ایک مجسمے کے قریب رک گئی۔ بظاہر یہ مرد عورت کے اختلاط کا اظہار تھا لیکن درحقیقت اس

میں آدم خوری کا عنصر واضح کیا گیا تھا۔ وہ بھی محبت کے ساتھ......

''شادی بھی اسی کا نام ہے۔ ایک دوسرے کو زندہ کھایا جائے۔'' ایک شناسا سا آواز آئی۔ وہ رنگی وان تھا۔ اس کے ہاتھ میں شیمپئن کا گلاس تھا۔ اس نے آگے جھک کر برنیڈا کی پیشانی چومی۔

''کیا آپ، ماڈرن آرٹ میں دلچسپی رکھتے ہیں؟'' برنیڈا نے سوال کیا۔

''میں نہیں جانتا، ماڈرن آرٹ کیا ہوتا ہے۔ مجھے نفرت ہے لیکن فلپ سینٹ پیری اور ماری آرہے تھے...... تم جانتے ہو کہ ماری ہیلن سے کتنی محبت کرتی ہے۔ اس نے ہیلن سے کہا اور ہیلن نے مجھے بھی گھسیٹ لیا۔'' رنگی نے وضاحت سے جواب دیا۔

''مجھے خوشی ہوئی آپ لوگوں کے آنے کی۔'' ایک نسوانی آواز نے ان کی توجہ بٹائی۔ وہ آرٹ گیلری کی مالکن اینیکا تھی۔

''شاندار انتظام کیا ہے تم نے۔'' رنگی نے تبصرہ کیا۔ پھر برنیڈا اور رچرڈ کا تعارف کرایا۔ ''نیٹا نظر نہیں آرہی۔'' اس نے اطراف میں دیکھا۔

''انتھونی موجود ہے تو نیٹا بھی یہیں ہوگی۔'' اینیکا مسکرائی۔

برنیڈا نے کچھ فاصلے پر ماری کو دیکھا جو اپنی دوست ہیلن وان کے ساتھ کھڑی تھی۔ دو عورتیں، دو گہری سہیلیاں، دونوں کی شادی ناکام تھی۔ آج دونوں زیادہ ہی تنہا تنہا لگ رہی تھیں۔ ہیلن، رنگی وان سے دور تھی۔ اور ماری کا شوہر آس پاس نظر ہی نہیں آرہا تھا۔

رنگی، اینیکا سے مصروفِ گفتگو تھا۔ جب رچرڈ نے معذرت کرتے ہوئے برنیڈا کا بازو پکڑا اور گول گھومتے ہوئے زینے کی طرف قدم بڑھایا۔

''کہاں؟ وہاں اوپر دیکھنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔'' برنیڈا نے نشاندہی کی۔

''میں نیٹا کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ اوپر گئی ہے۔'' دونوں سیکنڈ فلور پر آگئے۔ نیٹا وہاں کہیں دکھائی نہیں دی۔ انہوں نے بالکونی سے نیچے فرسٹ فلور پر نظر ڈالی۔ انتھونی مرکزِ نگاہ بنا ہوا تھا۔ تالیوں کی گونج، موسیقی کی لہریں اور تصاویر کے انداز...... رنگین پیرہن، سرگوشیاں، قہقہے۔

دفعتاً برنیڈا کو احساس ہوا کہ دو آنکھیں اس پر مرکوز ہیں۔ اس نے کانسی کے مجسمے کی طرف دیکھا۔ انتھونی، میڈونا کے پاس کھڑا برنیڈا کو تک رہا تھا۔ اس کی نگاہ میں چبھن تھی۔ برنیڈا پیچھے ہٹی، انتھونی نے بھی نظر ہٹالی۔

''کیا ہوا؟'' رچرڈ نے استفسار کیا۔

''انتھونی...... وہ عجیب انداز میں مجھے گھور رہا تھا۔''

رچرڈ نے نظر ڈالی تو انتھونی اس وقت رنگی وان سے مصافحہ کررہا تھا۔ رچرڈ دوبارہ سیکنڈ فلور کی طرف متوجہ ہوگیا۔ تاہم نیٹا کا کہیں پتا نہیں تھا۔ بے شک نیٹا نے اوپر آنے کے لیے احتیاط برتی تھی، لیکن اس کے مخصوص لباس کی جھلک کے باعث رچرڈ نے اندازہ لگالیا تھا۔

''تیسری منزل پر چلتے ہیں۔'' برنیڈا نے مشورہ دیا۔

رچرڈ نے اس کے مشورے پر عمل کیا لیکن وہاں بھی سناٹا تھا۔ دونوں واپسی کا ارادہ کررہے تھے جب پہلی منزل کے سازندوں نے یک لخت موسیقی کا سلسلہ روک دیا۔ موسیقی کے اختتام پر خاموشی گہرے سناٹے کے مانند لگی...... اور ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ الفاظ، موسیقی کے اختتام کے ساتھ سرگوشی میں ڈھل گئے۔ آواز ایک ستون کی آڑ میں سے آرہی تھی۔ ستون کونے میں تھا۔ رچرڈ، برنیڈا کو لے کر دھیرے سے ایک طرف ہوگیا۔

''میں نے بے صبری کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا، میں صورتِ حال کو سمجھتی ہوں۔'' وہ نیٹا کی آواز تھی۔

''میں جانتا ہوں، جانتا ہوں۔''

''تمہیں پتا ہے، انتھونی میرے لیے کیسا ہے، کتنا اہم ہے؟ ان تمام سالوں میں، میں تمہارے فیصلے کا انتظار کرتی رہی۔''

''مجھے احساس ہے، میں نے ہمیشہ تمہاری قدر کی...... کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔ انتھونی کو بہترین مواقع دیے...... اب وہ اکیس برس کا ہوگیا ہے۔ میری ذمے داری ختم ہوچکی۔''

''تمہاری ذمے داری۔'' نیٹا کی آواز آئی۔ ''وہ تو اب شروع ہوتی ہے۔''

رچرڈ نے بروقت برنیڈا کو آڑ میں دبالیا۔ نیٹا اچانک نکل کر کھٹ کھٹ کرتی بیرل نما سیڑھیوں کی طرف جارہی تھی۔ اس کے پیچھے فلپ سینٹ پیری نمودار ہوا۔

☆☆☆

فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے برنیڈا کے ذہن میں سینٹ ماری کا ہی تصور تھا۔ یہ احساس کس قدر اذیت ناک تھا کہ اس کا شوہر کسی اور کا ہے...... ''اسے بہت پہلے ادراک ہوجانا چاہیے تھا۔'' برنیڈا نے آہستگی سے کہا۔

''کیا ہونا چاہیے تھا؟'' رچرڈ نے سامنے سڑک کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ماری سینٹ پیری، اسے اپنے شوہر اور نینا کے افیئر کا ادراک بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ اس نے خود کو عرصے سے دہری اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ شوہر کا معاشقہ اور انتھونی......''

''انتھونی؟''

''تم نے انتھونی کے چہرے کے نقوش پر غور نہیں کیا؟''

''آہ، تمہارا مطلب ہے کہ انتھونی کا باپ فلپ ہے؟''

''تم نے اُن کی باتیں نہیں سنیں۔ نینا، انتھونی کے لیے فلپ کی ذمے داریوں کی بات کر رہی تھی...... اور یہ کہ آرٹ اسکول یا اس میں نمائش مہنگا شوق ہے۔ آرٹ بذاتِ خود مہنگا شوق ہے۔ انتھونی کے اخراجات کون پورے کرتا ہوگا؟''

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ نینا کا شوہر پل سے کود گیا تھا۔ میں تب سے شک میں تھا کہ وہی اصل غدار تھا لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ خودکشی کی وجہ ذاتی ہو؟''

''شادی؟'' برنیڈا نے کہا۔

''شادی اور انتھونی...... کیا اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ انتھونی اس کا بیٹا نہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سندرلینڈ، ڈیلفی نہیں تھا......؟''

''ہمیں تلاش کا رخ موڑنا پڑے گا۔'' رچرڈ نے کہا۔

''ڈھونڈنا تو ہمیں ڈیلفی کو ہی ہے جو زندہ ہے...... وہ جارڈن اور مجھ سے خوف زدہ ہے۔'' برنیڈا نے پلٹ کر دیکھا۔ پیجو میں دونوں فرنچ ایجنٹ پیچھے آ رہے تھے۔ پیجو کے عقب میں نامعلوم روشنیاں تھیں۔ معاً برنیڈا کو لگا کہ رچرڈ ٹھیک کہتا تھا۔ اسے فلیٹ سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ کہیں، کوئی بھی اسے دیکھ سکتا تھا۔ اسے نشانہ بنا سکتا تھا۔ معاً اس کے دل میں خوف نے سر اٹھایا۔ خواہش شدت سے بیدار ہوئی کہ وہ جلد از جلد فلیٹ میں پہنچ جائے۔

جیسے ہی گاڑی منزل پر پہنچی، برنیڈا نے تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ رچرڈ نے بازو سے پکڑ کر واپس اُسے اندر کھینچا۔ ''باہر مت نکلو۔ پہلے ایجنٹ فلیٹ کو چیک کریں گے۔ یہی طریقہ کار ہے۔''

برنیڈا رک کر دونوں ایجنٹ کی طرف دیکھنے لگی جو سیڑھیاں چڑھ کر فلیٹ کا لاک کھول رہے تھے۔ ایک سیڑھیوں پر کھڑا رہا اور دوسرا اندر غائب ہو گیا۔

''سیف ہاؤس کے بارے میں کون جان سکتا ہے؟'' برنیڈا نے جز بز ہو کر سوال کیا۔

''رشوت، بلیک میل اور تمہاری دن والی بے احتیاطی۔''

''کیا کلاڈ نے......''

''میں تمہیں ڈرا نہیں رہا ہوں۔ احتیاط ضروری ہے۔''

کچھ دیر بعد سیڑھیوں پر کھڑے ایجنٹ نے اشارہ دیا۔

''آل کلیئر، آؤ اب چلتے ہیں۔'' رچرڈ نے کہا۔

وہ دونوں عمارت کی طرف بڑھنے لگے۔ برنیڈا آگے تھی۔ قریب پہنچ کر اس نے فٹ پاتھ پر قدم رکھا۔ ساعت شکن دھماکے نے اسے پیچھے کی جانب پھینکا۔ زمین نے جیسے کروٹ بدلی۔ ٹوٹے ہوئے شیشے بارش کی طرح برسے...... اگلے لمحے رات کی سیاہی کو لپکتے شعلوں کی زبان نے روشن کر دیا۔ برنیڈا نیچے گری ہوئی تھی۔ کانوں میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ اسے رچرڈ کی چیخیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ نہ اسے احساس تھا کہ وہ اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھا ہے۔

''تم ٹھیک ہو؟'' وہ چیخا۔ ''میری طرف دیکھو۔''

برنیڈا نے نقاہت سے سر ہلایا۔

''یہیں رہنا، ابھی آیا۔'' وہ سیڑھیوں کے پاس سڑک پر گرے ایجنٹ کی طرف گیا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر وہ اس کی نبض تلاش کرتا رہا۔ پھر واپس آ گیا۔

''گاڑی میں چلو۔'' اس نے برنیڈا کو سہارا دیا۔

''ان کا کیا ہوگا؟''

''وہ مر چکا ہے۔ دوسرا اندر تھا۔ اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رچرڈ نے برنیڈا کو گاڑی میں دھکیلا۔

پہیوں کی چرچراہٹ کے ساتھ گاڑی حرکت میں آئی۔ رچرڈ پاگلوں کی طرح گاڑی دوڑا رہا تھا۔

''جارڈن کا کیا ہوگا؟ وہ لوگ وہاں بھی پہنچ جائیں گے۔''

''وہ محفوظ ہے۔''

''ہم کہاں جائیں گے؟'' برنیڈا نے لرزاں آواز میں سوال کیا۔

''یونان!''

☆☆☆

دوسری گھنٹی پر کلاڈ نے فون اٹھایا۔
''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''
''رچرڈ تم کہاں ہو......اور برنیڈا؟''
''ہم ٹھیک ہیں اور محفوظ جگہ پر ہیں۔''
''میرے ہی آدمی مارے گئے؟'' کلاڈ کی آواز میں شکوہ تھا۔
''مجھے افسوس ہے لیکن سیف ہاؤس محفوظ نہیں تھا۔''
''غلطی تمہاری ہے۔ برنیڈا کو باہر نہیں آنا چاہیے تھا......اُسے کسی نے دیکھا اور تعاقب کرتا ہوا سیف ہاؤس تک پہنچ گیا۔''
''میں غلطی تسلیم کرتا ہوں اور مزید غلطیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا امید کرتا ہوں کہ تم میرا پتا نہیں پوچھو گے۔''
کلاڈ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''ہم دونوں ایک دوسرے کو طویل عرصے سے جانتے ہیں۔ یہ وقت بے اعتباری کا نہیں ہے۔''
''کلاڈ، میں معذرت خواہ ہوں۔ مگر حالات کے تحت میرے پاس دوسری چوائس نہیں ہے۔'' رچرڈ نے نرمی سے کہا۔
''پھر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔''
''ہم تمہیں زحمت نہیں دیں گے۔''
''رچرڈ، رکو......'' لیکن رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ رچرڈ جیسے کھلاڑی کی کال ٹریس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ شاید یہ دونوں کے لیے اچھا ہوا، کلاڈ نے سوچا۔
''گڈ لک، میرے دوست۔'' کلاڈ بڑبڑایا۔

☆☆☆

رچرڈ نے پے فون کے ذریعے ایک اور کال کار سک لیا۔ کال واشنگٹن ڈی سی کے لیے تھی۔
اس کے کاروباری شریک نے جواب دیا۔
''سسکاروف ہیئر۔''
''نکی، میں رچرڈ بات کر رہا ہوں۔''
''خوب صورت پیرس، کیسا وقت گزر رہا ہے؟''
''پریشانی ہے۔ لمبی بات نہیں کر سکتا۔''
''مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔'' نکی نے سرد آہ کھینچی۔
''وہی پرانا ڈیلفی کیس ہے، 1973ء۔ نیٹو لیک۔''
''آں ہاں، یاد ہے۔''
''ڈیلفی کے سلسلے میں تمہارا تعاون ضروری ہے۔''
''ضرور، لیکن میں KGB میں تھا۔ یہ معاملہ مشرقی جرمنی سے تعلق رکھتا ہے۔''
''تمہارے تعلقات ہیں وہاں۔''
''براہِ راست نہیں...... بتاؤ کیا کر سکتا ہوں؟''
''کسی اسٹاسی ایجنٹ کو پکڑو۔''
''ہونہہ۔'' کچھ دیر بعد آواز آئی۔ ہنرچ لیٹرڈ۔ وہ ڈیلفی کے کام کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہوگا مگر ہنرچ کبھی مشرقی برلن سے باہر نہیں گیا۔''
''ٹھیک ہے، میں اس سے بات کروں گا، یہ کیسے ہو گا؟''
''مشکل سوال ہے۔ وہ برلن میں ہے۔'' نکی نے بتایا۔
''ہم برلن جائیں گے۔ کوئی مسئلہ نہیں۔'' رچرڈ نے عندیہ دیا۔
''مسئلہ ہے۔ وہ انتہائی نگہداشت کے قید خانے میں ہے۔''

☆☆☆

بوتھ سے نکل کر رچرڈ نے احتیاط سے سب وے پلیٹ فارم کا جائزہ لیا...... کریٹل پریفیکٹر کی ٹرین اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ ٹرین پر سوار ہوا اور تین اسٹاپ کے بعد اتر گیا۔ ایک بار پھر گرد و پیش کا جائزہ مکمل کرنے کے بعد اس نے بوبگنی پکاسو کی ٹرین پکڑی۔ ٹرین اس نے گارڈی ایسٹ پر چھوڑ دی۔ وہاں سے پیدل ''تیتشن'' تک آیا......
برنیڈا بتیاں بند کر کے کھڑکی کے قریب آرم چیئر میں بیٹھی تھی۔ رچرڈ نے اندر جا کر دروازہ بولٹ کر دیا۔
''سب ٹھیک ہے۔ ہم یہاں محفوظ ہیں...... کم از کم آج کی رات محفوظ ہیں۔''
''اور کل؟'' برنیڈا نے سرگوشی کی۔
''کل کی کل دیکھیں گے۔'' وہ بولا۔
''مجھے جارڈن کی فکر ہے۔''
''کلاڈ اس کا خیال رکھے گا۔''
''انکل ہیو؟''
''میں نے نکولائی سسکاروف سے کہا ہے انکل کا پتا لگائے۔''
''رچرڈ!''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

''ہاں؟''

''میں ڈر گئی ہوں...... مجھے چھوڑ کے مت جایا کرو...... میرے قریب آجاؤ......''

☆☆☆

وہ معمول کے مطابق مخصوص مقام پر ملے تھے...... اینکا گیلری کے عقب میں موجود گودام ان کی ملاقات کے لیے مخصوص تھا۔

''اب کیا کہو گے؟''

''بم منصوبے کے مطابق ٹھیک پلانٹ کیا گیا تھا۔''

ایمل فوش نے جواب دیا۔ ''کام ہو گیا تھا۔''

''نہیں، کام نہیں ہوا تھا۔ کام ہوتا تو وہ زندہ نہ ہوتی...... نہ رچرڈ وولف سانس لے رہا ہوتا۔''

''فیوز اپنی مرضی سے کام نہیں کرتا۔ اسے دو منٹ پر سیٹ کیا گیا تھا۔ دروازہ کھلنے کے دو منٹ بعد بم پھٹ گیا تھا'' فوش نے کہا۔

''جو بھی ہے۔ وہ دونوں زندہ ہیں...... تم اس معمولی چوہیا ماری سینٹ پیری کو بھی ختم نہ کر سکے۔''

''اس کی قسمت اچھی تھی۔ بہر حال اس مرتبہ وہ نہیں بچے گی۔''

''اُسے بھول جاؤ۔ پہلے بہن بھائی کو ٹھکانے لگاؤ۔ میرے خدا! کتنے خون ہو چکے ہیں...... اور وہ دونوں زندہ ہیں۔ کیسے؟''

''جارڈن اندر ہے میں کچھ......''

''وہ جہاں ہے، ناکارہ ہے۔ لڑکی کو دیکھو، میرے اندازے کے مطابق وہ رچرڈ کے ساتھ پیرس چھوڑنے کے چکر میں ہے۔ ان دونوں کو ڈھونڈو۔''

''کیسے؟'' ایمل فوش نے سوال اٹھایا۔

''تم پروفیشنل ہو۔''

''رچرڈ بھی ہے۔''

کچھ دیر کے لیے گودام میں خاموشی چھا گئی۔

''میں کرشمے نہیں دکھا سکتا۔ نہ اندھا دھند کام کرتا ہوں۔ مجھے اشارہ درکار ہے۔ اگر وہ انگلینڈ جا رہے ہیں تو......؟'' فوش نے کہا۔

''نہیں، وہ انگلینڈ نہیں جائیں گے۔ وہ یونان کے جزیرے پاروس جائیں گے۔''

''تمہارا مطلب ہے...... ری ڈیونیلی؟''

''رچرڈ۔ وہاں ضرور کوشش کرے گا۔ مجھے یقین ہے...... میری ماں نے برسوں پہلے ری ڈیو کا انتظام کر دیا تھا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا'' انتھونی نے نفرت سے کہا۔

☆☆☆

فوش کے جانے کے بعد انتھونی تنہا کھڑا رہا۔ بعض حلقوں کی جانب سے نکتہ چینی کے باوجود بطور آرٹسٹ وہ پیرس میں نام پیدا کر رہا تھا۔ اس میں ٹیلنٹ یا قسمت سے زیادہ دولت کا کمال تھا۔ فلپ سینٹ پیری کی دولت کا جادو تھا۔ جیسے ہی انتھونی کی ماں کا راز فاش ہوتا، دولت کا جادو بھی ختم ہو جانا تھا۔ انتھونی، اپنے باپ فلپ کے بارے میں سوچ کر ہنس پڑا۔ اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی فلپ کو کبھی شک نہیں ہوا تھا کہ انتھونی اور اس کی ماں کیا کر رہے ہیں......

لیکن عورت، عورت ہی ہوتی ہے۔ بیس برس پہلے نینا اگر مکمل صفائی کر دیتی تو بہتر تھا۔ ایک گواہ کو ملک سے باہر بھیج کر اس نے دانش مندی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا...... ایک زندہ گواہ...... بہت بڑی غلطی تھی۔ اگرچہ وہ ملک سے باہر تھا لیکن جب تک زندہ تھا، ایک ٹائم بم کی طرح تھا۔

انتھونی گودام سے نکل کر گلی میں آگیا اور کار کی طرف چل دیا۔ گھر جانے کا وقت تھا۔ نینا کو اس کی فکر رہتی تھی۔ وہ کوشش کرتا تھا کہ ماں کو کوئی پریشانی نہ ہو...... اس دنیا میں نینا ہی تو وہ واحد ہستی تھی جو انتھونی سے پیار کرتی تھی۔ اُسے سمجھتی تھی!

☆☆☆

جارڈن کو نو بجے ایسکارٹ کے ساتھ سیل سے نکالا گیا۔ وہ گارڈز کے ساتھ کوریڈور سے گزرتا ہوا وزیٹنگ روم میں پہنچا۔

وہاں ریگی وان منتظر تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے جارڈن کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ ''کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''جناب، جیل میں پڑا ہوں......''

''خوش ہو جاؤ، تمہاری مطلوبہ چیزیں لایا ہوں۔ بھنا ہوا گوشت، فرنچ بریڈ۔'' ریگی نے کاغذی لفافہ اس کی طرف کھسکایا۔ ''مزے کرو۔''

جارڈن نے لفافے میں جھانکا۔ ''ریگی، اولڈ مین، تم ایک سینٹ (Saint) ہو...... لیکن وائن کہاں ہے؟''

''وائن کے بغیر کیا مزہ آئے گا۔ سرخ برگنڈی وائن کی دو بوتلیں ہیں۔'' ریگی نے آنکھ جھپکا کر دوسرا پیپر بیگ آگے بڑھایا۔

جارڈن نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''سینٹ نہیں، سینٹ سے بڑھ کر ہو۔''

''ہیلن نہیں مانتی اس بات کو۔'' ریگی نے منہ بنایا۔ ''وہ تمہاری مطلوبہ کتابیں آج لے کر آئے گی۔''

''اچھا، تازہ خبر کیا ہے؟ برینڈا کہاں ہے؟''

ریگی نے لمبی سانس لی۔ ''اسی سوال کا ڈر تھا۔ وہ دونوں غالباً ملک چھوڑ گئے ہیں۔ کلاڈ نے انہیں جہاں رکھا تھا، وہاں بم پھٹا ہے۔''

''وہاٹ؟''

''وہ دونوں ٹھیک ہیں لیکن کلاڈ کے دو آدمی مارے گئے ہیں۔''

''دھماکا کس نے کیا؟ کلاڈ کیا کہتا ہے؟''

''یہ دھماکا گزشتہ دھماکے سے مماثل ہے۔''

''کاسمک سولیڈیرٹی؟ کیا پاگل پن ہے؟ کون گروپ ہے؟''

''ابھی تک اندھیرا ہے۔''

''لیکن ہم سویلین ہیں...... دہشت گرد ہمیں یا ماری سینٹ پیری کو نشانہ کیوں بنائیں گے؟''

''ہوسکتا ہے اُن کی سوچ مختلف ہو...... عام لوگوں پر حملے ہوتے ہیں اور دہشت پھیلتی ہے......''

''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ سرے سے کوئی دہشت گرد گروپ نہ ہو۔'' جارڈن کھڑا ہوگیا۔ ''یہ محض ایک کوراسٹوری ہو...... اصل مقصد کو چھپانے کے لیے۔''

''تمہارا مطلب یہ سیاست سے ہٹ کر ہے؟''

''ہاں۔''

''لیکن انہوں نے فلپ سینٹ پیری کو مارنے کی کوشش کیوں کی؟''

جارڈن ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ ''فلپ کو نہیں...... اس کی بیوی ماری......''

''ماری نے بم لگایا؟''

''نہیں، ماری ٹارگٹ تھی۔ وہ اکیلی گھر پر تھی۔ سب نے خیال کیا کہ دہشت گرد غلطی کر گئے ہیں لیکن وہ ٹھیک ٹھیک جانتے تھے کہ فلپ اس وقت لندن میں تھا۔ آپ فوراً رچرڈ تک یہ بات پہنچائیں جو میں نے ابھی کی ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم، وہ کہاں ہے؟''

''کلاڈ سے معلوم کریں...... انکل ہیو کو بھی تلاش کریں...... یہ اچھا ہوا کہ برینڈا چلی گئی۔''

ریگی سے ملاقات کے بعد جارڈن کو اس کے سیل میں واپس پہنچا دیا گیا۔ اس کے دو ساتھی اور تھے۔ ایک فراڈ، دوسرا چور...... تیسرا وہ خود تھا۔

☆☆☆

رچرڈ اور برینڈا ایک پب میں بیٹھے تھے۔ میز پر ریٹسینا کے دو گلاس رکھے تھے۔ یہ پب، یونان میں ان کی تیسری کوشش تھی۔

''موسم گرما میں یہاں بہت سیاح آتے ہیں۔'' پب کیپر نے کہا۔ ''میں سب کا ریکارڈ نہیں رکھ سکتا۔''

''لیکن یہ ری ڈیو نام کا فرانسیسی سیاح نہیں تھا۔ وہ بیس سال سے اس جزیرے پر رہ رہا ہے۔'' رچرڈ نے وضاحت کی۔

پب کیپر ہنسنے لگا۔ ''فرنچ مین ہو یا ڈچ مین، میرے لیے سب ایک ہیں۔'' وہ واپس کچن کی طرف چلا گیا۔

''ایک اور بند گلی۔'' برینڈا نے مایوسی سے کہا اور ریٹسینا کا سپ لیا۔ ''یہ بھی کوئی پینے کی چیز ہے۔''

پب کیپر کچن سے نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دو پلیٹیں تھیں جو اس نے ایک ٹیبل پر رکھ دیں۔ وہاں ایک جرمن فیملی بیٹھی تھی۔ کیپر جانے کے لیے مڑا تھا کہ رچرڈ نے آواز لگائی۔

''شاید کوئی اور جانتا ہو......؟''

''تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں نے بتایا کہ اس جزیرے پر ری ڈیو نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا۔''

''وہ عرصہ پہلے فیملی کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اپنی بیوی اور لڑکے کے ساتھ لڑکا اس وقت تیس بتیس سال کا ہو گا۔ اس کا نام جیرارڈ ہے۔''

اچانک بار کے پیچھے کوئی ڈش گر کر ٹوٹ گئی۔ سیاہ آنکھوں والی ایک جوان عورت رچرڈ کو گھور رہی تھی۔

''جیرارڈ؟'' وہ بولی۔

''ہاں، جیرارڈ ری ڈیو۔ تم اُسے جانتی ہو؟''

''وہ کچھ نہیں جانتی۔'' کیپر نے مداخلت کی اور عورت کو کچن کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔

''میں سمجھ رہا ہوں کہ وہ جیرارڈ کے نام سے واقف ہے۔''

عورت کشمکش کے عالم میں کھڑی تھی۔ کیا کرنا ہے؟ کیا کہنا ہے؟ وہ رچرڈ کو دیکھ رہی تھی۔

''ہم پیرس سے آئے ہیں۔'' اس وقت برینڈا نے کہا۔ ''ہمارا ملنا بہت ضروری ہے۔''

''تم فرنچ نہیں ہو۔'' عورت نے کہا۔

''میں انگریز... ہوں اور یہ امریکی ہے۔''

''اس نے کہا تھا...... کہا تھا کہ ایک فرنچ آدمی ہے جو

اُن کے لیے اچھا نہیں ہے۔‘‘

’’کس نے کہا تھا؟‘‘

’’جیرارڈ نے۔‘‘

’’اس نے ٹھیک کہا تھا۔ اسے احتیاط کرنی چاہیے۔‘‘ رچرڈ نے کہا۔ ’’لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ معاملات زیادہ پُرخطر ہیں اور بھی افراد ’پاروس‘ آسکتے ہیں، اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ براہِ کرم ہماری اس سے بات کرا دو...... ہم فرنچ نہیں ہیں۔‘‘

عورت ہچکچاہٹ کے ساتھ کچن میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد اس کا چہرہ نظر آیا۔ ’’فون پر جواب نہیں مل رہا ہے...... میں تم لوگوں کو وہاں تک لے جاتی ہوں......‘‘

☆☆☆

وہ ایک کچی اور ناہموار سڑک تھی جس کے ذریعے وہ لوگا رس بیچ تک پہنچے تھے۔ عورت کا نام صوفیہ تھا۔ اس کی جائے پیدائش وہی جزیرہ تھی۔ اسے چار زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ تین بھائی کاروبار چلاتے تھے۔ باپ ہار بر پر ہوٹل سنبھالتا تھا۔

’’تم جیرارڈ کو کیسے جانتی ہو؟‘‘ برنیڈا نے سوال کیا۔

’’ہم دوست ہیں۔‘‘ صوفیہ نے جواب دیا۔

’’لورز۔‘‘ برنیڈا کے ذہن میں آیا۔

’’جیرارڈ کی ماں کا انتقال پانچ سال پہلے ہوا تھا۔ اس کا باپ زندہ ہے لیکن اس کا نام ری ڈیو نہیں ہے۔‘‘

’’شاید انہوں نے نام تبدیل کر لیا ہو۔‘‘ برنیڈا نے کہا۔

بیچ کے قریب صوفیہ نے گاڑی روک دی۔ تینوں نیچے اترے۔ ’’وہ ہے۔‘‘ صوفیہ نے سمندر کی موجوں کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں جیرارڈ سیل بورڈ پر سرفنگ میں مشغول تھا۔ صوفیہ نے ہاتھ لہرایا اور یونانی زبان میں بلند آواز میں کچھ کہا...... رنگین بورڈ پانی پر پھسلتا ہوا موج کی اٹھان پر ساحل تک آیا۔ جیرارڈ ماہرانہ انداز میں پانی سے اتر گیا۔ بورڈ اس نے ریت پر چھوڑ دیا تھا۔

’’جیرارڈ، یہ دونوں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ری ڈیو تمہارے پاپا کا نام تھا؟‘‘ صوفیہ اس کے ساتھ ہمکلام ہوئی۔

’’یہ نام میرے لیے اجنبی ہے۔‘‘ جیرارڈ نامی آدمی نے خشک لہجے میں کہا اور پلٹ کر جانے لگا۔

’’جیرارڈ؟‘‘ صوفیہ نے پکارا۔

’’مجھے بات کرنے دو۔‘‘ رچرڈ آگے بڑھ گیا۔

برنیڈا، صوفیہ کے ساتھ کھڑی دونوں آدمیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جیرارڈ بار بار نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ہوا کے دوش پر رچرڈ کے چند الفاظ برنیڈا تک پہنچے...... جن میں دو الفاظ ’’مرڈر‘‘ اور ’’بم‘‘ نمایاں تھے۔ برنیڈا نے محسوس کیا کہ جیرارڈ نروس ہو گیا ہے۔ شاید صوفیہ کو بھی احساس ہو گیا تھا۔ وہ پوچھ بیٹھی۔

’’جیرارڈ کے پاپا نے کیا کیا تھا؟‘‘

’’کرنے کی بات نہیں ہے...... سوال یہ ہے کہ وہ کیا جانتا تھا؟‘‘

اچانک جیرارڈ مڑا اور واپس صوفیہ کے پاس آ گیا۔

’’نہیں جانتا ہے۔‘‘ اس نے خشک آواز میں کہا۔

اس مرتبہ وہ سب گاڑی میں ساحل کے متوازی سفر کر رہے تھے۔ جا بجا زیتون کے درخت تھے۔

’’پاپا انگریزی نہیں جانتے۔‘‘ جیرارڈ نے کہا۔ ’’مجھے تمہاری باتوں کی وضاحت کرنی پڑے گی۔ نہیں معلوم انہیں یاد بھی ہے؟‘‘

’’انہیں یاد ہونا چاہیے۔‘‘ رچرڈ نے کہا۔ ’’جس وجہ سے اُن کو پیرس چھوڑنا پڑا، وہ وجہ یاد ہوگی۔‘‘

’’بیس سال، ایک مدت ہوتی ہے۔‘‘ جیرارڈ بولا۔

’’تمہیں کیا یاد ہے؟ تم شاید اس وقت سولہ سال کے ہو گے؟‘‘ برنیڈا نے سوال کیا۔

’’سولہ نہیں، پندرہ سال......‘‘

’’پھر یقیناً تم ’’66، ریو میراج‘‘ کو نہیں بھولے ہو گے۔‘‘

جیرارڈ کی گرفت اسٹیرنگ وہیل پر سخت ہو گئی۔

’’ہاں، ہم وہاں رہتے تھے۔ قتل کے بعد پولیس ایک ہفتے تک روزانہ آتی رہی۔ وہ پاپا سے سوالات کرتے تھے۔‘‘

’’تمہیں وہ عورت یاد ہے...... جس نے اسکار لیٹی کے نام سے فلیٹ کرائے پر حاصل کیا تھا؟‘‘ رچرڈ نے استفسار کیا۔

’’ہاں، وہ ہر بدھ کو وہاں آتی تھی۔ ایک آدمی بھی اُس سے ملنے آتا تھا...... میں دروازے سے سنتا تھا لیکن ان کی عجیب آوازیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔‘‘

برنیڈا کچھ کہتے کہتے رک گئی...... کیا یہ سچ ہے کہ اُس کی ماں وہاں اپنے آشنا سے ملنے آتی تھی؟

’’ان دونوں کا حلیہ کیسا تھا؟‘‘ رچرڈ نے سوال کیا۔

’’اتنا یاد ہے کہ آدمی دراز قامت تھا۔‘‘

"عورت؟"

"وہ ہمیشہ اسکارف اور سن گلاسز کے ساتھ آتی تھی اور بہت خوب صورت تھی۔"

"کیا وہ انگریز تھی؟" برنیڈا نے سوال کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رچرڈ نے جیرارڈ کو تعاون پر کیسے آمادہ کیا۔

جیرارڈ نے وقفے سے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے، وہ انگریز تھی۔"

"کیا تمہیں یقین نہیں ہے؟"

"اُس وقت میں کم عمر تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ غیر ملکی ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا تعلق کس ملک سے ہے۔ قتل کے بعد مجھے پتا چلا کہ وہ انگریز تھی۔"

"واردات کے بعد تم نے انہیں دیکھا تھا؟"

جیرارڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ "پاپا نے اجازت نہیں دی تھی۔"

"یعنی تمہارے پاپا نے سب سے پہلے لاشوں کو دیکھا تھا؟" رچرڈ بولا۔

"نہیں۔ سب سے پہلے اُس آدمی نے دیکھا تھا۔"

رچرڈ نے حیرت سے گردن گھمائی۔ "کس آدمی نے؟"

"وہ جو اسکارلیٹی سے ملنے آتا تھا۔ ہمارے سامنے وہ اوپر گیا پھر چلاتا ہوا واپس بھاگا۔ اس وقت ہمیں گڑبڑ کا اندازہ ہوا اور پاپا نے پولیس کو فون کر دیا۔"

"اس آدمی کا کیا ہوا؟"

"وہ پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ وہ خوف زدہ تھا، کہیں الزام اس پر نہ آجائے اسی لیے اس نے رقم بھیجی تھی۔"

"خاموشی کی قیمت۔" برنیڈا کی سرگوشی سنائی دی۔

"یا جھوٹی گواہی؟" رچرڈ نے کہا۔ "رقم کیسے پہنچائی گئی؟"

"پولیس کے آنے سے پہلے ایک آدمی بریف کیس میں لایا تھا۔ میں نے پہلے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ پستہ قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ میرے پاپا کو وہ دوسرے کمرے میں لے گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کیا بات ہوئی...... پھر وہ چلا گیا۔"

"تمہارے پاپا نے نہیں بتایا؟"

"نہیں، انہوں نے مجھے بھی حکم دیا تھا کہ میں اس معاملے میں بالکل خاموش رہوں۔"

"تمہیں کیسے علم ہوا کہ بریف کیس میں رقم تھی؟"

"صاف ظاہر تھا...... فوراً ہی ہمارے حالات بدلنے شروع ہو گئے۔ نئی چیزیں آنے لگیں اور پھر ہم یونان آ گئے۔ یہاں ہم نے ولا بھی خرید لیا۔" اس نے گاڑی آہستہ کرتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ ولا کی چھت سرخ ٹائلوں سے مزین تھی۔ دیواروں کا رنگ سفید تھا۔ جیرارڈ نے گاڑی گرد آلود سیڈوان کے قریب پارک کر دی۔ ولا کے آس پاس کوئی دوسرا گھر نہیں تھا۔ عمارت بنجر پہاڑی کی ڈھلوان پر ایستادہ تھی۔ وہ سب گاڑی سے اتر گئے۔

جیرارڈ نے پتھریلی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے آواز لگائی۔ "پاپا!" آہنی گیٹ کھول کر وہ آگے بڑھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پھر آواز لگائی اور دروازہ دھکیلا۔ برنیڈا اور رچرڈ اس کے پیچھے تھے۔ دوسری بار بھی کوئی جواب نہیں آیا۔

"صبح سے میں نے یہیں پر فون کیا تھا۔" صوفیہ نے بتایا۔

"گاڑی باہر کھڑی ہے۔ پاپا کو گھر پر ہونا چاہیے۔" جیرارڈ بولا۔ لیونگ روم کراس کر کے وہ ڈائننگ روم کے در پر آیا۔ "پاپا؟" وہ وہیں رک گیا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہوئی۔ اس نے قدم بڑھایا...... یوں لگا جیسے وہ گھٹنوں کے بل گرنے والا ہے۔ برنیڈا نے ڈائننگ روم کا منظر دیکھا۔ روم کی لمبی اور وزنی ٹیبل کے ایک سرے پر سفید بالوں والے شخص کا سر میز پر رکھی ڈنر پلیٹ میں تھا۔ پلیٹ کی اشیائے طعام کا کچھ حصہ میز پر بکھرا ہوا تھا۔ رچرڈ، جیرارڈ کے قریب سے ہوتا ہوا ٹیبل پر پہنچا۔ اس نے آہستگی سے عمر رسیدہ شخص کا سر اوپر کیا۔ وہاں موجود تمام افراد نے دیکھا کہ معمر شخص کی پیشانی میں ایک سرخ گول سوراخ تھا۔

☆☆☆

ایمل فوش، آؤٹ ڈور کیفے کی میز پر مشروب کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اطراف میں اور میزوں پر سیاح موجود تھے۔ گھڑی پانچ بجا رہی تھی۔ آخری پبلک فیری، "پیریس" کے لیے نصف گھنٹے میں نکلنے والی تھی۔ اگر لڑکی نے جزیرہ آج رات چھوڑ دینا ہے تو اسے ساڑھے پانچ بجے والی فیری پر ہونا چاہیے۔ ایمل فوش نے سیاحوں کے علاوہ فیری پر بھی نظر رکھی ہوئی تھی۔ جیرارڈ کا باپ ایک آسان ٹارگٹ ثابت ہوا تھا۔ ایک تو وہ ولا سنسان جگہ پر تھا۔ دوسرے ٹارگٹ تنہا اور کمزور تھا لیکن وولف اور برنیڈا کا معاملہ اتنا سادہ نہ تھا۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ ولا پر ہی گھات لگا کر دونوں کا قصہ پاک کر دے لیکن ولا کی لوکیشن اس کے لیے موزوں نہیں تھی۔ گاڑی وہ اریب قریب نہیں چھپا سکتا تھا۔ وہ فوراً نظروں میں آجاتی۔ خود بھی نظر میں آئے بغیر گھات لگانا مشکل تھا اور وہ اپنا اصول

نہیں توڑ سکتا تھا۔ فرار کا محفوظ راستہ...... یہ اصول اس نے کبھی نہیں توڑا تھا۔ ایسی بے تکی جگہ پر رچرڈ وولف کو نشانہ بنانے کی کوشش بذاتِ خود ایک بہت بڑی حماقت ہوتی۔

فوش بزدل نہیں تھا لیکن وہ احمق بھی نہیں تھا۔

مناسب موقع کا انتظار ہی بہتر تھا۔ ''پیریس'' کی مصروف سڑکیں اور ہجوم بھی ایک اچھی جگہ تھی۔ وہاں دو سیاح مارے جاتے تو کوئی خاص ہلچل پیدا نہیں ہوئی تھی۔

آخری فیری پورٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ فوش چوکس ہو گیا۔ اترنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ جزیرہ پاروس سے جانے والے جمع ہو رہے تھے۔ تاہم یہ بھی تھوڑی تعداد میں تھے۔ ایمل فوش، بغور جانے والے گروپ کا جائزہ لے رہا تھا۔ دونوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا۔ فوش جانتا تھا کہ اس روز دونوں پاروس آئے تھے۔ پاروس میں موجود رابطے نے یہی اطلاع دی تھی۔ رابطہ کار نے دونوں کو ایک پب میں بھی دیکھا تھا۔ فوش سوچ رہا تھا، کیا دونوں کسی اور راستے سے نکل گئے یا یہیں پر رکے ہیں؟ دفعتاً اس کی نظروں نے ایک مرد کا نوٹس لیا۔ اس نے جیکٹ کے ساتھ ماہی گیروں والی سیاہ کیپ لگائی ہوئی تھی۔ اگرچہ اس کے شانے جھکے ہوئے تھے۔ تاہم قد کا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کم از کم چھ فٹ۔ قدبت اور چال مضبوط تھی۔ سائڈ سے چہرے کی جھلک ایک سیکنڈ کے قریب تھی، فوش کے لیے کافی تھی۔ وہ رچرڈ وولف ہی تھا۔ پریشان کن بات یہ تھی کہ وہ اکیلا تھا۔

فوش نے ادائیگی کی اور مسافروں میں گھل مل گیا۔ اس کی نگاہ تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ رچرڈ کو نظر انداز کیے بغیر اس نے کسی عورت اور لڑکی کا چہرہ نہیں چھوا لیکن برنیڈا ٹراوسٹوک غائب تھی۔ اس نے اضطراب محسوس کیا۔ کیا دونوں علیحدہ ہو گئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو نیا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ لڑکی کو تلاش کرنے کے لیے اسے جزیرے پر رکنا پڑے گا۔ اس کا دماغ برق رفتاری سے کام کر رہا تھا...... اس نے وولف کے پیچھے رہنے کا فیصلہ کیا جو چیز سامنے ہے، اس کے ساتھ رہنا بہتر ہے۔ جلد یا بدیر وولف دوبارہ لڑکی سے ملے گا۔ اس وقت تک فوش اپنی چال نہیں چلے گا......

فوش، رچرڈ کے عقب میں نشستوں کی دو قطاریں چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد فیری کے انجن بیدار ہوئے اور اس نے ڈاک سے کھسکنا شروع کیا۔ فوش کی نگاہ ٹوپی پر تھی۔ ایندھن اور خشک مچھلیوں کی بو بری لگ رہی تھی۔ فوش اٹھ کر ریلنگ پر گیا اور گہرے گہرے سانس لیے۔ چند منٹ بعد پلٹا اور اپنی نشست پر جاتے ہوئے سیاہ ٹوپی والے کے پاس سے گزرا۔ جیکٹ، کیپ وہی تھی...... قد کاٹھ بھی وہی تھا۔ لیکن چہرہ؟ وہ رچرڈ وولف نہیں تھا۔

فوش نے دانت پیستے ہوئے اطراف میں نظر دوڑائی۔ رچرڈ کہیں نہیں تھا۔ وہ ڈیک پر آیا پھر سیڑھیاں چڑھ کر فیری کی دوسری منزل پر آیا۔ وولف نہیں تھا۔ اس نے مڑ کر جزیرے کی طرف دیکھا جو لحظہ بہ لحظہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ فوش کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اس نے خود کو کوسا۔ یہ جھانسا تھا۔ وہ دونوں جزیرے پر ہی تھے۔ خود وہ یہاں پھنس گیا تھا۔ وہ پرانا کھلاڑی تھا۔ وولف کی نشست پر جو بھی بیٹھا تھا، اس سے سوال جواب کرنا فضول تھا۔ رچرڈ نے جگہ بدلنے کے لیے اسے پیسے دے کر فیری پر سوار کرایا ہو گا۔ فوش کو اب پیریس پہنچ کر بوٹ کے ذریعے واپس آنا پڑے گا۔ اس نے گھڑی دیکھ کر گھنٹوں کا حساب لگایا۔ اگر وہ خوش قسمت رہا تو رات ہی رات میں واپس آ جائے گا۔ اس نے قسم کھائی کہ دوسری رات سے پہلے دونوں کو ٹھکانے لگا دے گا۔ ''اگر وولف پروفیشنل ہے تو میں بھی اناڑی نہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔

☆☆☆

رچرڈ نشست پر چند سیکنڈ بیٹھ کر ہی اٹھ گیا۔ ٹوپی اور جیکٹ اتار کر اس نے سیٹ پر چھوڑی اور ڈیک پر پڑے کریٹس کے عقب میں دبک گیا۔ فوراً ہی صوفیہ کے بھائی نے جیکٹ چڑھا کر ٹوپی پہنی اور رچرڈ کی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کا قد چھ فٹ ایک انچ تھا۔ یہ حکمتِ عملی انہوں نے پہلے ہی ترتیب دے لی تھی۔ صوفیہ کے بھائی نے ٹوپی جھکائی اور دونوں بازوؤں میں سر رکھ کر بالائی دھڑ اگلی نشست پر لٹکا دیا۔ بنظرِ غائر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اونگھ رہا ہے...... رچرڈ اپنی کمین گاہ سے مسافروں کو آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ بعد فوش نظر آیا۔ وہ رچرڈ کی نشست پر نگاہ ڈالتا ہوا عقب میں دو قطار پیچھے بیٹھ گیا۔ بعد ازاں رچرڈ نے نیلے رنگ کی ٹوپی نکالی، سر پر جمائی اور احتیاط سے آڑ لیتا ہوا فیری سے اتر گیا...... کچھ دور جانے کے بعد وہ صوفیہ کی کار میں بیٹھ رہا تھا۔ چھ میل سفر کے بعد وہ ''میلینا'' پر سوار ہو گئے۔ میلینا، ان کی فشنگ بوٹ کا نام تھا۔ برنیڈا، بے چینی سے رچرڈ کا انتظار کر رہی تھی۔

رچرڈ نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ ''سب ٹھیک ہو گیا۔'' اس نے برنیڈا کے کان میں سرگوشی کی۔

''میں خوف زدہ تھی۔'' برنیڈا نے اس کے سینے میں چہرہ چھپا لیا۔ اس کے بال سمندری ہوا میں لہرا رہے تھے۔ بوٹ اسٹارٹ تھی۔ صوفیہ اور رچرڈ کے آتے ہی اس نے سمندر میں راستہ بنایا۔

''تم نے اُسے پہچانا کیسے تھا؟'' برنیڈا نے الگ ہو کر سوال کیا۔

''بیس سال پہلے جس شخص نے جیرارڈ کی فیملی کو رشوت دی تھی، تمہیں یاد ہے جیرارڈ نے اس کا حلیہ بتایا تھا اور پیرس کے پارک میں جو آدمی ہمارے پیچھے لگا تھا، اس کا حلیہ میرے ذہن میں تھا۔ دوسرے، فرنچ ایجنٹ کولیٹ اور جیرارڈ کے باپ کا قتل ایک ہی انداز میں ہوا۔ اور مجھے یقین ہے کہ پیرس کے ہوٹل میں تم پر فائرنگ کرنے والا بھی یقیناً یہی شخص تھا۔ تیسرا اس کا انداز، اس کی نگاہیں...... وہ وہاں تفریح نہیں کر رہا تھا بلکہ کسی کو کھوج رہا تھا۔ ہم دونوں بھی اس کا ہدف تھے۔ اسے خبر تھی کہ ہم 66، ریو میراج کے مالک کے پیچھے یونان آئے ہیں۔ وہ پروفیشنل ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ میری وجہ سے اس نے تمہیں یا ہم دونوں کو ولا پر ختم کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ ولا کی لوکیشن ایسی ہے کہ اس کی جگہ میں ہوتا، میں بھی کسی اور جگہ کا انتخاب کرتا۔ جیرارڈ کے پاپا سے فارغ ہو کر اس نے ٹھیک سوچا ہوگا کہ ہماری دلچسپی جزیرے پر ختم ہو جائے گی اور ہم ''پیریس'' کی فکر کریں گے۔ آج ہی واپس جائیں گے تو اسی ساڑھے پانچ بجے والی فیری کو پکڑیں گے۔ لہٰذا اُس نے فیری پر اور اس کے اطراف میں نظر رکھنی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اسے پورٹ کے قریبی کیفے میں ہونا چاہیے تھا۔ خطرہ صرف اتنا تھا کہ کہیں وہ پہلے مجھے نہ دیکھ لے۔ یہاں میں خوش قسمت رہا کہ پہلے اسے پہچان گیا اور جو منصوبہ ترتیب دیا، وہ تمہارے سامنے تھا۔''

''اب وہ کیا کرے گا؟''

''اب وہ بے بس ہے کہ فیری کا سفر مکمل کرے اور پرائیویٹ بوٹ پر فوراً ہی پلٹنے کی کوشش کرے کیونکہ وہ فریب کھا گیا ہے اور سمجھ بھی گیا ہے۔ اس کی دانست میں ہم جزیرے پر ہیں...... اس لیے واپس آئے گا۔''

''یوں لگتا ہے، میں تم سے نہیں قاتل سے باتیں کر رہی ہوں۔''

''تم نے کبھی شطرنج کھیلی ہے؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔

''نہیں۔''

''یہ شطرنج کا کھیل ہے۔ اس کھیل میں حریف کے دماغ میں بیٹھنا پڑتا ہے۔''

''پھر ہم ابھی تک ناکام کیوں ہیں؟ جیرارڈ کے پاپا کے قتل کے بعد پھر سے اندھیرے میں چلے گئے ہیں؟''

''ہم ناکام نہیں ہیں۔ بس کامیابی سے کچھ دور ہیں۔ ناکام وہ ہیں۔ اب تک تم دونوں کو ختم کرنے کی اُن کی ہر کوشش ناکام ہوئی ہے۔ وہ کوشش میں لگے ہیں اس لیے کہ وہ خوف زدہ ہیں۔''

''تم پریشان تو نہیں ہو؟'' برنیڈا، صوفیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

''مجھے جیرارڈ کی فکر ہے۔ وہ لوگ کہیں اُسے بھی......''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔ ''بیس سال پہلے وہ بچہ تھا۔ اس کی بات یا شہادت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

صوفیہ خاموش ہو کر دونوں بھائیوں کو دیکھنے لگی جو بے فکری سے گپ لگاتے ہوئے بوٹ بھگا رہے تھے۔

''کیا واقعی جیرارڈ کے مطابق بریف کیس میں رقم تھی؟'' اچانک برنیڈا نے سوال کیا۔

''رقم تو ری ڈیو کو دی گئی تھی...... ہاں یہ ممکن ہے کہ بریف کیس میں کچھ اور بھی ہو۔'' رچرڈ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اسکارلیٹی کا معاملہ پُراسرار ہے۔ ہر مرتبہ اسکارف اور چشمے کا مطلب؟ نیز اس کا آشنا دوہری مصیبت میں پڑ گیا تھا۔ پہلی مصیبت یا کرائسس...... فلیٹ میں دو لاشیں، اس نے رقم کے ذریعے ری ڈیو فیملی کا منہ بند کر کے اس کرائسس سے جان چھڑائی۔''

''اور دوسرا کرائسس؟''

''ڈیفی...... بطور ڈبل ایجنٹ اس کی پوزیشن۔ ممکن ہے اسے خبر مل گئی ہو کہ اس کا راز فاش ہونے والا ہے۔ چنانچہ اس نے نیٹو کی دستاویزات بھی بریف کیس میں رکھ دیں۔ رقم ری ڈیو کے پاس گئی اور دستاویزات پولیس کے ہاتھ لگیں۔ بروسرڈ ہمیں اشاروں سے بریف کیس کے بارے میں ہی بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مرڈر سین کے فوٹو میں بریف کیس نظر نہیں آ رہا۔ کیا کہہ سکتے ہیں اگر بریف کیس بعد میں رکھا گیا ہو اور انسپکٹر بروسرڈ کو یاد ہو......''

''لیکن بروسرڈ نے اس معاملے کو آگے نہیں بڑھایا۔ کیونکہ فرنچ انٹیلی جنس نے کیس کلوز کر دیا تھا؟'' برنیڈا نے کہا۔

''بالکل ٹھیک۔''

''انہوں نے فرض کر لیا کہ میرے والد دستاویزات وہاں لائے تھے لیکن ہم کیسے ثابت کریں؟'' برنیڈا نے مایوسی سے کہا۔

''اسکارلیٹی کا نامعلوم آشنا بتائے گا۔''

''کون ہے وہ؟'' برنیڈا ششدر رہ گئی۔

''اس کے لیے ہمیں مشرقی جرمنی جانا پڑے گا۔''

''تم جانتے ہوا ئے سے؟''

''نہیں، جاننے کے لیے ہی وہاں جانا پڑے گا۔''

☆☆☆

جارڈن کے ساتھی قیدیوں کے نام لی رائے اور فوفو تھے۔ دونوں کے ساتھ اس کی اچھی گھٹنے لگی تھی۔ انہوں نے سیل میں جوا کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ کھل کر رقم لگائی جاتی تھی کیونکہ ادائیگی کے لیے پرچیاں استعمال ہوتی تھیں جن پر ہندسے لکھ دیے جاتے۔ ہنسی ہنسی میں بعض اوقات داؤ کروڑوں تک چلا جاتا۔

اس وقت بھی یہی شغل جاری تھا۔ جب قدموں کی آہٹ نے خلل پیدا کیا...... سیل کے باہر ریگی وان باسکٹ لیے کھڑا تھا۔

''یہ اشیا خاص طور پر ہیلن نے بھجوائی ہیں...... آج سالمن بھی ہے۔'' ریگی نے کہا۔

''آپ واقعی ایک سچے دوست ہیں۔'' جارڈن کھڑا ہو گیا۔ ریگی نے دانتوں کی نمائش کی۔

''انکل ہیو کا کچھ پتا چلا؟''

ریگی نے مردہ سی آواز میں مژدۂ ناکامی سنایا۔

''کمال ہے۔'' جارڈن نے باسکٹ نیچے رکھ دی۔

''میں یہاں پڑا ہوں۔ برنیڈا غائب ہے اور انکل ہیو......'' وہ سیل کا چکر کاٹنے لگا۔ لی رائے اور فوفو ندیدی نظروں سے باسکٹ کو تک رہے تھے۔

جارڈن نے ماری کیس کے بارے میں پوچھا۔ ریگی کے مطابق اس میں بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔

''لیکن اس کے بارے میں ایک افواہ گردش کر رہی ہے۔''

''کیسی افواہ؟''

''عجیب سی بات ہے۔ افواہوں کی بنیاد بھی ہیلن ہی ہے...... مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ یہ افیئر سے متعلق ہے۔'' ریگی نے ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا۔

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''فلپ اور نینا کا افیئر......''

''اوہ...... یہ محرک ہے۔ جارڈن نے سوچا۔ ''افیئر کب سے تمہارے علم میں ہے؟''

''یہ افواہ پندرہ بیس سال پہلے میرے کان میں پڑی تھی۔ اس کے بعد ہی مجھے سمجھ آیا کہ ہیلن کیوں نینا کو ناپسند کرتی ہے۔ بلکہ نفرت کرتی ہے۔ پہلے میں سمجھا تھا کہ یہ محض عورتوں والا حسد ہے...... افیئر کی بات بعد میں سنی گئی......''

''ہیلن کو کیونکر علم ہوا؟''

''ماری نے بتایا تھا۔'' ریگی نے کہا۔

''اور کون کون جانتا ہے؟''

''ماری بے چاری تو خاموش رہتی ہے پھر بھی میرا خیال ہے کہ کافی لوگ جانتے ہیں۔'' ریگی نے جواب دیا۔

''پھر بھی وہ اب تک اس رشتے سے جڑی ہے؟''

''وفا ہے شاید...... اور فائدہ بھی کیا؟ بات پھیل جائے گی۔ ہاں فلپ کا کیریئر برباد ہو سکتا ہے۔ وہ وزیرِ مالیات ہے اور بظاہر مزید آگے بڑھتا نظر آ رہا ہے۔ ماری اس کی مضبوط پوزیشن میں قانونی شریک ہے۔''

''کیا تم یہ نہیں کہہ رہے کہ فلپ اپنی ہی بیوی کو قتل کروا سکتا ہے...... شاید ماری نے اسے وارننگ دی ہو کہ مسٹریس ایک کو چن لے...... نینا یا ماری۔ کیونکہ فلپ پرائم منسٹر کی نشست سے زیادہ دور نہیں ہے۔'' جارڈن نے خیال آرائی کی۔

ریگی سوچ میں پڑ گیا۔ ''اگر وہ نینا کا انتخاب کرتا ہے تو ماری سے جان چھڑانی پڑے گی۔''

''آہ، لیکن اگر اس کے برعکس ہوا تو نینا کیا کرے گی؟''

دونوں ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

''کاسمک سولیڈیرٹی، کاسمک اسکرین ہے...... بم کا تعلق سیاست سے نہیں ہے۔ یہ ذاتی معاملہ ہے۔'' جارڈن نے کہا۔

☆☆☆

برلن کی فلائٹ میں نصف مسافر تھے۔ دونوں فرسٹ کلاس میں تھے۔ جبکہ دونوں کی خستہ حالی فرسٹ کلاس سے میچ نہیں کر رہی تھی۔ فضائی میزبان نے ان کی فرمائش معلوم کی۔

''بلڈی میری۔'' برنیڈا نے کہا۔

''راب رائے۔'' رچرڈ نے کہا۔ ساتھ ہی لذیذ اشیائے طعام کا ڈبل آرڈر بھی دیا۔

تھکے ماندے بچوں کی طرح سو گئے۔ دونوں برلن پہنچنے تک سوتے رہے۔ فلائٹ اٹینڈنٹ بارہا انہیں دیکھ چکا تھا۔ فرسٹ کلاس کے مسافر اس حلیے میں سفر نہیں کرتے...... وہ دونوں سب سے آخر میں اترے۔ وہ ویٹنگ ایریا کی طرف جا رہے تھے۔ اٹینڈنٹ اُن کے پیچھے تھا۔

معاً دو افراد نمودار ہوئے اور اُن کا راستہ روک لیا۔ وہ ٹھٹک کر گھومے جیسے واپس جہاز کی طرف جانا چاہتے ہوں۔ تین مزید آدمی کہیں سے ٹپکے...... دونوں گھر چکے تھے۔ برنیڈا گھبرائی ہوئی تھی۔ اٹینڈنٹ کو یقین ہوگیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

رچرڈ اور برنیڈا کو ایک ایسے کمرے میں لے جایا گیا جہاں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ دروازہ بند ہوگیا۔

''وہ ہمارا انتظار کررہے تھے۔ انہیں کیسے معلوم ہوا؟'' برنیڈا نے سوال کیا۔

رچرڈ پریشانی کے عالم میں کمرے میں چکرانے لگا۔

''کسی طرح انہیں خبر ہوگئی...... ٹکٹ ہم نے کیش پر لیے تھے۔ پھر انہیں کیونکر علم ہوا۔ دوسرے وہ ائرپورٹ گارڈز تھے۔ اگر ان کو ہمیں ہلاک کرنا ہوتا تو گرفتار نہ کرتے؟''

''تمہارے سر بچانے کے لیے ہی تمہیں گرفتار کیا گیا ہے۔'' ایک شناسا سا آواز نے انہیں متحیر کردیا۔ برنیڈا ایڑیوں پر گھومی۔ دروازہ کھول کر انکل ہیو اندر داخل ہورہے تھے۔

''انکل؟'' وہ منہ کھولے حیرت سے انکل ہیو کو دیکھ رہی تھی۔ رچرڈ کی آنکھوں میں بھی استعجاب تھا۔

''یہ کیا حلیہ ہے تمہارا؟ خانہ بدوش لگ رہی ہو؟'' انکل نے برنیڈا سے کہا۔

''یونان کے چھوٹے چھوٹے ٹاؤنز میں ہم کریڈٹ کارڈز استعمال نہیں کرسکتے تھے۔ وہاں بیشتر سفر لفٹ لے کے کیا ہے۔'' رچرڈ نے بتایا۔

''بہرحال برلن پہنچ گئے تم۔''

''مگر...... آپ یہاں؟''

''دعوتیں نہیں اُڑا رہا...... یہاں میں تمہارے اگلے مشن کے لیے کام کررہا تھا۔ فی الحال دونوں ہوٹل جاکر حلیہ درست کرو، باہر کار کھڑی ہے۔ پھر ہم تمہارے قیدی ہینریچ لیٹزر سے ملتے ہیں۔''

''کیا کلیئرنس مل گئی؟'' رچرڈ کو ایک بار پھر حیرت کا سامنا تھا۔

''نہیں، میں یہاں مچھلیاں پکڑنے آیا تھا۔'' انکل ہیو کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

ہوٹل کے سوئٹ سے نہا دھو کر دونوں نے بہترین لباس زیب تن کیے۔ بعدازاں وہ انکل کے ہمراہ لیموزین میں روانہ ہوئے۔

''کیا وہ سچائی اگل دے گا؟'' رچرڈ نے استفسار کیا۔

''ہم نہیں جانتے۔'' ہیو نے کہا۔ ''ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کتنا بتائے گا۔ وہ پیرس آپریشنز کو مشرقی برلن سے دیکھتا تھا۔ وہ مختلف کوڈ نیم جانتا تھا لیکن چہروں سے ناآشنا تھا۔''

''یعنی، ممکن ہے...... ہمیں مطلوبہ جواب نہ ملے؟'' رچرڈ نے کہا۔

''ہاں، یہی تمام دشواریاں بیس سال پہلے بھی تھیں جو وقت گزرنے کے ساتھ مزید گمبھیر ہوگئی ہیں۔ اگر اس نے تعاون کیا تو شاید کچھ ہاتھ آجائے۔''

رچرڈ خاموش ہوگیا۔

قید خانے کی سیکیورٹی توقع سے زیادہ سخت تھی۔ اگر انکل ہیو نے پیش بندی نہ کی ہوتی تو وہاں داخل ہونا محال تھا۔ وہاں انکل ہیو کی آمد متوقع تھی۔ وہ تینوں، مختلف رکاوٹوں، چیک پوائنٹس سے گزرتے رہے۔ پُراسرار، آسیب زدہ سرد جنگ کے دشمن کی سرزمین کے نیم تاریک قید خانے میں آمد ایک عجیب تر تجربہ تھی۔ کمانڈنٹ آفس پر شائستگی کا مظاہرہ ہوا۔ انہیں گرما گرم چائے پیش کی گئی۔ سگار ہیو نے قبول کرلیا۔ رچرڈ نے نرمی سے انکار کردیا۔

''اب تک لیٹزر سب سے زیادہ اڑیل ثابت ہوا ہے۔'' کمانڈنٹ نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس بات سے ہی انکاری تھا کہ پیرس آپریشن میں اس کا کوئی رول تھا لیکن ہمارے پاس کافی ثبوت موجود ہیں۔''

''لیٹزر نے کوئی نام افشا کیا تھا؟'' رچرڈ نے پوچھا۔

کمانڈنٹ نے رچرڈ کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''تم CIA میں تھے مسٹر وولف؟''

رچرڈ نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ ''عرصہ ہوا میں لاتعلق ہوں۔''

''لیکن تم جانتے ہو کہ کس کے ماضی کو کیسے استعمال کیا جاتا ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں۔'' رچرڈ نے تردید نہیں کی۔ ''لیٹزر پہلے ہی قید میں ہے۔ اس کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں۔ اگر وہ ماضی کی چند باتیں ہمیں بتادے۔''

''ہاں، لیکن وہ ساتھی جو ڈبل ایجنٹ کے طور پر کام کررہے تھے اور اب تک غائب ہیں، ان کے پاس کھونے کے لیے سب کچھ ہے۔ سرد جنگ کے اختتام پر مشرقی جرمنی کی فائلز کھل گئی ہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی ان فائلوں میں سچائی کی تلاش کے لیے جاتا ہے۔ کوئی اپنے دوست کے لیے، کوئی محبوب کے لیے، کوئی شوہر کے لیے...... یہی وجہ ہے کہ لیٹزر ڈبل ایجنٹس کے نام دینے میں ہچکچاتا ہے۔ وہ اپنے پرانے ساتھیوں کا تحفظ چاہتا ہے۔'' کمانڈنٹ نے وضاحت کی۔

''لیکن وہ آج کل تعاون پر آمادہ ہے؟''

''ہاں، مسٹر ہیو کو میں نے بتایا تھا کہ کچھ عرصے سے اس کی کیفیت بدلی ہوئی ہے۔''

''کیوں؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔

''کمزور دل، ڈاکٹروں کے مطابق دل اس کا ساتھ چھوڑ رہا ہے...... دو مہینے یا شاید تین مہینے......'' کمانڈنٹ نے شانے اچکائے۔ ''ٹیٹر کو احساس ہے کہ اختتام قریب ہے اور وہ آخری ایام میں چند سہولتوں کا متمنی ہے۔ جن کے عوض بات کرنے پر آمادہ ہے۔''

''اس کا مطلب وہ جواب دے سکتا ہے؟''

''اس کے موڈ پر ہے...... آؤ دیکھتے ہیں وہ کس موڈ میں ہے۔''

لیٹر کے سیل کی طرف جاتے ہوئے برنیڈا سوچ رہی تھی کہ اس جیل سے نکلنے کے لیے فرشتۂ اجل کا انتظار کرنا لازم ہے۔ وہ لوگ سیل نمبر 5 کے قریب رک گئے۔ جہاں دو گارڈز پہرا دے رہے تھے۔ دونوں کے پاس اپنی چابی تھی۔ دونوں نے علیحدہ لاک کھولے۔

اندر ایک عمر رسیدہ نحیف آدمی آرام دہ چرمی نشست میں بیٹھا تھا۔ کرسی کے قریب آکسیجن ٹینک رکھا تھا۔ وہ ناک کے نتھنوں میں ٹیوبز کے ذریعے سانس لے رہا تھا۔

''لارڈ لووٹ، انگلینڈ سے ملنے آئے ہیں۔'' کمانڈنٹ نے ہینریچ لیٹر کو مخاطب کیا۔ ''تم اس نام سے واقف ہو؟''

لیٹر نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ ''ایم آئی سکس۔'' اس کے ہونٹوں سے مدھم سرگوشی خارج ہوئی۔

''ہاں، اب میں ریٹائرڈ ہوں۔'' ہیو نے کہا۔

لیٹر نے رچرڈ اور برنیڈا پر نظر ڈالی۔

''یہ میری بھتیجی ہے۔'' ہیو نے پھر کہا۔ ''اور یہ رچرڈ وولف، میرا ساتھی۔''

لیٹر، رچرڈ کو دیکھ رہا تھا۔ ''CIA؟'' دوسری سرگوشی۔

''ہاں، میں بھی ریٹائرڈ ہوں۔'' رچرڈ نے بتایا۔

لیٹر ہولے سے مسکرایا اور خاموش رہا۔ تاہم اس کی آنکھوں میں سوال پوشیدہ تھا۔ معاً اس نے کھانسنا شروع کر دیا۔ ہیو نے اَن کہے سوال کے جواب میں کہا۔ ''پیرس میں ایک ڈبل ایجنٹ، جس کا کوڈ ڈیلفی تھا...... اس کی شناخت کے لیے آئے ہیں۔''

وہ خاموش رہا۔

''وہ تمہارے اور نیٹو کے درمیان ایک کڑی تھا۔ تمہیں یاد ہے؟''

''بیس سال ہو گئے۔ دنیا تبدیل ہو چکی ہے۔'' سرگوشی سنائی دی۔

''ہمیں صرف اُس کا نام چاہیے۔''

''تاکہ تم اسے بھی میری طرح پنجرے میں بند کر دو۔''

''نہیں۔'' رچرڈ بولا۔ ''تاکہ قتلِ عام رک جائے۔''

لیٹر کے تاثرات میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ ''کیسا قتلِ عام؟''

رچرڈ نے بتایا کہ پیرس اور یونان میں کیا ہوا......

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' لیٹر نے کہا۔

''کیوں؟''

''ڈیلفی سویا ہوا ہے۔ اُسے غیر فعال کر دیا گیا تھا۔''

''پھر قتل کی وارداتیں کیوں ہو رہی ہیں جو اسی کے ساتھ لنک ہیں۔''

''ایک منٹ۔'' ہیو نے کہا۔ ''سلانے کا مطلب مردہ تو نہیں ہے؟''

''وہ غیر فعال ہے۔ قتل کی وارداتوں سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔''

''شاید تم سچ نہیں بتانا چاہتے۔'' رچرڈ نے کہا۔

''یہ امکان ہمیشہ رہتا ہے۔'' وہ مسکرایا۔ اچانک وہ پھر کھانسنے لگا۔ اس مرتبہ کھانسی طویل تھی۔ آواز یوں آرہی تھی جیسے کوئی شخص ڈوب رہا ہو۔ سب خاموش تھے۔

سکون ملنے پر وہ بولا۔ ''ڈیلفی کرائے کا ایجنٹ تھا۔ اس کا نظریات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسے موٹی رقم مل رہی تھی۔''

''ادائیگی کب روکی گئی؟''

''جب بہت زیادہ افراد ملوث ہو گئے اور اُس کا راز خطرے میں پڑ گیا۔ اس نے اپنے تمام نشان مٹائے اور کام بند کر دیا۔''

''اسی لیے میرے والدین کو ہلاک کیا گیا؟'' برنیڈا پہلی مرتبہ بولی۔

لیٹر نے غور سے برنیڈا کی جانب دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے؟''

''برنارڈ اور میڈیلن ٹراوسٹوک، انہیں 66، ریو میراج، بگالی (پیرس) کے ایک فلیٹ میں قتل کیا گیا تھا۔''

''میری معلومات کے مطابق وہ ایک قتل اور خودکشی کا کیس تھا۔''

''یا ڈیلفی نے دونوں کو قتل کیا؟'' انکل ہیو نے کہا۔

''سچ یہ ہے کہ میں نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔''

''مطلب یہ کہ تم نے جو کچھ بتایا، اس میں سارا سچ نہیں ہے؟'' رچرڈ نے منطقی سوال اٹھایا۔

''بسا اوقات سچ، جھوٹ بن جاتے ہیں۔'' اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا اور کمانڈنٹ کی طرف دیکھا۔ ''مجھے آرام چاہیے۔''

''صرف ایک سوال۔ آخری بار۔'' رچرڈ نے کہا۔ ''کیا ڈیلفی مر چکا ہے؟''

لیٹز ر نے رچرڈ کی آنکھوں میں دیکھا۔ یوں لگا جیسے وہ حقیقت بتانے والا ہے۔ لیکن اس کے جواب نے سب کو اُلجھن میں ڈال دیا۔

''وہ سویا ہوا ہے۔''

''یعنی زندہ ہے؟''

''تمہاری سوچ کے مطابق۔'' لیٹز ر نے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

انہوں نے لیموزین میں گفتگو کرنا مناسب خیال نہیں کیا تھا۔ اس وقت تینوں ایک پُرہجوم ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ وہ سلیپر (Sleeper) کہنا چاہ رہا تھا۔'' رچرڈ نے کہا۔

''سلیپر؟'' برنیڈا نے ایک ابرو اچکایا۔

''مطلب، سیکرٹ ایجنٹ...... ایسا ایجنٹ جو لمبے عرصے کے لیے غیر فعال ہو۔ اس کو ہم لوگ ''سلیپر'' کی اصطلاح سے جانتے ہیں۔'' رچرڈ نے تشریح کی۔

''خوابیدہ حالت میں وہ ایجنٹ مخصوص جگہ پر نئی پوزیشن ڈویلپ کرتا ہے۔'' انکل ہیو نے اضافہ کیا۔ ''بوقتِ ضرورت سگنل ملنے پر وہ دوبارہ فعال ہوجاتا ہے۔''

''مطلب وہ زندہ ہے لیکن فعال نہیں ہے؟'' برنیڈا نے نتیجہ اخذ کیا۔

''ہاں...... تاہم اُس نے واضح انکار کیا ہے کہ پیرس میں ان دونوں کو اس نے ڈیلفی کے ذریعے قتل کرایا تھا۔''

''اگر بوقتِ ضرورت اسے ایکٹو کیا جاسکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ درمیانی وقفے میں اسے بااثر حیثیت میں ہونا چاہیے یا ایسی حیثیت کے قریب تر......''

''ٹھیک سمجھ رہی ہو۔'' رچرڈ نے تائید کی۔

''لیکن پھر یہ خون خرابا کیوں ہو رہا ہے؟''

''ظاہر ہے...... تم دونوں بہن بھائی اسے بے نقاب کرنے کے مشن پر ہو۔''

''اسٹیفن سدرلینڈ؟''

''لیکن وہ عرصہ پہلے خودکشی کر چکا ہے۔''

''فلپ سینٹ پیری، وہ اہم پوزیشن پر ہے اور وزیراعظم کی پوزیشن سے قریب تر ہے۔'' ہیو نے رائے دی۔

''میں کلاڈ سے کہتا ہوں کہ فلپ پر نظر رکھے۔''

''ساتھ ہی نینا پر بھی۔'' رچرڈ نے لقمہ دیا۔

''نینا؟''

''ہاں، اس کا دائرۂ اثر وسیع ہے۔ وہ بستر کے دونوں جانب سے خفیہ معلومات لے سکتی ہے...... فلپ سے اور ماری سے بھی۔'' رچرڈ نے کہا۔

''نینا کو میں نے ہمیشہ شک کے دائرے سے باہر رکھا لیکن اس مرتبہ یہ غلطی نہیں ہوگی۔'' انکل ہیو نے عندیہ دیا۔

☆☆☆

کلاڈ، تینوں کو لینے اورلی ائرپورٹ پہنچ گیا تھا۔ دورانِ سفر گفتگو جاری تھی۔ ''میں فلپ اور نینا کی سیکیورٹی فائلز دیکھ چکا ہوں۔'' کلاڈ نے بتایا۔ ''فلپ کی فائل صاف ہے...... اگر وہ سلیپر ہے بھی تو ہمارے پاس کوئی شواہد موجود نہیں ہیں۔''

''اور نینا؟''

کلاڈ نے گہری سانس لی۔ ''ہماری ڈیئر نینا آنٹی میں معمولی نقص نظر آتا ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے لندن اسٹیج پر ایک غیر اہم کردار سے ایکٹنگ کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت اس کا ایک ساتھی اداکار سے معاشقہ رہا۔ اس اداکار کا تعلق مشرقی جرمنی سے تھا۔ اداکار کا دعویٰ تھا کہ وہ وہاں سے فرار ہو کر نکلا ہے۔ تاہم تین سال بعد وہ اچانک غائب ہوگیا۔''

''وہ ریکروٹر ہوسکتا ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔

''امکان ہے۔''

''یہ معمولی افیئر، نینا کی تفتیش میں کیا مدد کرسکتا ہے؟'' برنیڈا نے سوال کیا۔

کلاڈ نے شانے اچکائے۔ ''جب نینا اور اسٹیفن سدرلینڈ کی شادی ہوئی تو اس نے اداکاری کو خیرباد کہہ کر سیاسی بیوی بننے کو ترجیح دی۔ اس کی کوئی آفیشل حیثیت نہیں تھی۔ اصولی طور پر بیگمات پر کوئی چیک نہیں ہوتا، خصوصاً امریکی ڈپلومیٹس کی بیگمات پر...... جس کا فائدہ نینا کو پہنچا۔ کیا فائدہ پہنچا۔ کیا کہہ سکتے ہیں۔''

''وہ اپنے شوہر کی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر نیٹو کی فائلز تک پہنچ سکتی تھی لیکن تمہارے پاس ثبوت نہیں ہے۔ نہ تم اُسے قاتل ثابت کرسکتے ہو۔''

''ایسا ہی ہے۔'' کلاڈ نے تسلیم کیا۔ ''اسٹیفن سدرلینڈ زندہ نہیں ہے اور نینا نے فلپ سے تعلقات بنا لیے ہیں۔ اگر

وہ سلیپر ہے تو یہ اس کی نئی پوزیشن ہے۔''

''اسے گھیرا بھی نہیں جاسکتا۔ وہ اداکارہ رہ چکی ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔

''ٹریپ تیار کرنا ہوگا۔'' کلاڈ نے تجویز دی۔

''کیسے، کسے چارہ بناؤ گے؟'' رچرڈ نے کلاڈ کو دیکھا۔

''جارڈن!''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' برنیڈا نے مداخلت کی۔

''وہ پہلے ہی تیار ہے۔ میری بات ہو چکی ہے۔ ہمارے آدمی ہر جگہ موجود رہیں گے، تیار حالت میں۔''

''وہ غلطی ہو سکتی ہے۔ وہ زخمی بھی ہوسکتا ہے۔'' برنیڈا کی تشویش قائم تھی۔

''ایسا جیل میں بھی ہوسکتا ہے...... اس طرح کم از کم کوئی جواب تو ملے گا۔''

برنیڈا نے رچرڈ، پھر انکل کو دیکھا۔ دونوں خاموش تھے۔ برنیڈا خاموشی کا مطلب سمجھ گئی۔ ''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس نے کلاڈ سے سوال کیا۔

''ڈیئر تم پیچیدگی کھڑی کر رہی ہو۔ تم پکچر سے باہر رہو۔ وان فیملی کے گھر تم محفوظ رہوگی۔'' انکل ہیو نے کہا۔

''کیا گارنٹی ہے؟'' برنیڈا اجزبز ہوگئی۔

''کوئی گارنٹی نہیں۔ گارنٹی چاہیے تو اس مشن سے ہاتھ اٹھالو اور واپس چلو۔'' انکل ہیو نے کہا۔

''برنیڈا یہ ہمارے پاس آخری موقع ہے۔ جارڈن کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں خود بھی ٹیم کے ساتھ رہوں گا۔'' رچرڈ نے یقین دہانی کرائی۔

''تم ساتھ رہو گے تو پھر میں تیار ہوں۔'' بالآخر برنیڈا نے آمادگی ظاہر کی۔

''فکر مت کرو۔'' رچرڈ نے دوبارہ اطمینان دلایا۔

''رگی اور ہیلن کیا جانتے ہیں؟'' برنیڈا نے استفسار کیا۔

''یہی کہ تمہیں ایک محفوظ جگہ مطلوب ہے...... اور وہ تیار ہیں، یقیناً یہ اُن کے پاس پرانی دوستی نبھانے کا ایک موقع ہے۔'' کلاڈ بولا۔

☆☆☆

کلاڈ اور ہیو باہر گاڑی میں بیٹھے تھے۔ برنیڈا کو رچرڈ سے بات کرنے کا موقع تک نہ ملا۔ تاہم رچرڈ نے رخصت ہوتے وقت اسے باہنوں کے حصار میں لے کر چوما۔

''تمہارے لیے بہترین محفوظ جگہ ہے۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''کچھ بھی ہوجائے، کمپاؤنڈ سے آگے مت جانا۔''

''مجھے تمہاری فکر ہے...... تم دونوں کی۔'' برنیڈا نے سسکی لی۔

''میں جارڈن کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔'' اس نے اعتماد سے کہا اور برنیڈا کے رخسار کو چھو کر روانہ ہوگیا۔

''رچرڈ، میں بھی ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' اس نے خود سے سرگوشی کی اور واپس گھر کے اندر چلی گئی۔

☆☆☆

''تو آپ لوگ تیار ہوگئے؟'' جارڈن نے کہا۔

''اور کوئی متبادل نہیں ہے۔'' انکل ہیو نے جواب دیا۔

گارڈ نے دروازہ کھولا۔ جارڈن اپنے ساتھی قیدیوں کو الوداع کہے بغیر نہیں جاسکتا تھا۔ وہ مڑا، فوفو اور لیرائے کے چہروں پر ہلکی سی اداسی تھی۔

''مجھے ڈر تھا کہ مجھے جانا ہوگا۔'' جارڈن مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا۔ ''میں تم دونوں کا مشکور ہوں۔'' اسے ان رسمی الفاظ کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ اس نے اپنی نفیس جیکٹ اتار کر فوفو کی جانب اچھال دی۔ ''تمہارے اوپر یہ فٹ رہے گی۔'' وہ ہاتھ ہلا کر سیل سے باہر آگیا۔ وہ سیدھے رٹز ہوٹل پہنچے تھے۔ اسی فلور پر۔ اگرچہ کمرا دوسرا تھا۔ جارڈن شاور لے کر مناسب حلیے میں آیا اور ایک سوٹ زیب تن کیا۔

''بلٹ پروف ونڈوز۔'' کلاڈ نے بتایا۔ ''سامنے والے کمرے میں مائیکروفونز...... ہال میں دو سادہ پوش ایجنٹ۔'' کلاڈ نے بریف کیس سے ایک آٹومیٹک پسٹل نکال کر جارڈن کے حوالے کیا۔

''کسی بھی غیر متوقع صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ تمہارے پاس ہو...... حفظِ ماتقدم...... استعمال آتا ہے؟''

جارڈن نے مہارت سے کلپ ہتھیار میں فٹ کیا اور رچرڈ کو دیکھا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''ریسٹورنٹ میں جاؤ۔ کھاؤ پیو، کچھ وقت گزارو، تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد تمہیں دیکھ لیں۔ پھر واپس کمرے میں آجاؤ۔''

''اس کے بعد؟''

''اس کے بعد ہم انتظار کریں گے، تمہارے پیچھے کون آتا ہے؟''

''کوئی آئے گا بھی؟''

''گارنٹی دیتا ہوں۔'' کلاڈ نے یقین کے ساتھ کہا۔

☆☆☆

تیس منٹ بعد ہوٹل کی ملازمہ کی جانب سے ایمل فوش نے کال وصول کی۔ یہ وہی ملازمہ تھی جس کی مدد سے ایک ہفتہ قبل وہ برنیڈا کے سوئٹ میں داخل ہوا تھا۔

”وہ واپس آ گیا ہے...... انگریز لڑکا۔“

”لیکن وہ تو قید تھا؟“

”میں نے اُسے تھوڑی دیر پہلے دیکھا ہے۔ وہ کمرا نمبر 515 میں اکیلا ہے۔“

فوش نے حیرت محسوس کی۔ یقیناً اس کی بااثر فیملی نے اپنے تعلقات استعمال کیے ہوں گے۔ وہ کوئی عام قیدی نہیں تھا۔ ”مجھے آج رات ہی اس کے کمرے میں گھسنا پڑے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ اِدھر اُدھر ہو جائے۔“ فوش نے ملازمہ سے کہا۔

”نہیں، میں نہیں کر سکتی۔“ وہ ہچکچائی۔ ”میری ملازمت بھی جا سکتی ہے۔“

”تم نے پہلے بھی کیا تھا۔ میں ڈبل معاوضہ دوں گا۔“

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

”پہلے لفافہ چھوڑ دو۔ پھر میں پاس کی دوں گی۔“

”منظور ہے۔“

بعدازاں فوراً ہی فوش نے انتھونی کو تازہ صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

”اس مرتبہ میں غلطی برداشت نہیں کروں گا۔ بلکہ میں خود وہاں موجود ہوں گا۔“ انتھونی نے کہا۔

”یہ دانشمندی کے خلاف ہوگا۔“ فوش نے اعتراض کیا۔

”ہم کب حرکت میں آئیں گے؟“ انتھونی نے سنی ان سنی کر دی۔

فوش نے بمشکل غصے پر قابو پایا۔ لڑکے کا ملوث ہونا فاش غلطی تھی۔ انتھونی کو تحمل چاہیے تھا۔ فوش جانتا تھا۔ پہلی ملاقات سے واقف تھا۔ لیکن کسی کی جان لینا ایک بالکل الگ معاملہ تھا۔ مرڈر۔ اور انتھونی اپنی مختلف ہیجانی کیفیات، جنس، اذیت پسندی، ایبنارمل مجسمہ سازی وغیرہ میں مرڈر کا اضافہ کرنا چاہتا تھا۔

بہرحال تھوڑی سی ردوکد کے بعد فوش راضی ہو گیا۔ وہ تو ایک مہرہ تھا۔ معاوضہ انتھونی ہی دیتا تھا۔

☆☆☆

ساڑھے گیارہ بجے جارڈن نے کمرے میں اندھیرا کر دیا۔ بستر پر سر کی جگہ تین تکیے رکھ کر کمبل کھینچ دیا۔ اس نے ایسا انداز اپنایا تھا کہ دیکھنے پر معلوم ہوتا جیسے بیڈ پر کوئی سو رہا ہے...... پھر وہ دروازے کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ دوسری طرف رچرڈ بیٹھا تھا۔ اندھیرے میں گھات لگائے، دونوں منتظر تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ دو گھنٹے بیت گئے۔ جارڈن بور ہو گیا...... دونوں نے کھسر پھسر شروع کر دی۔ پتا نہیں کتنی دیر دونوں سرگوشیاں کرتے رہے۔ دفعتاً دونوں خاموش ہو گئے۔ رچرڈ نے دروازے سے کان لگا دیا۔ ”کوئی کوریڈور میں ہے۔“ اس نے آخری سرگوشی کی۔ دونوں دروازے کے اطراف میں چوکس ہو گئے۔ ”کلاڈ کے آدمی کہاں ہیں، جو قاتل یہاں تک آ گیا؟“ جارڈن نے سوچا۔ اس نے تناؤ کی کیفیت محسوس کی۔

دروازے کے لاک میں چابی گھومی اور جارڈن منجمد ہو گیا۔ دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ اچانک دروازہ کھل گیا۔ وہ ایک نہیں دو تھے۔ دو سائے، باہر سے آنے والی روشنی میں ایک نے بستر کی جانب نشانہ باندھ کے دو فائر کیے۔ رچرڈ اپنی جگہ سے اچھلا اور دونوں کو لیتا ہوا زمین پر گرا۔

جارڈن نے گن دوسرے سائے کی پسلیوں میں گھسا دی۔ ”ہلنا مت۔“ اس نے غرانے کی کوشش کی۔ جارڈن حیران رہ گیا۔ جب اس نے دیکھا وہ ساکت ہونے کے بجائے کمرے سے نکل بھاگا۔ جارڈن بھی اس کے پیچھے لپکا تھا۔ اس وقت فرنچ ایجنٹ نمودار ہوئے اور مفرور کا راستہ روک لیا...... وہ مزاحمت کر رہا تھا۔ تاہم منٹوں میں اسے بے بس کر دیا گیا۔ جارڈن پلک جھپکائے بغیر اسے گھور رہا تھا۔

”انتھونی؟“

جارڈن نے مڑ کر دیکھا۔ رچرڈ گن مین کو اپنے آگے لگائے کمرے سے نکل رہا تھا۔ ”پہچانو اِسے؟“

”یہ جیل میں میرا جعلی وکیل بن کر آیا تھا۔“

رچرڈ نے اسے زمین بوس کر دیا۔ ”اس کی اصل شناخت معلوم کرتے ہیں۔ اگرچہ میں اسے پہچان گیا ہوں۔ یہ یونان میں بھی ہمارے پیچھے آیا تھا لیکن اس کا نام نہیں معلوم۔“

☆☆☆

برنیڈا، ریگی کی لائبریری میں موجود تھی۔ آتش دان میں آگ اور ہاتھ میں برانڈی کا گلاس تھا۔ ہیلن اوپر گیسٹ روم ٹھیک کر رہی تھی۔

”تم اپنی ماں سے بہت مشابہت رکھتی ہو۔“ ریگی نے کہا۔

”میں چھوٹی تھی۔ پھر بھی کچھ کچھ یاد ہے۔ شاید ایک مرتبہ ماما نے بتایا تھا کہ وان فیملی کتنے اچھے اور پرانے دوست

ہیں...... اس وقت مجھے ایسے ہی دوستوں کی ضرورت ہے۔''

''بس کرو...... کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے۔'' ریگی نے کہا۔''جب بھی تمہیں دیکھتا، مجھے میڈیلن یاد آجاتی ہے۔'' ریگی نے دوسرا گلاس خالی کر کے تیسرا بھرنا شروع کیا۔ اچانک وہ مضطرب ہوگیا ہیلن دروازے میں کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ ''تم پھر حد سے تجاوز کر رہے ہو۔'' ہیلن کا اشارہ برانڈی کی طرف تھا۔

''تیسرا ہی تو ہے۔'' وہ منمنایا۔

''چلو اٹھو، کافی وقت ہوگیا ہے۔'' ہیلن نے قریب آکر اس کا بازو پکڑا۔ دونوں لائبریری سے نکل گئے۔ ریگی کی چال غیر متوازن تھی۔ جاتے جاتے ہیلن نے برنیڈا پر معذرت خواہانہ نظر ڈالی۔ تاہم ہیلن کا رویہ شوہر کے ساتھ برنیڈا کو برا لگا تھا۔ دونوں اکیلے ہوتے تو اور بات تھی...... برنیڈا خالی دروازے کو دیکھتی رہی۔ اس کا ذہن متنوع خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ انگلینڈ میں اکثر دونوں انکل ہیو کے پاس آتے تھے۔ پتا نہیں کیوں ہیلن نے ریگی کو مجبور کیا کہ پیرس والی پوسٹ قبول کرلے۔ یوں وان فیملی...... اچانک انگلینڈ چھوڑ گئی۔ ہیلن وہیں پلی بڑھی تھی۔ اس کے آبا کا تعلق بھی انگلینڈ سے تھا۔ دوست احباب...... رشتے دار...... پھر پیرس کیوں؟ جبکہ انہیں فرنچ زبان بھی ٹھیک نہیں آتی تھی۔

یوں لگتا تھا، جیسے وہ انگلینڈ سے فرار ہوئے تھے۔ برنیڈا نے سر جھٹکا۔ اس کی نظر مینٹل پیس پر گئی۔ وہاں ایک موٹے پستہ قد آدمی کی تصویر تھی، جس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ تصویر کے نیچے ریگی وان لکھا تھا...... ٹری مون گن کلب، برنیڈا کو ہیلن کی تصویر کہیں نظر نہیں آئی۔ برنیڈا کے لیے یہ عجیب بات تھی۔ اسے اپنے باپ کی لائبریری یاد آئی۔

وہ اٹھ کر ریگی کی ڈیسک پر آگئی اور آہستگی سے ایک دراز کھولی، پین، پیپر کلپس، اسٹیپلر، دوسری دراز، اسٹیشنری...... وہ بے دھیانی میں لائبریری میں چکرا رہی تھی۔ وہ ایک اسٹول کے پاس رک گئی جس پر چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ اسٹول ایزی چیئر سے مطابقت رکھتا تھا۔ چمڑے کا رنگ بھی ایک جیسا تھا۔ لیکن اسٹول، ایزی چیئر سے دور رکھا تھا۔ لائبریری کی سیٹنگ میں وہ بے تکی جگہ پر پڑا تھا...... ایک ہی مقصد سمجھ میں آتا تھا کہ وہ وہاں اوپر چڑھنے کے لیے رکھا گیا تھا۔ برنیڈا نے اسٹول کے بالمقابل مہاگنی کے شیلف کو دیکھا جو آٹھ فٹ اونچا تھا۔ شیلف میں کتابیں بھری تھیں۔ شیلف کی چھت پر چینی طرز کے قدرے بڑے سائز کے پیالے رکھے تھے۔ کسی نامعلوم تحریک کے زیرِ اثر وہ اسٹول پر چڑھی اور پہلے پیالے میں ہاتھ گھمایا۔ پیالہ خالی تھا۔ پھر اس نے دوسرے پیالے میں ہاتھ پھیرا۔ جس میں کوئی چیز رکھی تھی۔ شاید کتاب تھی۔ اس نے کتاب اٹھالی۔ وہ کتاب نہیں فوٹو البم تھا...... برنیڈا البم لے کر نیچے اتر آئی۔

آتش دان کے قریب بیٹھ کر اس نے پہلا صفحہ کھولا۔ وہ ایک ہنستی ہوئی بارہ سالہ لڑکی کا فوٹو تھا۔ دوسرا بھی اس لڑکی کا فوٹو تھا۔ آگے بھی مختلف انداز میں وہی تصاویر تھیں۔ آخر میں ایک شادی کی تصویر تھی لیکن اسے درمیان سے پھاڑ دیا گیا تھا۔ تصویر میں صرف دلہن نظر آرہی تھی۔ برنیڈا کی سانس رک گئی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے دلہن کی تصویر کو گھور رہی تھی۔ دولھا کی تصویر کو پھاڑ کر الگ کر دیا گیا تھا...... برنیڈا نے تصویر کے مسکراتے ہونٹوں پر انگلی پھیری، سیاہ بالوں کو چھوا۔

معاً برنیڈا ایک جھٹکے سے اٹھی، البم کو بند کر دیا۔ وہ رچرڈ تک کیسے پہنچے؟ وہ فون کی طرف بڑھی اور کلاڈ کا نمبر ملایا۔ گریٹنگ کے بعد ریکارڈڈ پیغام سنائی دیا۔ بیپ کے بعد اس نے پیغام دیا۔ کلاڈ، میں برنیڈا ہوں۔ فوراً بات کرنی ہے۔ مجھے شہادت مل گئی ہے۔ جتنی جلد ہو سکے مجھے لے جاؤ اور...... وہ تھم گئی۔ اس کا ہاتھ بھی جم گیا۔ وہ کلک کی آواز تھی۔ کسی نے مکان کے دوسرے حصے سے فون کاٹ دیا تھا اور برنیڈا کی بات بھی سن لی تھی۔

برنیڈا کے دل کی دھڑکن بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے فون رکھ دیا۔ گھر میں کہیں ایکسٹینشن تھی۔ وہ اچھل پڑی۔ مجھے یہاں سے نکلنا ہے...... ہر صورت یہاں سے نکلنا ہے۔ البم کو سینے سے لگائے، اس نے لائبریری چھوڑ دی۔ سیکیورٹی سسٹم آف کر کے وہ باہر نکلی۔ باہر ٹھنڈی رات تھی، سناٹا تھا۔ سناٹے میں خوف کی آمیزش تھی۔ کورٹ یارڈ کے پار آہنی گیٹ تھا۔ وہ بلاشبہ لاک تھا۔ باہر نکلنے کے لیے اس نے احاطے کا جائزہ لیا۔ ایک اور گیٹ تھا۔ نسبتاً چھوٹا۔ لیکن وہ بھی لاک تھا۔ وہ کیا کرے؟ اسے پسینا آگیا۔ اس نے دیواروں کو دیکھتے ہوئے چکر کاٹا اور سیب کا درخت دیکھ لیا جس کی شاخیں دیواروں پر لٹکی ہوئی تھیں۔ اس نے نچلی شاخ کو پکڑا...... شاخ در شاخ دیوار پر چڑھنے کی کوشش میں البم اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ گھبراہٹ میں اضافہ ہوگیا۔ برنیڈا البم کے لیے واپس نیچے اتری۔ اسی وقت تیز روشنی نے اس کی آنکھیں کو چندھیا دیں۔ وہ ہیلن تھی جس کے ایک ہاتھ میں فلیش لائٹ تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' ہیلن کی آواز آئی۔

''میں...... میں واک کرنا چاہ رہی تھی۔ گیٹ بند تھے۔'' اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے جواب دیا۔

''میں گیٹ کھول دیتی۔''
''میں نہیں چاہتی تھی، کسی کو پریشان کروں۔'' برنیڈا نے فلیش لائٹ کی طرف سے نظریں پھیریں۔
''تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟'' ہیلن نے فلیش لائٹ نیچے کی۔ ''البم؟ یہ تمہیں کہاں سے ملا؟''
''لائبریری۔'' برنیڈا کیا کہتی۔
''اتنے برسوں تک اس نے یہ چھپا کر رکھا اور مجھ سے قسم کھا کھا کر جھوٹ بولتا رہا۔''
''کیسی قسم، ہیلن؟''
ہیلن خاموش رہی۔ ''یہی کہ اب وہ اُس سے محبت نہیں کرتا...... میں ایک بھوت کے ساتھ زندگی گزارتی رہی...... جب وہ زندہ تھی، اس وقت اُس کو چاہنا، چاند پکڑنے جیسا تھا۔ اب وہ زندہ نہیں ہے مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ مرنے کے بعد بھی اُس کی چاہت میں مبتلا ہے۔''
برنیڈا نے ہمدردی سے کہا۔ ''میں اور تم جان گئے ہیں کہ یہ یک طرفہ محبت تھی۔''
''میں اتنی خوب صورت نہیں تھی۔'' ہیلن نے کہا۔
''لیکن ریگی نے تم سے شادی کی ہے۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔''
''نہیں، یہ محبت نہیں ہے۔ سمجھوتا ہے۔ میری دولت کی ہوس تھی۔''
برنیڈا نے کوشش کی۔ ''تم چاہو تو نئی زندگی کا آغاز کر سکتی ہو...... تمہاری عمر ابھی زیادہ نہیں ہے۔''
''ریگی پاگل ہے، آج بھی اُسے چاہتا ہے۔ وہ آج بھی اس کے دل میں بستی ہے۔ میں بھی پاگل تھی، میں سمجھی ریگی اسے بھول جائے گا...... ریگی برداشت نہیں کر سکا کہ وہ کسی اور کی ہو جائے...... میں سمجھی تھی کہ میں نے اس کی محبت کو مٹا دیا ہے اور اب وہ صرف میرا ہے۔''
''کیا کہا تم نے؟'' برنیڈا کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔
''ہاں، وہ میں ہی تھی۔'' ہیلن نے جواب دیا۔
خون برنیڈا کی رگوں میں برف ہو گیا۔ اگلے لمحے اس کے دماغ میں جھماکا ہوا۔ یہ وقت برف ہونے کا نہیں تھا۔ وہ قاتل ہیلن کی شکل میں سامنے موجود تھا۔ اسے بھاگنا تھا۔ کہاں؟
کلک کی آواز آئی۔ ''تم بھی ہو بہو اسی کی طرح ہو...... یعنی اتنے عرصے بعد مجھے اسے دوبارہ ہلاک کرنا پڑے گا۔''
''لیکن میں میڈیلن نہیں ہوں۔''
''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری آگہی خطرناک ہے۔''
ہیلن نے گن والا ہاتھ اٹھایا۔ ''گیراج کی طرف چلو، ہم ڈرائیونگ پر جائیں گے۔''

☆☆☆

''ایمل فوش۔'' کلاڈ نے کہا اور فولڈر کھولا۔ ''عمر چھیالیس برس۔ سابقہ فرنچ خفیہ اہلکار۔ قبرص میں تین سال قبل فضائی حادثے میں مردہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ 1972ء میں فوش نے امریکن مشن کے ساتھ رابطہ کاری کی...... سفیر سدرلینڈ فیملی کو فون پر دھمکیاں ملی تھیں۔ کئی سال تک فوش سدرلینڈ کی فیملی کے ساتھ رابطہ میں رہا تھا۔ پھر اسے دوسری ذمّے داریاں سونپ دی گئیں جنھیں وہ فرضی موت تک نبھاتا رہا۔''
''کسی بھی کام کے لیے اپنی پرائیویٹ خدمات اس نے کب سے پیش کرنا شروع کیں؟'' ہیو کا سوال تھا۔
''کلاڈ نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔ ''سدرلینڈ کی بیوہ نیتا کو اندر لاؤ۔''
نیتا اندر آئی تو اس کا اعتماد اور چال ڈھال پہلے جیسی تھی۔
''اس وقت تم لوگ کیا کر رہے ہو؟'' وہ بولی۔
رچرڈ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ''تم نہیں جانتیں...... شاید...... انتھونی ہماری تحویل میں ہے۔''
رچرڈ نے اس کی آنکھوں میں خوف کی خفیف سی کرن دیکھی جو فوراً ہی غائب ہو گئی۔ ''تم لوگ کوئی غلطی کر گئے ہو۔ اس نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔''
''اس نے کرائے کے قاتل سے مرڈر کرایا ہے۔ ناقابلِ تردید ثبوت۔ ایک سے زیادہ چشم دید گواہ۔ کیس پکا ہے۔ لمبے عرصے کے لیے اندر جائے گا۔''
ذرا دیر بعد ہی نیتا کا رنگ اُڑنا شروع ہو گیا۔ ''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' بالآخر وہ بول پڑی۔
''وہ دو فرنچ ایجنٹس کی ہلاکت کا ذمّے دار ہے...... اور دو عدد اقدامِ قتل۔ ایک جارڈن پر اور دوسرا ماری سینٹ پیری۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ تم ہم سے تعاون کرو۔''
''اس نے خود تو کچھ نہیں کیا؟'' وہ بولی۔
''لیکن اس نے کرائے کے قاتل سے کام لیا...... وہ بچے گا نہیں۔''
''وہ بچہ ہے۔ مجھے بچانے کے لیے کر رہا تھا۔''
''کیا مطلب؟''
نیتا کا سر جھک گیا۔ ''ماضی۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''سب بدل جاتا ہے..... ماضی نہیں بدلتا۔''
''تم ڈیلفی ہو؟'' رچرڈ نے اچانک سوال کیا۔
وہ خاموش رہی۔
''تم نے کسی طرح ان دونوں کو وہاں اکٹھا کیا۔ پھر ہلاک کر دیا۔ کیونکہ تمہارا راز فاش ہونے والا تھا۔''
''نہیں۔''
''تم نے دستاویزات کا بریف کیس برنارڈ کے پاس رکھ دیا۔''
''نہیں۔''
رچرڈ نے اٹھ کر اسے شانوں سے پکڑ لیا۔ ''تمہیں اب بھی کوئی امید ہے؟''
وہ اب باقاعدہ سسک رہی تھی۔ ''میں نے نہیں مارا۔'' وہ چیخ اٹھی، وہ پہلے ہی مر چکے تھے۔''
رچرڈ چونکا اور اُسے چھوڑ دیا۔ ''کس نے مارا؟ ایمل فوش، یا فلپ؟''
''نہیں، فلپ نے لاشیں دریافت کی تھیں۔ بدحواسی میں اس نے مجھے فون کیا۔ میں نے فوش سے رابطہ کیا اور اپنے ناموں کو کلیئر رکھنے کے لیے ضروری بندوبست کیا۔ ری ڈیو کو بھی یونان بھجوا دیا۔''
''اور دستاویزات؟''
''فوش نے رکھی تھیں۔''
''مطلب تم ڈیلفی نہیں ہو، وہ کوئی اور پُراسرار شخص تھا۔'' جارڈن نے اعتراض کیا۔ ''جس نے وہی فلیٹ منتخب کیا جہاں تم اور فلپ ملتے تھے؟''
''میں نہیں جانتی کہ نامعلوم شخص نے ہمارا فلیٹ کیوں منتخب کیا؟''
''تو تمہارا فرضی نام اسکالیٹی تھا؟''
نیتا نے اثبات میں سر ہلایا۔
''فلیٹ کے بارے میں اور کس کو پتا تھا؟ ماری کو؟''
''ہاں، شاید۔''
''کسی اور کو؟''
''نہیں۔''
''ایک منٹ۔'' دفعتاً جارڈن نے ہاتھ اٹھایا۔ ''کوئی اور بھی جانتا تھا۔''
سب قدرے حیرت سے جارڈن کو دیکھ رہے تھے۔
''میں نے ریگی سے سنا تھا کہ ہیلن کو فیئر کے بارے میں علم ہے..... اُسے ماری نے بتایا۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔''

رچرڈ نے جارڈن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ایک ہی ساعت میں دونوں سمجھ گئے کہ دونوں کیا سوچ رہے ہیں.....
برنیڈا۔
اسی لمحے دونوں مڑے۔ ''ہمیں کور کرنا۔'' رچرڈ کی غراہٹ کلاڈ کے لیے تھی۔ ''وہیں ملیں گے۔''
''وان فیملی؟''
رچرڈ نے جواب نہیں دیا۔ وہ پہلے ہی دوڑ لگا چکا تھا۔

☆☆☆

برنیڈا، مرسڈیز کار کے اندر تھی۔ اُس کا ہاتھ ڈور ہینڈل پر تھا لیکن جیسے برف ہو رہا تھا۔
''ہیلن، میرا خیال ہے وہ بہت جلد تم تک پہنچ جائیں گے۔''
''بیس سال میں نہیں پہنچے تو اب کیا پہنچیں گے۔''
برنیڈا کی نظر گن پر تھی جس کا رخ اس کے سینے کی جانب تھا۔ ہیلن نے چابیاں اس کی گود میں پھینک دیں۔ ''اسٹارٹ کرو!''
برنیڈا نے ہینڈل پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ ''میری ماں نے کبھی تمہارے خلاف سوچا تک نہیں۔ نہ ان کو ریگی میں کوئی دلچسپی تھی۔''
''لیکن ریگی کو دلچسپی تھی اور اب بھی ہے۔ وہ دیوانہ ہے۔ تم نے غور نہیں کیا، وہ تمہیں کیسے دیکھتا ہے..... سوتے میں تمہاری ماں کو پکارتا ہے..... تم کار چلاؤ۔'' ہیلن نے کہا۔
''کہاں جانا ہے؟''
''سیدھی چلتی رہو۔''
برنیڈا کے ہاتھ پسیج گئے تھے..... لرز رہے تھے۔
''میرے والد نے تمہیں کیا نقصان پہنچایا تھا؟ تم نے کیوں اُن کو.....؟''
''الزام کسی کے سر تو جانا تھا۔ بہتر تھا کہ الزام ایک مردہ آدمی کے سر پر رہے۔ نیتا کے خفیہ فلیٹ نے کام اور آسان بنا دیا تھا۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''تمہیں نہیں معلوم کہ نیتا اور فلپ نے خود کو بچانے کے لیے کس افراتفری کا سامنا کیا تھا۔''
''اور ڈیلفی؟''
ہیلن نے حیرت سے سر دائیں بائیں ہلایا۔ برنیڈا اندازہ نہ کر سکی کہ ہیلن بے خبر ہے یا محض اداکاری کر رہی ہے۔ مطلب یہ کچھ نہیں جانتی۔ ہم غلط معموں کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ رچرڈ کو بھی اس پر شک نہیں ہوگا۔ وہ کبھی نہیں جان پائے گا کہ درحقیقت کیا ہوا؟

سڑک نے گھومنا شروع کیا۔ وہ بوائے ڈی بولون کی گہرائی میں جا رہے تھے۔ یہاں درختوں میں یا کیچڑ زدہ تالاب میں وہ لوگ مجھے دریافت کریں گے۔ ہیڈ لائٹس آخری حد جہاں ختم ہو رہی تھی وہاں سڑک پھر گھوم رہی تھی۔

مجھے یہ آخری چانس لینا چاہیے۔ برنیڈا نے سوچا میں لڑوں گی یا پھر وہ مجھے شوٹ کر دے گی...... برنیڈا نے سڑک کی گولائی کو نظرانداز کیا، اسٹیئرنگ کو سیدھا رکھا اور ایکسلریٹر دباتی چلی گئی۔ کار غرا کر اچھلی...... پہیوں کی چیخ سنائی دی۔ برنیڈا کی پشت سیٹ کے ساتھ چپک گئی۔

ہیلن چلائی۔ ’’نہیں!‘‘ اس نے اسٹیئرنگ وہیل گھمانے کے لیے ہاتھ چلایا۔ کار تیز رفتاری سے درختوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اچانک برنیڈا نے کار کو درختوں سے بچانے کے لیے تیز رفتاری کے عالم میں ہی اسٹیئرنگ گھمایا۔ سب کچھ بے قابو ہو گیا۔ زمین اور آسمان گھوم گئے۔ ایک دوسرے میں مل گئے۔ گاڑی قلابازیاں کھا رہی تھی۔ گاڑی جب رکی تو چھت کے بل پڑی تھی۔ برنیڈا کو کچھ ہوش نہ تھا کہ کیا ہوا...... کہاں چوٹیں آئیں...... اک احساس تھا کہ وہ زندہ ہے۔

ونڈ شیلڈ ٹوٹ گیا تھا۔ اسٹیئرنگ نے اسے دبایا ہوا تھا۔ چھت پچک کر اس کے قریب آگئی تھی۔ سیٹ بیلٹ نہ ہوتی تو اسٹیئرنگ اس کی پسلیاں توڑ چکا ہوتا یا وہ ونڈ شیلڈ کے باہر ہوتی۔ کچھ ہوش آیا تو سب سے پہلے اس نے سیٹ بیلٹ الگ کی۔ اس کا پورا جسم دکھ رہا تھا۔ اسٹیئرنگ کی وجہ سے ونڈ شیلڈ کی طرف سے نہیں نکل سکتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح کھسک کر اس نے خود کو شیلڈ اور چھت سے ایک طرف ہٹایا۔ تاریکی نے بھی اس کی حالت خراب کی ہوئی تھی۔ ٹانگ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ گاڑی کا برا حال تھا، اسے ٹھیک اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے کے ساتھ ہے۔ برنیڈا نے اندازے سے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ ہراس کے عالم میں اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ اچانک اسے ایندھن کی بو کا احساس ہوا۔ بُو کی تیزی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے اندھوں کی طرح تگ و دو کی...... ٹوٹی ہوئی کھڑکی واحد امکان تھا۔ زخمی حالت میں اس نے مزید زخم کھائے۔ لیکن کھڑکی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کی ایک ٹانگ کام نہیں کر رہی تھی۔ اس نے خود کو درختوں کی طرف گھسیٹنا شروع کیا۔ معاً وہ پھسلی، اور رکنے کی کوشش میں پھسلتی چلی گئی۔ وہ کسی اتھلی کھائی میں گری تھی۔ بے اختیار چیخ نکل گئی۔ عین اسی وقت دھماکا ہوا اور ماحول روشن ہو گیا۔ شعلوں کے بلند فوارے نے گاڑی کو چھپا لیا تھا۔ اس کے ماؤف ہوتے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔

’’کیوں ہیلن...... کیوں؟‘‘

☆☆☆

وان فیملی کی رہائش گاہ سے تین میل کے فاصلے پر شعلے بلند ہو رہے تھے۔

’’ہیلن...!‘‘ رچرڈ چلایا۔ اس نے بھاگنا شروع کیا۔

’’اوہ مائی گاڈ۔‘‘ گاڑی سے کچھ فاصلے پر اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا۔ وہ دہشت سے سینڈل کو دیکھ رہا تھا۔ جو کبھی برنیڈا کے پیر کی زینت ہوتی تھی۔

’’برنیڈا!‘‘ وہ چیخ اٹھا اور جلتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھا لیکن شعلوں کی تپتی زبانوں نے اجازت نہیں دی۔ وہ پسپا ہو گیا۔ اس نے گوشت جلنے کی بو سونگھ لی تھی۔ وہ دیوانگی کے عالم میں پھر آگے بڑھا۔

’’رک جاؤ۔‘‘ جارڈن نے پہنچ کر اُسے پیچھے کھینچا۔

’’اسے باہر نکالنا ہے۔‘‘ رچرڈ بے قابو ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کی سماعت سے کراہنے کی آواز ٹکرائی۔ آواز کار کے بجائے درختوں میں سے آئی تھی۔ آواز جارڈن نے بھی سن لی تھی۔ دونوں آوازیں دیتے ہوئے بڑھے...... کراہوں کے سہارے وہ جلد ہی برنیڈا تک پہنچ گئے۔ وہ ہوش میں تھی۔ تاہم ہوش میں کچھ بے ہوشی بھی تھی۔ رچرڈ نے اسے سمیٹ کر گود میں اٹھا لیا۔ برنیڈا کا انگ انگ سرد ہو گیا تھا۔

’’وہ شاک میں ہے...... وقت کم ہے...... قریبی اسپتال کون سا ہے؟‘‘ وہ چیخا۔

جارڈن، کار کی طرف بھاگا۔

جارڈن بہت تیزی سے کار دوڑا رہا تھا۔ رچرڈ نیم بے ہوش برنیڈا سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک اس کی گود میں تھی۔

’’ہمت کرو...... میرے ساتھ رہو...... پلیز ڈارلنگ ...... پلیز۔‘‘

☆☆☆

اسپتال میں اینستھیسیا کے دوران، نحیف آواز میں برنیڈا نے رچرڈ کو آواز دی۔ اسے اپنی ہی آواز اجنبی لگی تھی۔ کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دبایا۔ نرس نے بتایا کہ وہ رچرڈ ہے۔ برنیڈا اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ تاہم وہ سمجھ گئی۔ آنکھیں کھولنے کی طاقت نہیں تھی۔ نیند کا غلبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ سوتے سوتے، آخری خیال یہی تھا کہ جب وہ صبح بیدار ہو گی تو رچرڈ اس کے پاس بیٹھا ہو گا۔

دشمن

تنویر ریاض

زمانۂ جنگ میں قومیں انسانی حقوق کو بالائے طاق رکھ دیتی ہیں... ان کے اندر سے انسانیت ختم ہو کے صرف حیوانیت جھلکتی ہے... یہودیوں اور نازیوں کے بیچ جنگ اور تشدد پسند رویے دنیا کی آنکھ سے اوجھل نہیں رہے... دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے... جنگ بندی کے باوجود دشمنی کی مدت ختم نہ ہوسکی... محرومیوں سے قریب تر کر دینے والے حالات و واقعات کی تلخ و سفاک تصویر کشی...

لاکھوں لاشوں پر تعمیر کیے جانے والے روشن مستقبل کی بنیادیں......

میرا ممکنہ مؤکل بوسٹن میں واقع اسکوی اسکوائر کے میٹرو اسٹیشن کے داخلی دروازے پر کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ فون پر اس نے جو حلیہ بتایا، وہ اس پر پورا اُترتا تھا۔ اس کی عمر پچیس کے لگ بھگ ہوگی۔ دبلا پتلا، سیاہ بالوں والا وہ شخص سیاہ سوٹ، سفید قمیص اور سیاہ ٹائی لگائے ہوئے تھا۔ اس بے چارے کو دیکھ کر یوں لگا جیسے اس نے ایک مہینے سے کچھ نہیں کھایا۔ گول شیشوں کی عینک کے پیچھے اُبھری ہوئی آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے انہیں اوپر سے چسپاں کر دیا گیا ہو۔ اس

کے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔
میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ''رونی سلور؟''
اس نے ہونٹوں پر یوں زبان پھیری جیسے میں کوئی پولیس والا ہوں اور میں نے اسے کوئی ناشائستہ حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔
''ہاں۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
''کیا تم میرے دفتر چلنا پسند کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔'' اس نے کہا۔
وہ جمعے کی شب تھی۔ سڑکوں پر بسیں، ٹیکسیاں اور ٹرک رواں دواں تھے۔ گردونواح میں واقع بار اور مکانات سے بہ آواز بلند باتیں کرنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس شور کی وجہ سے باتیں کرنے اور سننے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ میں نے اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور ہم دفتر کی جانب روانہ ہوگئے۔ وہ دیکھنے میں لاطینی لگ رہا تھا لیکن میں اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر جان گیا تھا کہ اس کا تعلق کہاں سے ہے۔ جب ہم چوراہے پر پہنچے تو ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ کسی ٹرک نے بیک فائر کیا تھا۔ رونی تقریباً گرنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے سنبھال لیا۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جس میں شرمندگی اور شکریہ دونوں ہی شامل تھے۔
میرا دفتر عمارت کی بالائی منزل پر واقع تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر ایک تنگ راہداری میں پہنچے جس کے دونوں جانب تین دروازے تھے جن پر ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ میری قطار میں دو کمرے خالی تھے جبکہ دوسری جانب ایک وکیل، پیانو ٹیچر اور پریس ایجنٹ کے دفاتر تھے۔ میں نے اپنے دفتر کا دروازہ کھولا۔ لائٹ جلائی اور اندر داخل ہوگیا۔ کمرے کے وسط میں ایک پرانی میز اور کرسی رکھی ہوئی تھی جبکہ ایک اسٹینڈ پر ٹائپ رائٹر اور دو فائل کیبنٹ تھے۔ میری میز کے سامنے لکڑی کی دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر میں نے مہمان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد میں نے کمرے کی کھڑکی کھولی تاکہ تازہ ہوا اندر آسکے اور خود کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔
''ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ ملازمت کے دوران ان سے میرا دل بھر چکا ہے۔ ویسے بھی میں انہیں پسند نہیں کرتا۔''
''تم کہاں کام کرتے تھے؟'' اس نے پوچھا۔
میں نے کاغذوں کے نیچے سے ایک پیڈ اور دراز میں سے فونٹین پین نکالا اور کہا۔ ''مجھے مختلف ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ انگلینڈ، فرانس، بیلجیم، جرمنی وغیرہ۔ دراصل میں ملٹری پولیس میں تھا اور تم......؟''
''سسلی، اٹلی، فرانس، جرمنی...... میں پینتالیسویں انفنٹری ڈویژن میں تھا۔''
''تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟''
گو کہ یہ ایک فضول سا سوال تھا لیکن یہ جاننا بھی ضروری تھا کہ اسے میرے بارے میں کس نے بتایا۔
رونی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''زرد صفحات۔ میں بوسٹن کا رہنے والا نہیں ہوں اور کسی کو بھی نہیں جانتا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ فون بک کا سہارا لوں۔''
''اچھا آئیڈیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن 'ایس' سے شروع ہونے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے، اس میں تمہیں میرا نام کیسے مل گیا؟''
''میں نے صرف وہ نام تلاش کیے جو پرائیویٹ سراغ رساں ہیں۔ ایک نے جواب نہیں دیا۔ دوسرا یہ کام چھوڑ چکا ہے۔ اس طرح میں تم تک پہنچ گیا۔''
''بہت خوب۔'' میں نے اس کا نام پیڈ پر لکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں مسٹر سلور؟''
اس نے اپنی ران پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کسی کی تلاش ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے ڈھونڈو۔''
''کون ہے وہ؟''
''گریگ لیڈر۔ شکاگو ٹریبون کا جنگی نامہ نگار تھا۔ وہ ہماری کمپنی سے وابستہ رہا اور اس نے جنگ کے آخری دو مہینوں میں ہمارے ساتھ ہی سفر کیا۔ میری نظر میں وہ ایک اچھا آدمی تھا۔''
''ٹھیک ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہوگا؟''
''وہ یہیں کہیں ہے۔'' رونی نے کہا۔ ''میں نے اسے ساؤتھ اسٹیشن پر ٹرین سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ میرے پاس سے گزر گیا۔ میں نے اس کا نام لے کر پکارا لیکن وہ ہجوم میں گم ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔''
''تم جانتے ہو کہ وہ کس ٹرین سے اُترا تھا؟''
''نہیں۔''
''یہ کب کی بات ہے؟''
''گزشتہ بدھ۔''
''تمہیں وقت یاد ہے؟''
''ہاں، بظاہر یہ بات مضحکہ خیز لگتی ہے۔ میری گھڑی

ہمیشہ تیز چلتی ہے۔ اس لیے میں نے اسٹیشن کے کلاک میں وقت دیکھا۔ وہ آٹھ بج کر پانچ منٹ بتا رہا تھا۔''

''تم اسے کیوں تلاش کر رہے ہو؟ کیا وہ تمہارا مقروض ہے یا اس نے تمہاری کوئی چیز چرائی ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ آخر میں کئی ہفتوں تک ہمارے ساتھ رہا۔ برف باری، بارش اور گولہ باری میں بھی وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں گیا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی کھانا کھاتا اور ہماری طرح خندقوں اور مورچوں میں رہتا۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

''اوہ، اب میں سمجھا۔'' میں نے کچھ حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''اس کے پاس بہت قیمتی کیمرا تھا۔ جس سے اس نے ہماری کئی تصویریں کھینچیں۔ اس کا کہنا تھا کہ جب جنگ ختم ہو جائے گی تو وہ ہم سب کو ان تصویروں کی کاپیاں بھیجے گا۔ اس نے ہمارے نام اور پتے بھی اپنی نوٹ بک میں لکھ لیے تھے۔''

میں نے پیڈ پر لکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہیں یہ تصویریں ابھی تک نہیں ملیں۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اور اسی لیے تم اسے تلاش کر رہے ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے کہا۔ ''بظاہر یہ حماقت ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس بات کو ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن وہ یادیں ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اچھی یا بُری۔ میں اچھی باتیں یاد رکھنا چاہتا ہوں۔ ان لوگوں کو جو میری پلٹن میں تھے یا وہ جو واپس نہیں آسکے۔ ان کی لاشیں ابھی تک وہیں ہوں گی اور میں ان کی شکلیں بھولتا جا رہا ہوں لیکن میں انہیں نہیں بھولنا چاہتا۔ وہ ان تصویروں میں موجود ہیں۔''

مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ میں نے کہا۔ ''تم کچھ پینا پسند کرو گے، چائے یا کافی؟''

''کچھ بھی مل جائے۔ میرا خیال ہے کہ کافی ٹھیک رہے گی۔''

میں نے دو پیالی کافی بنائی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پیالی پکڑی اور کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ''کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر چینی کے بنے ہوئے کپ میں کافی پینے کی عیاشی کروں گا۔''

اسی وقت کھلی ہوئی کھڑکی سے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ کچھ نوجوان لڑکیاں ہاتھ ہلا کر قہقہے لگا رہی تھیں۔ رونی نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی اور بولا۔ ''کیا تم یہ آوازیں سُن رہے ہو؟''

''ہاں، انہیں سننا کچھ مشکل نہیں۔'' میں نے کہا۔

''جنگ کو ختم ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا اور یہ لوگ سب کچھ بھول گئے۔ انہیں صرف راشننگ کے خاتمے اور ملازمتوں کی فکر ہے۔ تمام قربانیاں، خون کا نذرانہ، تشدد سب کچھ بھلا دیا گیا۔''

میں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں ایسا نہیں سمجھتا رونی۔'' اس وقت مجھے اپنے بڑے بھائی کی شدت سے یاد آئی جو جنگ میں مارا گیا تھا۔ ''ہم میں سے بہت سے لوگوں کو اب بھی سب کچھ یاد ہے۔''

''لیکن یہ کافی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب ایٹمی ہتھیاروں، نئے برقی آلات اور نیو میکسیکو میں بیلاسٹک میزائلوں کے تجربات کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ یہی ہمارا مستقبل ہے۔ میں ایسے روشن مستقبل پر لعنت بھیجتا ہوں جو لاکھوں لاشوں پر تعمیر کیا جائے۔''

اب بات میری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''اسی لیے ان تصویروں کا حصول تمہارے لیے بہت اہم ہے۔''

اس نے اپنی پیالی اٹھائی اور بولا۔ ''ہاں، وقت گزرنے کے ساتھ مزید لوگ انہیں بھولتے جائیں گے۔ میں ایسا نہیں چاہتا مسٹر سولیون۔ کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟''

میں ہاں کہنے والا تھا لیکن اس سے پہلے کچھ مزید باتیں جاننے کی ضرورت تھی۔ ''تم نے کہا کہ یہ شخص گریگ لیڈر شاکو ٹریبون کے لیے لکھتا تھا۔ کیا تم نے جنگ کے بعد اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی؟''

''ہاں، میں نے بالکل ایسا ہی کیا۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے چند خطوط لکھے جن کا آج تک جواب نہیں ملا۔ بلکہ ایک مرتبہ تو میں نے فون بھی کیا تھا۔ جواب دینے والا بہت جلدی میں تھا۔ اس نے بتایا کہ گریگ نے انیس سو پینتالیس کے موسم گرما میں اخبار کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔''

''اوہ۔'' میں نے کافی کا کپ میز پر رکھا اور پین اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''تم نے بتایا کہ بوسٹن کے رہنے والے نہیں ہو۔ پھر تمہارا تعلق کس شہر سے ہے؟''

''فلاڈیلفیا۔''

''گویا تم اپنے گھر سے کافی دور ہو؟''

اس کے جسم میں سختی آ گئی۔ شاید اس نے یہ بات زیادہ محسوس کی تھی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے کئی سیکنڈ بعد کہا۔

''بوسٹن کیوں آئے ہو؟''

اس نے ایک بار پھر اپنی پتلون پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''میرا ایک اسپتال میں وقت طے تھا۔''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا اور تین چار اسپتالوں کے نام لے دیے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے اسے بغور دیکھا اور پھر میرے ذہن میں ایک اور نام آ گیا۔

''میکلین اسپتال۔'' میں نے پوچھا۔ ''جو بلمونٹ میں ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

اس نے جلدی سے سر ہلا دیا۔ میں نے محتاط الفاظ میں کہا۔ ''وہ نفسیاتی اسپتال ہے۔ اس میں شرمندہ ہونے والی کوئی بات نہیں۔''

''شرمندہ؟'' اس نے تیزی سے کہا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ میں شرمندہ ہوں؟''

''نہیں۔ میں نے یونہی ایک بات کہہ دی تھی لیکن تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

وہ آگے کی طرف جھکا اور اپنے دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔ ''دن کے وقت میں ٹھیک رہتا ہوں گو کہ مجھے شور پسند نہیں اور اسی لیے مجھے ٹرین میں سفر کرنا اچھا نہیں لگتا لیکن رات بہت بُری گزرتی ہے، ڈراؤنے خواب آتے رہتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ٹائم مشین کے ذریعے میں دوبارہ پیچھے چلا گیا ہوں۔ گولیوں کی آوازیں، بموں کے دھماکے بار بار میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برستے ہیں۔ مایوسی نے مجھے گھیرا ہوا ہے۔ جیسے سزا کا حکم سنا دیا گیا ہو اور میں کبھی زندگی کی طرف واپس نہیں آؤں گا۔ کیا تم بھی خواب دیکھتے ہو مسٹر سولیون؟''

میرا چلتا ہوا قلم رک گیا اور مجھے وہ بھورے بالوں والا امریکی فوجی یاد آ گیا جو بلج کی لڑائی کے دوران پکڑا گیا تھا۔ مجھے خاص طور پر بُلایا گیا تاکہ محاذ سے آنے والی ایمبولینس گاڑیوں کو خالی کروانے میں مدد کر سکوں۔ وہ فوجی ایک کینوس کے اسٹریچر پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے دوسرے تین ملٹری پولیس والوں کے ساتھ مل کر اسے ایک بڑے خیمے میں قائم فیلڈ اسپتال تک پہنچایا۔ زمین پر برف اور کیچڑ کی تہ جمی ہوئی تھی جس پر جیپوں اور ایمبولینس کے چلنے سے گہرے نشانات پڑ گئے تھے اور بارش کے ساتھ ساتھ تیز برف باری بھی ہو رہی تھی۔ اس کے سر کے گرد ایک خون آلود پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ بار بار اپنے شہر اسپوکین کی ایک سڑک کا نام لے کر اپنی دادی سے رابطہ کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

جب نرس نے اس کی پٹی کھولی تو اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ''اوہ میرے خدا، میں اس کا بھیجا دیکھ سکتی ہوں۔''

لیکن اس فوجی نے نرس کی بات نہیں سنی اور بار بار اپنی دادی کے گھر کا پتا دہراتا رہا۔ میں نے دوبارہ قلم سنبھالا اور ذہن سے تمام خیالات کو جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، خوش قسمتی سے ایسے خواب نہیں دیکھتا۔''

یہ کہہ کر میں نے اس کی جانب دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے پر مایوسی نظر آئی۔ میں نے کہا۔ ''رونی، میں تمہارا کیس لوں گا اور تمہارے مطلوبہ شخص کو تلاش کر لوں گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب وہ کیا کر رہا ہے اور اگر ہم خوش قسمت ہوئے تو شاید اب بھی اس کے پاس ان تصویروں کے نیگیٹو محفوظ ہوں گے جن کا اس نے تم سے وعدہ کیا تھا۔''

اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ اُبھری اور وہ بولا۔ ''مسٹر سولیون، یہ تو بہت اچھا ہوگا۔''

''جب تک میں اسے تلاش نہ کر لوں، کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم مجھے اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟''

''اس کا قد تقریباً چھ فٹ ہے۔ فربہ جسم، چھوٹے سنہرے بال، نیلی آنکھیں، چھوٹے کان اور اس کے بائیں گال پر زخم کا چھوٹا سا نشان ہے۔''

میں نے یہ تمام معلومات اپنے پاس لکھ لیں اور کہا۔ ''فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔''

رونی نے کہا۔ ''مجھے کیا معاوضہ دینا ہوگا؟''

''میں مناسب رعایت کر دوں گا۔ کام ختم ہونے پر ہم طے کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

''میں تم سے کس طرح رابطہ کر سکتا ہوں؟''

''میکلین اسپتال میں۔ ہمیں کیمپس سے باہر آنے کی اجازت ہے، اگر ڈاکٹر سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ کیا وہ تمہاری مدد کر رہے ہیں؟''

وہ شرماتے ہوئے بولا۔ ''کچھ زیادہ نہیں۔''

اس کے جانے کے پندرہ منٹ بعد میں نے آنکھیں کھولیں۔ آگے کی طرف جھک کر اپنا فون اٹھایا اور طویل

فاصلے کی کال کے لیے آپریٹر سے رابطہ کیا۔ گو کہ اس کے اخراجات زیادہ ہوتے لیکن اس کیس کے لیے ایک اچھا خاصا آغاز ہوسکتی تھی جسے میں سادہ نوعیت کا سمجھ رہا تھا۔

میں اپنے نوٹس پر نظر ڈال رہا تھا جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور آپریٹر نے کہا۔ ''جناب! آپ کی کال ملا دی گئی ہے۔''

''شکریہ آپریٹر۔'' میں نے کہا اور ہمہ تن گوش ہوگیا۔ پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا۔ دوسری جانب سے کسی نے مترنم آواز میں کہا۔

''تمہیں کس سے بات کرنی ہے؟''

''نیوز روم میں کسی سے بات کروا دو جو فارن ڈیسک یا اوورسیز سے متعلق ہو۔''

''ہولڈ کرو۔'' اس نے کہا اور خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد کسی نے کہا۔ ''اوورسیز۔ میں سائنوسکی بول رہا ہوں۔''

''ہیلو، میں بوسٹن سے ولیم سولیون بات کر رہا ہوں اور مجھے تمہارے ایک غیر ملکی نامہ نگار گریگ لیڈر کی تلاش ہے۔''

''اب وہ یہاں کام نہیں کرتا۔''

''میں جانتا ہوں لیکن مجھے توقع تھی کہ شاید اس کے کسی خاندان کے فرد کے بارے میں معلومات مل جائیں۔''

''مسٹر! تم نے غلط جگہ فون کیا ہے۔ یہ اخبار کا دفتر ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

دوسرے دن میں شہر کے مختلف حصوں میں گیا۔ شروعات بوسٹن پبلک لائبریری سے کی۔ اس کے ریفرنس روم میں مجھے ایک ضخیم شکاگو فون بک مل گئی۔ اس کمرے میں اڑتالیس ریاستوں کی فون بک اور ڈائریکٹریاں موجود تھیں۔ شکاگو کی فون بک میں لیڈر نام کے چھ نمبر ملے جبکہ فلاڈیلفیا کی نوٹ بک میں چھ سے زیادہ صفحات لیڈر کے نام سے بھرے ہوئے تھے لیکن ان میں کوئی بھی میرے مطلب کا نہ تھا۔ میں نے دونوں کتابیں واپس اپنی جگہ پر رکھ دیں۔

اب مجھے اگلا قدم اٹھانا تھا۔ میں نے ایک دکان سے بہت سے سکے لیے اور کوپلے اسکوائر میں نصب پے فون سے شکاگو فون کرنا شروع کر دیے۔ میں ایک کے بعد ایک کال کرتا رہا لیکن کہیں سے بھی گریگ لیڈر کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ جب میرے پاس آخری سکہ بھی ختم ہوگیا تو میں ٹیلی فون بوتھ سے باہر آگیا۔ پیلی ٹیکسی روکی اور اسے نیوز پیپر رو، چلنے کے لیے کہا۔ اس جگہ کا اصل نام واشنگٹن اسٹریٹ تھا لیکن اخبارات کے دفاتر ہونے کی وجہ سے نیوز پیپر رو کہلاتی تھی۔ وہاں ایک ہی بلاک میں بوسٹن پوسٹ، بوسٹن امریکن اور بوسٹن گلوب کے دفاتر تھے۔ میں نے سب سے پہلے بوسٹن گلوب کا انتخاب کیا۔ پُرہجوم نیوز روم میں لوگوں کے باتیں کرنے، ٹیلی فون کی گھنٹی اور ٹیلی پرنٹر کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ میں میزوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا ایک شناسا چہرے کے پاس جا کر رک گیا۔

ڈون بورنیٹ نے مجھے دیکھا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو، کون آیا ہے۔ میرا پسندیدہ سراغ رساں بلی۔ کہاں آوارہ گردی ہو رہی ہے؟''

''یہ تو چلتا رہتا ہے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ڈون تقریباً میرا ہم عمر ہی تھا لیکن دیکھنے میں دبلا نظر آتا تھا۔ اس کے بال بھورے، باریک مونچھیں اور آنکھوں پر گول شیشوں والی عینک لگائی ہوئی تھی۔ نظر کی کمزوری اور خراب صحت کی وجہ سے وہ جنگ میں جانے سے بچ گیا تھا۔

''مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔'' میں نے کہا۔

''شاید تم کچھ مدد کرسکو۔''

اس نے میز پر پڑے انبار میں سے ایک سادہ کاغذ نکالا اور بولا۔ ''تمہیں کیا معلومات چاہئیں؟''

''مجھے ایک شخص گریگ لیڈر کی تلاش ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ جنگ کے دنوں میں شکاگو ٹریبون کے لیے جنگی نامہ نگار کے طور پر کام کر رہا تھا۔ جنگ کے بعد اس نے وہ ملازمت چھوڑ دی۔ میرے ایک مؤکل سے اس کی دوستی محاذ پر ہوگئی تھی اور لیڈر نے اسے چند تصویریں بھیجنے کا وعدہ کیا تھا جو محاذ پر لی گئی تھیں لیکن وہ تصویریں ابھی تک میرے مؤکل کو نہیں ملیں۔''

''تمہارے مؤکل کو معلوم ہونا چاہیے کہ رپورٹر یا فوٹوگرافر پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ کیا وہ بوسٹن میں ہی ہے؟''

''ہاں۔''

''اور یہ گریگ لیڈر؟''

''میرے مؤکل نے اسے چند روز قبل ساؤتھ اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ اس نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا لیکن اسٹیشن پر بہت رش تھا اور وہ اس میں گم ہوگیا۔''

''اوہ۔'' ڈون نے کہا۔ ''تم دونوں میں سے کسی ایک نے ٹریبون کو فون کرنے کے بارے میں سوچا؟''

''کیا عمدہ تجویز ہے؟'' میں نے طنزاً کہا۔ ''واقعی تم ایک رپورٹر ہو جو کبھی اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھتا۔ میں اور میرا مؤکل وہاں فون کر چکے ہیں لیکن وہ لیڈر کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے۔''

ڈون نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تم چاہتے ہو کہ میں ٹیلی فون کے ذریعے کوئی جادو دکھاؤں۔ اس کے لیے مجھے طویل فاصلے کی کالز کرنا پڑیں گی جن میں کافی پیسے خرچ ہوجائیں گے۔''

''بے فکر رہو، جو خرچ ہوگا وہ میں دوں گا یا تمہیں کسی اچھے ریستوران میں لنچ کروا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے فون اٹھاتے ہوئے ایک سنگل نمبر ڈائل کیا اور بولا۔ ''شرلے، میں نیوز روم سے ڈون بول رہا ہوں۔ کیا تم شکاگو ٹریبون میں ڈینو وینڈل سے میری براہِ راست بات کروا سکتی ہو؟''

اس نے فون واپس کریڈل پر رکھ دیا اور بولا۔ ''ڈینو وینڈل پہلے یہیں کام کیا کرتا تھا لیکن اچھے معاوضے اور جھیل مشی گن دیکھنے کے شوق میں وہ شکاگو چلا گیا۔ کال ملنے میں تقریباً دس منٹ لگ سکتے ہیں۔ تمہیں کوئی اور بات کرنا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔

اس نے میز پر سے بوسٹن گلوب کا تازہ شمارہ اٹھا کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''کسی کونے میں بیٹھ کر اس اخبار کا مطالعہ کرو۔ دس منٹ بعد واپس آجانا۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے لیا اور سرخیوں پر نظر دوڑانے لگا۔ کوئی خاص خبر نہ تھی جو میرے لیے دلچسپی کا باعث ہوتی۔ میں نے اخبار تہ کر کے ایک خالی میز پر رکھا اور نیوز روم میں ٹہلنے لگا۔ وہاں دیواروں اور ستونوں پر پرانے اخبارات کے فرنٹ پیج فریم کر کے آویزاں کیے گئے تھے۔ ان میں وہ اخبارات بھی تھے جو یوم فتح کے بارے میں خبروں سے بھرے ہوئے تھے جب نازی فوج نے اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے اور دوسری جنگِ عظیم کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ میں ایک ایسے اخبار کے سامنے رک گیا جس میں بلج کی لڑائی کا حوالہ دیا گیا تھا۔ اس میں ہزاروں فوجی مارے گئے تھے۔

میرے ذہن میں اس خیمے کا نقشہ گھوم گیا جہاں میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جنگ میں مرنے والے سپاہیوں کی لاشیں کینوس کے تھیلوں میں منتقل کر رہا تھا۔ میرے سامنے دو سپاہیوں کی لاشیں لائی گئیں۔ آرمی سرجن نے ان کا معائنہ کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔ ''ان لوگوں کے سر کے پیچھے بہت قریب سے گولی ماری گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نازیوں نے انہیں جنگی قیدی بنایا اور پھر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

میں نے ان تکلیف دہ یادوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور واپس ڈون کی میز پر چلا گیا۔ وہ بولا۔ ''تم کچھ جلدی آگئے۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور آپریٹر نے بتایا کہ ڈینو بیورنیٹ لائن پر ہے۔ اس نے لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''ہیلو ڈینو، مجھے تمہارے ایک غیر ملکی نامہ نگار گریگ لیڈر کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔ اس نے گزشتہ موسم گرما میں ملازمت چھوڑ دی تھی۔ اگر تم اس کا پتا یا کسی رشتے دار کے بارے میں کچھ بتا سکو۔''

دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا وہ اسے اپنے پیڈ پر لکھتا گیا پھر اس نے فون رکھ دیا اور بولا۔ ''تمہارا مطلوبہ شخص ٹریبون کے لیے کام کر رہا تھا۔ وہ تقریباً ایک سال تک یورپین تھیٹر آف آپریشن میں رہا پھر اس نے آٹھ مئی کو یوم فتح کے موقع پر ایک ٹیلیکس کے ذریعے ملازمت چھوڑنے کی اطلاع دی۔ اس کے بقایا جات میونخ کے ایک فوجی پوسٹ آفس کو بھیج دیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ اور کوئی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔''

اگلے روز میں معمول سے پہلے بیدار ہوگیا۔ لباس تبدیل کر کے میں نے ٹیکسی کی اور ساؤتھ اسٹیشن کی جانب روانہ ہوگیا۔ یہ شہر کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن تھا جہاں سے مختلف علاقوں کے لیے ٹرینیں چلتی تھیں۔ عمارت میں نصب کلاک میں سات بج کر پچاس منٹ ہو رہے تھے اور مختلف قصبوں سے ساؤتھ بوسٹن آنے والوں کی ایک بڑی تعداد اسٹیشن کی عمارت سے باہر آرہی تھی۔ انہیں منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے پیلی ٹیکسیاں ایک قطار میں کھڑی تھیں۔

میں مرکزی دروازے پر کھڑا ہنستے مسکراتے مردوں اور عورتوں کو باہر آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد راشن بندی ختم ہوچکی تھی اور عورتیں میک اپ کے ساتھ بہترین لباس میں نظر آرہی تھیں۔ میں نے اپنی گھڑی بلڈنگ میں لگے ہوئے کلاک سے ملائی اور انتظار کرنے لگا۔ آٹھ بج کر پانچ منٹ بعد وہ شخص مجمع میں سے برآمد ہوا جس کا مجھے انتظار تھا۔ اس کا حلیہ ہوبہو وہی تھا جو رونی نے مجھے

بتایا۔ تقریباً چھ فٹ قدم، مضبوط جسامت، سنہرے بال۔ چھوٹے کان، گال پر زخم کا نشان۔ اس نے گہرے سرمئی رنگ کا سوٹ، ہلکے زرد رنگ کی قمیص اور نیلی ٹائی لگا رکھی تھی۔ وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے اپنا منہ بند رکھا اور اس کے پیچھے چل دیا۔

ایک آدمی کا تعاقب کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ خصوصاً جب وہ کوئی مشتبہ شخص ہو۔ آپ کو بار بار یہ کوشش کرنا ہوتی ہے کہ کہیں اسے یہ معلوم نہ ہوجائے کہ کوئی اس کا تعاقب کررہا ہے لیکن گریگ کے معاملے میں مجھے ایسی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ اپنی دھن میں مست چلا جارہا تھا پھر وہ ایک ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ چند منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کافی کی گتے کی پیالی اور ایک خاکی کاغذ کا لفافہ تھا۔ میں نے اس کا فارگو اسٹریٹ کے اختتام تک پیچھا کیا۔ جب تک وہ ایک گھڑیوں اور زیورات کی دکان میں داخل نہ ہوگیا۔

میں نے باہر لگے ہوئے بورڈ پر نظر ڈالی۔ برونسٹین فائن جیولز۔ میں چند منٹ باہر کھڑا رہا۔ پھر دکان میں چلا گیا۔ وہاں بہت سارے شیشے کے شوکیس اور ڈسپلے رکھے ہوئے تھے جبکہ ایک کونے میں کام کرنے کی جگہ تھی۔ گریگ لیڈر اسی عقبی حصے میں سفید کوٹ پہنے کام کررہا تھا۔ مجھے وہاں ایک اور شخص نظر آیا جو اس دکان کا منیجر معلوم ہورہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی تھی۔ میں نے اسے اپنا کارڈ دکھایا اور مالک سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

دو منٹ بعد دکان کے عقبی حصے میں واقع دفتر سے دکان کا مالک برونسٹین نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے اپنی سفید قمیص کی آستین اوپر تک چڑھا رکھی تھی۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا۔ ”کہو کیا بات ہے؟“

میں چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ ”کوئی خاص بات نہیں ہے مسٹر برونسٹین۔ میں تمہارے ایک ملازم گریگ لیڈر کے ماضی کے بارے میں چھان بین کررہا ہوں۔ دراصل وہ ایک بڑی بیمہ پالیسی خرید رہا ہے۔ اسی سلسلے میں اس کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔“

میری بات سن کر وہ پُرسکون ہوگیا۔ اس نے جو کچھ مجھے بتایا۔ اس کے مطابق گریگ لیڈر اس کی دکان پر گزشتہ چھ ماہ سے کام کررہا تھا۔ وہ ایک خاموش طبع شخص ہے اور اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ اس لیے کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ سب سے پہلے کام پر آتا اور سب سے آخر

میں جاتا تھا۔ اس دوران اس نے کوئی چھٹی نہیں کی تھی۔ وہ ڈورچیسٹر کے علاقے میں کہیں رہتا تھا۔

''اس کے علاوہ اور کچھ؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، مجھے یقین ہے کہ اس نے جنگ میں بھی حصہ لیا تھا گو کہ اس نے کبھی اس بارے میں بات نہیں کی۔ ایک دن سڑک پر ایک حادثہ پیش آیا۔ ٹرک پر سے ایک بڑا سیمنٹ کا بلاک زمین پر گر گیا۔ اس کے گرنے سے اتنا زوردار دھماکا ہوا جیسے کوئی بم پھٹ گیا ہو اور وہ بے چارہ گریگ دہشت زدہ ہو کر کاؤنٹر کے نیچے دبک گیا۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے مصافحہ کیا اور بولا۔ ''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو کیا تم اس گفتگو کو خفیہ رکھ سکتے ہو؟''

''بالکل۔'' اس نے کہا۔ ''تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو۔ میں نہیں چاہوں گا کہ وہ یہاں سے چلا جائے بلکہ میری خواہش ہے کہ اس جیسے تین آدمی اور مل جائیں۔''

دفتر واپس آیا تو رونی سلور راہداری میں کھڑا... میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکا اور بولا۔ ''کیا رہا؟ تم نے کچھ معلوم کیا؟''

پہلے میں نے سوچا تھا کہ اسے اپنے دفتر میں بٹھاؤں گا اور اگر ممکن ہوا تو کافی بھی پلاؤں گا۔ لیکن اس کی زبان سے یہ بات سن کر میرا ارادہ بدل گیا۔ جب ہم پہلی بار ملے تو وہ خاصا گھبرایا ہوا لگ رہا تھا لیکن اس بار لگ رہا تھا کہ جیسے وہ پھٹ پڑنے کو تیار ہے۔

''ابھی تو ابتدا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جب کام ختم ہو گا تو تمہیں بتا دوں گا۔''

''کیا؟ تم مجھے موجودہ صورتِ حال کے بارے میں رپورٹ نہیں دو گے؟ اب تک تم نے کیا معلوم کیا؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میرا یہ طریقہ نہیں ہے۔ جب کام مکمل کر لوں گا تو تمہیں اس کی رپورٹ مل جائے گی، اس سے پہلے نہیں۔''

''یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''ممکن ہے کہ تمہاری نظر میں نہ ہو۔'' میں نے دفتر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر تم اسے پسند نہیں کرتے تو کسی دوسرے سراغ رساں کا بندوبست کر لو۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

یہ کہہ کر میں دفتر میں چلا گیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ دوسرے دن میں نے اپنے ایک دوسرے مؤکل کے لیے اس کی بیوی کی نگرانی کی جس کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ وہ اس سے بے وفائی کر رہی ہے جب میں نے اس کی نگرانی کی تو یہ شبہ درست نکلا۔ وہ واقعی اس کے چھوٹے بھائی سے پیار کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ اس کے بعد دفتر واپس آ گیا۔ وہ ایک سرد دن تھا اور میں ایک بڑے کام کے لیے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک میرے دماغ میں ایک بات آئی۔ میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھائی۔ ایک نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ ''میکلین اسپتال۔''

''مجھے اس شعبے سے بات کرنی ہے جو مریضوں کو داخل کرتے ہیں۔''

''ہولڈ کریں۔'' کچھ دیر بعد ایک دوسری آواز سنائی دی۔ ''ایڈمیشن سے مس ٹرنر بول رہی ہوں۔''

''گڈ آفٹر نون مس ٹرنر۔'' میں نے اپنی آواز میں سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بوسٹن آفس سے رالف سوینی بول رہا ہوں۔ ہم زخمی اور بیمار فوجیوں کے اسپتالوں میں داخلے کا انتظام کرتے ہیں۔''

''ہیلو، مسٹر سوینی۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم بہت مصروف ہو۔ اس لیے تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' میں نے اپنے لہجے میں عاجزی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''دراصل ہمارے ریکارڈ میں کچھ گڑبڑ ہے۔ میں تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ فلاڈیلفیا سے تعلق رکھنے والا رونالڈ سلور تمہارے ذہنی امراض کے شعبے میں زیرِ علاج ہے۔ ہم اس بات کو یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ میکلین اسپتال کو تمہاری عمدہ خدمات کے عوض فوری ادائیگی کی جا سکے۔''

''ہولڈ کرو۔ میں ریکارڈ دیکھ کر بتاتی ہوں۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا اور ریسیور میز پر رکھ دیا پھر مجھے فائل کیبنٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ بمشکل ایک منٹ بعد ہی اس نے دوبارہ ریسیور اٹھا لیا اور بولی۔ ''یہ درست ہے مسٹر سوینی، وہ ہمارے یہاں بیرونی مریض ہے اور اسے فرینڈ را اسپتال نے بھیجا تھا۔''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے اپنا پین انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔ ''بہت بہت شکریہ۔ وہ پینتالیس ویں انفنٹری میں رہ چکا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ہمارے ریکارڈ کے مطابق وہ پینتالیس ویں نہیں بلکہ ننانوے ویں انفنٹری ڈویژن

میں تھا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے؟'' میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔

اس کا لہجہ یکا یک بدل گیا اور وہ عجیب سی آواز میں بولی۔ ''میں اس شعبے کی انچارج ہوں اور تم مجھ سے ذمّے داری کی توقع رکھ سکتے ہو۔''

اس سے پہلے کہ وہ فون بند کرتی' میں نے پوچھا۔ ''غالباً یہ ڈویژن فرانس میں تھا؟''

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتی۔ ہمارے ریکارڈ کے مطابق وہ بیلجیم میں تھا پھر وہ چھ مہینے جرمنی میں جنگی قیدی رہا۔

اس روز سہ پہر میں گھر واپس جاتے ہوئے میں نے گریگ لیڈر کا پیچھا کرنا شروع کیا جو اپنی دکان سے نکل کر ساؤتھ اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اسٹیشن کی مرکزی عمارت میں داخل ہوا جس کے صدر دروازے پر ریلوے کے ملازمین کارڈ لیے اپنے مطالبات کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ میں گریگ کا تعاقب کرتے ہوئے اسٹیشن میں داخل ہو گیا۔ وہ ڈورچیسٹر جانے والی ٹرین میں سوار ہو رہا تھا۔ میں نے بھی ٹکٹ لے کر اس کی تقلید کی۔

ڈورچیسٹر، بوسٹن کے جنوب میں واقع ایک نواحی قصبہ تھا۔ دوسرے امریکی صدر جان ایڈمز یہیں پیدا ہوئے۔ اس کے علاوہ یہاں فورریور شپ یارڈ بھی تھا جس میں جنگ کے دوران نیوی کے لیے کئی جہاز تیار کیے گئے۔ لیڈر اسٹیشن سے دو بلاک کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی عمارت میں رہتا تھا۔ میں نے اس پر مسلسل نظریں جمائے ہوئے تھیں۔ وہ راستے میں ایک گروسری اسٹور پر رکا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا لفافہ تھا۔ وہ عمارت سڑک کے دوسری جانب تھی اور وہ گراؤنڈ فلور پر رہتا تھا۔

میں نے دو منٹ بعد سڑک پار کی اور اس کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہ اپنا کوٹ، ٹائی اور ہیٹ اتار چکا تھا اور اس کا چہرہ بے خوف نظر آ رہا تھا۔

''مسٹر لیڈر؟ گریگ لیڈر؟''

''ہاں، میں ہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''کیا چاہتے ہو؟''

میں نے اسے اپنا کارڈ دکھایا تو اس کے منہ سے ہلکی سی سیٹی کی آواز نکلی اور وہ بولا۔ ''تم کس بارے میں تحقیقات کر رہے ہو؟''

''مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''کیوں نہیں، آ جاؤ۔''

اس کا اپارٹمنٹ چھوٹا لیکن صاف ستھرا تھا۔ ہر چیز ترتیب اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ عقب میں ایک چھوٹا سا کچن تھا جبکہ لیونگ روم میں کاؤچ، کافی ٹیبل، دو آرام کرسیاں اور ایک بڑا سا ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ کافی کی میز پر بوسٹن پوسٹ، لائف اور ٹائم میگزین کے شمارے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر لیڈر! میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔''

''بہت اچھا۔'' اس نے کہا۔ ''کیا تم اپنے بارے میں بتاؤ گے؟''

''میری خدمات ایک ایسے شخص نے حاصل کی ہیں جو تمہیں تلاش کر رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک فوجی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ جنگ کے دوران تم ایک جنگی نامہ نگار کے طور پر اس کے یونٹ کے ساتھ تھے۔''

''ہاں، ٹھیک ہے۔ میں نے کچھ عرصہ ٹریبون کے لیے کام کیا تھا۔ لیکن وہ مجھے کیوں ڈھونڈ رہا ہے؟''

''اس کا کہنا ہے کہ تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ ختم ہونے پر اسے وہ تصویریں بھیج دو گے جو تم نے محاذ پر کھینچی تھیں۔''

''ہاں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اچانک ہی وہ اپنی عمر سے دس سال زیادہ نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میں نے بہت سے لوگوں سے یہ وعدہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے نام اور پتے بھی نوٹ کر لیے تھے پھر جنگ ختم ہو گئی۔ میں نے تباہ شدہ شہر، امریکی بچوں اور فوجیوں کی لاشیں دیکھیں۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔''

اس نے ایک طویل سانس لی اور دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ''میں نے دل برداشتہ ہو کر اپنے اخبار کو ٹیلیکس بھیجا کہ اب میں ان کے لیے مزید کام نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے اپنی نوٹ بک اور کیمرا جنوبی فرانس میں ہی کہیں پھینک دیا اور امریکا واپس آ گیا۔''

''تم نے بوسٹن کا انتخاب کیوں کیا؟''

''کیوں نہ کرتا؟ یہاں کا ٹکٹ سب سے سستا تھا۔ اس لیے بوسٹن آنے کو ترجیح دی۔ مجھے یہ شہر پسند آیا اور

یہاں ملازمت بھی مل گئی۔''

''جیولری کی دکان میں؟''

''اوہ میرے خدا! تم میری نگرانی کر رہے ہو؟''

''معاف کرنا۔ یہ میرے کام کا حصہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے جیولری کی دکان کا انتخاب کیوں کیا؟''

''میں نے اسکول کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ایک اسٹور میں ملازمت کی تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ بڑی عجیب بات لگتی ہے لیکن مختلف یونٹوں کے ساتھ رہنے، ان کا کھانا کھانے، کیچڑ اور مٹی میں چلنے، گولیوں اور بموں کی آوازیں سننے کے بعد میں پُرسکون زندگی گزارنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اسٹور کی ملازمت بالکل مناسب ہے۔ شام کو کام ختم ہونے کے بعد آپ گھر آ جاتے ہیں اور کسی قسم کا ذہنی دباؤ یا تھکاوٹ نہیں ہوتی۔''

''کیا تمہیں اخبار کی ملازمت یاد نہیں آئی؟''

''بالکل نہیں بلکہ میں تو خوش ہوں کہ محاذ سے صحیح سلامت واپس آ گیا۔ میرا ایک دوست تھا ارنی پاٹل۔ اسے چاہیے تھا کہ میری طرح وہ بھی جنگ کے خاتمے پر واپس آ جاتا لیکن وہ بے وقوف بحرالکاہل چلا گیا اور گولی کا نشانہ بن گیا۔''

میں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر لیڈر! زحمت دینے کے لیے معذرت خواہ ہوں، مجھے خوشی ہے کہ تم نے اندر آنے کی اجازت دی۔''

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ کیا میں اس فوجی کا نام جان سکتا ہوں جو مجھے تلاش کر رہا ہے؟''

''معاف کرنا۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔''

''اوہ! میں سمجھ گیا۔''

وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میں چند قدم آگے بڑھا اور یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ وہاں رونی سلور سیدھے ہاتھ میں سیمی آٹومیٹک پستول لیے ہوئے کھڑا تھا۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''ہائے رونی!''

''وہ اندر ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' رونی نے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ اور پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کی سفید قمیص بھی گیلی ہو چکی تھی اور اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں لیکن اس نے بہت مضبوطی سے پستول پکڑا ہوا تھا۔

''رونی، دیکھو یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ میرا مطلب ہے......''

وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''بلی! میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور شکر گزار ہوں کہ اپنا کام بخوبی انجام دے رہے ہو لیکن اگر تم فوراً ہی اندر واپس نہیں گئے تو میں پلک جھپکنے میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

میں نے اپنے سر کو حرکت نہیں دی لیکن کن انکھیوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ فٹ پاتھ بالکل خالی تھی۔ صرف چند کاریں اور بسیں سڑک پر نظر آ رہی تھیں۔ رونی نے کہا۔ ''یہ مت سمجھنا کہ ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے بوڑھے لوگوں، سپاہیوں اور ان نوجوانوں کو مارا ہے جو اپنے آپ کو فوجی ظاہر کر رہے تھے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اندر چلتے ہیں۔ تم پُرسکون رہنا۔''

''میرے بارے میں پریشان مت ہو، چلو۔''

میں واپس لیڈر کے دروازے پر گیا اور بے دلی سے دستک دی۔ جیسے ہی لیڈر نے دروازہ کھولا، رونی نے میری گدی پکڑی اور پوری قوت سے مجھے اندر دھکیل دیا۔ لیڈر نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک رونی اندر آ چکا تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور کمرے میں آ گیا۔ میں اور لیڈر اپنے ہاتھ اوپر اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ رونی کمرے کے وسط میں پستول تانے کھڑا ہوا تھا۔

''ہینز۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''کتیا کی اولاد۔ میں تجھے بہت عرصے سے تلاش کر رہا تھا۔ اس وقت تجھے اپنے سامنے دیکھ کر بہت حیرت ہو رہی ہے۔''

رونی ایک قدم آگے بڑھا اور اس نے لیڈر کی پنڈلی پر زوردار لات رسید کی۔ وہ بُری طرح چلایا اور کاؤچ پر جا گرا۔ رونی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ''کیوں تکلیف ہو رہی ہے لیکن اس کا موازنہ اس سے نہیں کیا جا سکتا جو تم نے میرے اور دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ کیا۔ اوہ ہینز، میں نہیں بتا سکتا کہ کب سے اس دن کا خواب دیکھ رہا تھا۔''

اب میرے بولنے کی باری تھی۔ ''رونی! تم نے مجھ سے اپنے سروس ریکارڈ کے بارے میں جھوٹ بولا۔ تم جنگی قیدی تھے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

رونی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''جنگی قیدی تو بہت معصوم سا اور عام سا لفظ ہے، نہیں بلی، میں اس سے بہت زیادہ تھا اور اس ذلیل انسان نے مجھے اس حال کو پہنچایا۔ ہر گزرتے دن، ہفتے اور مہینے کے ساتھ میری اذیت بڑھتی گئی۔''

لیڈر کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ بناوٹی انداز میں بولا۔

''مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں کہ تم کس بارے میں گفتگو کررہے ہو۔''

رونی نے کہا۔ ''خبردار! کاؤچ سے اٹھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ تمھاری دونوں آنکھوں کے درمیان سوراخ ہو جائے گا۔''

''مسٹرسولیون، یہ شخص پاگل ہوگیا ہے۔ میں نازی سپاہی نہیں ہوں۔''

''یہ جزوی طور پر درست ہے۔'' رونی نے کہا۔ ''یہ نسلاً جرمن ہے۔ اس کی پیدائش کلیولینڈ کی ہے لیکن یہ واپس اپنے آبائی وطن چلا گیا اور اس نے جنگ میں شامل ہو کر لوگوں پر تشدد کرنا اور مارنا شروع کر دیا۔''

میں نے رونی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو کہ اس نے تم سے دورانِ قید بدسلوکی کی؟''

رونی میری طرف گھوما لیکن اب بھی اس کے پستول کا رخ لیڈر کی جانب ہی تھا۔ ''میں کسی جنگی کیمپ میں قید نہیں تھا بلکہ بلج کی لڑائی کے دوران اپنی پلٹن کے ہمراہ گرفتار ہوگیا تھا اور جب ہمیں محاذ سے پیچھے بھیجا جارہا تھا تو مجھے اپنے ساتھیوں سے الگ کر دیا گیا۔ نازیوں کو معلوم تھا کہ میں یہودی ہوں۔ اس لیے میرے علاوہ سب لوگوں کو قید خانے بھیج دیا گیا اور مجھے ایک خاص جگہ پر رکھا گیا جہاں میری اس شخص ہینز کیسلر سے ملاقات ہوئی۔ اس خاص جگہ کا نام ڈچاؤ تھا۔''

''لیکن ڈچاؤ...... وہ تو ایک نظربندی کیمپ تھا۔'' میں نے کہا۔ ''جبکہ تم ایک سپاہی تھے۔''

رونی نے ایک اور زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ انہوں نے میری اس حیثیت کی پروا کی ہوگی۔ انہیں صرف یہ معلوم تھا کہ میں یہودی ہوں۔ وہاں دنیا بھر سے یہودیوں کو لاکر رکھا گیا تھا اور چند مجھ جیسے امریکی اور ہینز جیسے جرمن نژاد امریکن بھی شامل تھے۔''

رونی کی آواز اچانک ہی بھرّا گئی اور وہ بولا۔ ''یہ میرے پاس اس وقت آیا جب مجھے پہلی بار مار پڑی۔ مجھے ننگا کر دیا گیا اور پہننے کے لیے ایک باریک سا پاجامہ دے دیا۔ اس نے کہا کہ وہ امریکی ہے اور میرا خیال رکھے گا۔ مجھے اس کی بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے میرا یہ خیال رکھا کہ زیادہ مار پڑنے لگی۔ زیادہ کام کروایا گیا اور زیادہ تشدد کیا گیا۔''

میں نے کاؤچ پر بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے؟''

اس کا چہرہ ابھی تک سرخ تھا، وہ بولا۔ ''میرا نام گریگ لیڈر ہے اور میں ایک گھڑی ساز ہوں۔ البتہ پہلے میں ٹریبون کے لیے رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ ایسی باتیں کیوں کررہا ہے مسٹر سولیون۔'' اس نے کاؤچ سے اٹھنے کی کوشش کی اور کہا۔ ''ہمیں پولیس کو بلانا چاہیے۔ وہی یہ مسئلہ حل کرے گی اور......''

رونی نے تیزی سے حرکت کی اور قریب آکر پستول کی نال گریگ لیڈر کے سر سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ ہمیشہ اپنی جان بچانے کی فکر کرتے ہو جیسا کہ ڈچاؤ میں ہوا تھا۔ جب امریکی ہمیں آزاد کرانے کے لیے آئے تو زیادہ تر لوگ بیرکوں سے باہر آگئے لیکن چند ایک نے دو محافظوں کو پکڑ کر اتنا مارا کہ ان کی موت واقع ہوگئی اور جب امریکی فوجیوں نے وہاں لاشوں کا ڈھیر دیکھا تو انہوں نے وہاں موجود تمام محافظوں کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے گولی ماردی۔''

رونی نے لمحہ بھر توقف کیا اور بولا۔ ''لیکن میں ہینز کو تلاش کررہا تھا۔ مجھے اس سے ان تمام تکلیفوں کا حساب چکانا تھا۔ اس نے مجھ پر بے پناہ تشدد کیا۔ مجھے گھنٹوں برف میں کھڑا رکھا۔ مجھے کھانے کو نہیں دیا۔ پھر وہ مجھے نظر آ گیا۔ میں نے ایک شخص کے ساتھ اسے عمارت میں داخل ہوتے دیکھا جو دیکھنے میں سپاہی لگ رہا تھا لیکن اس کے بازو پر جنگی نامہ نگار کا بیج لگا ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے اس شخص کو بھی کوئی کہانی سنائی ہوگی۔ میں نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی لیکن بہت زیادہ کمزور ہوجانے کی وجہ سے اس تک نہیں پہنچ سکا۔''

لیڈر نے کہا۔ ''مسٹر سولیون! تم جانتے ہو کہ یہ پاگل ہے۔ پولیس کو فون کرو۔ تبھی ہم اس مسئلے کو حل کرسکتے ہیں۔''

''خاموش رہو۔'' رونی نے کہا۔ ''بعد میں کچھ لوگوں سے سنا کہ ٹریبون کا نامہ نگار لیڈر لاپتا ہوگیا ہے اور انہیں کمانڈنٹ کے دفتر میں ایک نازی افسر کی لاش ملی جس کا سر غائب تھا جیسے اس نے اپنے منہ میں پستول رکھ کر خود کو ہلاک کرلیا ہو۔ میں سمجھ گیا کہ کیا ہوا ہوگا۔'' پھر وہ گریگ لیڈر کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔ ''تم نے اس مرنے والے کی وردی پہن کر اس کی شناخت اختیار کرلی۔''

لیڈر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میں وہاں ڈچاؤ میں تھا۔ میں نے وہاں بہت کچھ دیکھا، بہت سی تصویریں اتاریں۔ میں وہاں سے نکلنا چاہ رہا تھا۔ اس لیے میں نے ایسا کیا۔ میں وہاں نہیں رہ سکتا تھا۔''

میں نے اپنے مؤکل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''رونی! یہ پستول مجھے دے دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس کی اصلیت کو بے نقاب کر دوں گا اور اسے فرار کا موقع نہیں ملے گا۔ میرا وعدہ ہے کہ سچ کو سامنے لاؤں گا۔''
لیڈر نے اپنا منہ بند رکھا جبکہ رونی بدستور اس کے سینے کی جانب پستول تانے کھڑا رہا۔ اس نے کہا۔ ''تمہارا وعدہ ہے کہ میری مدد کرو گے۔''
''ہاں۔''
''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم میرا پستول لے سکتے ہو۔''
لیڈر کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ دوسرے ہی لمحے رونی نے کہا۔ ''جب میں اپنا کام ختم کرلوں۔'' اور اس کے ساتھ ہی اس نے لیڈر کے سینے میں تین گولیاں اتار دیں۔
میں گولیوں کی آواز سننے کا عادی تھا لیکن کبھی کسی بند کمرے میں اس کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہ بہت زوردار آواز تھی۔ لیڈر پیچھے کی جانب لڑھکا اور میں نے کرسی سے چھلانگ لگا دی اور لیڈر کے قریب پہنچ کر اس کی قمیص سامنے سے پھاڑ کر دیکھی۔ اس کے سینے کے وسط سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ وہ مزید چند سیکنڈ ہوش میں رہا پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔
رونی نے پستول میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
''میرا کام ختم ہو چکا ہے۔''
میں نے پستول لے کر اس کا میگزین نکالا اور اسے اپنے کوٹ کی بائیں جیب میں رکھ لیا پھر میں نے اس کا چیمبر خالی کیا۔ وہ مجھے اعشاریہ بتیس کا لگ رہا تھا۔ میں نے وہ خالی پستول اپنے کوٹ کی دوسری جیب میں رکھ لیا۔ رونی نے کچھ بولنا چاہا لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ میں دوبارہ لیڈر کی لاش کے پاس گیا اور اس کی تلاشی لینے لگا، پھر میں نے اس کا والٹ کھول کر دیکھا اور اس میں سے مختلف کارڈز نکال کر میز پر رکھنے لگا۔ ڈرائیونگ لائسنس، سوشل سیکیورٹی کارڈ، شکاگو ٹریبون کا پریس کارڈ اور امریکی فوج کا نامہ نگار کا پاس۔
رونی مسکراتے ہوئے بولا۔ ''نازی فوجی تشدد، قتل اور دھوکا دہی کے ماہر تھے۔ اس نے بھی یہودیوں کے اخبار میں ملازمت کرلی۔ کون سوچ سکتا ہے کہ وہاں کوئی نازی جنگی مجرم بھی ہوگا۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ ہینز کیسلر جیسا نازی افسر اپنے لیے جعلی کاغذات بنوا سکتا ہے؟''
میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا تو وہ بولا۔ ''صرف میری خاطر ایک چیز چیک کرلو۔ اگر میرا شبہ غلط نکلا تو میں ہر بات کا اعتراف کرلوں گا۔''
''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''اس کی قمیص ہٹاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''اور اس کے بازو کا اوپری حصہ دیکھو۔ تمہیں وہاں ایک ٹیٹو ملے گا۔''
مجھے نہیں معلوم کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے ہینز کی قمیص کو پیچھے سے پکڑ کر اوپر کیا اور اس کے دائیں بازو کی آستین اتاری۔ وہاں کوئی ٹیٹو نہیں تھا۔
''مجھے افسوس ہے رونی۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں کوئی ٹیٹو نہیں ہے۔''
''دوسرا بازو دیکھو۔'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''وہاں ضرور ہوگا۔''
میں نے دوبارہ وہی عمل دہرایا۔ اس کے بائیں بازو پر واقعی ایک ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ میں نے لاش کو سیدھا کیا اور بولا۔ ''تم نے ٹھیک کہا۔ اس کے بازو پر AB کا ٹیٹو بنا ہوا ہے۔''
رونی بولا۔ ''زیادہ تر نازی فوجی اپنے خون کے گروپ کے حروف کا ٹیٹو بنواتے تھے تاکہ اگر وہ زخمی ہو جائیں تو انہیں فوری طور پر ان کے گروپ کا خون مل سکے۔ تمام جرمن ڈاکٹرز کو سختی سے ہدایت تھی کہ نازی فوجیوں کو علاج کے سلسلے میں ترجیح دی جائے۔''
پھر مجھے یاد آیا کہ اپنے آپ کو گریگ لیڈر کہنے والا یہ شخص جب سگریٹ سلگا رہا تھا تو اس نے امریکیوں کی طرح انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کے بجائے انگوٹھے اور انگشت شہادت کے درمیان سگریٹ پکڑی اور یہ طریقہ جرمنوں کا تھا۔
''اب کیا کرنا ہے؟'' رونی نے پوچھا۔
''تم نے کہا تھا کہ میری مدد چاہتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''کیا اب بھی تم یہی سوچ رہے ہو؟''
''بالکل۔''
''میں تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔''
رونی نے الجھتے ہوئے پوچھا۔ ''کس سلسلے میں؟''
میں نے پلٹ کر کاؤچ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اس دشمن کی لاش کو ٹھکانے لگانے میں۔'' گریگ لیڈر کی شناخت ظاہر ہونے کے بعد میں بھی اسے اپنا دشمن سمجھنے لگا تھا۔ وہ امریکی نہیں بلکہ نازی جرمن تھا۔ اس نازی فوج کا سپاہی جس نے میرے ہزاروں ہم وطنوں کو تشدد کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

آپ اپنے دام میں

ایس۔ انور

اکثر بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ دل ربا اور خوب صورت خواتین ذہانت سے محروم ہوتی ہیں... ذہین اور ہوشیار خواتین خوب صورتی سے لیکن بعض ایسی خوش نصیب عورتیں بھی ہوتی ہیں جن کے پاس بیک وقت ظاہری حسن بھی ہوتا ہے اور ذہن کی تیزی بھی۔ ایک ایسی طرح دار عورت کا فسانہ... ایک حادثے نے اس کی خوب صورت زندگی کا دیا بجھا دیا...

فنکارانہ ذہن کے شاطرانہ منصوبے کا چونکا دینے والا اختتام......

یہ پندرہ مئی کی سہ پہر کا واقعہ ہے جب ڈھائی بجے کے لگ بھگ ایک سیاہ رنگ کی کیڈی لاک کار ایک پہاڑی سڑک پر تیز رفتاری سے نیچے آتے ہوئے حفاظتی جنگلے کو توڑتی ہوئی جنوبی کیلی فورنیا کے اس پہاڑی علاقے میں گھنے خودرو پودوں سے بھری گہری تنگ گھاٹی میں جا گری۔

ایک عینی شاہد نے جب یہ حادثہ دیکھا تو وہ ٹوٹے ہوئے حفاظتی جنگلے کے پاس رک گیا اور اس نے اپنے سیل فون سے نائن ون ون پر فون کر دیا۔

جب ایمرجنسی ورکرز گھاٹی میں پڑی تباہ شدہ کار تک پہنچے تو انہیں کار کے اندر جارج ولبر اور اس کی جوان بیوی پالین کی مسخ شدہ لاشیں دکھائی دیں۔

اسی سہ پہر ایک پولیس مکینک نے یہ دریافت کیا کہ کار کی بریک لائنز ناکارہ کی گئی تھیں جس کے سبب کار کو یہ حادثہ پیش آیا تھا۔

پولیس نے اس کیس کا باضابطہ ڈبل ہومی سائڈ کے طور پر اندراج کر لیا۔

جارج اور پالین کا حویلی نما مکان اسی پہاڑی کی چوٹی پر بنا ہوا تھا اور جائے حادثہ سے تقریباً ایک میل کی بلندی پر واقع تھا۔ ہومی سائڈ اسکواڈ نے اس مفروضے کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ کار کے بریکوں میں خرابی پہاڑ کی چوٹی پر واقع اسی حویلی نما مکان میں کی گئی تھی، اس روز کے واقعات اور صبح حویلی میں آنے والے مہمانوں کے بارے میں تفتیش سے اپنے کام کے آغاز کا فیصلہ کیا۔

حویلی کی غمزدہ ملازمہ نے آنسو بہاتے ہوئے انہیں اس روز صبح صرف دو مہمانوں کی آمد کے بارے میں بتایا۔ ایک مہمان ایڈم ولبر تھا جو جارج ولبر کا بیٹا تھا اور اس کی پہلی شادی کی نشانی تھا۔ دوسرا مہمان ہورلیس ہالبائر تھا جو جارج ولبر کا بزنس پارٹنر تھا اور اس سے خفا تھا۔

کیپٹن کریگ کی فوری دلچسپی کا مرکز جارج ولبر کا بیٹا ایڈم ولبر تھا جس کی عمر بیس برس سے کچھ اوپر تھی۔ اس ناپختہ نوجوان نے کئی پیشوں میں اپنا مستقبل بنانے کی کوشش کی تھی جیسے ریسٹورنٹ کا کاروبار، فلم پروڈیوسر، آرٹسٹ لیکن اسے کسی میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ بالآخر اس نے ایک فیشن مزاج آرٹ گیلری کھولنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس کے ہر کیریئر کے لیے مالی امداد اس کے شفیق باپ نے کی تھی۔ حتیٰ کہ جارج کی دوسری بیوی پالین کی آمد ہوگئی۔ پالین عمر میں ایڈم سے صرف ایک سال بڑی تھی اور وہ اس بات پر خفا تھی کہ جارج اپنی دولت اپنے اکلوتے بیٹے پر فیاضی سے لٹا رہا ہے۔

جارج سے شادی کے چند ماہ بعد ہی پالین نے جارج کے تمام مالی معاملات کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا اور عین اس وقت ایڈم کو وراثت سے محروم کر دیا جب وہ اپنی حد سے بڑھ کر مہنگی آرٹ گیلری کے عظیم الشان افتتاح کی تیاریاں کر رہا تھا۔

”میں اس روز صبح تقریباً نو بجے حویلی پہنچ گیا تھا۔“ ایڈم نے اپنے حلفیہ بیان میں کہا۔ ”میں حقیقت میں اپنی آرٹ گیلری میں بے حد مصروف تھا لیکن ڈیڈی کا اصرار تھا کہ میں ہر بدھ کے روز صبح ناشتا ان کے ساتھ کیا کروں۔ اس روز بھی میں نے ناشتا ان کے پاس حویلی میں جا کر کیا۔ پھر ڈیڈی سوئمنگ کے لیے چلے گئے۔ پالین نے مجھ سے کہا کہ میں ڈیڈی کی کار کا آئل تبدیل کر دوں۔ اس سلسلے میں ڈیڈی کی اپنی مخصوص عادت تھی۔ وہ اپنی کار کا آئل خود ہی چینج کیا کرتے تھے۔ پالین نے کہا کہ ڈیڈی کی عمر اس قابل نہیں رہی کہ وہ یہ کام خود کریں۔ ایسا نہ ہو کہ انہیں کوئی چوٹ وغیرہ آجائے۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔ اس لیے میں نے کار کا آئل چینج کر دیا اور لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے وہاں سے نکل آیا۔ اس وقت ہلکی لیکن مسلسل بارش گرنا شروع ہوگئی تھی۔“

ایڈم نے ان دونوں سے رخصت ہوتے وقت جو الوداعی الفاظ ادا کیے تھے وہ اپنی آرٹ گیلری کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی یاددہانی تھی۔ یہ افتتاح سہ پہر تین بجے ہونا تھا اور وہ جارج اور پالین دونوں کی اس تقریب میں آمد کا شدت سے منتظر تھا۔ وہ حویلی سے سیدھا اپنی آرٹ گیلری آگیا تھا اور اس وقت تک وہیں پر تھا جب اسے ان دونوں کی کار کے حادثے میں ہلاک ہونے کی اطلاع دی گئی۔

حویلی میں دوسرے مہمان کی آمد ایڈم کے وہاں سے رخصت ہونے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی۔

”مجھے چند کاغذات پر جارج کے دستخط لینے تھے۔“ ہورلیس ہالبائر نے پولیس کو بتایا۔ ”جب سے جارج نے دوسری شادی کی تھی، وہ کمپنی کے معاملات کو نظرانداز کر رہا تھا۔ جیسے کہ اس کا بچپن لوٹ آیا تھا۔ وہ شاذونادر ہی دفتر آتا تھا۔ میں کاغذات پر دستخط کرانے کے لیے کسی سیکریٹری کو بھی اس کے پاس بھیج سکتا تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ چند کلائنٹس سے ملنے کے لیے ڈیلس پرواز کر جاتا، میں جارج سے کاروباری معاملات میں سنجیدگی اختیار کرنے کے بارے میں براہِ راست بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو وہ سوئمنگ پول میں تھا۔ ہمارے درمیان ایک گرماگرم بحث رہی اور پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ اس وقت دوپہر کے سوا بارہ بج رہے تھے۔ میں وہاں سے اپنی کار میں واپس سیدھا دفتر آگیا تھا۔“

اسی روز شام کو پالین کی بہترین سہیلی سوزی یونکرز نے مقامی پولیس اسٹیشن فون کیا۔ ”میں ایک گمشدہ فرد کی رپورٹ درج کرانا چاہتی ہوں۔“ اس نے ایمرجنسی ڈسپیچر کو بتایا۔ ”اس کا نام پالین ولبر ہے۔ اس کو شام پانچ بجے شاپنگ پر

جانے کے لیے میرے پاس آتا تھا۔ وہ کبھی بھی لیٹ نہیں ہوتی۔ اسے اپنے سوتیلے بیٹے کی آرٹ گیلری سے ڈرائیو کر کے براہ راست میرے پاس آنا تھا کیونکہ اس کے شوہر نے ڈیلس کی ایک بزنس فلائٹ پکڑنے کے لیے سیدھا ائرپورٹ چلے جانا تھا۔ میں نے اس کے سوتیلے بیٹے ایڈم کی آرٹ گیلری کو فون کیا تو پتا چلا کہ ان دونوں میاں بیوی میں سے کوئی بھی وہاں نہیں پہنچا تھا۔ وہ دونوں کئی گھنٹوں سے غائب ہیں۔''

پولیس ڈسپیچر نے پالین کی سہیلی کو مشورہ دیا کہ وہ ٹیلی وژن آن کرے اور نیوز دیکھ لے۔ یوں سوزی یونگرز کو ان دونوں میاں بیوی کی موت کے بارے میں پتا چلا تھا۔

کیپٹن کریگ اپنے ڈاؤن ٹاؤن آفس میں بیٹھا۔ اس کیس کے اب تک کی دستاویزات کو الٹ پلٹ کر ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی اور میئر کا دفتر مجرم کو حراست میں لینے کے لیے اس کی گردن پر سوار تھے اور اس کا جینا دوبھر کیا ہوا تھا۔

کیپٹن کریگ کے ایک ہاتھ میں جارج ولبر کی وصیت تھی۔ وصیت کے مطابق جارج کی تمام جائداد اور دولت کی وارث اس کی بیوی پالین تھی۔ وصیت نامے کی قانونی توثیق سے قبل پالین کی موت کی صورت میں وہ تمام جائداد اور دولت جارج کے سابقہ وارث ایڈم کو منتقل ہو جانا تھی۔

''یہ ایک عمدہ جواز ہو سکتا ہے۔'' کیپٹن کریگ بڑبڑایا۔

کریگ کے دوسرے ہاتھ میں جارج ولبر کے ہورلیس ہالبائر کے ساتھ پارٹنرشپ کا معاہدہ نامہ تھا۔ معاہدے کی رو سے جارج کی موت کی صورت میں کمپنی میں جارج کے حصص براہ راست اس کی حیات بیوی کے نام ٹرانسفر ہو جانے تھے۔ اگر وہ بھی زندہ نہیں رہتی تو کمپنی مکمل طور پر دوسرے بانی پارٹنر ہورلیس کو منتقل ہو جائے گی۔

''ایک اور عمدہ جواز!'' کیپٹن کریگ نے کہا۔

اس حادثے کے بارے میں میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ یہ تھی:

''حفاظتی جنگلے سے کار کے ٹکراتے ہی دونوں میاں بیوی کی موت واقع ہو چکی تھی۔ جارج ولبر ڈرائیور سیٹ پر تھا اور اس نے سیٹ بیلٹ باندھی ہوئی تھی۔ اس کے زخم توقع کے عین مطابق تھے۔ ٹوٹی ہوئی گردن اور ٹوٹی ہوئی ریڑھ کی ہڈی، دیگر غیر مہلک فریکچرز، متعدد اوپری چوٹیں۔ مسز پالین نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھی ہوئی تھی۔ اس کے تمام زخم

اور چوٹیں تقریباً اوپری تھیں۔ البتہ اس کے سر کے عقبی حصے میں ایک کاری گہرے زخم کا نشان تھا۔ اس مخصوص زخم کی بدرنگی اور سوجن یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہ زخم اس کی موت سے خاصا پہلے لگا تھا۔ اس زخم میں سفید پتھریلے ذرات موجود پائے گئے تھے۔ میں نے مسز پالین کے لباس کا جائزہ بھی لیا۔ اس کے لباس کا پچھلا حصہ گیلا اور گندہ تھا اور اس پر اسی قسم کے سفید پتھریلے ذرات موجود تھے جو اس کے سر کے عقبی حصے کے گہرے زخم میں پائے گئے تھے۔''

ہومی سائڈ اسکواڈ نے جارج ولبر کے گیراج کا معائنہ کیا اور انہوں نے اپنی کرائم سین رپورٹ میں ان باتوں کی نشاندہی کی:

''گیراج کے فرش پر عین اسی جگہ جہاں کار پارک کی گئی تھی، تیل کا ایک بڑا سا دھبا موجود پایا گیا۔

''گیراج میں موجود دوسری کار پر جو سرخ رنگ کی پورشے تھی کہیں بھی ایڈم یا ہورلیس کی انگلیوں کے نشانات موجود نہیں پائے گئے۔ یہ کار پالین کی تھی۔ نہ ہی پورشے کار کے بریکوں سے کوئی چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی۔

''حویلی اور گیراج کے تقریباً درمیان میں سفید پتھروں کی روش پر خون کے قطرے موجود پائے گئے۔ اس مقام کے اطراف میں روڑی بھی منتشر دکھائی دی۔

تباہ شدہ کار کے معائنے کی رپورٹ یہ تھی۔

''چونکہ کار بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی تھی اس لیے اس کے چیسز پر سے کسی قسم کے نشانات کی بازیابی ناممکن تھی۔ البتہ ڈرائیور سائڈ کی ایش ٹرے میں ایک مڑی تڑی رسید دریافت ہوئی۔ یہ خریداری کی ایک کمپیوٹرائزڈ رسید تھی جو جارج ولبر کی پہاڑی کے دامن میں واقع ایک کنوینینس اسٹور کی جاری کی ہوئی تھی۔ یہ دودھ کے ایک ڈبے اور سگریٹ کے ایک کارٹن کی خریداری کی رسید تھی اور اس پر پندرہ مئی کی تاریخ اور دوپہر بارہ بج کر اکتالیس منٹ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اسٹور کی کلرک نے رسید کے حوالے سے بتایا کہ کار میں آنے والا خریدار تنہا تھا اور کار وہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے خریدار کا جو حلیہ بتایا وہ جارج ولبر کا حلیہ تھا۔

اسٹور کلرک کے شہادتی بیان نے پولیس کو مشکل صورت حال سے دوچار کر دیا۔ اگر کار کے بریک دوپہر بارہ بج کر اکتالیس منٹ پر درست کام کر رہے تھے تو پھر نہ ہی ایڈم ولبر اور نہ ہی ہورلیس کار کے بریکوں میں کوئی گڑبڑ کر سکتے تھے۔

کیپٹن کریگ اس حادثے کے جرم میں کسی کو بھی حراست میں لینے سے قاصر رہا۔

لیکن جب ایڈم ولبر نے وہ حویلی فروخت کی تو سامان منتقل کرنے والوں کو پالین کے میٹریس کے نیچے چھپی ہوئی ایک ڈائری ملی۔ اس پرائیویٹ ڈائری میں پالین نے اپنے شوہر کو قتل کرنے اور اپنے سوتیلے بیٹے کو پھانسنے کے منصوبے کی تفصیل درج کی ہوئی تھی۔

کروڑ پتی بوڑھے جارج ولبر سے شادی ہونے کے بعد پالین کے ذہن میں اسے قتل کرنے کا منصوبہ تشکیل پانے لگا۔ اس نے سوچا کہ وہ ایڈم کو کار کا آئل تبدیل کرنے کو کہے گی تاکہ کار کے نچلے چیسز پر ایڈم کی انگلیوں کے نشانات ثبت ہو جائیں۔ پھر وہ تیل تبدیل کرنے والے آلات ضائع کر دے گی اور کار کے بریکوں کو خود ناکارہ بنا دے گی۔ پھر جارج کے مرنے کے بعد وہ پولیس کو یہی بتائے گی کہ پہلے اس کا ارادہ جارج کے ہمراہ سفر کرنے کا تھا اور ایڈم ان دونوں کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

ان تمام معلومات کی روشنی میں کیپٹن کریگ نے بکھرے ہوئے ٹکڑے جوڑنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا۔

اپنے بزنس پارٹنر ہورلیس کے جانے کے بعد جارج نے اپنی کار نکالی اور پہاڑی کے دامن میں واقع کنوینینس اسٹور سے دودھ اور سگریٹ لینے چلا گیا۔ اس کی واپسی کے ایک گھنٹے بعد پالین نے کار کی بریکوں کو ناکارہ کر دیا۔

پھر لگ بھگ دوپہر دو بج کر پچیس منٹ پر وہ دونوں حویلی سے نکل کر اپنی اپنی کاروں کی جانب چل دیے۔ لیکن پالین اتفاق سے اپنی پورشے کار تک پہنچنے سے پہلے ہی بارش میں بھیگی روش کے پتھروں پر پھسل گئی اور گرتے ہی کاری زخم آنے کے نتیجے میں بے ہوش ہو گئی۔ جارج یہ منظر دیکھ کر ہیجان میں مبتلا ہو گیا اور اپنی زیادہ عمر کی پروا کیے بغیر کسی نہ کسی طرح اپنی بے ہوش بیوی پالین کو اٹھا کر کار تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا ارادہ اسے پہاڑی کے دامن میں واقع قصبے کے اسپتال کے ایمرجنسی روم لے جانے کا تھا تاکہ اسے فوری طبی امداد مہیا کی جا سکے۔

حتمی نتیجہ یہ رہا کہ پالین نہ صرف اپنے منصوبے کے مطابق اپنے شوہر کو قتل کرنے میں کامیاب رہی بلکہ خود اپنے آپ کو بھی ہلاک ہونے سے نہ بچا سکی۔

بدنصیب

سلیم انور

کچھ کاوشیں ایسی ہوتی ہیں... جو عمر بھر الجھائے رکھتی ہیں... کوشش کے باوجود انسان اس کے سود و زیاں سے دامن نہیں چھڑا پاتا... ایک ایسے ہی تخلیق کار کی دلی خواہش کا قصہ... وہ عرصۂ دراز تک تکمیلِ خواہش کے انتظار میں دن گنتا رہا... یہاں تک کہ فیصلے کی گھڑی آپہنچی...

سراہے جانے کے جنون میں مبتلا ایک مصنف کا آغاز و انجام......

نیلی فلیش کرتی ہوئی روشنیوں میں لاؤنج جگمگا رہا تھا۔ ٹیرنس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑکی کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ جب اس نے ریوالور اپنے منہ میں رکھا تو ریوالور کے اسٹیل کی ٹھنڈک اسے اپنے دانتوں میں محسوس ہونے لگی۔

سائرن کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ٹیرنس نے آنسوؤں سے تر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

ٹیرنس میک کوئی برا آدمی نہیں تھا۔ حالات نے اس کا مقدر ہی کچھ ایسا لکھا تھا۔ اس نے ریوالور کے ٹریگر پر اپنی

انگلی کا دباؤ بڑھایا تو اس کی پوری زندگی اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزرنے لگی...... اس کی غیر اہم اور رقت آمیز زندگی!

وہ ہمیشہ سے ایک ہی چیز کا خواہاں رہا تھا۔ وہ اپنی شناخت چاہتا تھا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اس نے اپنی آنکھیں کھول لیں اور کمپیوٹر کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کا تازہ ترین ناول کمپیوٹر کے اسکرین کی زینت بنا ہوا تھا۔ تازہ ترین اور بے حیثیت ناول!

لگاتار شدید محنت سے بھرپور وہ شب و روز...... وہ شدید ذہنی تناؤ، غصے اور جھنجلاہٹ کی کیفیت...... لیکن کس لیے؟

ٹیرنس اب تک بارہ ناول لکھ چکا تھا۔ ان میں سے ہر ایک ناول مکمل کرنے کے بعد وہ خود کو یقین دلاتا تھا کہ اس نے ایک بیسٹ سیلر ناول لکھ دیا ہے لیکن ہر مرتبہ اس کا ناول مسترد ہو جاتا تھا۔ یکے بعد دیگرے رد کیے جانے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

ان لٹریری ایجنٹس کو کیا پتا؟ شاید انہوں نے اس کے ناولز کو پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی ہو۔ اس کی تحریروں کو فضول اور ناکارہ سمجھا گیا ہوگا جیسے کہ ٹیرنس خود تھا...... فراموش کیا ہوا اور مسترد کردہ!

یہ خیال ہر وقت اس کے ذہن پر مسلط رہتا تھا کہ ایک بیسٹ سیلر ناول نگار کی حیثیت سے اس کی شناخت بن جائے۔ ناول نگاری اس کی پہچان بن جائے۔ اس کی اسی ذہنی اثر زدگی کی بنا پر اس کی بیوی کرسٹائن اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ”تم اپنی فیملی سے زیادہ اپنی تحریروں کے بارے میں سوچتے رہتے ہو۔ تمہیں اپنی فیملی، اپنی بیوی بچوں کی قطعی پروا نہیں ہے۔“ وہ اس پر مسلسل طنز و ملامت کرتی رہتی تھی۔

شاید وہ اپنی جگہ درست تھی۔ ٹیرنس نے برسوں سے خود کو اپنی فیملی سے جدا کیا ہوا تھا۔ لکھنا پڑھنا ہی اس کا اوڑھنا بچھونا بن چکا تھا اور اس کی بیوی کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والے کافی کے کپ اور اسنیک تیار کرتی رہتی۔

جہاں تک اس کے بچوں سارہ اور پال کا تعلق تھا تو وہ ہمیشہ پیسے دے کر انہیں ٹال دیا کرتا تھا تاکہ وہ اس کی تصوراتی دنیا میں مخل نہ ہونے پائیں۔

اور اب وہ بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

اس نے پائیدان پر پڑے ہوئے خط کی جانب دیکھا۔ غالباً اس کے ناول کے رد کیے جانے کا ایک اور خط آ گیا ہے۔

شیشہ ٹوٹنے کی آواز نے اس کے تصورات کے سلسلے کو منتشر کر دیا۔ وہ لوگ اسے پکڑنے کے لیے آ رہے ہیں۔

اپنی بدحال اور اذیت ناک زندگی میں وہ جس ایک چیز سے سب سے زیادہ خوف زدہ ہوتا تھا وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہونے کا خوف تھا۔ اس خوف کا مضحکہ خیز پہلو یہ تھا کہ وہ اپنی تمام زندگی اپنے بیڈ روم میں تنہا اور سب سے الگ تھلگ لکھنے لکھانے میں مصروف رہا تھا لیکن جیل کی کوٹھری کی تنہائی سے اسے خوف محسوس ہوتا تھا۔ وہ خوف محصوری کا مریض بن چکا تھا۔

اسے کلاک کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ کلاک کی سوئی کی ہر حرکت اسے اپنی منزل سے قریب تر لے جا رہی تھی۔ اسے موت سے متعارف کرانے کے لیے۔

اتنے میں داخلی دروازے پر ٹھوکریں پڑنے اور اس کے ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے مسلح پولیس والوں کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

ٹیرنس نے فوراً ہی اپنے منہ میں رکھے ہوئے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔

پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

ایک روز قبل!

ٹیرنس دی پلازاتامی ریسٹورنٹ کے سائے میں کھڑا ہوا تھا۔ ہلکی بارش پڑ رہی تھی اور اس کے نرم براؤن بال بھیگ کر اس کی چندیا سے چپکے ہوئے تھے۔ لیکن وہ موسم کی اس کیفیت سے قطعی بے نیاز تھا۔

اس کے منتشر ذہن پر بس ایک ہی دھن سوار تھی...... جیمز نولان سے ملاقات!

اس نے جیمز نولان اور اس کے ہمراہ ایک اور شخص کو ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ ٹیرنس نے رومال سے اپنے چہرے کو خشک کیا تو اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ وہ اطمینان سے چلتا ہوا ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ وہ سیدھا اس میز پر پہنچ گیا جہاں لٹریری ایجنٹ اور اس کا مہمان بیٹھ چکے تھے اور مینیو کارڈ کا جائزہ لے رہے تھے۔

میز پر موجود شمعوں کی جھلملاتی روشنی میں جیمز نولان کے چہرے کے نقوش نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی نظریں ٹیرنس پر جمی ہوئی تھیں جو اس کی میز کے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔ جیمز نولان کے چاندی جیسے بال سلیقے سے

تراشیدہ تھے۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں دکھائی دے رہی تھیں جو اس کی دولت مندی کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ یقیناً یہ ٹھاٹ باٹ ان مصنفوں کی محنت کے عوض حاصل ہوا تھا جن کی نمائندگی وہ کیا کرتا تھا۔

''مسٹر نولان!'' ٹیرنس نے اسے مخاطب کیا۔ ''تم مجھے نہیں جانتے لیکن تم نے میری کچھ تحریریں پڑھی ہوں گی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے وہ سب کچھ پڑھا ہے جو میں نے ہمیشہ لکھا ہے۔''

جیمز نولان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ''ایکسکیوزمی۔ اگر تم مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہو تو مجھ سے اپائنٹمنٹ لو جیسا کہ ہر کوئی لیتا ہے۔''

ٹیرنس نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر نولان میں نہایت عجز و احترام کے ساتھ یہ باور کرادوں کہ میں نے صرف ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی بار تم سے اپائنٹمنٹ لینے کی کوشش کی لیکن تمہاری چاپلوس سیکریٹری نے ہر مرتبہ مجھے دھوکا دے دیا۔''

ٹیرنس کی بلند آواز پر ریسٹورنٹ میں موجود دیگر گاہکوں نے اپنی توجہ ان کی میز کی جانب مبذول کرلی۔ نولان ان کی جانب دیکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں مسکرا دیا۔

''تم نے کیا بتایا، تمہارا نام کیا ہے؟''

''میں نے نام نہیں بتایا لیکن نام ٹیرنس میک لسکی ہے۔''

نولان مسکرا دیا۔ اس کے پرفیکٹ سفید دانت جگمگا رہے تھے۔ ''آہ ہاں میک لسکی...... ہمیشہ ڈٹے رہنے والا میک لسکی!''

''مسٹر نولان! میں اخلاقاً بس ایک چھوٹی سی بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ بس مجھے یہ بتادیں کہ آخر میری تحریر میں کیا خامی ہے۔ بس میں یہی پوچھنا چاہتا ہوں؟''

نولان نے اپنے ادھیڑ عمر مہمان کی جانب دیکھا اور مسکرانے لگا۔ پھر اپنی توجہ ٹیرنس کی جانب مبذول کرتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر میک لسکی، میں سال میں صرف دو یا تین مصنفوں کو قبول کرتا ہوں جیسے کہ یہ مسٹر لی جو یہاں موجود ہیں۔ تمہیں یہ لازمی احساس ہوگا کہ مجھے ہر ہفتے سیکڑوں مسودے موصول ہوتے ہیں جن میں سے بیشتر فضول اور کچرا ہوتے ہیں۔ صاف بات یہ ہے کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہاری غلطیوں کی نشاندہی کرسکوں اور تمہاری تحریر پر تبصرہ کرسکوں۔''

''فضول! کچرا! تم بد دماغ، متکبر! بیشتر نام نہاد فضول، کچرا مصنف ایک دن میں مسلسل بارہ گھنٹے اور ہفتے کے ساتوں دن لکھنے ہی میں مصروف رہتے ہیں...... تم نے مجھے ذہنی مریض بنا دیا ہے۔''

''اگر تم نے اپنی بات مکمل کر لی ہے تو مسٹر میک لسکی، میں معذرت چاہوں گا کیونکہ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''نہیں، میں نے اپنی بات ختم نہیں کی، قابل نفرت آدمی! تم کسی بیسٹ سیلر کو اس وقت تک پہچان نہیں سکتے جب تک وہ تمہارے مطمئن چہرے پر دے کر نہ مارا جائے۔''

''جارج!'' نولان نے منیجر کو متوجہ کیا۔ ''برائے مہربانی کیا تم اِس شخص کو ریسٹورنٹ سے باہر نہیں نکال سکتے، پلیز؟''

اس سے قبل کہ اسے ریسٹورنٹ سے باہر نکالا جاتا، ٹیرنس نے میز پر موجود شراب کا گلاس اٹھایا اور سرخ وائن ایجنٹ نولان کے چہرے پر پھینک دی۔

☆☆☆

ٹیرنس ریسٹورنٹ کے باہر اپنی کار میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی دہکتی آنکھیں کار کے ونڈ اسکرین کے وائپرز پر جمی ہوئی تھیں جو اپنے مخصوص انداز میں حرکت کر رہے تھے اور بارش کے قطروں کو ونڈ اسکرین پر ٹھہرنے نہیں دے رہے تھے۔ ٹیرنس نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُس کے آدھے سر کے درد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اتنے میں نولان اور اس کا مہمان بھی ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ اپنی بی ایم ڈبلیو میں سوار ہونے سے قبل نولان نے اپنے مہمان سے الوداعی مصافحہ کیا اور اسے رخصت کرنے کے بعد اس نے اپنی کار بھی آگے بڑھا دی۔

ٹیرنس نے نولان کی برانڈ نیو کار کا تعاقب شروع کر دیا۔ اُس کے اندر کا طیش اس طرح بڑھ رہا تھا جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑنے کا منتظر ہو۔

دس منٹ بعد نولان کی کار بیلکر یویا میں واقع اس کے عالیشان گھر میں داخل ہو گئی۔ ٹیرنس نے اس عالی شان عمارت کا بھرپور جائزہ لیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کتنے گھنٹوں کی تحریر کے نتیجے میں وہ ایسی رہائش کا مالک بن سکتا ہے۔

وہ نولان کو اپنے گھر میں داخل ہوتا دیکھتا رہا۔ اس نے اندر داخل ہونے کے بعد تمام روشنیاں آن کر دیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ نولان اپنے گھر میں اس وقت تنِ تنہا ہے۔

ٹیرنس نے اپنی کار کے گلوو کمپارٹمنٹ میں رکھا ہوا اپنا ریوالور نکال لیا۔ گن میٹل کے اسٹیل کی ٹھنڈک اسے اپنے رگ و پے میں سرایت کرتی محسوس ہوئی۔ اس نے ایک بڑا سا فولڈر اپنے کوٹ کے نیچے رکھ لیا تاکہ اسے بارش سے بچا سکے۔

ٹیرنس بارش میں چلتا ہوا نولان کے داخلی دروازے تک جا پہنچا اور انتظار کرنے لگا۔ جب اس نے دروازے کی گھنٹی کا بٹن دبایا تو اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی دھڑکن بھی اپنی معمول کی رفتار سے دگنی ہو گئی۔

وہ دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر جونہی دروازہ کھلا اُس نے پوری قوت سے دروازے کو دھکا دے دیا۔ ایجنٹ نولان فرش پر جا گرا۔

ٹیرنس، زمین پر گرے ہوئے نولان پر جھک گیا اور حیرت زدہ ایجنٹ کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اپنے ریوالور کی نال اس کی کھوپڑی پر لگا دی۔

''نہیں، ایسا مت کرو، پلیز!''

''کہو پلیز مسٹر میک لسکی!'' ٹیرنس غرایا۔

''پلیز مسٹر میک لسکی!''

''اب......'' ٹیرنس نے ایک گندی گالی دیتے ہوئے کہا۔ ''اب تم اپنے مرنے کا انتظار کرو۔ جب تک ہم اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں۔''

وہ نولان کے ڈیلکس لاؤنج میں داخل ہو گئے۔ ٹیرنس نے نولان کو سرخ لیدر آرم چیئر پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ پھر وہ خود اطمینان کے ساتھ لاؤنج میں ٹہلنے لگا اور وہاں کی ہر شے کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا۔

بیش قیمت لکڑی کے تختوں سے جڑی دیواروں پر عالی شان پینٹنگز کے ساتھ کئی ایک سرٹیفکیٹ بھی سجے ہوئے تھے۔ لاؤنج کے ایک کنارے پر ایک بڑا سا گرانڈ پیانو رکھا ہوا تھا۔

''یہ بتاؤ نولان، کیا تم شادی شدہ ہو؟''

''نا...... نا...... نہیں۔'' نولان نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''گڈ! تب تو کوئی بھی تمہیں مس نہیں کرے گا۔ ہے نا؟'' ٹیرنس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''پلیز، اگر تمہیں رقم چاہیے تو میرے پاس......''

''شٹ اپ! زمین کے نکمے اور بد دماغ آدمی! کیا تمہارے خیال میں، میں یہاں تمہیں لوٹنے کے لیے آیا

ہوں......؟ میں چاہتا ہوں کہ تم اِسے پڑھو۔‘‘ یہ کہتے ہوئے ٹیرنس نے اپنے ناول کا مسودہ نولان کی جانب بڑھا دیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی جبکہ ایجنٹ نولان کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔

’’ہاں، میں خوشی کے ساتھ اِسے پڑھوں گا۔ اگر تم اپنا پتا چھوڑ جاؤ تو......‘‘

ٹیرنس نے ریوالور کی نال نولان کے گلے پر رکھ دی۔ ’’میرے خیال سے تم نے میری بات نہیں سمجھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اِسے ابھی پڑھو۔‘‘

’’ابھی؟‘‘

’’ہاں، ابھی۔‘‘

نولان نے فولڈر میں رکھا ہوا ناول نکال لیا۔ اس کے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے۔

’’مجھے بتاؤ نولان، کیا تم نے کبھی بھی میرا کوئی مسودہ پڑھا تھا؟ میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔‘‘

’’میرے پاس لوگ ہیں جو میرے لیے مسودے پڑھتے ہیں۔ اگر مسودے میں کچھ جان ہوتی ہے تو پھر وہ مسودے کو میری طرف بڑھا دیتے ہیں۔‘‘ نولان نے بتایا۔

’’اور کیا میرے ناولز میں سے کوئی ایک بھی کبھی تمہاری طرف بڑھایا گیا تھا؟ میں سچی بات سننا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے جھوٹ بولا تو مجھے پتا چل جائے گا۔‘‘

’’نن...... نن...... نو، آئی ایم سوری۔ میں نے اُن میں کبھی کوئی نہیں پڑھا۔‘‘

’’ویل، اب تمہیں یہ پڑھنا ہوگا...... پڑھو۔‘‘

خوف زدہ ایجنٹ نولان نے مسودہ اٹھایا اور ناول کو پڑھنا شروع کر دیا۔

’’بلند آواز سے! میں چاہتا ہوں کہ تم اِسے اونچی آواز سے پڑھو۔‘‘ ٹیرنس نے حکم دیا۔

’’ان فورسین سرکم اسٹانسز بائی ٹیرنس میک لسکی!‘‘

نولان صبح تک ناول کو مسلسل بلند آواز سے پڑھتا رہا۔ ٹیرنس اس کے مقابل بیٹھا ناول سن رہا تھا، وہ ہر لفظ، ہر جملے کا بھرپور لطف اٹھا رہا تھا۔

بالآخر وہ ناول کے آخری باب پر آ گیا۔ اس وقت صبح کے سوا سات بج رہے تھے۔

آخری باب مکمل کرنے کے بعد ایجنٹ نولان نے سر اوپر اٹھایا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

’’مسٹر میک لسکی، بلاشبہ یہ ایک آؤٹ اسٹینڈنگ ناول ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اِس سے زیادہ دلچسپ اور پُراثر ناول کبھی نہیں پڑھا۔‘‘

’’تم نے بہت دیر کر دی نولان۔ تم اپنا موقع ضائع کر چکے ہو۔‘‘

’’نہیں، رکو۔ میں سنجیدہ ہوں۔ تمہارا ناول بہت عمدہ اور نہایت خوب تھا۔ آؤ ہم اس واقعے کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ اور میں تمہارا یہ ناول شائع کرا دوں گا۔ ہمارے ہاتھوں میں ایک بیسٹ سیلر ہے سر میک لسکی۔‘‘

’’ہمارے! سوری نولان، غلط ریسپانس ہے۔‘‘

ٹیرنس گولی کو نولان کی پیشانی میں داخل ہوتے دیکھتا رہا۔ وہ لیدر کی کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھا رہ گیا۔ نولان کی پیشانی سے خون ابل رہا تھا۔ ریوالور کی نال سے دھوئیں کا مرغولا اٹھ رہا تھا۔

ٹیرنس مسکرا دیا۔ اس نے اپنے ناول کے بہت سے صفحات ہوا میں اچھال دیے۔ اس کے بدن میں توانائی کی ایک بڑی سی لہر دوڑنے لگی۔ اس کا تاحیات کا مطلوبہ مقصد پورا ہو چکا تھا۔ ایک لٹریری ایجنٹ نے اس کا ناول پڑھ لیا تھا۔ اس کے باوجود کہ اسے علم تھا نولان نے ناول کے نہایت دلچسپ اور پُراثر ہونے کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔

☆☆☆

سراغ رساں جھک کر ٹیرنس کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ ’’یہ کون تھا، جوزف؟‘‘

’’ایک گھٹیا سا مصنف جو طلاق یافتہ تھا اور اس کے دو بچے بھی ہیں۔‘‘

سراغ رساں نے دہلیز پر پڑا ہوا کھلا لفافہ اٹھا لیا اور اس میں موجود خط کو نکال کر پڑھنے لگا۔

’’یہ اتنا گھٹیا مصنف بھی نہیں تھا، جوزف۔‘‘ سراغ رساں نے کہا۔ ’’اس کا تازہ ترین ناول شائع ہونے والا تھا۔‘‘

ٹیرنس میک لسکی کا ناول ’’ان فورسین سرکم اسٹانسز‘‘ دو سال تک بیسٹ سیلر کی فہرست میں شامل رہا۔ لیکن بدنصیب مصنف کو اپنے ناول کو شائع ہوتے دیکھنے اور اپنے نام کو بیسٹ سیلر مصنف کے طور پر شناخت کیے جانے سے آگاہی کا موقع ہی نہیں مل سکا۔

کاش اُس نے اپنی خودکشی والے دن ناول کی اشاعت کی نوید لانے والے خط کا لفافہ کھول کر پڑھ لیا ہوتا!

بائیسویں قسط

انگارے

طاہر جاوید مغل

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی اُن کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیں دار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس بلیک میلنگ سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کر دیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کر دیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ لگ گیا جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوا لیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، اس نے سرغنہ ثاقب کے فرار کا ڈراما رچایا۔ ایک بار پھر پارا ہاؤس میں دھماکے گونج اٹھے۔ تابڑ توڑ گولیاں چلیں اور مقابلے میں سرغنہ ثاقب اور اس کا ساتھی عبرت ناک موت مارے گئے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ثاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔

بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی بھتیجی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ آقا جان کا بیٹا مخالف پارٹی بن چکا تھا اور امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ آقا جان کی بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے جانی گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ زینب محل سے غائب تھی اور انیق کی وجہ سے ہماری گرفت میں تھی۔ ابراہیم کا زینب کے بغیر برا حال تھا۔ آگے دشمن کے علاقے میں جگہ جگہ ناکا بندی تھی۔ قسطینا سے غیر محسوس طور پر تعلقات بڑھتے جا رہے تھے...... جو کئی سرکردہ عہدے داروں کو قبول نہیں تھے اور کمانڈر افغانی نے مجھے طلب کر لیا تھا۔ افغانی نے مجھ سے انتہائی ترشی اور دھمکی آمیز انداز میں بات کی اور باور کرایا کہ میں قسطینا سے دور رہوں۔ مگر زینب کی بات بتا کر میں بازی پلٹ چکا تھا اب افغانی کو میرے بارے میں اپنی رائے بدلنا پڑی۔ ابراہیم کا برا حال تھا۔ مجھے اس کی جان بچانے کے لیے اسے زینب کے بارے میں بتانا پڑا۔ مجھے شروع سے آقا جان پر شک تھا۔ وہ مجھے اغوا کر کے اپنے ٹارچر سیل لے گیا۔ میرے ساتھ جاناں بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ جاناں کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچ گئی وہ زخموں سے چور تھی۔ آقا جان اور حلمی نے خوفناک منصوبہ بندی کی تھی۔ جاناں نے اپنی جان دے کر حقِ نمک ادا کر دیا تھا۔ میں خود بھی سراپا زخم تھا۔ مگر ہر صورت قسطینا تک یہ بات پہنچانا چاہتا تھا کہ اب ریاست پر حملہ ہونے والا ہے۔ دوست آستین کا سانپ ثابت ہوئے تھے۔ امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کر چاروں جانب سے حملہ آور ہوئے تھے۔ پورا شہر اس کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ ان کے قدم اب محل کی جانب بڑھ رہے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

پہلے قسطینا کے سیکریٹری کی آواز آئی، پھر وہ خود فون لائن پر آ گئی۔ ''ہیلو شاہ زائب! کیا کر رہے ہو؟'' اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں، بس سونے کی تیاری تھی۔''

''دیکھو، مجھ سے جھوٹ نہ بولا کرو اور یہ مت بھولو کہ میں تمہاری پرستار بھی ہوں اور پرستار اپنے اسٹار میں ہر خوبی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس میں سچ کی خوبی بھی شامل ہے۔''

''میں نے کیا جھوٹ بولا ہے؟''

''تم بولنے والے ہو...... مجھے بتاؤ تم نے اب تک اسپتال جا کر اپنا معائنہ کیوں نہیں کروایا...... کیا تمہارا ارادہ سچ مچ اپنا بازو کٹوانے کا ہی ہے؟'' وہ بڑے درد سے بولی۔

''نہیں قسطینا! لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگلے چند پہر بڑے نازک ہیں۔ یہ لڑائی کوئی بھی رخ اختیار کر سکتی ہے۔ اس دوران میں اگر میں آپریشن کرا کے بستر پر جا لیٹتا تو میرے لیے بڑی شرمندگی اور دکھ کی بات ہوگی۔ میں نے ڈاکٹر ماریہ سے ٹریٹ منٹ لی ہے۔ انہوں نے نئی بینڈیج بھی کر دی ہے۔ میں اب کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔''

''تم پرلے درجے کے ضدی اور ہٹ دھرم ہو شاہ زائب! تم بہت بڑی بے وقوفی کر رہے ہو اور اس بے وقوفی کے جواز پیش کر رہے ہو۔ میں بہت مایوس ہوئی ہوں۔ میری طرف سے جو مرضی آئے کرتے پھرو۔'' اس نے بڑبڑا کر کھٹاک سے فون بند کر دیا۔

لیکن بیس تیس سیکنڈ بعد ہی فون کی بیل دوبارہ ہونے لگی۔ دوبارہ قسطینا کی کال تھی۔ حسب سابق پہلے سیکریٹری نے بات کی پھر وہ لائن پر آ گئی۔ چند سیکنڈ بعد اس کی قدرے بوجھل آواز ابھری۔ ''سوری شاہ زائب! مجھے غصہ آ گیا تھا۔ مجھے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''آپ سپریم کمانڈر ہیں۔ آپ سوری کہہ کر مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔''

''میں نے کہا ہے نا کہ میں ایک لیجنڈ کی پرستار بھی ہوں۔ اس حوالے سے میری فکرمندی بہت زیادہ ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تمہیں اپنے سامنے ''لائیو'' دیکھ کر اور تم سے مل کر میری پسندیدگی اور چاہت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ کل تم نے جس طرح ایک نہایت خطرناک موقع پر میرے سامنے خود کو ڈھال بنایا اور آخری وقت تک ڈٹے رہے...... میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ میرے لیے وہ یادگار لمحے تھے۔ کاش میں انہیں ہمیشہ کے لیے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر سکتی۔''

میں نے کہا۔ ''چلیں کوئی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے مزید مواقع آ جائیں۔''

''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ تمہیں صحت مند اور تندرست ہونا چاہیے۔ لڑائی رک گئی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ لڑائی رکنے میں بھی تمہاری تجویز کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ امریکن قیدیوں کو سامنے لانے سے رائے زل کی بے رحمی کو

لگام پڑگئی ہے۔ پوری امید ہے کہ اگلے تین چار روز فائر بندی جاری رہے گی اور اس دوران میں شاید خون خرابے سے بچنے کا کوئی راستہ بھی نکل آئے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے بازو کو دوبارہ ''آپریٹ'' کرالو۔ میں سچ کہتی ہوں، میں بہت فکرمند ہوں۔'' آخر میں قسطینا کی آواز جذبات سے بوجھل ہوگئی۔

''لیکن قسطینا......''

''پلیز...... میری خاطر۔'' اس نے میری بات کاٹ کر عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس لہجے میں خاص قسم کی اپنائیت تھی۔

''آپ میری کمانڈر ہیں...... آپ حکم دے سکتی ہیں...... مگر......''

''اگر سپریم کمانڈر مان رہے ہو تو پھر اگر مگر تو نہ کرو...... پلیز۔''

''اوکے!'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

فون کال ختم ہوئی تو میں مخمصے میں پڑ گیا۔ وہ بڑی حد تک درست بھی کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر ماریہ کا بھی یہی کہنا تھا کہ میں اپنے بازو پر ظلم کر رہا ہوں۔ تو پھر کیا کروں؟ اسپتال میں جا کر لیٹ جاؤں۔ بازو کے علاوہ بھی میرے جسم پر کئی شدید چوٹیں آقا جان کی کرم فرمائی کی گواہی دیتی تھیں۔

پتا نہیں میں کب تک سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے نیند آگئی۔ آنکھ کھلی تو دھماکے ہو رہے تھے۔ پہلے تو مجھے لگا کہ شاید سماعت کا دھوکا ہے مگر پھر میں نے بوفرگن کے ہیوی دھماکوں کی آوازیں سنیں۔ یہ شیل ڈی پیلس کے عقبی احاطوں پر فائر کیے گئے تھے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ انیق اور سیف مجھ سے پہلے ہی جاگ چکے تھے۔ انیق نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''بڑی توپ کا فائر آرہا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی ڈی پیلس کی فصیل پر سے جوابی فائر بھی ہونے لگا۔ دھماکوں کی گونج درودیوار میں سرایت کرنے لگی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے جی۔'' سیف نے کہا۔ ''رات کو تو 'جنگ بندی' ہوئی ہے اور دن چڑھتے ہی ختم بھی ہوگئی ہے۔''

''لگتا ہے کوئی فاؤل کھیل رہا ہے۔'' انیق نے کہا۔

''ایسا فاؤل تو کبڈی میں بھی برداشت نہیں ہوتا۔ یہ تو سچی مچی کی جنگ ہے۔'' سیف نے کہا اور اس کا پنجابی خون جوش مار کر اس کے چہرے کو سرخ کرنے لگا۔

بمشکل دو منٹ بعد یہ فائرنگ رک گئی مگر اس مختصر فائرنگ نے اس خوشگوار خیال کو چکنا چور کر دیا کہ اگلے دو تین روز عافیت سے گزریں گے۔ گولہ باری کا آغاز گرے فورس کی طرف سے ہی ہوا تھا۔ کیا وہ کسی طرح کا دباؤ ڈالنا چاہتے تھے یا یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ بڑے حملے کو زیادہ دیر تک ملتوی نہیں رکھیں گے۔ ڈی پیلس کے اہم مقامات پر امریکن قیدیوں کو باندھ دیا گیا تھا، اس کے باوجود گرے فورس اور ایجنسی کی گولہ باری دیدہ دلیری کے زمرے میں ہی آتی تھی۔

اچانک کمانڈر فارس دوڑتا ہوا ہم تک پہنچا۔ وہ مجھے ایک طرف لے جا کر بولا۔ ''برادر شاہ زیب! بہت گڑبڑ ہو گیا ہے۔ قسطینا بی بی اور عزت مآب میں جھگڑا ہونے والا ہے۔ اگر آپ اس جھگڑے کو روکنے کے لیے کچھ کر سکتا ہے تو پلیز کرو۔''

''ہوا کیا ہے؟''

''عزت مآب کے حکم پر ان کے اسپیشل گارڈز نے ان امریکنوں کو کھولنا شروع کر دیا ہے، جن کو کل رات خاص جگہوں پر باندھا گیا تھا۔ قسطینا بی بی بہت زیادہ طیش میں ہے، وہ اسپیشل گارڈز کو روکنے کے لیے جا رہا ہے۔ وہاں ہنگامہ ہو سکتا ہے۔''

اطلاع تشویش ناک تھی۔ میں اور انیق کمرے سے نکلے اور کمانڈر فارس جان کے پیچھے چلتے دوسری منزل کی سیڑھیوں تک پہنچے۔ یہاں پر کل رات جن دو امریکنوں کو ستونوں کے ساتھ باندھا گیا تھا، وہ اب وہاں نہیں تھے۔ یہ منظر کمانڈر فارس جان کی اطلاع کی تصدیق کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کئی جگہوں سے امریکنوں کو کھولا جا چکا ہے۔ شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے جو گولہ باری کی گئی، وہ بھی اسی بدلتی ہوئی صورتِ حال کا نتیجہ تھی۔

دوسری منزل سے ڈی پیلس کا عقبی احاطہ نظر آنے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو گولہ باری کی گئی تھی، اس میں دو تین گولے اس احاطے میں گرے تھے۔ یہاں مجھے لکڑی کے کچھ ٹوٹے ہوئے تختے اور خون کے دھبے نظر آئے۔

فارس جان دانت پیس کر بولا۔ ''خو آپ نے دیکھا ان حرام زادوں کا کرتوت یہ لکڑی کا سارا ٹکڑا تابوتوں کا ہے۔ یہاں دو شہیدوں کا نماز جنازہ ادا کیا جا رہا تھا۔ شہیدوں کی میتوں کو بھی شہید کر دیا گیا ہے۔ کم از کم آٹھ بندوں کا جان گیا ہے۔ زخمی ہونے والا ابھی کافی (کافی) ہے۔''

ہم چند قدم آگے گئے تو بڑے کوریڈور سے قسطینا برآمد ہوئی۔ وہ یونیفارم میں تھی۔ ہولسٹر اس کی پتلی کمر سے ہچکولے کھا رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اور عقب میں اس

کے حفاظتی دستے کے چوکس رائفل مین تھے۔ وہ تمتمائے چہرے کے ساتھ لمبے ڈگ بھرتی ہوئی سامنے والے ٹیرس کی طرف جارہی تھی۔ ہم بھی اس کے ساتھ ہولیے۔ ٹیرس پر پہنچے تو وہاں بھی ہلچل نظر آئی۔ میں نے دیکھا عزت مآب کے اسپیشل گارڈز یہاں کثیر تعداد میں موجود تھے۔ وہ ٹیرس کے آہنی جنگلے سے بندھے ہوئے امریکن قیدیوں کو کھول رہے تھے۔ سرخ ٹماٹر سے چہرے والا ایک فربہ اندام امریکی جو صورت سے ہی کسی بڑے ہوٹل یا نائٹ کلب کا مالک نظر آتا تھا، بلند آواز سے کچھ بول رہا تھا۔ دو اسپیشل گارڈز اس کے پاؤں کی رسیاں کھولنے کے لیے نیچے جھکے ہوئے تھے۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' قسطینا چلائی۔

اسپیشل گارڈز قسطینا کو دیکھ کر ٹھٹکے اور سیدھے کھڑے ہوگئے۔ ''یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟'' قسطینا نے دوبارہ دہاڑ کر پوچھا۔

''یہ عزت مآب کا حکم ہے۔ ہم حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔'' ایک گارڈ نے جواب دیا۔

''تم ان کو نہیں کھول سکتے۔ ان کو باندھنے کا فیصلہ باہمی مشورے سے ہوا تھا، اب اگر ان کو کھولنا ہے تو بھی فیصلہ باہمی مشورے سے ہوگا۔''

''گستاخی معاف یور ہائی نس! ہمیں یہ کام ابھی کرنے کا حکم ہے۔'' گارڈ نے مستحکم لہجے میں کہا اور موٹے امریکی کے پاؤں کھولنے کے لیے دوبارہ جھک گیا۔

قسطینا نے ہولسٹر میں سے اپنا چمک دار ریوالور نکال لیا۔ ''میں کہتی ہوں پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں شوٹ کردوں گی۔''

اسی دوران میں اسپیشل گارڈز کے دستے کے عقب سے عزت مآب ریان فردوس نمودار ہوا۔ اس کے چہرے کے سرخ داغ طیش کے وقت گہرے سرخ بلکہ سیاہی مائل ہو جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا چہرے پر سیاہی کے دھبے ہوں۔ وہ اپنے فربہ جسم کو جھلاتا تیزی سے آگے آیا۔ خونی نظروں سے قسطینا کو دیکھا اور ملائی زبان میں بولا۔ ''یہ میرا حکم ہے۔ تم چلاؤ گولی، میں خود ان کو کھولوں گا۔''

وہ رکوع کے بل جھکا اور اس نے خود اپنے ہاتھوں سے ایک تیز دھار خنجر کو حرکت دے کر امریکی کی مشکیں کاٹ دیں۔ امریکی کو اسپیشل گارڈ نے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ قسطینا غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ریان فردوس پھنکارا۔ ''چلا سکتی ہو تو چلاؤ گولی، مار سکتی ہو تو ماردو مجھے۔ میرا کوئی گارڈ تمہیں نہیں روکے گا۔''

تب وہ چند میٹر کے فاصلے پر ایک اور امریکی کی طرف بڑھا۔ یہ بھی کوئی جواں سال بزنس مین ہی لگتا تھا۔ اسے بھی کھڑی حالت میں جنگلے کے ساتھ باندھا گیا تھا اور اس کا رخ ڈی پیلس کی فصیل نما دیوار کی طرف تھا۔ قسطینا نے اپنے طیش کو حتی الامکان ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''عزت مآب! آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ ہمارے اور ہمارے بچوں کے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔''

ریان فردوس گرجا۔ ''اگر وہ ٹکڑے کرنے پر آہی گئے تو پھر ایسے بھی کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔ تم...... تم کل کی بچی ہو...... اتنی ہی بات کرو جتنی تمہاری حیثیت اور تمہاری عقل ہے۔ یہ تمہاری بھول ہے کہ ان امریکنوں کو یہاں وہاں باندھ کر ہم ان لوگوں کو حملے سے روک سکتے ہیں۔ یہ حملہ تو پھر بھی ہوگا اور زیادہ خوفناک ہوگا۔''

مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں بول پڑا۔ ''عزت مآب! اپنی حیثیت سے بڑھ کر بول رہا ہوں۔ مجھے معاف کیا جائے لیکن جہاں تک مجھ ناچیز کا تجربہ ہے، ان امریکنوں کی ایک جان، ہم لوگوں کی سو جانوں سے زیادہ ''قیمتی'' ہوتی ہے۔

وعدے

بیوی نے روتے ہوئے کہا۔ ''شادی سے پہلے تم کہتے تھے کہ میں شادی کے بعد بھی تم سے اسی طرح پیار کرتا رہوں گا۔ اب تم مجھ سے ہر وقت لڑتے رہتے ہو......''

''اوئے نیک بختا! مجھے کیا معلوم تھا کہ میری شادی تیرے ہی ساتھ ہو جائے گی۔''

غم روزگار

انٹرویو ہو رہا تھا۔ بہت سے سوالات کے بعد انٹرویو کرنے والے نے پوچھا۔ ''آپ کے کتنے بچے ہیں؟''

''چار!''

''بیٹے یا بیٹیاں؟''

''چاروں بیٹے ہیں۔''

''کیا تعلیم ہے ان کی؟''

''ایک ڈاکٹر ہے، دوسرا انجینئر، تیسرا پی ایچ ڈی ہے اور چوتھا!'' موصوف نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''بس کیا بتاؤں...... وہ چور ہے!''

''ایسے پڑھے لکھے گھرانے میں چور؟'' حیرت سے کہا گیا۔ ''آپ نے تو اسے عاق کر دیا ہوگا؟''

''نہیں!'' انہوں نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔ ''کیسے عاق کردوں۔ ہم سب کا خرچ وہی اکیلا پورا کرتا ہے...... باقی تینوں تو ایک مدت سے بے روزگار ہیں۔''

کراچی سے ولید بلال کا استقلال

یہ اپنے ایک ہم وطن کو بچانے کے لیے درجنوں غیر امریکیوں کو قتل کر سکتے ہیں اور اپنی ایک جان کی حفاظت کی خاطر لاکھوں ڈالر کا گولہ بارود برباد کر سکتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے ڈیڑھ سو امریکنوں کی زندگی موت کا سوال ہوگا تو یہ کبھی حملہ نہیں کریں گے۔'' میری بات کو مترجم نے ریان فردوس تک پہنچایا۔

''تم بکواس کرتے ہو۔'' ریان فردوس گرجا۔ ''ان کا حملہ اب ہو کر رہنا ہے اور اگر اس حملے میں ان امریکنوں کا نقصان بھی ہوگیا تو وہ قتلِ عام کر دیں گے اور قیدیوں کو اس طرح باندھنا اور انسانی ڈھال بنانا جنگی جرم بھی ہے......''

قسطینا نے چیخ کر کہا۔ ''اور کیا وہ کوئی جنگی جرم نہیں کر رہے۔ اب تک درجنوں جرم کیے ہیں انہوں نے۔ جان بوجھ کر معصوم بچوں کو مارا ہے، دہشت پھیلانے کے لیے عورتوں کا ریپ کر رہے ہیں اور اب یہ تازہ ترین کارنامہ بھی آپ نے دیکھ لیا ہوگا۔ فائر بندی کے ٹکڑے کر کے جنازوں پر گولہ باری کی ہے۔ بات صرف اتنی ہے عزت مآب کہ...... آپ خوف زدہ ہیں۔ آپ...... ہر قیمت پر جنگ سے بچنا چاہتے ہیں اور قیمت بہت بڑی ہے۔ آپ صرف اپنی جان بچانے کے لیے جاماجی کے ہزاروں لوگوں کو بدترین موت کے حوالے کر دیں گے۔''

''گستاخ...... بے شرم...... اپنی زبان بند کر۔ تو مجھے سب کے سامنے بزدل کہہ رہی ہے اور اگر کوئی اس سے بڑی گالی ہے تو وہ بھی دے لے مجھے...... آج جتنی بھی بھڑاس تیرے دل میں ہے نکال لے...... بلکہ...... بہتر یہ ہے کہ تو مجھے گولی ہی مار دے۔ یہ لے پکڑ...... یہ لے پکڑ...... میرے ہی پستول سے مار دے مجھے۔''

ریان فردوس نے اپنا طلائی دستے والا پستول زبردستی قسطینا کے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کی۔ ساتھ ساتھ وہ مسلسل آگ اُگل رہا تھا۔ پستول نیچے گر پڑا۔ جسے ریان فردوس کے باڈی گارڈ نے اٹھا لیا۔

ریان فردوس بپھرا ہوا دوسرے امریکن قیدی کی طرف بڑھا اور اپنے ہاتھ سے اس کی بندش کاٹنے لگا۔ سب سکتہ زدہ کھڑے تھے۔ قسطینا سمیت کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ ریان فردوس کو اس عمل سے روک سکتا۔ تب وہ تیسرے قیدی کی طرف بڑھا۔ میں نے دیکھا قسطینا غم و غصے کے سبب تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ پھر وہ تیزی سے مڑی اور لمبے ڈگ بھرتی سیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔ اس کے ذاتی دستے کے درجنوں مسلح گارڈز اس کے عقب میں تھے۔ کمانڈر فارس جان اور چند دیگر کمانڈر بھی اس کے ساتھ تھے۔

☆☆☆

بہت سے اہم افراد کا خیال تھا کہ ریان فردوس جو کچھ کر رہا ہے، غلط ہے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ریان فردوس کو روک سکتا۔ قسطینا، بیگم نورل، ابراہیم سب اپنی اپنی جگہ پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ سپاہیوں اور لشکریوں میں اب بھی بے شمار لوگ ایسے تھے جو بند آنکھوں سے ریان فردوس کی اطاعت کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے...... کیونکہ وہ ان کا آقا و مالک تھا۔ اس صورت میں خدشہ تھا کہ دو دھڑے بن جاتے اور ان میں باہمی تصادم ہو جاتا۔ دو تین دن میں ہی صورتِ حال کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ قسطینا اور اس کی ہائی کمان نے نیوسٹی پر ایک زوردار حملے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس مشن کو ''درخت کاٹنے'' کا کوڈ ورڈ دیا گیا تھا۔ درخت تو نہیں کٹے تھے، الٹا انسانوں کی فصل کٹنا شروع ہو گئی تھی اور اس میں بڑا کردار آقا جان کی غداری کا تھا۔ کسی وقت ذہن میں یہ سوال بھی ابھرتا تھا کہ اگر آقا جان، رائے زل وغیرہ سے ملا ہوا تھا تو اس نے برج کلب پر فضائی حملہ کرانے میں ہماری مدد کیوں کی؟ اس کا جواب یہ تھا کہ وہ کبھی کبھی وکٹ کے دونوں جانب کھیلتا تھا۔ اس کا اصل مقصد تو یہی تھا کہ زیادہ سے زیادہ بدامنی پھیلے اور اسے اپنے مذموم مقاصد پورا کرنے کا موقع ملے۔

یہ دوپہر کا وقت تھا۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر ڈی پیلس پر بے یقینی اور خوف کے گہرے سائے تھے۔ پتا چل رہا تھا کہ رائے زل کی والدہ ہاناوانی گرے فورس کے ساتھ ہے اور اس کے حوالے سے ڈی پیلس میں پُراسرار افواہیں گردش کر رہی ہیں۔ لشکریوں میں عجیب سی مایوسی اور دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری طرف حملہ آوروں کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ انہوں نے ڈی پیلس کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ ایک ایک انچ پر توپیں اور ایم آر ایل نصب کر دیے گئے ہیں۔ گرے فورس کے ہیلی کاپٹرز آزادانہ ڈی پیلس پر پروازیں کر رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انیق جوسن کُن لے کر آیا تھا، اس سے پتا چلا تھا کہ ریان فردوس اب براہِ راست رائے زل اور ایجنسی والوں سے مذاکرات کر رہا ہے۔ ریان فردوس کا بڑا بیٹا کمال احمد بھی کسی حد تک اپنے والد اور والد کے ہمنواؤں کا ساتھ دے رہا تھا۔

اسی دوران میں مجھے کمانڈر فارس تیز قدموں سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر تلاطم تھا۔ مجھے

ایک طرف لے جا کر بولا۔ ''برادر شاہ زیب! ام کو لگتا ہے کہ قسطینا بی بی بہت زیادہ پریشان ہے۔ اس نے پچھلے دو گھنٹے سے خود کو کمرے میں بند کیا ہوا ہے۔ کوئی پون (فون) سن رہا ہے، نہ دروازہ کھول رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اب تو موبائل فون بھی کھل گئے ہیں۔ اس کے ذاتی نمبر پر رابطہ کرو۔''

''کیا ہے جی۔ وہ بند کر دیتا ہے۔ امارا خیال ہے کہ آپ اس کو سمجھانے اور تسلی دینے کا کوشش کر سکتا ہے۔ آپ امارے ساتھ چلے تو شاید کچھ بہتر ہو جائے۔''

سیف اپنی دیسی خوراک ڈھونڈنے نکلا ہوا تھا۔ وہ ہر حال میں خوش رہنے والا بندہ تھا۔ تاہم انیق کل سے بجھا بجھا نظر آتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ خانساماں ازمیر طیب کی موت تھی۔ ازمیر طیب اس کا گہرا دوست بن چکا تھا۔ میں نے انیق کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کمانڈر فارس جان کے ساتھ قسطینا کی طرف چل دیا۔

قریباً دس منٹ بعد میں قسطینا کے سامنے اس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس نے بمشکل دروازہ کھولا تھا اور اب بھی سخت مضطرب نظر آ رہی تھی۔ وہ جین اور جرسی میں تھی۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے بے چینی سے کمرے میں چکرا رہی تھی۔ آنکھیں سرخ انگارا تھیں۔

میں نے کہا۔ ''قسطینا! آپ نے ناشتا بھی نہیں کیا، کچھ کھا پی لیں۔''

''میرے خیال میں زہر ہی کھا لیا جائے۔'' وہ عجیب دکھی لہجے میں بولی۔

''آپ اتنی مایوس کیوں ہو رہی ہیں۔ جنگ میں کئی موقع ایسے آتے ہیں جب پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ یہ شکست نہیں ہوتی، وقت کا تقاضا ہوتا ہے۔''

''اس سے پیچھے اور کیا ہٹیں گے ہم؟'' وہ تڑخ کر بولی۔ ''وہ ہمارے گھر میں گھسنے والے ہیں، ہمیں برباد کرنے والے ہیں۔''

''ہم کو حقیقت سے آنکھ نہیں چرانی چاہیے قسطینا۔ ہماری فورس کے پاس ایمونیشن نہ ہونے کے برابر ہے۔ کمانڈر راوان اپنے ساتھیوں کے ساتھ علیحدہ ہو چکا ہے۔ آقا جان اور حلمی وغیرہ ایجنسی کی گود میں جا بیٹھے ہیں۔ لشکریوں کی بڑی تعداد میں خوف پایا جا رہا ہے۔ ایسی صورت میں لڑائی کتنی دیر جاری رکھی جا سکتی ہے؟''

وہ طیش میں بولی۔ ''اگر یہ سب کچھ ہی کرنا تھا تو اس وقت کیوں نہ کر لیا گیا جب ابھی یہاں لاشیں گرنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ میرے والد بھی زندہ تھے۔ سیکڑوں بے گناہ سانس لے رہے تھے۔ جب یہاں قربانیاں دی جا رہی تھیں اس وقت...... یہ شخص پاکستان میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ آج جو کچھ یہاں ہو رہا ہے یہ اسی شخص کی کم ہمتی اور بزدلی کا نتیجہ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں قسطینا...... مگر ہمیں دوسرے پہلو کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اب یہاں جو صورتِ حال بنی ہوئی ہے، اس میں غداری کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ اب اگر گرین فورس کے پاس ایمونیشن نہیں تو اس کی بڑی وجہ آقا جان اور حلمی کی غداری ہے۔''

''تو کیا اب یہ غدار نقصان نہیں پہنچائیں گے؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر کسی معاہدے کے ساتھ رائے زل ڈی پیلس میں داخل ہو گیا تو، آقا جان جیسے لوگ ہمیں معاف کریں گے؟ وہ چن چن کر ان لوگوں کو ماریں گے جن سے نفرت کرتے ہیں۔''

''آپ ایک مفروضے پر بات کر رہی ہیں قسطینا! ابھی ہمیں حالات کا رخ دیکھنا چاہیے اور اپنے آپ کو لڑائی کے لیے پوری طرح تیار رکھنا چاہیے۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں لوگ ہیں جو آپ کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہیں۔''

''لیکن میں کیوں کسی کو کٹ مرنے کا کہوں۔ میں نہیں کہوں گی۔ بالکل نہیں کہوں گی۔'' وہ چلا کر بولی اور اس کی شفاف گردن کی رگیں پھول گئیں۔ ''میں باز آئی ایسی کمانڈری سے، میں باز آئی ایسی لڑائی سے۔ میں لعنت بھیجتی ہوں۔''

اس نے ایک چرمی غلاف کے اندر سے تیز دھار آرمی ڈیگر نکالا اور اپنی گرین یونیفارم کی طرف لپکی۔ یہ یونیفارم قریب ہی اپنے تمغوں سمیت ایک ہینگر پر جھول رہی تھی۔ اس نے وحشت کے عالم میں یونیفارم پر خنجر کے پے در پے وار کرنے شروع کر دیے اور اسے پھاڑ کر رکھ دیا۔

میں اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چلا رہی تھی۔ ''مجھے نہیں چاہیے یہ وردی۔ یہ کچھ نہیں کر سکی۔ کچھ نہیں کر سکی اور تو اور میرے ڈیڈ کی موت کا بدلہ تک نہیں لے سکی۔'' وہ جیسے دیوانی سی ہو رہی تھی۔

میں نے اسے اپنے بازو کے حلقے میں لینا چاہا۔ وہ مزاحمت کر رہی تھی لیکن پھر میرے زخمی بازو کو دیکھ کر وہ ایک دم نڈھال سی ہو گئی۔ اس نے اپنا سر میرے سینے پر ڈال دیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں اسے اپنے ساتھ لگائے لگائے صوفے پر بیٹھ گیا۔ رائے زل کی گرین فورس کے دو

گن شپ ہیلی کاپٹر بہت نیچی پرواز کرتے ہوئے ڈی پیلس کے اوپر سے گزر رہے۔ پروں کی پھڑپھڑاہٹ جیسے فرشتہ اجل کے پروں سے مشابہ تھی۔ میں نے اس کا کندھا سہلاتے ہوئے کہا۔ ''قسطینا، آپ کو اس طرح ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ ہر مشکل کے بعد آسانی کا امکان ہوتا ہے۔ یہ ادیب اور شاعر لوگ جو یہ بات کہتے ہیں کہ رات جتنی اندھیری ہوتی ہے، صبح اتنی ہی قریب ہوتی ہے، کچھ غلط نہیں کہتے۔ ہارتا تو دراصل وہی ہے، جو امید کا دامن چھوڑتا ہے۔ میں نے اتنے وسیع پیمانے پر ہونے والی لڑائی میں تو کبھی حصہ نہیں لیا مگر Ring کے اندر کئی بڑے مشکل مرحلوں سے گزرا ہوں اور میں نے سیکھا ہے کہ جہاں بندے کی ہمت جواب دینے والی ہوتی ہے وہاں اکثر کامیابی آس پاس ہی کھڑی ہوتی ہے۔''

وہ جیسے کراہ کر بولی۔ ''اب میں کیا ہمت کروں؟ جاماجی کا اصل مالک اور مختار تو وہی بندہ ہے نا، جو اپنے ہاتھوں سے امریکنوں کی رسیاں کھول رہا ہے اور ان رسیوں سے ہم سب کے لیے موت کا پھندا تیار کر رہا ہے۔ کاش ہم اس عمل کو روک سکتے...... مجھے لگتا ہے ہمارے بہت سے شہیدوں کی روحیں تڑپ اٹھی ہوں گی اور ان میں میرے پیارے والد کی روح بھی ہوگی۔ وہ ہر رات میری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ قسطینا! میرے قاتل کا کیا ہوا؟ اس شخص کا کیا ہوا جس نے میرا خون بہانے کے بعد جشن منایا تھا اور مٹھائیاں تقسیم کی تھیں۔''

وہ بولتی جارہی تھی اور سسک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے رسنے والی نمی میری قمیص میں سرایت کر رہی تھی۔ آج پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ بہت بہادر اور عالی دماغ ہونے کے باوجود وہ ایک لڑکی بھی ہے۔ جو غم اور مایوسی کے گھیرے میں آکر ٹوٹ سکتی ہے۔ اس کے آنسو چھلک سکتے ہیں۔ پچھلے چند دنوں میں جو پے در پے صدمات اور مایوسیاں اسے سہنا پڑی تھیں، انہوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

میں اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا اور نہایت ہمدردی کے ساتھ اس کی دلجوئی کی کوشش کرنے لگا۔ جس فوجی خنجر سے اس نے اپنی یونیفارم کے ٹکڑے ٹکڑے کیے تھے وہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ وہ جیسے بھول ہی چکی تھی کہ وہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے آہستگی سے اس کی انگلیاں کھولیں اور نکیلا خنجر اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔

وہ مجھ سے علیحدہ ہوگئی۔ اس نے طیش کے عالم میں اپنے آنسو پونچھے۔ میں نے اس کے لیے ایک سافٹ ڈرنک بنایا اور گلاس اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے بیزاری کے عالم میں گلاس مجھ سے لے کر ایک طرف رکھ دیا۔

کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے ذہن میں کوئی سوال ابھرتا ہے اور اس کا جواب بھی تھوڑی ہی دیر میں اس کے سامنے آجاتا ہے۔ ابھی مجھے قسطینا سے باتیں کرتے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ میرے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ یہ انیق کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کی وہ بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! بری خبروں کے درمیان آپ کے لیے ایک اچھی خبر...... یا شاید یوں کہنا چاہیے کہ قسطینا صاحبہ کے لیے ایک اچھی خبر۔''

''سسپنس نہ بڑھاؤ، بات کرو۔''

''سسپنس ہی تو اسٹوری کی جان ہوتی ہے جناب، فلم کا سسپنس ہی ہوتا ہے جو فلم بین کو آخری سین تک سنیما ہاؤس میں بٹھائے رکھتا ہے۔''

''مگر سسپنس بوگس ہو تو کچھ فلم بین کرسیاں بھی توڑ دیتے ہیں۔ اس نسبت سے تمہارے سر کی شامت بھی آسکتی ہے۔''

''میں جانتا ہوں جناب! آج کل آپ بہت سیریس موڈ میں ہیں۔ لہٰذا کوئی بوگس سسپنس پیش کر کے اپنی شامت اعمال کو دعوت نہیں دوں گا۔''

''اب بک بھی چکو۔''

''مصدقہ اطلاع یہ ہے کہ ایجنسی کا چیف گیرٹ جو برج کلب کے فضائی حملے میں شدید زخمی ہوا تھا، چل بسا ہے۔''

میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ یہ قسطینا کے دشمن نمبر ایک کی بات ہو رہی تھی۔ یہی شخص تھا جسے قسطینا اپنے والد کی موت کا ذمے دار سمجھتی تھی۔

میں نے اپنے اندرونی جذبات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی افواہ ہو؟''

''افواہ ہوتی تو میں آپ کا قیمتی وقت ضائع نہ کرتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے پاسبان بریگیڈ کے ایک اہم ترین جاسوس نے بھی اپنے خفیہ پیغام کے ذریعے اس خبر کی تصدیق کردی ہے۔ پتا چلا ہے کہ کل رات چیف گیرٹ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ آج اسے ایک اسپیشل طیارے کے ذریعے امریکا روانہ کیا جانے والا تھا پھر ڈاکٹرز نے کہا کہ اس کی حالت سفر کے قابل نہیں۔ سب تیاری مکمل تھی مگر ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے وہ آنجہانی ہوگیا۔''

انیق سے بات ختم کرتے ہی میں نے قسطینا سے کہا۔ ''بری خبروں کے درمیان ایک اچھی خبر...... ذرا دل تھام کر سنیں۔'' وہ پوری طرح میری طرف متوجہ ہوگئی۔ میں نے

کہا۔ ’’گیرٹ آج نیوسٹی کے فوجی اسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔ ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے اس نے آخری سانس لی ہے۔‘‘

میں نے دیکھا قسطینا کے بجھے ہوئے چہرے پر روشنی پھیلی اور اس نے کئی رنگ بدلے۔ ’’مجھے یقین نہیں آرہا شاہ زائب!‘‘ وہ لرزاں آواز میں بولی۔

یہی وقت تھا جب قسطینا کے سیل فون اور لینڈ لائن فون کی گھنٹیاں ایک ساتھ بجنے لگیں۔ اس نے لپک کر لینڈ لائن فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف سے ملنے والی اطلاع کو اس نے بڑے غور سے سنا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا چلا گیا۔ پھر اس نے سیل فون کی کال سنی۔ یہ کال کمانڈر فارس جان کی طرف سے تھی۔ اس کال کا موضوع بھی چیف گیرٹ کی موت ہی تھی۔

’’میں مزید تفصیل جاننا چاہوں گی، فوراً...... اور اگر کوئی تصویر وغیرہ بھی ہو سکے تو مہیا کرو۔‘‘ قسطینا نے کمانڈر فارس سے کہا۔ خوشی کے مارے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

کمانڈر فارس جان سے بات ختم کر کے اُس نے میری طرف دیکھا۔ اب پھر اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تھے لیکن اب یہ خوشی کے تھے۔ وہ بے حد جذباتی انداز میں بولی۔ ’’شاہ زائب تم نے مجھے بہت اچھی خبر سنائی۔ جی چاہتا ہے تمہارا منہ موتیوں سے بھر دوں۔‘‘

پھر وہ ایک دم مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے آگے پیچھے جھلاتی ہوئی، پرجوش لہجے میں بولی۔ ’’میں سمجھتی ہوں، برج کلب پر ہمارا حملہ آج کامیاب ہوا ہے۔ اس حملے نے اپنا مقصد...... اپنا اصل مقصد آج حاصل کیا ہے۔ آج اس موذی درندے کی زندگی ختم ہوگئی ہے جس نے میرے ڈیڈ کی جان لی اور اس کے ساتھ ساتھ بے شمار پُرامن اور بے گناہ لوگوں کو خون میں نہلایا۔‘‘

مجھ سے علیحدہ ہو کر وہ ایک بار پھر اپنے سیل فون پر جھپٹی۔ گیرٹ کی موت کے بارے میں مزید تفصیلات حاصل کرنے لگی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ایجنسی کے اس اہم ترین شخص کی موت کی خبر تیزی سے پھیل گئی ہے۔ بے شک اس خبر سے، جنگ کی موجودہ صورتِ حال پر تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر یہ خبر بہت سے لوگوں کے لیے سکون کا باعث ضرور تھی۔ میں نے کہا۔ ’’قسطینا! دیکھو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم یہی بات کر رہے تھے نا کہ خوشی سے غم کے اور غم سے خوشی کے اسباب نکل آتے ہیں۔ گھپ اندھیرے میں بھی روشنی کی کوئی نہ کوئی کرن ضرور چھپی ہوتی ہے۔‘‘

وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑی تھی۔ ’’ہاں، شاہ زائب! یہ خبر واقعی مایوسی کے سمندر میں خوشی کا ایک جزیرہ ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ قدرت نے میرے کندھوں پر سے ایک بڑا بوجھ ہٹا دیا ہے۔ بے شک ابھی باقی کے حالات جوں کے توں ہیں مگر میں ذاتی طور پر خود کو ایک بہتر کیفیت میں محسوس کر رہی ہوں۔‘‘

میں نے اس کا موڈ مزید بہتر کرنے کے لیے مسکرا کر کہا۔ ’’یاد رکھیے، آپ نے میرا منہ موتیوں سے بھرنے کا وعدہ کیا ہے۔‘‘

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ان لمحوں میں وہ جنگجو قسطینا نہیں، ایک الھڑ لڑکی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شوخی ابھری۔ اس نے اپنے بوائے کٹ بالوں کو پیشانی سے ہٹایا اور آگے بڑھ کر مجھے چوم لیا۔

’’زبردست۔‘‘ میں نے اس کی ادا کو سراہا۔

اس کے چہرے پر شفق کا رنگ لہرایا مگر پھر فوراً ہی وہ سنجیدہ دکھائی دینے لگی۔ اس نے الماری کی طرف جا کر اپنا آفس بیگ نکالا۔ اس میں سے اپنے والد ’’آدم محترم‘‘ کی فریم شدہ تصویر نکالی۔ کھوئے کھوئے انداز میں اس پر ہاتھ پھیرا اور پھر اسے بوسہ دیا۔ ’’پیارے ڈیڈ! وہ شخص آج اس دنیا میں نہیں رہا جس نے آپ کی موت پر جشن منایا تھا۔ جاماجی کی زمین آج اس کے بوجھ سے آزاد ہے۔‘‘

اس نے تصویر کو دوبارہ بوسہ دیا اور اپنے آفس بیگ میں واپس رکھ دیا۔

☆☆☆

اگلا دن بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ نو دس بجے تک تو خوف و ہراس کی فضا موجود رہی۔ وہ ہزاروں شہری بھی سہمے رہے جنہوں نے ڈی پیلس کی وسیع و عریض چار دیواری میں پناہ لے رکھی تھی مگر پھر اچانک یہ خبر پھیلی کہ عزت مآب اور رائے زل میں ہونے والے مذاکرات ایجنسی کی مدد سے کامیاب ہو گئے ہیں اور فوری لڑائی کا خطرہ ٹل گیا ہے۔

کچھ دیر بعد مجھے کمانڈر فارس جان کی شکل نظر آئی۔ آج میں پہلی بار اسے جنگی لباس کے بغیر دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ قسطینا، جبر وارث اور کچھ دوسرے کمانڈرز کی طرح وہ بھی موجودہ صورتِ حال سے لاتعلق ہو گیا ہے۔ اس نے کہا۔ ’’شاہ زیب بھائی! جو کچھ ہو رہا ہے، ام کو اس کا بالکل توقع نہیں تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ام نے اب تک جو بھی قربانیاں دیا، وہ سب بیکار رہ گیا۔‘‘

’’لیکن یہ بھی تو پتا چلے کہ معاہدہ کیا ہوا ہے؟‘‘

''جو کچھ ام کو معلوم ہوا ہے اس کے مطابق تو ام نے ایک طرح سے ہتھیار ڈال دیا ہے۔ رائے زل اور ایجنسی کا لوگ دندناتا ہوا ڈی پیلس میں داخل ہو جائے گا۔''

''لیکن کچھ شرطوں کی بات بھی تو کی جارہی ہے۔''

''شرطوں کا بات یہ ہے کہ رائے زل اور ایجنسی کا لوگ ڈی پیلس میں داخل تو ہو گا مگر دو دن بعد یہاں سے واپس چلا جائے گا۔ اس دوران میں معاہدے کی کاغذی کارروائی مکمل کر لیا جائے گا۔ دو دن بعد ڈی پیلس کے علاوہ جاما جی کا علاقہ بھی خالی کر دیا جائے گا۔ دوسری شرط کے مطابق جزیرے کا نیا سرحد مقرر کیا جائے گا۔ اس سرحد کے مطابق آدھا علاقہ رائے زل کے پاس جائے گا اور آدھا عزت مآب اور اس کے دونوں بیٹوں کے پاس رہے گا، وہ اپنے علاقے میں خود مختار ہوں گے، تیسری شرط یہ ہے کہ آئندہ کم از کم پندرہ سال کے لیے کسی طرح کا کوئی بھی لڑائی نہیں کیا جائے گا اور دونوں پریق (فریق) ایک دوسرے کی ملکیت کا احترام کرے گا۔ اس کے علاوہ دونوں طرپ کے قیدیوں کے لیے بھی کچھ باتیں طے کیا گیا ہے۔''

''آقا جان اور حلمی وغیرہ کے بارے میں کیا پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''کہا تو یہ جارہا ہے کہ یہ معاہدہ کرانے میں اصل کردار آقا جان کا ہی ہے۔ آقا جان ہی دونوں پریقوں کو مذاکرات کی میز تک لایا ہے۔ معاہدے کی ایک شق کے مطابق آقا جان صیب کو ڈی پیلس میں کوئی نہایت اہم عہدہ بھی دیا جارہا ہے۔''

میری نگاہوں میں چند دن پہلے کا وہ منظر گھوم گیا جب جاں بہ لیب جاناں مجھے اپنی حاصل کردہ معلومات سے آگاہ کر رہی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ آقا جان اور اس کے دوست اس بات پر مٹھائی تقسیم کر رہے تھے کہ آقا جان کو کوئی نہایت اہم مرتبہ حاصل ہونے والا ہے۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ فارس جان! یہاں دھوکا تو نہیں ہو رہا؟ میرا مطلب ہے ڈی پیلس میں گھسنے کے بعد رائے زل اور اس کی ماں یہاں سے نکل جائیں گے؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' فارس جان ذرا الجھن سے بولا۔ ''لیکن بتایا جارہا ہے کہ اس وقت زبردست دوستانہ ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ ہاناوانی نے اپنے سابق شوہر عزت مآب سے پون پر براہِ راست بات کی ہے اور اسے یقین دلایا ہے کہ معاہدے کی ایک ایک شرط کا پاسداری کیا جائے گا۔ ہاناوانی نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کسی ایک بے گناہ کا خون بھی اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔ دوسری طرپ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ کمال احمد اپنے سوتیلے بھائی رائے زل سے ملاقات کے لیے خود ڈی پیلس سے باہر گیا ہے۔ رائے زل نے کمال احمد کو چھوٹا بھائی کہہ کر اسے گلے سے لگایا ہے...... اور رائے زل کے خاص دستے نے کمال احمد کو باقاعدہ سلامی پیش کی ہے۔''

''ایجنسی والے کیا کہتے ہیں؟ برج کلب پر فضائی حملے میں ان کا نقصان زیادہ ہوا تھا۔ چیف گیرٹ کی ہلاکت بھی اسی حملے کا نتیجہ ہے۔''

''لیکن اس وقت تو ایجنسی والا بھی خاصا ملائم نظر آتا ہے برادر۔ ان کے ایک کمانڈر نے کہا ہے کہ عزت مآب نے سیکڑوں امریکن قیدیوں کو موت سے بچایا ہے اور ان کو اپنی حفاظت میں رکھنے کے لیے اپنے کئی ساتھیوں کا مخالفت بھی مول لیا ہے۔''

دوپہر کے بعد مقامی ٹی وی پر ریان فردوس کی شکل نظر آئی۔ اس کے چربی دار چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ اس کے تاثرات یہ بتا رہے تھے کہ وہ اپنی ملکیت اور خود مختاری بچ جانے کے حوالے سے مطمئن ہے۔ اس نے ملائی زبان میں خطاب کیا اور اپنے لوگوں کو معاہدے کی تفصیلات بتائیں۔

آخر میں اس نے کہا۔ ''اب گرے فورس اور ایجنسی والوں کی حیثیت ہمارے مہمانوں کی سی ہے۔ ان کے خلاف ڈی پیلس کے اندر یا باہر کسی طرح کی کوئی کارروائی نہیں ہونی چاہیے بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ہم ان کا اچھے طریقے سے استقبال کریں۔ بیشتر تنازعات ختم ہو چکے ہیں اور اب ہم امن اور صلح جوئی کے ایک نئے دور کا آغاز کرنے جارہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ڈی پیلس کی طرح ڈی پیلس سے باہر بھی مہمانوں کا خوش دلی سے استقبال کیا جائے۔''

اس تقریر کے بعد میں کمرے سے باہر نکلا تو ڈی پیلس کی فضا مختلف نظر آئی۔ وہ لوگ جو پچھلے دو دن سے خود کو محاصرے میں سمجھ رہے تھے اور بدترین حالات سے ڈر رہے تھے اب مطمئن نظر آرہے تھے۔ کچھ جگہوں پر میں نے دیکھا کہ راستوں کی صفائی کی جارہی ہے اور آرائشی لائٹس وغیرہ آویزاں اور نصب کی جارہی ہیں۔ ایک جگہ تین لوڈرز کھڑے تھے اور یہ اوپر تک ڈینی فلاورز سے لدے ہوئے تھے۔ مستعد ملازمین ٹوکروں کے ذریعے یہ پھول لوڈر سے اتار کر اندر پہنچانے میں مصروف تھے۔ ڈی پیلس میں ہر طرف خوشی اور اطمینان کی لہر سی محسوس ہوتی تھی لیکن میں سوچ

رہا تھا کہ رائے زل اور آقا جان وغیرہ کے یہاں آنے کے بعد میرا اور فارس جان جیسے لوگوں کا کیا بنے گا۔ دو دن پہلے جب ابھی بڑا حملہ نہیں ہوا تھا میں آقا جان کے حبس بے جا سے باقاعدہ فرار ہوا تھا اور اس فرار کے دوران میں آقا جان کے کئی اہل کار میری وجہ سے اپنی جان سے ہارے تھے۔

میں ڈی پیلس کے ایک وسیع برآمدے میں پہنچا تو یہاں بھی استقبال کی تیاریاں نظر آئیں۔ خدام اور خواجہ سرا محرابی دروازوں میں پھولوں کی سجاوٹ کررہے تھے...... اور ملائی زبان کے کچھ رنگین بینرز بھی یہاں وہاں آویزاں کیے جارہے تھے۔

میں نے ایک بات واضح طور پر محسوس کی۔ میں جہاں جاتا تھا لوگ مجھے اشتیاق سے دیکھتے تھے۔ اکثریت اب مجھے پہچاننے لگی تھی اور ان کی آنکھوں میں میرے لیے احترام نظر آتا تھا۔ کئی چھوٹے بڑوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ایک دو عمر رسیدہ افراد نے حوصلہ افزائی کے انداز میں میری پیٹھ تھپکی۔ وہ مجھ سے سوال بھی پوچھ رہے تھے۔ ایک صحافی ٹائپ لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ موجودہ صورتِ حال سے مطمئن ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میں اس سوال کا جواب کیسے دے سکتا ہوں؟ مجھے یہاں کے حالات کا زیادہ تجربہ نہیں۔ عزت مآب اور ان کے رفقا جو کررہے ہیں، سوچ سمجھ کر ہی کررہے ہوں گے۔''

لڑکی نے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، گرے فورس کے لوگ ڈی پیلس میں کب تک رہیں گے؟''

''کہا تو یہی جارہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تین دن اور امید ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔''

جدید لباس والی لڑکی سے میری یہ بات چیت انگلش میں ہورہی تھی وہ بولی۔ ''کچھ لوگ مادام ہاناوانی کی آمد سے خوف زدہ بھی ہیں۔ خاص طور سے مقامی لوگ اور رضا کار۔ ان کا خیال ہے کہ وہ پُراسرار قوتوں کی مالک ہیں۔ وہ یہاں آکر کچھ انوکھا کریں گی اور لوگ دل سے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے مطیع ہوجائیں گے۔ آج کے دور میں تو یہ سب باتیں عجیب ہی لگتی ہیں۔''

''میں ذاتی طور پر ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ بہرحال آپ ایسے سوال کسی مذہبی اسکالر یا سائیکاٹرسٹ سے پوچھیں۔''

میں وہاں سے کھسکنا چاہ رہا تھا مگر اسی دوران میں ایک اور خاتون تیزی سے میری طرف بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں مائک تھا اور پہلو میں کیمرا مین۔ اس نے آتے ہی سوال داغا۔ ''مسٹر شاہ زیب! لڑائی میں آپ ایک ہیرو کے طور پر ابھرے ہیں۔ آپ نے جس طرح ایک نہایت نازک موقعے پر ہر ہائی نس کی حفاظت کی...... اور اس سے پہلے ایمونیشن ڈپوز کو مکمل تباہی سے بچایا، لوگ آپ کے گرویدہ ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے جو نیا معاہدہ ہوا ہے، وہ کس حد تک ہمارے حق میں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں خود کو ہیرو سمجھنے کی غلطی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ایسے حالات میں اکثر ہیروز کو پھانسی چڑھتے ہوئے ہی دیکھا گیا ہے۔ میں ایک عام ایم ایم اے فائٹر ضرور ہوں...... حالات کے دھارے میں بہہ کر آپ لوگوں کے درمیان پہنچ گیا ہوں اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق حق کا ساتھ دینے کی ناچیز کوشش کررہا ہوں......''

اس نے میری بات کاٹی۔ ''آپ ایم ایم اے کے عام فائٹر نہیں ہیں۔ اس دور دراز جزیرے میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آپ کو ایک بڑے چیمپئن کی حیثیت سے جانتے ہیں اور آپ کو یہاں اپنے درمیان پاکر بے حد حیران اور خوش ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ بڑے حملے سے پہلے آپ کو محترم آقا جان کے کچھ لوگوں نے ڈی پیلس سے اغوا کرکے نامعلوم جگہ پر پہنچایا تھا، جہاں آپ کو غالباً تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ اب سننے میں آرہا ہے کہ معاہدے کی رُو سے محترم آقا جان کو یہاں ایک نہایت اہم عہدہ دیا جارہا ہے، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس نئی صورتِ حال میں ہر ہائی نس قسطینا اور آپ جیسے دیگر لوگوں کے لیے مشکلات کھڑی نہیں ہوں گی؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ سارے معاملات ہماری ہائی کمان کی نگاہوں سے بھی اوجھل نہیں ہیں۔ جب اس طرح کے معاہدے ہوتے ہیں تو ان میں یہ سارے پہلو مدِنظر رکھ کر شرائط طے کی جاتی ہیں۔''

دینے کو تو میں نے صحافی خاتون کو جواب دے دیا تھا مگر یہ سوال میرے اپنے ذہن میں بھی پوری شدت سے موجود تھا۔ چند منٹ بعد دونوں فی میل صحافیوں سے جان چھڑا کر میں ڈی پیلس کے اس حصے میں پہنچا جہاں ابراہیم کی رہائش گاہ تھی۔ دربان سے معلوم ہوا کہ ہز ہائی نس چھوٹے صاحب یہیں پر ہیں۔ میں نے اپنے آنے کی اطلاع اندر پہنچائی۔ مختلف مراحل سے گزر کر میں ابراہیم کے رُوبرو پہنچ گیا۔

وہ اب باقاعدہ اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملاتا تھا اور بات چیت میں اپنے شاہی تکلف کو بالائے طاق رکھ دیتا تھا۔ دیگر لوگوں کی طرح مجھے اس کے چہرے پر بھی اطمینان ہی نظر

آیا۔ اس نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! خدا کا شکر ہے کہ خونریزی کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ معاہدے کے لیے دونوں طرف سے پیش رفت ہوئی ہے۔ اس میں کسی کی سبکی بھی نظر نہیں آرہی۔''

''مگر ایک بات تو سوچنے کی ہے نا ابراہیم! آقا جان ہمارے دشمنوں کے کندھوں پر سوار ہو کر یہاں آرہا ہے اور اب اس کی حیثیت اور طاقت میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔ کیا وہ......''

''آپ پریشان نہ ہوں۔'' ابراہیم نے میری بات کاٹی۔ ''ان سارے معاملات پر میں نے بھائی کمال احمد سے تفصیلی بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ معاہدے کی اہم ترین شقوں میں ایک یہ بھی ہے کہ سسٹر قسطینا، شہید افغانی کے بھائی رازی خاں، کمانڈر فارس جان، میجر وارث اور ایسے تمام اہم افراد اور ان کے ساتھیوں کو مکمل تحفظ دیا جائے گا۔''

''ایسی شرائط کا ضامن کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دونوں طرف کے اہم ترین افراد...... اور اس کے ساتھ ساتھ ایجنسی...... ایجنسی والے عزت مآب کو بہت اہمیت دے رہے ہیں کہ انہوں نے لڑائی میں غیر جانبداری اختیار کی اور اس کے ساتھ ساتھ امریکی قیدیوں کی جان بچائی۔''

''لیکن میری معلومات کے مطابق، ایجنسی میں کئی بڑے خطرناک قسم کے آفیسر موجود ہیں۔ ان کا کینہ ابھر کر سامنے آسکتا ہے۔''

''میرا دل گواہی دیتا ہے شاہ زیب بھائی، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ لیکن ہم مزید احتیاط یہ کریں گے کہ آپ...... آپ کے ساتھی اور دیگر ایسے افراد جن کو کسی طرح کا خطرہ ہو سکتا ہے، اگلے 72 گھنٹے تک ایک ہی جگہ رہیں گے۔ پاسبان بریگیڈ کے جانباز آپ لوگوں کو اپنے حفاظتی دائرے میں رکھیں گے۔ 72 گھنٹے بعد وہ لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس کے بعد انشاء اللہ سب کچھ بڑی تیزی سے معمول پر آئے گا۔''

اسی دوران میں سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ ابراہیم کا فون تھا اور بغلی کمرے میں پڑا تھا۔ وہ فون لینے کے لیے کمرے میں گیا۔ دروازہ کھلا تو میری نگاہ چند سیکنڈ کے لیے اندر گئی۔ مجھے کمرے کی دو دیواریں نظر آئیں جن پر زینب کی بہت سی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر تصویریں ایسی تھیں جن میں وہ دلہن کے دلکش سرخ جوڑے میں تھی۔ گہنوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ایک پری پیکر لیکن معصوم لڑکی۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ ابراہیم دو تین منٹ کی گفتگو کے بعد واپس میرے پاس آگیا۔ خود ہی بولا۔

''زینب کی کال تھی۔ بالکل چڑیا کی طرح دل ہے اس کا...... بہت جلد سہم جاتی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اسے عزت مآب سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ وہ یہاں ہے تو وہ قیامت برپا کر دیں گے۔''

''خدشہ تو اس کا درست ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے اسے بتا دیا ہے کہ جاماجی میں اس کے حوالے سے کیا سمجھا جا رہا ہے؟''

''ہاں، میں نے اسے اندھیرے میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے بتا دیا ہے کہ یہاں بہت سے لوگوں کی نگاہوں میں وہ زندہ نہیں ہے اور اس کے حد سے بڑھے ہوئے ڈر کی وجہ بھی یہی ہے۔ کبھی کبھی تو دل میں آتا ہے کہ حالات ذرا بہتر ہو جائیں تو اسے لے کر خاموشی سے کہیں نکل جاؤں۔ پاکستان یا پھر کسی بھی دور کے ملک میں جہاں صرف ہم دونوں ہوں۔''

''مگر...... آپ جہاں بھی جائیں گے، آپ کی مجبوریاں تو آپ کے ساتھ جائیں گی نا، آپ زینب کو اپنا نہیں سکیں گے۔''

وہ جیسے چونک گیا۔ شاید کچھ دیر کے لیے اس ''دیوار'' کو بھول گیا تھا جو اُن دونوں کے درمیان حائل تھی۔ ایک بلند و بالا دیوار۔ یہ زہر کی دیوار تھی...... یہ موت کی حد بندی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں گہری اداسی کے سائے لہرانے لگے۔

اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی نوخیز داڑھی میں بے چینی سے انگلیاں چلائیں۔ ''میں اپنی ان مجبوریوں کا کیا کروں بھائی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کسی وقت تو اتنا دکھی ہو جاتا ہوں، جی چاہتا ہے کہ جن کی وجہ سے میں اور بھائی کمال یہ دکھ جھیل رہے ہیں، ان کو گولیوں سے چھلنی کر ڈالوں۔ ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ دوں۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ اپنی سوتیلی والدہ ہانا دانی کی بات ہی کر رہے ہیں۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گویا ہوا۔ ''بے شک یہی عورت ہے جس نے کئی برس پہلے عزت مآب کو زہر دے کر زندگی موت کی کشمکش سے دوچار کیا تھا اور اب جزیرے کے سب سے بڑے پیش گو کے مطابق ہم دونوں بھائیوں کی زندگی بھی اسی خطرے سے دوچار ہے۔''

''جزیرے کا سب سے بڑا پیش گو؟...... یہ بات

میں دوسری تیسری مرتبہ سن رہا ہوں، یہ شخص ہے کون؟''
''اسی عورت ہاناوانی کا سگا بھائی۔'' ابراہیم نے نفرت سے کہا۔''یہ دونوں بہن بھائی قدرتی طور پر پیش گوئی کی زبردست صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان کی اس صلاحیت سے ان کے بدترین مخالف بھی انکار نہیں کر سکتے۔ ہاناوانی کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں میں ایک جادو رکھتی ہے اپنی جانب دیکھنے والے کو مسخر کر لیتی ہے۔ یہ ہم شکل بہن بھائی تھے۔ کچھ اور پُراسرار مشابہتیں بھی ان دونوں میں موجود ہیں۔ مثلاً دونوں کے ہاتھوں میں چھ چھ انگلیاں ہیں۔ ان کی عادات بھی آپس میں بہت ملتی تھیں۔ لیکن پھر بتدریج ان دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔ ہاناوانی عیش و عشرت، لالچ اور ہوس کی طرف چلی گئی۔ اس کا بھائی حاذق ذکری درویش صفت ہو گیا اور جنگلوں کی طرف نکل گیا۔ برسوں پہلے محترم ذکری نے ہی ہمارے والدین کو وارننگ دی تھی کہ ہاناوانی کسی نہ کسی موقع پر ہم دونوں بھائیوں کو زہر کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارے گی۔ اسی شدید خطرے کی پیش بندی کرتے کرتے ہماری زندگیاں بدحال و تباہ ہو گئیں۔''

ابراہیم نے گہرے دکھ میں ڈوب کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ سانس تیزی سے آجا رہی تھی۔ میں نے منرل واٹر کی بوتل سے پانی گلاس میں انڈیلا۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا پھر جلدی سے میری کلائی پکڑ لی۔''یہ کیا کر رہے ہیں۔ آپ اس گلاس میں نہیں پی سکتے۔''

''نہیں ابراہیم! میں آپ کو ہی دے رہا ہوں۔'' میں نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ایک گھونٹ بھر کر کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔''یہ میرا گلاس ہے۔ میں نے اسے زہر آلود کر دیا ہے۔ میرے استعمال کا ہر برتن زہر آلود ہو جاتا ہے۔ ہر چیز...... ہر چیز......'' اس کا گلا رندھ گیا۔

اسی دوران میں اس کے سیل فون پر پھر زینب کی کال آ گئی۔ وہ انگلش نہیں جانتی تھی اور وہ اردو نہیں جانتا تھا۔ پھر بھی یہ ان دونوں کی غیر معمولی محبت تھی کہ وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مدعا ایک دوسرے کو سمجھا دیتے تھے۔ زینب اب ملائی کے کچھ اہم الفاظ بولنا شروع ہو گئی تھی۔ ابراہیم نے اردو کے کچھ الفاظ سیکھ لیے تھے۔ کہیں کہیں وہ انگریزی کے آسان الفاظ بھی گھسا دیتے تھے۔ زینب، وہیں ڈاکٹر ماریہ کے پورشن میں تھی۔ ابراہیم سے پوچھ رہی تھی کہ اس نے سر کے درد کی دوا کھائی ہے یا نہیں۔

وہ کہہ رہا تھا۔''پین نہیں ...... اب سر...... گڈ ہوتا......'' یہ اردو ملی انگلش تھی۔

میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو انیق اور سیف خاموش بیٹھے تھے۔ سیف کافی اداس نظر آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔''کیا ہوا سیفی؟''

اس سے پہلے ہی انیق بول اٹھا۔''لگتا ہے اِسے بھابی...... میرا مطلب ہے ہونے والی بھابی یاد آ رہی ہے۔''

میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ انیق نے عام سے انداز میں کتنی تلخ بات کہہ دی تھی۔ ابھی تک اسے معلوم نہیں تھا کہ جس کو وہ ہونے والی بھابی کہہ رہا ہے، وہ اصل میں کون ہے؟

سیف نے بیزاری سے سر ہلایا۔''نہیں استاد جی! یہ بات نہیں ہے۔ دراصل میرا تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو گیا ہے۔ لڑائی گرم تھی تو میں بھی گرم تھا۔ اب تو بالکل ''شہتوت جلیبا ٹھنڈا ٹھار'' بن گیا ہوں۔ کیا فائدہ ہوا اتنی دور یہاں آنے کا۔''

''بڑے ناشکرے ہو بھئی۔'' انیق نے کہا، اتنی مارا ماری تو تمہاری نسلوں میں سے کسی نے نہیں دیکھی ہو گی۔ کیا یہاں ایٹم بم ہی گرتا تو تمہاری تسلی ہوتی۔''

''ایٹم بم نہ گرتا...... لیکن...... کم از کم دو چار پھٹ لگتے مجھے...... ایک آدھ ہڈی ٹوٹتی...... ذرا ہائے شائے ہوتی۔''

''اور اگر ہڈی کے بجائے تمہارا ناریل ہی ٹوٹ جاتا، مارٹر کا گولا لگنے سے؟''

''تو بھی کوئی گل نہیں تھی شہزادے، پر یہ روکھا پھیکا کام تو نہ ہوتا۔'' اس نے ایک بار پھر منہ لٹکا لیا۔

عمر میں وہ مجھ سے دو ڈھائی سال ہی چھوٹا تھا مگر مجھے استاد جی اور استاد صاحب کہتا تھا۔ میں بھی اسے ٹوکتا نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں، اب مجھے اس کا خیال رہنے لگا تھا۔ کبھی کبھی اس کے بارے میں تھوڑی سی منفی سوچ بھی ذہن میں ابھرتی تھی۔ اس سوچ کا تعلق تاجور کے خفیہ وڈیو کلپ سے تھا۔ سیف نے یہ کلپ کیوں بنوایا تھا۔ کیا وہ اس پر کسی قسم کا شک کرتا تھا۔ اس کلپ میں تاجور اس بات کا اعتراف کرتی نظر آئی تھی کہ وہ ''کسی'' سے پیار کرتی تھی۔

انیق نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''ویسے جنابِ عالی! اداس تو آپ بھی بہت لگ رہے ہیں۔ کوئی پرانی بات تو یاد نہیں آ گئی؟''

میں خاموش رہا، وہ بولا۔''آپ نہ بھی بتائیں گے تو مجھے پتا تو چل ہی جانا ہے۔ اتنی آلتی پالتیاں ماری ہیں اور

اتنے مشکل چلّے کاٹے ہیں، بندے کے اندر جھانکنا آ گیا ہے مجھے۔ میں زیادہ ''شو'' نہیں کرتا ورنہ ان مقامی لوگوں نے تو باقاعدہ میری پرار تھنا شروع کر دینی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''زیادہ خوش فہمی میں نہ رہو۔ کوئی اتنا نور بھی نہیں برس رہا تمہارے چہرے پر...... اس کے علاوہ کئی علاقوں میں یہ رواج بھی ہے کہ پرارتھنا بعد میں کرتے ہیں پہلے پیر صاحب کی قبر بناتے ہیں۔''

''آپ نے مجھے ہمیشہ ''انڈر اسٹیمیٹ'' کیا ہے۔ اچھا، میں ابھی آپ کو آپ کے دل کی باتیں بتاتا ہوں۔''

اس نے آنکھوں کو بھینگا کیا اور بولا۔ ''ہو جا فوکس...... ہو جا فوکس...... لو جی ہو گیا فوکس۔'' وہ اسی طرح آنکھیں بھینگی کیے کیے بولا۔ ''یہ تھری ڈی غیب دانی ہے جناب! میرا اندازہ ہے کہ آپ کو اس وقت دو باتیں زیادہ پریشان کر رہی ہیں۔ ایک تو وہی سجاول بھائی والی۔ آپ بہت الجھن میں ہیں۔ کیا میں غلط فرما رہا ہوں...... میرا مطلب ہے کہہ رہا ہوں؟''

''یہاں تک تو تم ٹھیک بک رہے ہو۔''

اس نے ''بک رہے ہو'' کو نظر انداز کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''آپ ابھی تک اس بات کو تسلیم نہیں کر پا رہے کہ میں نے آپ کو جو اطلاع دی ہے، وہ درست ہے۔ آپ ابھی تک امریش...... مم...... میرا مطلب ہے، سجاول بھائی کو گمشدہ ہی سمجھ رہے ہیں۔''

اس نے ذرا توقف کیا۔ اپنی بھینگی آنکھوں کو ٹھیک کر کے ذرا آرام دیا، پھر دوبارہ بھینگا کر کے بولا۔ ''دوسری پریشانی آپ کو پرانی باتوں کے حوالے سے ہے۔ آپ کو کوئی بہت پریشان کر رہا ہے، بہت زیادہ۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ بونگیاں مار رہا ہے مگر اتفاقاً اس وقت اس کی دونوں باتیں درست تھیں۔ میرے ذہن میں جو چند الجھنیں تھیں، وہ یہی تھیں۔ سجاول کہاں ہے؟ زینب کا کیا بنے گا اور اسے کب تک چھپایا جا سکے گا؟ ہانا وانی اور رائے زل کس قماش کے لوگ ہیں اور...... اور فون کے وڈیو کلپ میں نظر آنے والی تاجور، جو میری زندگی کا سب سے بڑا زخم تھی...... اس کی آواز پچھلے کئی پہر سے مسلسل میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ''ہاں یہ غلطی تو ہوئی ہے...... یہ غلطی تو ہوئی ہے۔'' یہ اس نے کیا کہہ دیا تھا۔ بار بار ذہن میں سوال ابھرتا تھا کہ اگر وہ یہ غلطی نہ کرتی (یعنی مجھے میری دنیا چھوڑ کر اپنی دنیا میں آنے کا کہتی) تو کیا میں مان لیتا؟

ایک شریف شہری بن کر گھر گرہستی کی زندگی گزارنے لگتا؟ کیا میرے لیے یہ ممکن ہوتا کہ اپنے پیچھے لگی ہوئی بلاؤں سے پیچھا چھڑا کر اس کے ساتھ دنیا کے کسی گمنام گوشے میں گم ہو جاؤں؟ کیا میرا پیچھا کرتی ہوئی موت مجھے مہلت دے دیتی؟ میں جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ مجھے تو بہت جلد ایک بار پھر ٹیکساری گینگ کی زد میں آنا ہی ہے، جو میرے اردگرد ہوں گے وہ بھی بدترین آزمائش کا شکار ہو جائیں گے۔

سیف کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں امن آشتی کے اس ماحول سے مایوس تو ضرور ہوا ہوں لیکن ایک بات پر آپ مجھے شاباش دیں۔''

انیق نے فوراً لقمہ دیا۔ ''کوئی کبڈی شبڈی جیتی ہے تم نے؟''

''کوئی یہاں کبڈی کھیلے گا تو جیت کر بھی دکھا دوں گا۔ فی الحال دوسری بات پر شاباش مانگ رہا ہوں۔''

''کون سی بات؟'' میں نے دریافت کیا۔

''میری تیز نظر اور بندے کو پہچان لینے کا فن۔''

''کس کو پہچانا تم نے؟''

''آپ کو، اور کس کو۔ جب سکھیرا پنڈ سے میں آپ کے پیچھے لگا تو مجھے کچھ پتا نہیں تھا، آپ کون ہیں' یہ تو یہاں آ کر معلوم ہوا ہے کہ میری طرح آپ بھی کھلاڑی ہیں بلکہ میں کیا چیز ہوں آپ کے سامنے۔ آپ بہت بڑے چیمپئن ہیں۔''

میرے اندر جھنجلاہٹ کی لہر سی اٹھی۔ میں نے کہا۔ ''تو چھت پر چڑھ جاؤ اور سب مل کر ڈھول بجانا شروع کر دو۔ ساتھ ساتھ میرے چیمپئن ہونے کی منادی بھی کر دو۔''

میرے لب و لہجے نے سیف اور انیق دونوں کو چونکا دیا۔ سیف کا رنگ اُڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے بوتل کھول کر الکحل کے چند گھونٹ لیے اور نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ دراصل جس طرح یہاں جاماجی میں میرے چیمپئن ہونے کا چرچا ہو گیا تھا اور بہت سے لوگ مجھے ایسٹرن کی حیثیت سے جان گئے تھے، مجھے بے حد جھلاہٹ ہو رہی تھی۔ مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ اب ڈنمارک میں موجود میرے جانی دشمنوں کو مجھ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

کچھ دیر بعد سیف کی بجھی ہوئی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''مجھے افسوس ہے جی کہ آپ کو میری بات بری لگی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔''

میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ چند منٹ بعد طبیعت کچھ بحال ہوئی تو میں نے کہا۔ ''مجھے بھی معاف کر دو۔ میں غصے میں بول گیا۔ دراصل...... کچھ مسئلے ہیں جن کی وجہ سے میں اپنا آپ چھپانا

چاہتا تھا لیکن جتنی کوشش کی اتنا ہی کام خراب ہوا۔''

اس سے پہلے کہ کوئی مزید سوال جواب ہوتا، دھمادھم کی بلند آواز سے فوجی بینڈ بجنا شروع ہوگیا۔ یہ بہت بڑا بینڈ تھا اور اس کی آواز جیسے پورے ڈی پیلس میں پھیل رہی تھی۔ ہم یہ منظر دیکھنے کے لیے تیسری منزل پر چلے گئے۔ قریباً ایک سو کے قریب فوجی سازندے دو قطاروں میں کھڑے شاندار استقبالیہ دھنیں بکھیر رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک طویل سرخ قالین بچھا تھا۔ یہ صرف ریہرسل تھی۔

ڈی پیلس کی فصیل کا منظر بالکل بدل چکا تھا۔ مارٹر گنیں، ملٹی بیل راکٹ لانچر اور فلیم تھروور کی طرح کا سارا اسلحہ ہٹایا جا چکا تھا۔ رائے زل کی گرے فورس اور ایجنسی کا اتحاد بھی اپنے سب ہلکے بھاری ہتھیار پیچھے لے گیا تھا۔ فصیل پر صرف چند توپیں رہ گئی تھیں۔ ایک افسر نے بتایا کہ یہ سلامی میں داغنے کے لیے رکھی گئی ہیں۔

فصیل سے باہر کا منظر بھی دور تک نظر آرہا تھا۔ شہر کی گلیوں میں شام کے سائے طویل ہونا شروع ہوگئے تھے۔ لوگوں کی چہل پہل نظر آرہی تھی۔ مختلف جگہوں اور چوراہوں پر آرائشی لائٹس لگائی جارہی تھیں۔ کئی جگہ رنگ برنگی جھنڈیاں بھی دکھائی دیں۔ عزت مآب کے حکم کے مطابق شہر کے لوگ نیوسٹی والوں کے استقبال کے لیے نکل آئے تھے۔

سیف نے ہوا میں سونگھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ بریانی کی دیگیں پک رہی ہیں...... اور شاید مچھلی وغیرہ بھی بھونی جارہی ہے۔''

انیق بولا۔ ''تمہاری بات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ کھانے کے معاملے میں تمہاری سونگھنے کی حس کسی بھی گھریلو اور جنگلی جانور سے زیادہ تیز ہے۔''

سیف اسے گھور کر رہ گیا۔ ویسے وہ درست کہہ رہا تھا۔ مختلف پکوانوں کی خوشبو ڈی پیلس کے وسیع وعریض کچن کی طرف سے اٹھ رہی تھی اور شہر کے گلی کوچوں میں بھی چکرا رہی تھی۔ ڈی پیلس کے عظیم الشان کچن کا خیال آیا تو دھیان خود بخود خانساماں ازمیر طیب کی طرف چلا گیا۔ مسکراتے ہوئے چہرے والا وہ فربہ اندام شخص اپنے تمام تر ہنر کے ساتھ بارود کی بھینٹ چڑھ گیا تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ کمانڈر افغانی، میجر واحد، کیپٹن سعد اور نجانے کتنے مزید ایسے تھے جن کی لاشوں کے کفن بھی ابھی میلے نہیں ہوئے تھے مگر جا بجا میں استقبالیہ تیاریاں ہورہی تھیں۔ مجھے پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ جنگ کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہیں اور یہ امن کی معاشرت اور اخلاقیات سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ جنگ کرنے والے اپنے پیاروں کی لاشوں کے قریب بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں اور اپنے زخمی ساتھیوں کی آہ و بکا کے درمیان اپنی نیند پوری کرتے ہیں۔ دشمن کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے لیے ان کا رویہ بالکل مختلف ہوجاتا ہے۔ محبت، نفرت، شرم و حیا اور رحم دلی، سب کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی کچھ ہورہا تھا۔ دونوں طرف سے مرنے والوں کو فراموش کردیا گیا تھا اور ایک نیا ماحول استوار کیا جارہا تھا۔

شام کے فوراً بعد پورا ڈی پیلس بقعۂ نور بن گیا۔ جگہ جگہ سرخ قالین بچھ گئے۔ موسیقی کی دھنیں بکھرنے لگیں۔ ایک خادم نے آکر اطلاع دی۔ ''ڈی پیلس کا مین گیٹ کھول دیا گیا ہے۔ گرے فورس کے دستے اندر آنا شروع ہوگئے ہیں۔''

''میرا خیال ہے ہمیں تیسری منزل پر چلنا چاہیے۔ وہاں سے بہتر نظارہ ہوسکے گا۔'' انیق نے رائے دی۔

ہم زینے طے کرکے تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ ہمیں بالکونیوں سے نیچے بہت سے مسلح افراد دکھائی دیے۔ ''یہ کون لوگ ہیں؟'' میں نے ایک آفیسر سے دریافت کیا۔

''یہ پاسبان بریگیڈ کے جوان ہیں۔ یہ ڈی پیلس کے اس حصے کو اپنے گھیرے میں رکھیں گے...... ہر ہائی نس قسطینا، میجر وارث اور کمانڈر فارس جان کے علاوہ اور بہت سے اہم لوگ اسی پورشن میں موجود ہیں۔''

اسی دوران میں مجھے کمانڈر فارس جان اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹیلی اسکوپ تھی۔ ہم ایک بالکونی میں کھڑے ہوگئے اور دیوہیکل ستونوں کی اوٹ سے مین گیٹ کا منظر دیکھنے لگے۔ سب سے پہلے ایجنسی کے امریکی گارڈز اور ان کی جیپیں ڈی پیلس میں داخل ہورہی تھیں۔ ایجنسی کے گارڈز کی وردیاں بھی یوں تو سبز تھیں لیکن وہ اپنی دھاری دار ٹوپیوں کی وجہ سے گرین فورس سے الگ پہچانے جاتے تھے۔ دونوں طرف کھڑے خوش پوش بچے گاڑیوں پر پھول نچھاور کرنے لگے۔ امریکی بھی خوش دلی سے ہاتھ لہرا رہے تھے اور سلام کررہے تھے۔ بے شک یہ لوگ مسلح تھے مگر فضا سراسر دوستانہ تھی۔ ایجنسی کی بیسیوں گاڑیاں ڈی پیلس میں داخل ہوچکیں تو گرے فورس کی چھوٹی بڑی گاڑیاں دکھائی دینے لگیں۔ ان پر نیوسٹی کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ میں نے ٹیلی اسکوپ سے دیکھا۔ پیدل اور گاڑی سوار سپاہیوں کی طویل قطار تھی جو شہر کی گلیوں میں

رینگتی ہوئی ڈی پیلس کے مین گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ عزت مآب کے حکم کے مطابق شہری ان گاڑیوں پر گل پاشی کررہے تھے۔ عزت مآب مفاہمت کی پالیسی کا علم بردار تھا اور یہ پالیسی اس وقت جوبن پر نظر آتی تھی۔

دفعتاً میری نگاہ ایک بلند فوجی ٹرک پر پڑی۔ عجیب وضع کے اس ٹرک پر شیشے کا ایک باکس سا تھا۔ باکس میں کچھ لوگ موجود تھے۔ دورویہ کھڑے تماشائی ان لوگوں کو دیکھنے کے لیے اُمڈے پڑ رہے تھے۔ طاقتور اسٹریٹ لائٹس میں سب کچھ صاف دکھائی دیتا تھا۔

کمانڈر فارس جان نے اپنی ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رائے زل اور ہاناوانی کا ٹرک ہے۔ پوری طرح بم پروف ہے۔ اس کے اوپر جو شیشہ لگا ہے، وہ بھی بلٹ پروف ہے اور دھماکوں کو برداشت کرسکتا ہے۔''

سیف نے کہا۔ ''گولی کو روکنے والے تو بہت سے شیشے نکل آئے ہیں مگر فرشتے کو روکنے والا شیشہ کوئی نہیں بن سکا۔''

فارس جان بولا۔ ''واہ .... برادر، تم نے سوالاکھ کی بات کیا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو اس بڈھی چڑیل کے چنے پڑھے ہی جانے ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائی اور ٹرک کو دیکھنے لگا۔ اردگرد سیکڑوں مسلح افراد تھے اور یہ قافلہ رینگتا ہوا ڈی پیلس کے مین گیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ یہی وقت تھا جب یکے بعد دیگرے سلامی کی توپیں داغی گئیں اور بینڈ زورشور سے دھنیں بکھیرنے لگے۔ گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں میں کھڑے لوگ جھنڈیاں لہرا رہے تھے اور گل پاشی کررہے تھے۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ان میں سے کتنے لوگ مجبوراً اور کتنے خوش دلی سے یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ بہرحال یہ حقیقت سب کے لیے اطمینان بخش تھی کہ خونریزی کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

اور پھر مجھے ٹیلی اسکوپ میں سے رائے زل اور اس کی والدہ محترمہ کی ''شکل مبارک'' دکھائی دینے لگی۔ ایک زرنگار کرسی پر خوش پوش رائے زل بڑے کروفر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ گوشت اور چربی کا ایک گولا سا دکھائی دیتا تھا۔ میں اس سے پہلے قسطینا کے بنائے ہوئے خفیہ وڈیو کلپ میں بھی اس ظالم موٹے کو دیکھ چکا تھا۔ وہ مسکرا کر تماشائیوں کی طرف دیکھتا تھا تو صاف پتا چلتا تھا کہ یہ مسکراہٹ اس نے اپنے منحوس چہرے پر بہت مشکل سے چڑھائی ہے۔ رائے

زل کے پہلو میں دوسری زرنگار کرسی پر وہ عورت موجود تھی جس کی سحرکاری نے یہاں کے لوگوں کے ذہنوں کو جکڑ رکھا تھا، اسے کئی ناموں سے پکارا جاتا تھا جن میں ایک نام ماذوورا بھی تھا، یعنی قہر کی ملکہ۔ اور یہ قہر کی ملکہ اب بڑے طمطراق سے شاہی نشست پر براجمان تھی۔ اس نے سفید اور سیاہ رنگ کا لباس زیب تن کررکھا تھا۔ درجنوں ہی گہنے اس کے جسم پر نظر آرہے تھے اور ان گہنوں میں قیمتی پتھر لشکارے مارتے تھے۔ وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ بس کسی وقت اپنا ایک ہاتھ تھوڑا سا اٹھاتی تھی اور لوگوں کے سلاموں کا جواب دیتی تھی۔ یہ رات کا وقت تھا پھر بھی لگتا تھا کہ اس نے گہرے رنگ کا چشمہ لگا رکھا ہے۔ ہاں یہی تھی مادام ہاناوانی۔ وہ کئی دہائیوں سے ریان فردوس، نسا نورل اور ان کے دو بیٹوں پر عرصۂ حیات تنگ کیے ہوئے تھی اور آج بالآخر وہ فاتحانہ انداز میں ڈی پیلس میں داخل ہوگئی تھی۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا کئی دہائیوں سے چلنے والی وہ دشمنی واقعی اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے جس نے اس جزیرے کے عام لوگوں کی زندگیاں حرام کررکھی تھیں۔ کیا واقعی امن کا دور دورہ ہوگا اور ان چمکیلی خوشگوار دوپہروں کا دور واپس آجائے گا جس کا ذکر قسطینا نے کیا تھا؟ یا پھر کوئی گڑبڑ ہوجائے گی اور ریان فردوس اور کمال احمد کی صلح جوئی کسی سازش کے خنجر سے لہولہان ہوجائے گی۔

ڈی پیلس کا بغلی احاطہ جو کم و بیش سات ایکڑ پر مشتمل تھا مہمانوں کی گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے پہلے ہی خالی کرا لیا گیا تھا۔ اب گاڑیاں اندر آتی جارہی تھیں اور گرین فورس کے چاق چوبند جوان پارکنگ میں ان کی رہنمائی کرتے جارہے تھے۔

رائے زل اور ہاناوانی والا بلند و بالا ٹرک ہمارے سامنے سے گزرتا ہوا اس بڑے چبوترے کی طرف گیا جہاں عزت مآب ریان فردوس، نسا نورل اور درجنوں اہلِ خانہ، رائے زل اور ہاناوانی کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ دونوں فریقین اس حیران کن تبدیلی پر خوش نظر آتے تھے۔ درحقیقت یہ ایک بہت بڑی کایا کلپ تھی جو ہمارے سامنے ہورہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ برسوں پرانے تنازعات اچانک اپنے حل کی جانب آجاتے ہیں اور بدترین حالات ایک خوشگوار ماحول میں ڈھلنے لگتے ہیں۔

ڈی پیلس میں اور ڈی پیلس سے باہر وہ ایک بارونق رات تھی۔ شہر کے تاجروں اور ہوٹل مالکان نے نیوسٹی کے سپاہیوں کے لیے اپنی دکانوں اور طعام گاہوں کے

دروازے کھول دیے تھے۔ انہیں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی جارہی تھیں۔ ڈی پیلس کے اندر گرے فورس کے کمانڈروں اور افسروں کے لیے قیام وطعام کے علاوہ تفریح کے مواقع بھی فراہم کیے گئے تھے۔ کہا جارہا تھا کہ مادام ہاناوانی اور رائے زل نے محل کے خاص الخاص حصے میں قیام کیا ہے اور ان کی ہر طرح خاطر مدارت کی جارہی ہے۔ جذبۂ خیرسگالی کے طور پر رائے زل نے گرین فورس کے کم و بیش ایک ہزار قیدی فوراً رِہا کرنے کا اعلان کیا تھا۔ دوسری طرف ریان فردوس نے بھی چار پانچ سو کے قریب قیدی رِہا کردیے تھے۔ چار سو کے لگ بھگ امریکی قیدی اس کے علاوہ تھے۔

میرے بازو میں پھر شدید درد شروع ہوچکا تھا۔ ہلکا سا بخار بھی محسوس ہورہا تھا۔ ڈاکٹر ماریہ نے عارضی بندوبست کے طور پر جو انجکشن تجویز کیے تھے، وہ انیق نے مجھے لگائے اور بینڈیج کی حالت بھی درست کی۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ میں قسطینا کو دیکھنے اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ وہاں اپنی سہیلی ڈاکٹر ماریہ کے ساتھ موجود تھی۔ چیف گیرٹ کی موت نے قسطینا کے دل و دماغ پر سے ایک بڑا بوجھ ہٹا کر اسے مطمئن اور خوش کیا تھا مگر اب وہ پھر پریشان دکھائی دیتی تھی۔ اس کی پریشانی کی علامت یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے بائیں کان کی لو کو ہولے ہولے کھینچتی رہتی تھی۔ ڈاکٹر ماریہ بھی گم صم سی تھی۔

میں نے کہا۔ ”کیا بات ہے قسطینا؟ اب تو لگتا ہے کہ سب کچھ اچھا ہونے جارہا ہے۔“

”لیکن میرے لیے سب کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں اس شخص سے بہت بیزار ہوں۔ اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔“

”آپ کس کی بات کررہی ہیں؟“

”رائے زل کی۔“ وہ نفرت سے بولی۔ ”کچھ دیر بعد رات کا کھانا کھایا جانے والا ہے۔ پھوپی جان (نسانورل) مجھے اور ماریہ کو بھی بلارہی ہیں اور وہ رائے زل کے کہنے پر ہی بلارہی ہوں گی۔“

”اگر آپ نہیں جانا چاہتیں تو انکار کردیں۔“

”انکار ہی کیا تھا لیکن پھر ابراہیم کی فون کال آگئی۔ اب میں نے فون ہی بند کردیا ہے۔“

مجھے یہ بات ابراہیم سے معلوم ہوئی تھی کہ ماضی میں رائے زل، ڈاکٹر ماریہ میں بہت دلچسپی لیتا رہا ہے۔ ڈاکٹر ماریہ بہت زیادہ خوب صورت تو نہیں تھی مگر اس میں ایک طرح کی ذہانت آمیز کشش تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال کے درمیان تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس کی ماں برٹش اور والد برونائی کا تھا۔ قریباً تین سال پہلے اپنے ملائی خاوند سے اس کی علیحدگی ہوچکی تھی۔ اب ایک تین سالہ بچہ اس کے ساتھ تھا۔

میں نے قسطینا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر ماریہ تو آپ سے بھی زیادہ پریشان ہیں۔ شاید یہ بھی جانا نہیں چاہتیں۔“

”ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ قسطینا نے کہا۔

اسی دوران میں ڈاکٹر ماریہ کے فون کا میوزک بجنے لگا۔ ڈاکٹر ماریہ نے نمبر پڑھنے کے بعد سوالیہ نظروں سے قسطینا کی طرف دیکھا۔ قسطینا بیزاری سے بولی۔ ”بند کردو۔“ چند سیکنڈ بعد میوزک بند ہوا تو ڈاکٹر ماریہ نے فون آف کردیا۔

ہم نے کچھ دیر تک موجودہ صورتِ حال کے بارے میں گفتگو کی۔ پھر ڈاکٹر ماریہ نے اپنے ہلکے براؤنش بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا اور میرے بازو کی طرف دیکھنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ اب میرے بازو کی حالتِ زار، زیرِ بحث آجائے گی۔ میں نے آنکھ کے خفیف اشارے سے اسے منع کردیا اور پھر موقع ملتے ہی وہاں سے کھسک آیا۔

وہ رات خیر خیریت سے گزر گئی۔ صبح معلوم ہوا کہ ڈی پیلس میں مادام ہاناوانی اور رائے کی خوب آؤ بھگت ہورہی ہے۔ تحفے تحائف کا تبادلہ بھی ہوا ہے۔ گلے شکوے بھی ہورہے ہیں اور ساتھ ساتھ دور بھی کیے جارہے ہیں۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا جارہا تھا کہ آج شام شاید مادام ہاناوانی مقامی ٹی وی پر کوئی ”اسپیچ“ وغیرہ بھی دیں گی۔

سہ پہر کا وقت تھا جب سیف میرے پاس بھاگا ہوا آیا۔ کہنے لگا۔ ”استاد صاحب وہاں شہر میں ایک جگہ کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ میں نے ابھی دوربین سے دیکھا ہے۔“

میں اور انیق باہر نکلے اور سیف کے ساتھ بالکونی کی طرف گئے۔ سیف سے ٹیلی اسکوپ لے کر میں نے ڈی پیلس کی فصیل سے باہر دیکھا۔ شہر کی ایک سڑک پر واقعی گڑبڑ محسوس ہوئی۔ یوں لگا کہ مقامی لوگ کسی بات پر شدید احتجاج کررہے ہیں اور رائے زل کی گرے فورس کے لوگ انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش میں ہیں۔ اسی دوران میں دو فائر بھی سنائی دیے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ ہوائی فائر تھے لیکن انہوں نے چونکایا۔

سیف بولا۔ ”استاد محترم! ہمیں دیکھنا چاہیے۔ یہ

نہتے لوگ ہیں، کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔"

"یار! تم زیادہ رستم زماں نہ بنو۔" انیق نے اسے ٹوکا۔ "ہمیں یہاں سے نہ نکلنے کی ہدایت کی گئی ہے۔"

اسی دوران میں، میں نے دوبارہ ٹیلی اسکوپ میں دیکھا۔ معاملہ کچھ گمبھیر نظر آیا۔ احتجاج کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ گرے فورس کے مسلح سپاہی انہیں رائفلوں کے دستوں سے پیچھے دھکیل رہے تھے۔ "گرین فورس" اردگرد کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے فون پر کمانڈر فارس جان سے رابطہ کرنا چاہا مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ میں، انیق اور سیف کے ہمراہ سیڑھیاں اتر کر تیزی سے نیچے آیا۔ ہم ایک گاڑی پر ڈی پیلس کے مین گیٹ تک گئے اور پھر وہاں سے پیدل آگے بڑھے۔ اب ڈی پیلس کے قریباً سب محافظ اور اہم لوگ مجھے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ مجھے باہر جانے سے کسی نے نہیں روکا۔ ہم نے ایک چوراہا پار کیا اور دو چھوٹی سڑکوں سے گزر کر ہنگامے والی جگہ پر پہنچ گئے۔ ایک پرائمری اسکول کی عمارت کے سامنے تین چار سو کے قریب مقامی لوگ جمع ہو چکے تھے، ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے اور وہ غصیلے نعرے لگا رہے تھے۔

انیق نے دو تین مقامی افراد سے بات کی پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "معاملہ سنگین ہے جی۔ آپ قسطینا صاحبہ سے رابطہ کریں اور ان سے کہیں کہ وہ فوراً نوٹس لیں اور گرین فورس کے جوانوں کو بھیجیں۔"

"لیکن ہوا کیا ہے؟"

"یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ "گرے فورس" والے کچھ عورتوں کو پکڑ کر یہاں لائے ہیں اور ان سے مار پیٹ کر رہے ہیں۔ یہ عورتیں عبدالکریم کی فیملی کی ہیں۔ شاید اُن پر تشدد کر کے ان سے عبدالکریم کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے۔"

کریم کا نام سنتے ہی اس کی ساری کہانی اور سارا حلیہ میرے ذہن میں آ گیا۔ ناکردہ جرموں کی پاداش میں ایجنسی والوں نے اس شخص کو "دہشت گرد" بنا رکھا تھا۔ اس کا اصل جرم صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنے بچے کو ٹکر مارنے والی ایک کار سوار امریکن لڑکی کو صرف ٹچ کیا تھا۔ اس پر پولیس اسٹیشن میں شرمناک تشدد کیا گیا اور اسے بچانے کی کوشش میں اس کا بھائی بھی لپیٹ میں آ گیا۔ بس اس "گناہ" کی سزا میں اس کی پوری فیملی تباہ ہوئی تھی۔ اس کا بھائی مارا گیا تھا اور اپنے ہی اس بھائی کی کھوپڑی کا ایک ٹکڑا کریم کی ٹانگ میں لگا تھا جس نے اس کی ٹانگ کی رگیں کاٹ کر اسے ہمیشہ کے لیے ایک حسرت ناک لنگڑاہٹ دے دی تھی۔ غالباً یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اسے ابھی تک معاف نہیں کیا گیا تھا اور اسے ڈھونڈنے کے لیے اس کے اہلِ خانہ کو پکڑ کر یہاں بند کر دیا گیا تھا۔

ہجوم اور ہجوم کا طیش بڑھتا جا رہا تھا۔ کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ پیش آ سکتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہاں گرین فورس کا کوئی اہم شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس اِکا دُکا سپاہی موجود تھے جو فاصلے پر کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں تیزی سے اسکول کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس وسیع دو منزلہ اسکول کو گرے فورس کے فوجیوں کی رہائش کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اور اسی اسکول کے ایک حصے کو شاید تفتیشی مرکز کی حیثیت دے دی گئی تھی۔

گیٹ پر کھڑے ایک تنومند فوجی افسر سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ شخص رینک کے اعتبار سے کرنل وغیرہ لگتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں میگافون تھا۔ اسی میگافون پر وہ ذرا دیر پہلے ہجوم کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی سیاہ آنکھوں میں شناسائی کی جھلک نمودار ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے ڈی پیلس کے ایک اہم فرد کی حیثیت سے جانتا ہے۔ "کیا بات ہے مسٹر؟" اس نے اپنے اندرونی طیش کو دباتے ہوئے بظاہر شائستہ لہجے میں کہا۔

"سوری، میں مداخلت کر رہا ہوں۔ مجھے بتایا جا رہا ہے کہ یہاں کچھ خواتین کو پکڑ کر لایا گیا ہے اور ان سے مار پیٹ کی جا رہی ہے؟"

"آپ کی انفارمیشن درست نہیں۔ یہاں پانچ افراد لائے گئے ہیں جن میں سے صرف دو خواتین ہیں اور ان خواتین سے مرد نہیں "خواتین اہلکار" ہی پوچھ گچھ کر رہی ہیں۔ ہم نے ان لوگوں کو ڈی پیلس کی پیشگی اجازت کے بعد ہی پکڑا ہے۔"

"ان سے کیا پوچھ گچھ ہو رہی ہے؟"

"انہوں نے ایک ایسے شخص کو پناہ دینے کا جرم کیا ہے جو کئی جنگی جرائم کا ارتکاب کر چکا ہے اور ہمیں فوری مطلوب ہے۔"

میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "شاید آپ عبدالکریم کی بات کر رہے ہیں جو ایک ٹانگ سے معذور ہے اور جس کی پوری فیملی کو اس لیے موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے کہ وہ ایک امریکن لڑکی کو اپنے پلید ہاتھ سے چھونے کا قصوروار

ہوا تھا۔''

وہ روکھے لہجے میں بولا۔ ''مجھے تفصیلات معلوم نہیں۔ میں وہی کررہا ہوں جو مجھے حکم ملا ہے اور آپ براہِ مہربانی ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کریں ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔''

اسی دوران میں ہجوم میں سے ایک بپھرا ہوا نوجوان گرے فوجیوں کا گھیرا توڑ کر مجھ تک پہنچ گیا۔ اس نے گرے کرنل کی طرف اشارہ کیا اور چلّا کر بولا۔ ''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہاں کوئی لیڈی اہلکار نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ..... بھیڑیے ہیں جو اُن عورتوں کو نوچ رہے ہیں۔ ہمارے ہی شہر میں، ہمارے ہی سامنے ان کی عزت پامال کرنا چاہ رہے ہیں... ہم یہ نہیں ہونے دیں گے۔'' نوجوان کے لمبے بال کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔

گرے فورس کا کرنل دہاڑا۔ ''ایسے کام تم لوگوں کے ہیں..... اور تم نے کیے ہیں، ہم کچھ بھی بھولے نہیں ہیں۔ خود کو فتح مند سمجھنے کے بعد تم لوگوں نے واشنگٹن ہوٹل میں کیا کیا تھا۔ وہاں جن کتّوں نے بے گناہ غیر ملکی عورتوں پر ظلم توڑا ان میں یہ لنگڑا بھی شامل تھا اور یہ کوئی ایک جرم نہیں ہے اس کا۔''

اب بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ واشنگٹن ہوٹل میں جو کچھ ہوا تھا، اس کا بدلہ چکانے کے لیے اور کریم کو ڈھونڈنے کے لیے کچھ لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جارہا تھا جن میں دو عورتیں بھی شامل تھیں۔ ہم اسکول کے گیٹ کے بالکل پاس کھڑے تھے، اچانک اندر سے کسی لڑکی کے چلّانے کی دردناک آواز آئی۔ اس آواز نے جیسے ہمارے سینوں میں انگارے بھر دیے۔ لمبے بالوں والا نوجوان تڑپ کر گرے کرنل کی طرف بڑھا مگر میں نے اسے راستے میں ہی دبوچ لیا۔ ''نہیں، پیچھے ہٹو، خود کو کنٹرول کرو۔ مجھے بات کرنے دو۔''

میں نے فون نکالا۔ پہلے قسطینا سے بات کرنا چاہی لیکن پھر اسے مزید پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے پہلے ابراہیم اور پھر بیگم نسا نورل کو ٹرائی کیا۔ نسا نورل سے بات ہوگئی۔ میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''محترم بیگم! یہاں پرائمری اسکول کی عمارت میں گرے فورس کے لوگ کریم کے گھرانے کی کچھ عورتوں اور مردوں کو تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ کیا دونوں طرف کے لوگوں کا تحفظ معاہدے کی شقوں میں نہیں؟''

''بے شک ایسا ہے۔'' بیگم نورل نے تحمل سے کہا پھر ذرا توقف سے بولیں۔ ''لیکن جو لوگ جنگی جرائم میں ملوث ہیں ان پر تو مقدمات چلیں گے، چاہے وہ ہماری جانب ہوں یا اُن کی۔''

''لیکن..... لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں بڑی بیگم! یہ شخص کسی جنگی جرم میں شامل نہیں۔ یہ لوگ واشنگٹن ہوٹل کے جس واقعے کا حوالہ دے رہے ہیں، وہ میرے سامنے ہوا تھا۔ یہ شخص وہاں صرف پہرے داروں میں شامل تھا اور خود ہر ہائی نس قسطینا نے اسے وہاں مقرر کیا تھا۔''

''لیکن جو کچھ بھی ہے، ایسے لوگوں کو بھاگنا نہیں چاہیے۔ انہیں خود کو انصاف کے لیے پیش کرنا چاہیے۔''

''گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن یہاں جو کچھ عورتوں کے ساتھ ہورہا ہے، اس نے لوگوں میں شدید غصہ پیدا کردیا ہے۔ کوئی حادثہ ہوسکتا ہے۔ آپ اس عمل کو روکیں اور ساتھ ہی گرین فورس کے کسی دستے کو یہاں بھیجیں تاکہ صورتِ حال کنٹرول کی جاسکے۔''

بیگم نورل چند سیکنڈ تک تذبذب میں رہنے کے بعد بولیں۔ ''تم ایک منٹ ہولڈ کرو۔ میں عزت مآب سے بات کرتی ہوں۔''

میں نے ہولڈ آن کیا۔ ایک منٹ سے پہلے ہی بیگم نورل کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''شاہ زیب! تم وہاں سے فوراً واپس آجاؤ۔ عزت مآب ایک ذمے دار آفیسر کو بھیج رہے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہوگیا۔

اندازہ ہوا کہ بیگم نورل کو عزت مآب کی طرف سے سخت جواب ملا ہے۔ شاید ''عزت مآب'' کی طرف سے مجھے ایک آدھ صلوات بھی سنائی گئی ہو اور کہا گیا ہو کہ مجھے اس پھڈے میں ٹانگ اڑانے کے لیے کس نے کہا ہے۔ دوسری بات یہ سمجھ میں آرہی تھی کہ عزت مآب ریان فردوس یہاں گرین فورس کا دستہ بھیجنے کے حق میں نہیں تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کوئی ٹکراؤ نہ ہوجائے۔ وہ کسی آفیسر کو بھیج رہا تھا، یہ بزدلی کی بڑی عمدہ مثال تھی۔ اپنے ہی شہر میں اپنے ہی لوگوں کی حفاظت نہیں کی جارہی تھی۔

اچانک وہ کچھ ہوا جس کی توقع کسی نے نہیں کی تھی۔ کسی قریبی مکان کی چھت سے رائے زل کی گرے فورس کے سپاہیوں پر ایل ایم جی کے تین چار برسٹ چلائے گئے۔ میں نے پانچ چھ سپاہیوں کو زخمی ہوکر گرتے دیکھا۔ ہجوم ایک تند ریلے کی طرح گرے سپاہیوں کی طرف بڑھا۔ ان کی تعداد وہاں تیس چالیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ہجوم سیکڑوں میں تھا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں کند اور تیز دھار

آلات کے علاوہ آتشیں ہتھیار بھی دکھائی دے رہے تھے۔

ہجوم اتنی سرعت سے جھپٹا تھا کہ گرے فورس والوں کو مزاحمت کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ ایک طوفانی ریلا تھا۔ غیظ و غضب سے بھرا ہوا اور ہر رکاوٹ کو روندتا ہوا۔ گرے فورس والے شاید چند گولیاں ہی چلا سکے ہوں گے۔ ہجوم ان پر ٹوٹ پڑا۔ تیز دھار آلات چمکے۔ تابڑ توڑ فائر ہوئے۔ میں نے ایک ادھیڑ عمر شہری کو دیکھا۔ اس نے صرف دو تین فٹ کے فاصلے سے گرے فورس کے ایک سپاہی کے سر میں گولی ماری اور دوسرے پر جھپٹ پڑا۔ یہاں کسی کو روکا نہیں جاسکتا تھا۔ میں اور انیق ہکا بکا کھڑے تھے...... ہاں سیف مار دھاڑ کرنے والوں میں شامل ہو گیا تھا۔ یہ لرزہ خیز مناظر تھے۔ گرے فورس کے سپاہیوں کی لاشیں لوگوں کے پاؤں تلے کچلی جا رہی تھیں۔

''میرے خیال میں ہمیں اندر دیکھنا چاہیے، میں نے ہولسٹر سے پستول نکالتے ہوئے کہا۔

میں اور انیق اسکول کی عمارت میں داخل ہوئے۔ ہم اس طرف بڑھے جہاں کسی لڑکی کے چلانے کی آواز سنائی دی تھی۔ اسکول کی کینٹین کے پاس یہ دو مستطیل کمرے تھے۔ ہم اندر گھسے تو تکلیف دہ مناظر نظر آئے۔ دو مردوں اور ایک لڑکی کو بالکل برہنہ حالت میں چھت سے لٹکایا گیا تھا۔ آہنی زنجیروں کے تناؤ کی وجہ سے ان کی کلائیاں چھلی ہوئی تھیں اور جسموں پر شدید مار پیٹ کے نشان تھے۔ باقی دو قیدی جن میں ایک جواں سال عورت بھی تھی، سہمے ہوئے ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ تیسرا فرش پر تھا اور مر چکا تھا۔ اس کے جسم کے نازک حصے ناپید تھے۔ ان پر تیز دھار آلہ استعمال ہوا تھا...... اندازہ ہو رہا تھا کہ باہر کے حالات دیکھ کر اسکول کے اندر موجود چند گرے فوجی راہِ فرار اختیار کر گئے ہیں۔

ہمارے پیچھے ہی پیچھے درجنوں بپھرے ہوئے لوگ اندر پہنچ گئے۔ ان کے سروں پر جیسے خون سوار تھا۔ ہم نے برہنہ لڑکی کو ایک چادر سے ڈھانپا اور اس کی زنجیر کھول کر اسے نیچے اتارا۔ وہ نیم بے ہوش تھی۔ دونوں مردوں کی حالت بھی ملتی جلتی تھی۔ مشتعل لوگ اسکول کے کونوں کھدروں میں گرے سپاہیوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ صرف ایک شخص ملا۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کو بچانے کی کوشش کرتے، تین چار فائر ہوئے اور وہ مٹی کا ڈھیر ہو کر نیچے گر گیا۔

میں نے کہا۔ ''یہ بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ انیق، ہمیں فوراً اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچنا چاہیے۔''

انیق نے تائید کی۔ ہم نے سیف کو ساتھ لیا اور فوراً اپنے کمرے تک پہنچ گئے۔ یہ ڈی پیلس کا وہی پورشن تھا جہاں قسطینا، کمانڈر فارس اور میجر وارث وغیرہ سمیت بہت سے اہم افراد موجود تھے۔ اس پورشن کو پاسبان بریگیڈ کے جانبازوں نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اسکول کے سامنے ہونے والے خونی تصادم کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی تھی۔ میں نے قسطینا سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر فوری طور پر کامیابی نہیں ہوئی۔ ہاں چند منٹ بعد کمانڈر فارس سے رابطہ ہو گیا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''برادر! معاملہ خراب ہو گیا ہے۔ ابھی ام کو پون پر پتا چلا ہے کہ شہر کی سپر مارکیٹ میں بھی خون خرابا ہوا ہے۔ گرے پورس کا لوگ ایک مسجد میں جوتوں سمیت گھس گیا۔ امام صیب کے منع کرنے پر انہیں تھپڑ مارا گیا جس پر کسی جوشیلے نے تھپڑ مارنے والے کو چھرا گھونپ دیا۔ ایک دم لڑائی کا آگ بھڑک اٹھا۔ کہا جا رہا ہے کہ لوگ گرے سپاہیوں پر پل پڑے۔ سات آٹھ سپاہیوں کو موقع پر ہی مار دیا گیا ہے اور دو چار کی لاشوں کو آگ بھی لگا دیا گیا ہے۔''

''قسطینا صاحبہ کو فوراً ایکشن لینا چاہیے۔ گرین فورس کہیں نظر نہیں آ رہی۔ یہ لوگ کہاں ہیں؟ قسطینا صاحبہ اور میجر وارث کمانڈروں سے رابطہ کریں۔''

''ہر ہانس قسطینا تو بالکل لاتعلق ہو گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ام اب کچھ نہیں کرے گا۔ عزت مآب جانے اور رائے زل جانے۔ اور...... امارے خیال میں وہ...... ٹھیک بھی کہتا ہے۔ عزت مآب نے امریکن قیدیوں کا رسیاں کھول کر ام سب کا باگیں دشمن کے ہاتھوں میں پکڑا دیا ہے اور آپ نے جو دوسرا بات پوچھا ہے کہ امارا گرین پورس کا لوگ کہیں نظر کیوں نہیں آ رہا تو اس کا جواب بھی بڑا پریشان کن ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''عزت مآب کا احتیاط پسندی ام سب کا بیڑا غرق کیا ہے۔ عزت مآب کے حکم پر رات ہی کو امارے بہت سے دستے ڈی پیلس سے نکل گئے تھے۔ وہ اب چھاؤنی میں ہے۔ عزت مآب نہیں چاہتا تھا کہ گرے پورس اور گرین پورس ایک دوسرے کے سامنے رہے اور دونوں طرف کا لوگ مسلح ہونے کی وجہ سے کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔ اب دیکھو جی، ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے اور امارا پورس کہیں نظر نہیں آ رہا، اللہ خیر کرے۔''

میرے ذہن میں ایک اور بات بری طرح چبھ رہی تھی۔ کریم کے گھرانے کے مرد و زن کو پکڑنے والے اور ان کو اسکول میں لاکر تشدد کرنے والے سب کے سب گرے فورس کے لوگ تھے، ان میں ہمیں ایک بھی امریکن دکھائی نہیں دیا تھا۔ حالانکہ ایسے معاملوں میں وہ اب پیش پیش نظر آرہے تھے کیا اس کے پیچھے بھی کوئی سازش تھی۔

ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ معلوم ہوا، صورتِ حال کو کنٹرول کرنے کے لیے رائے زل بنفسِ نفیس ڈی پیلس سے باہر گیا ہے۔ عزت مآب کا بڑا بیٹا کمال احمد بھی اس کے ساتھ ہے۔ وہ لوگ اسی بم پروف فوجی ٹرک پر سوار ہیں جس پر ہم نے انہیں کل رات دیکھا تھا۔ اس کے قریباً دس منٹ بعد ہی یہ دوسری خبر پہنچی کہ کسی گھر کی چھت سے رائے زل کے ٹرک پر بھی اندھا دھند فائرنگ کی گئی ہے اور اس فائرنگ میں ٹرک کے پیچھے چلنے والے کئی گرے سپاہی مارے گئے ہیں۔

دو تین منٹ بعد ہی ڈی پیلس کے باہر اسکول کے چوراہے کی جانب سے تابڑ توڑ فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آٹومیٹک رائفلوں سے سنگل فائر ہو رہے تھے اور برسٹ بھی چلائے جا رہے تھے۔ صورت حال کی سنگینی نے مجھے اور کمانڈر فارس جان کو قسطینا تک پہنچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بدستور سادہ لباس ''شرٹ، جرسی اور جینز'' میں تھی۔ وہ اپنے کمرے میں بھوکی شیرنی کی طرح چکرا رہی تھی۔

شہر میں ہونے والی فائرنگ کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''قسطینا! آپ نے، عزت مآب یا بیگم نورل سے رابطہ کیا؟''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ان سے رابطہ کرنے کی اور میں ہوتی بھی کون ہوں رابطے کرنے والی؟ یہ ان کی پراپرٹی ہے، وہ ان کا جزیرہ ہے، وہ یہاں سیاہ سفید کے مالک ہیں، ہم تو ان کے لیے کرائے کے لوگ ہیں۔ ان کے حکم پر لڑنے مرنے والے......بس۔''

وہ غم و غصے کے تند ریلے میں بہہ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''یہ جو جھگڑا ہوا ہے، اس میں ایجنسی والے کہیں نظر نہیں آرہے یور ہائی نس۔''

''وہ نظر آئیں گے بھی نہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ ''ہاں، ابھی وہ نظر آئیں گے بھی نہیں۔ وہ اپنا کام دوسروں سے کرانا بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ روس ہو، افغانستان ہو یا عراق...... کس جگہ وہ خود لڑے ہیں۔ مکار لومڑ...... اور یہاں وہ بڈھی کھوسٹ ہانا وانی بھی ان کے ساتھ ملی ہوئی ہے، اس کے سینے میں کینے کی آگ جل رہی ہے۔ وہ ایک ایک کو بھسم کر کے دم لے گی۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ معاہدہ ایک دھوکا تھا۔''

''سراسر دھوکا، فراڈ اور ایک بے رحم ڈراما۔''

''آپ کا کیا خیال ہے، رائے زل بھی اس دھوکے میں پوری طرح شریک ہے؟''

''وہ اور اس کی ماں ایک ہیں۔ وہ وہی کرتا ہے جو اس کی ماں کہتی ہے۔ یہ دونوں ہم کو تو دھوکا دے رہے ہیں اپنے لوگوں کو بھی دھوکا دے رہے ہیں۔ اگر دونوں طرف کے لوگوں کے دلوں میں کہیں تھوڑی بہت اخوت اور نرمی رہ بھی گئی ہے تو وہ اسے بھی ملیا میٹ کر دینا چاہتے ہیں۔ ''چاہتے'' بھی کیا ہیں، کر چکے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اب...... یہاں قتلِ عام شروع ہو سکتا ہے۔''

ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ ہم نے ڈی پیلس کی دوسری منزل سے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ ڈی پیلس سے باہر ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ اسکول کی عمارت کے سامنے جو مشتعل ہجوم جمع ہوا تھا اور پُرجوش نعرے لگا رہا تھا، وہ اب بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگتا ہوا ڈی پیلس کے مین گیٹ کی طرف آرہا تھا۔ عقب سے ان پر گرے فورس کے سپاہی اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ لوگ بھاگ رہے تھے، گر رہے تھے، پاؤں کے نیچے کچلے جا رہے تھے۔ ان میں جوان مرد و زن بھی تھے اور بچے بوڑھے بھی۔ شاید انہیں واقعی قتلِ عام کا حکم دے دیا گیا تھا۔

وہ لوگ بھاگتے ہوئے ڈی پیلس کی طرف آرہے تھے۔ شاید یہاں پناہ لینا چاہ رہے تھے۔ اپنے ''عزت مآب'' کی حفاظت میں آنا چاہتے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ مین گیٹ تک پہنچتے، ان پر ڈی پیلس کی فصیل سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ فائرنگ کرنے والے گرے فورس کے لوگ ہی تھے۔

طرفہ تماشا تھا۔ کل رات جو لوگ بڑی خوش دلی سے گرے فورس کا استقبال کر رہے تھے، وہ گولیوں سے بھونے جا رہے تھے اور جو خوش دلی سے استقبال کرا رہے تھے، وہ اب گولیاں چلا رہے تھے۔ شاید اسی طرح کا قتلِ عام تاریخ کے ایک بدنام کردار جنرل ڈائر نے جلیانوالہ باغ میں بھی کرایا تھا۔ کچھ ہی سیکنڈز میں ہم نے ان گنت افراد کو اپنے سامنے ڈھیر ہوتے دیکھا۔ اب ہمارے لیے رکنا اور تماشا دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ قسطینا کو اس کے حال پر چھوڑ کر ہم سیڑھیوں کی طرف لپکے۔ کمانڈر فارس کے علاوہ انیق اور

سیف بھی ہمراہ تھے۔ میرے ہاتھ میں ایم ایم جی تھی۔ انیق اور سیف بھی آٹومیٹک رائفلوں سے مسلح تھے۔ کمانڈر فارس اپنے ساتھیوں کو ایکشن میں لانے کے لیے ٹیرس کی طرف نکل گیا۔

ہم نیچے پہنچے تو انیق نے پکار کر کہا۔ ''وہ دیکھیں شاہ زیب بھائی!''

میں نے انیق کی نظر کا تعاقب کیا، ڈی پیلس کے اندر بھی گرے فورس والے عام لوگوں پر پل پڑے تھے۔ وہ نہتے لوگوں کو بے دریغ شوٹ کر رہے تھے۔ لوگ چلاتے ہوئے چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔

''ہم ان لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمیں زینب اور ابراہیم کو دیکھنا ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ دونوں ڈاکٹر ماریہ والے پورشن میں ہیں۔'' میں نے کہا اور ڈاکٹر ماریہ کی رہائش گاہ کی طرف دوڑا۔ میرا زخمی بازو میرے گلے میں جھول رہا تھا۔ ایم ایم جی میرے دائیں ہاتھ میں تھی۔ ہمارے اردگرد ایک طوفان برپا تھا۔ جارحیت ننگی ہو کر وحشیانہ رقص کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی خونی سیلاب کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ گرے فورس کے سپاہیوں نے درندوں کا روپ دھار لیا تھا، ان کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ وہ اپنے سامنے آنے والے ہر مقامی کو قتل کر رہے تھے۔ روتے بچے، ہاتھ جوڑتی عورتیں، قدموں میں گرے ہوئے بوڑھے، کوئی بھی ان کے دلوں میں رحم کی رمق نہیں جگا پا رہا تھا۔ وہ ہر طرف جھپٹ پڑے تھے اور بلاامتیاز لوگوں کو شوٹ کر رہے تھے، انہیں سنگینیں اور خنجر گھونپ رہے تھے۔ مرنے والوں میں سے کچھ مقدور بھر مزاحمت کر رہے تھے۔

اچانک میں سکتے میں رہ گیا۔ دوڑتے دوڑتے میرے قدم تھم گئے۔ میں نے سجاول سیالکوٹی کو دیکھا۔ وہ مجھ سے کوئی تیس قدم کے فاصلے پر موجود تھا۔ ایک کھڑکی میں لگی ہوئی آگ کے پس منظر میں اس کا چہرہ مجھے صاف نظر آیا۔ اس کے بدن پر ایک ایسی وردی تھی جو راے زل کی گرے فورس سے ملتی جلتی تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے اس نے ایک رضاکار کے سینے میں اپنی سیون ایم ایم رائفل کی گولی ماری۔ دوسرے رضاکار کو گولی مارنے لگا تو رائفل نے جواب دے دیا۔ اس کا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ میگزین بدلنے کی مہلت نہیں تھی۔ سجاول نے رائفل کی قریباً ایک فٹ لمبی سنگین دوسرے رضاکار کے پیٹ میں گھونپ دی۔ یہ سارا واقعہ دو تین سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ تب میں نے ایک سترہ اٹھارہ سال کے دبلے پتلے لڑکے کو دیکھا۔ اس نے چلا کر سجاول کے سر پر ایک سالم اینٹ رسید کی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ ذرا سا لڑکھڑانے کے بعد سجاول لڑکے کے پیچھے بھاگا۔ وہ اسے اپنی سنگین میں پرو دینا چاہتا تھا۔

میرا سکتہ جیسے ٹوٹا اور میں سجاول کے پیچھے دوڑا۔ ''سجاول...... رک جاؤ سجاول۔'' میں سینے کی پوری طاقت سے پکارا۔

اس نے مڑ کر میری طرف نہیں دیکھا۔ اس کے سارے غیظ و غضب اور اس کی توجہ کا رخ دبلے پتلے لڑکے کی طرف تھا۔ گولیوں کی بارش اور شعلوں کے رقص میں ہم آگے پیچھے دوڑتے چلے گئے۔

''سجاول...... سجاول۔'' میں پھر پکارا۔ اس نے کچھ نہیں سنا۔

مجھے یہی لگا کہ وہ لڑکے کو مار ڈالے گا۔ اس کے اور لڑکے کے درمیان دو چار قدم کا فاصلہ ہی رہ گیا تھا۔ میں نے بھاگنے میں اپنی پوری طاقت صرف کی۔ لڑکا سجاول کی زد میں آنے ہی والا تھا کہ میں سجاول پر جا پڑا۔ ہم دونوں لڑھکتے ہوئے ایک دروازے سے ٹکرائے اور اسے توڑتے ہوئے ایک کشادہ روم میں جا گرے۔ لڑکا دوسرے دروازے سے نکل کر بھاگتا چلا گیا تھا۔ یہ ایک اسٹڈی روم لگتا تھا۔

''سجاول، یہ میں ہوں۔'' میں نے چلا کر کہا۔

اسٹڈی روم کے فرش پر اوندھے منہ گرنے کے بعد سجاول نے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا۔ آہ...... اس کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ وہ ایک بے رحم اجنبی کی آنکھیں تھیں۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر کسی میز کے نیچے جا چکی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے ایک زوردار دھکا دیا۔ میں دیوار سے جا ٹکرایا۔

''تمہیں ڈھونڈ رہا تھا...... تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔'' وہ خونخوار لہجے میں بولا اور کسی عفریت کی طرح میری طرف بڑھا۔

رائفل میرے اکلوتے ہاتھ سے بھی نکل چکی تھی۔ اگر ہوتی بھی تو میں اسے استعمال کیسے کر سکتا تھا۔ اس نے مجھے ٹھوکر رسید کی اور میں پشت کے بل کتابوں کی ایک الماری سے ٹکرایا۔ میرے اندر سے جیسے کسی نے پکار کر کہا...... شاہ زیب تمہارا سامنا پھر اسی قاتل مُکے سے ہونے والا ہے جو دوسرے سانس کی مہلت نہیں دیتا اور میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا، میں پہلے سے تیار تھا اس لیے بچ نکلا۔ ورنہ جس مُکے نے کتابوں کی چوبی الماری کو چکنا چور کیا، وہ

میرے سر کے بھی ٹکڑے کر سکتا تھا۔
میں نے اپنے دفاع میں وار کیا۔ میرے سر کی ٹکر اس کے سینے پر لگی اور وہ چند قدم لڑکھڑا گیا۔ ''سجاول! تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ ایسا؟ سجاول، دوست ہوں تمہارا۔''
''تو دوست نہیں، زہریلا ناگ ہے، تیری فطرت جان گیا ہوں چنگی طرح سے۔'' وہ عجیب لہجے میں بولا...... اور پھر مجھ پر جھپٹا۔
مجھے ڈیرے پر ہونے والی ہتھ جوڑی کے مناظر یاد آ گئے۔ میں جانتا تھا سجاول کوئی معمولی فائٹر نہیں ہے۔ وہ وادیِ سون کے کسی قدیم قبیلے کا جنگجو فرد تھا۔ اس کا ناتا خونریزی کی کچھ پرانی رسموں سے تھا۔ اس کے دائیں بازو میں ایک ایسی غیر مرئی توانائی تھی جو کسی بھی شخص کو لمحوں میں موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔
اگلے تیس چالیس سیکنڈز تک میں خود کو اس سے بچاتا ہی رہا۔ اس دوران میں، میں نے کم و بیش چار بار خود کو اس کے قاتل گھونسے سے بچایا۔
اچانک سیف بھی اس لڑائی میں کود پڑا۔ اس نے پھرتی دکھائی اور یکایک سجاول کو عقب سے اپنے جپھے میں لے لیا۔ کبڈی کے کھلاڑی کی حیثیت سے اسے اپنی اس گرفت پر بڑا ناز تھا مگر مدِمقابل کوئی عام شخص نہیں تھا۔ میں چلّایا۔ ''سیف! یہ کیا کر رہے ہو...... پیچھے ہٹ جاؤ۔''
ابھی میرے الفاظ منہ میں ہی تھے کہ سجاول نے اندھا دھند زور لگایا۔ اس کے دونوں بازو بھی سیف کی گرفت میں تھے مگر پاؤں تو آزاد تھے۔ وہ وحشت کے عالم میں پیچھے کی طرف گیا اور سیف کو ایک دیوار سے ٹکرا دیا۔ سیف کی گرفت ختم ہو گئی۔ سجاول کسی درندے کی طرح دہاڑتا ہوا سیف کی طرف پلٹا اور یہی وہ اینگل تھا جہاں سے وہ سجاول کے قاتل گھونسے کی زد میں آ سکتا تھا، میں جھپٹ کر سجاول کی طرف گیا اور اس مرتبہ میں نے اسے عقب سے جکڑنے کی ادھوری کوشش کی پھر بھی سجاول کی شدید ٹھوکر کام کر گئی۔ یہ ٹھوکر سیف کے پیٹ میں لگی اور وہ جیسے ہوا میں اُڑتا ہوا کمرے سے باہر جا گرا۔ غالباً وہ اٹھ کر دوبارہ سجاول کی طرف آنے کی حماقت کرتا مگر انیق نے اسے پکڑ لیا۔
ایک بار پھر خود کو سجاول کے گھونسے سے بچاتے ہوئے میں سجاول سے لپٹ گیا اور اڑنگا لگا کر اسے پشت کے بل گرانے کی کوشش کی مگر وہ سنبھل گیا۔ اس کارروائی کے دوران میں ایک ریفریجریٹر پہلو کے بل گرا اور اس میں سے شارٹ سرکٹ کی آوازیں آئیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کمرے سے باہر بھی کشت و خون عروج پر ہے۔ کہرام سا مچا ہوا تھا۔ ہلکے اور بھاری ہتھیاروں سے تابڑ توڑ فائرنگ ہو رہی تھی۔ بے شک میں ایم ایم اے چیمپئن تھا۔ اپنے سخت ترین حریفوں کو بھی بیک فٹ پر لانے کے بے شمار طریقے جانتا تھا مگر میرے زخمی بازو نے مجھے آدھا کر دیا تھا اور اصل میں یہ زخم بھی اسی سجاول سیالکوٹی کا دیا ہوا تھا۔
اچانک میں اوندھے منہ گرا اور مجھے اندازہ ہوا کہ میں ''نیک لاک'' کا شکار ہو گیا ہوں۔ عام فہم الفاظ میں، میری گردن سجاول کے بازو کے شکنجے میں آ گئی تھی۔ دو بدو فائٹ میں اکثر اس طرح کے مواقع آ جاتے ہیں۔ بندہ اپنے حریف کے کسی خطرناک ہتھکنڈے سے بچنے کی تگ و دو میں رہتا ہے اور کسی کم خطرناک داؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ آہنی جسم والا سجاول میری پشت پر سوار تھا اور اپنے بازو کا بے پناہ دباؤ ڈال کر میری سانس کی ڈور منقطع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ انیق بھی جان گیا تھا کہ بپھرا ہوا سجاول کسی بھی لمحے میری گردن توڑ سکتا ہے۔ وہ دیوانہ وار سجاول پر جھپٹا اور اس کے کندھے اور سر پر رائفل کے دستے سے شدید ضربات لگائیں۔ سجاول جیسے جنون کی کیفیت میں تھا اور تکلیف اس کے لیے بے معنی ہو چکی تھی۔
''مار دوں گا پیچھے ہٹ جاؤ۔'' انیق کی آواز جیسے میلوں دور سے میرے کانوں تک پہنچی۔
میں نے دھندلائی نظروں سے دیکھا، اس نے چند فٹ پیچھے ہٹ کر رائفل کا رخ سجاول کی طرف کر لیا تھا۔ سجاول، انیق کے لیے امریش پوری تھا اور آج اس نے واقعی امریش پوری بن کے دکھا دیا تھا۔ لیکن میرا دل ایک اور گواہی دے رہا تھا۔ سجاول وہ نہیں تھا جو نظر آ رہا تھا۔ وہ کسی کے ''زیرِاثر'' تھا۔ میں نے اس کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کے چہرے پر کسی اور کی آنکھیں دھری ہیں۔
سخت ترین اذیت میں ہونے کے باوجود میں نے انگلی کے اشارے سے انیق کو گولی چلانے سے منع کیا۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے خود کو چند انچ آگے کی جانب سرکایا اور اپنا ہاتھ بجلی کے اس تار تک پہنچا دیا جو ریفریجریٹر گرنے سے علیحدہ ہوا تھا۔ پیچھے سے یہ تار ابھی تک ساکٹ میں لگا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ کرنٹ مجھے بھی لگے گا لیکن میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب

میں نے تار کا ٹوٹا ہوا سرا سجاول کے بازو سے ٹچ کیا تو وہ پھڑک کر پہلو کے بل گرا۔ شاک مجھے بھی کم نہیں لگا تھا لیکن میں فوراً سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے جو ٹھوکر سجاول کے سر پر لگائی وہ ان ممنوعہ ضربات میں سے ایک تھی جو مکس مارشل آرٹ میں سنگین فاؤل کہلاتی ہیں۔ لیکن میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں مجروح تھا اور میرا حریف مجھے ہرانے کے لیے نہیں، مارنے کے لیے لڑ رہا تھا۔ میرے جوتے کی ٹھوکر عین اس کی کنپٹی کے وسط میں لگی اور وہ یوں بے حرکت ہوگیا، جیسے مدتوں سے ساکت پڑا ہو۔

رائفل ابھی تک انیق کے ہاتھ میں تھی اور اس کا رخ سجاول کی طرف تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ چند سیکنڈ پہلے تک اس پر گولی چلانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

''اس نے آپ کو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' انیق نے لرزاں آواز میں کہا۔

''مجھے لگتا ہے، یہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے۔''

''مجھے تو لگتا ہے جی کہ یہ کبھی بھی اپنے ہوش حواس میں نہیں تھا۔''

''یہ بحث کا وقت نہیں انیق۔'' میں نے سجاول کی نبض دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسے فوراً گھسیٹ کر اس ریفریجریٹر کے پیچھے کرو۔''

انیق اور سیف نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ کمرے کا بیشتر فرنیچر ٹوٹ چکا تھا۔ کتابوں کی الماریاں الٹی ہوئی تھیں اور فرش پر لکڑیاں اور شیشے بکھرے تھے۔ باہر سے چند اندھی گولیاں آئیں اور اسٹڈی روم کی ایل سی ڈی کو چکنا چور کرگئیں۔ ہم نے خود کو نیچے گرالیا۔ ڈی پیلس کے احاطوں اور راہداریوں میں قیامت کا سماں تھا۔ اب دستی بموں کے دھماکے بھی شروع ہو گئے تھے۔ وحشت زدہ آواز میں ''لاؤڈ اسپیکرز'' پر کچھ اعلانات کیے جارہے تھے مگر کسی کو ان کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ویسے بھی یہ ملائی زبان میں تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ گرے فورس کے کسی کمانڈر کی طرف سے اپنے فوجیوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ان سے کہا جارہا ہے کہ وہ بے گناہ لوگوں کے خون سے ہاتھ نہ رنگیں مگر چند لمحے بعد انیق نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اسی رائے زل کی آواز ہے۔ طیش میں اندھا ہورہا ہے۔ سپاہیوں کو حکم دے رہا ہے کہ جو بھی مزاحمت کرے اسے کچل ڈالو کسی کو معاف نہ کرو۔ انہیں بتاؤ کہ ہماری دوستی کیا ہے اور دشمنی کیا ہے۔''

میں ششدر رہ گیا۔ میرا دھیان ایک بار پھر زینب اور ابراہیم کی طرف چلا گیا۔ میں نے انیق سے کہا۔ ''تم یہیں رہو سجاول کے پاس۔ ہر صورت میں اس کی حفاظت کرنی ہے۔ ہم زینب اور ابراہیم کو دیکھتے ہیں۔''

انیق نے اپنی گن سمیت تباہ حال اسٹڈی روم میں پوزیشن لے لی۔ میں اور سیف اس دو منزلہ رہائشی پورشن کی طرف بڑھے جو ڈاکٹر ماریہ کی رہائش گاہ تھی۔ یہاں بھی لاشیں بکھری ہوئی تھیں تاہم لڑائی کا زور اس طرف کم تھا۔ زیادہ مار کٹائی ڈی پیلس کے خاص الخاص حصے میں ہورہی تھی۔ وہاں عزت مآب اور اس کی فیملی کے بہت سے اہم لوگ موجود تھے۔ ان اہم لوگوں کے علاوہ وہاں سنبل سمیت وہ درجنوں خواصیں بھی موجود تھیں جو عزت مآب کے حرم کا حصہ تھیں اور وہ رقاصائیں اور خوبرو ملازمائیں جو عزت مآب کے اردگرد کے ماحول کو دلکش بناتی تھیں۔ وہ سب کچھ اس وقت شدید خطرے کی زد میں تھا۔ عزت مآب ریان فردوس کی امن پسندی اور کم ہمتی اسے ڈبونے جارہی تھی۔ وہ ایجنسی اور سابقہ بیوی کے سامنے جھکتا چلا گیا تھا۔ اسے امید تھی کہ شاید وہ لوگ اس سے مہربانی کا سلوک کریں گے مگر جنگ کا اپنا بہاؤ ہوتا ہے اور لڑنے والوں کی اپنی نفسیات اور اخلاقیات۔

ہر طرف پگھلا ہوا قاتل سیسا تیر رہا تھا۔ ہم جھک کر دوڑتے اور مختلف چیزوں کی آڑ لیتے ہوئے مطلوبہ پورشن تک پہنچ گئے۔ ہم نے کسی سے بھی براہِ راست تصادم سے بچنے کی کوشش کی تھی اور کامیاب رہے تھے۔ پورشن کے ایک حصے میں کسی دستی بم کی وجہ سے آگ بھڑک اٹھی تھی اور گاڑھا دھواں اٹھ رہا تھا۔

میں اس کمرے میں پہنچا جہاں ایک ڈیکوریشن پیس کے اندر میرا پن ہول اسپائی کیمرا موجود تھا اور مجھے اس کمرے کے کچھ رومانی مناظر بھی دکھاتا رہا تھا (اب چار جنگ ختم ہونے کے سبب یہ کیمرا بند ہو چکا تھا) میں کمرے میں پہنچا تو میرا اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ ابراہیم بھی یہاں موجود تھا۔ زینب نے اپنی براؤن شال کو اسکارف کی طرح چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی تھی اور دعائیہ انداز میں کچھ بڑبڑاتی چلی جارہی تھی۔ ڈاکٹر ماریہ کا رنگ بھی خوف سے سفید دکھائی دے رہا تھا۔ ابراہیم کے کندھے سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔ بے شک وہ بھی اپنی فیملی کی طرح ایک امن پسند لڑکا تھا مگر اس وقت مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھر آئی۔

''شاہ زیب بھائی! ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا ورنہ یہ لوگ اس طرف بھی چڑھ دوڑیں گے۔'' اس کی آواز صورتِ حال کی سنگینی کے سبب کانپ رہی تھی۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ چاروں طرف دندناتے پھر رہے ہیں۔ کسی بھی وقت ہلا بول سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی محفوظ ٹھکانا ہے آپ کی نظر میں؟''

''میری نظر میں ہے۔'' ماریہ شستہ انگلش میں بولی۔ ''لیکن اس کے لیے ہمیں ڈی پیلس سے باہر نکلنا پڑے گا۔''

''ابھی ہم شاید نکل سکتے ہیں۔'' میں نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس رہائشی پورشن کے عین سامنے ایک آرمڈ گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے اگنیشن میں لگی ہوئی چابی بھی مجھے صاف نظر آرہی تھی۔ گرے فورس کی اس گاڑی میں ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کرسکتے تھے۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا۔ اس نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ جب وہ تینوں اپنا مختصر سامان سمیٹ رہے تھے، میں نے نگاہ بچا کر اپنا اسپائی کیمرا ڈیکوریشن پیس سے علیحدہ کرلیا۔ میں نے سیف سے کہا۔ ''تم مرنے مارنے کے لیے تڑپ رہے ہونا، یہ شوق یہاں پورا ہوسکتا ہے۔ تیار رہو۔''

وہ بولا۔ ''مارنے کے لیے تڑپ رہا ہوں، مرنے کے لیے نہیں۔ ابھی آپ کے شاگرد نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے جناب۔''

اس نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا تھا لیکن لگتا تھا کہ اندر سے اب وہ بھی کچھ دہل گیا ہے۔

میری ہدایت کے مطابق ''زینب فدا'' اور ماریہ نے خود کو لمبی چادروں میں سرتاپا چھپالیا۔ ابراہیم نے بڑی سرعت سے ایک خادم کا لباس پہن لیا تھا۔ سر پر ایک بوسیدہ ٹوپی کے ساتھ وہ بالکل بدلے حلیے میں نظر آتا تھا۔ میں نے رائفل چیک کی اور انہیں لے کر آگے بڑھا۔ سیف سب سے پیچھے تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو خطرے کے کھلاڑیوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے ڈاکٹر ماریہ سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر آپ کا بچہ؟''

''وہ یہاں نہیں ہے۔ پچھلے ہفتے میں نے اُسے برونائی بھیج دیا تھا۔ اس کی خالہ کے پاس۔''

ہم چند زینے طے کرکے اس رہائش گاہ کے مین دروازے تک پہنچ گئے۔ اب مشکل مرحلہ تھا۔ ہم نے پچیس تیس میٹر کا فاصلہ کھلی جگہ پر بھاگ کر طے کرنا تھا اور رہائش گاہ کے پہلو میں کھڑی آرمڈ گاڑی تک پہنچنا تھا۔ پہلے میں نے گیٹ کھول کر باہر جھانکا۔ مجھے درجنوں بپھرے ہوئے گرے فوجی نظر آئے۔ وہ فوجی گاڑیوں پر سوار اسی جانب آرہے تھے۔ میں نے دیکھا وہ اپنے راستے میں آنے والے ہر سویلین کو بے دریغ شوٹ کررہے تھے۔

میں نے دروازہ کھولا۔ ہم سب مقررہ سمت میں دوڑے۔ ابھی ہم آٹھ دس میٹر آگے ہی گئے تھے کہ ایک گولی آئی اور ڈاکٹر ماریہ کے اس پستہ قد ملازم کو چاٹ گئی جو ہمارے ساتھ ہی جان بچانے کے لیے بھاگا تھا۔ اسے دیکھنے کا موقع کہاں تھا...ہم بھاگتے ہوئے رہائش گاہ کے پہلو میں پہنچے اور میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ دس پندرہ سیکنڈ پہلے جو آرمڈ گاڑی وہاں موجود تھی...... وہ اب موجود نہیں تھی۔ وہ کافی دور جاچکی تھی۔ ہماری حالت اس شخص کی سی تھی جو طوفانی ژالہ باری سے بچنے کے لیے کسی شیڈ کے نیچے پناہ لے اور وہ شیڈ فوراً ہی طوفان کے زور سے ہوا میں اُڑ جائے۔

میں نے دیکھا ڈی پیلس کے پورچ کی طرف سے ایک فوجی جیپ نے یوٹرن لیا اور سیدھی ہماری جانب روانہ ہوئی۔ شاید جیپ پر موجود گرے فوجیوں نے ہمیں بھاگتے اور رکتے دیکھ لیا تھا۔

میں نے ابراہیم سے کہا۔ ''آپ بھاگیں اور مڑ کر نہیں دیکھیں، جلدی کریں۔''

ابراہیم، زینب اور ڈاکٹر ماریہ ڈی پیلس کے طویل برآمدوں کی طرف دوڑے۔ جیپ تیزی سے قریب آرہی تھی۔ اس پر ایک اسٹینڈ تھا اور اسٹینڈ پر M16 مشین گن نصب تھی۔ گولیوں والی سنہری بیلٹ سہ پہر کی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ یہ بیلٹ حرکت میں آجاتی تو یقیناً ہمارے جسموں میں درجنوں سوراخ ہوجاتے۔ صرف ایک برسٹ چلانے کا موقع تھا...... اور اپنے اکلوتے ہاتھ سے یہ برسٹ میں نے جیپ کے ڈرائیور پر چلایا۔ (سیف تب تک نشانہ ہی لے رہا تھا) جیپ تیزی سے گھومی اور کئی قلابازیاں کھا کر آگ کے گہرے زرد گولے میں بدل گئی۔

سیف نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ ہم اپنے ساتھیوں کے عقب میں دوڑے۔ زینب بھاگتے ہوئے گر گئی تھی۔ اس کے اٹھنے اور دوبارہ دوڑنے تک ہم ان سے جاملے۔ زخمیوں اور لاشوں کو پھلانگتے ہوئے ہم برآمدوں تک پہنچے۔

''وہ پیچھے آرہے ہیں۔'' سیف کی ہانپتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں نے دیکھا دو جیپیں بلا کی رفتار سے ہماری طرف آ رہی تھیں۔ بے شک ہم پھنس چکے تھے۔ ابراہیم کا چہرہ بالکل زرد نظر آنے لگا۔ ہم برآمدے میں داخل ہوئے۔ یہ برآمدہ دراصل ایک راستے کی طرح تھا جس پر چھت تھی۔ یہ چھت والا راستہ احاطے کے آر پار بہت دور تک چلا گیا تھا۔ کل رات یہاں جو آرائشی گلدان رکھے گئے تھے، ان میں سے زیادہ تر اب ٹکڑوں کی شکل میں تھے اور حسرت کی تصویر نظر آتے تھے۔ سرخ قالینوں پر گلدستے بکھرے ہوئے تھے۔ شاید یہ وہی گلدستے ہوں جو کل رات یہاں کے بچوں نے بڑی معصومیت سے رائے زل اور اس کی والدہ کو پیش کیے تھے اور شاید وہ بچے بھی یہیں کہیں لاشوں یا زخمیوں میں پڑے ہوں۔ محرابی دروازوں والے اس برآمدے میں کئی دہشت زدہ لوگوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ ہم برآمدے کو پار کر کے دوسری طرف کے احاطے میں اتر گئے۔ یوں لگا کہ اب کسی بھی وقت ہم پر گولیاں برس سکتی ہیں۔ اچانک دائیں طرف سے ایک بڑی بکتر بند گاڑی نمودار ہوئی اور زوردار بریک کے ساتھ عین ہمارے سامنے رکی۔ میں نے انگلی رائفل کے ٹریگر پر رکھ لی۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے، پی کیپ والے شخص نے میری طرف دیکھا...... وہ انیق تھا۔

''آ جاؤ شاہ زیب بھائی۔'' وہ چلایا۔

میں نے پہلے زینب اور ڈاکٹر ماریہ کو گاڑی میں دھکیلا۔ پھر ہم خود گھس گئے۔ انیق نے کلچ چھوڑا اور ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ ہارن پر رکھ دیا تھا۔

''سجاول کہاں ہے؟'' میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

''جہاں اُسے ہونا چاہیے۔''

''بکواس بند کرو۔ کہاں ہے وہ؟''

اس نے سمنے کی ایکٹنگ کی اور بولا۔ ''یہیں پر ہے جی۔ پچھلی سیٹوں کے پیچھے۔''

جب انیق مشکل ترین حالات میں بھی ہلکا پھلکا انداز اختیار کرتا تھا، مجھے اچھا لگتا تھا۔ اس کی جی داری کی گواہی ملتی تھی۔

ایک برسٹ آیا اور گاڑی کے پہلو سے ٹکرایا۔ مجھے لگا کہ جوابی فائرنگ کی ضرورت نہیں۔ ہم ڈی پیلس کے عظیم الشان مین گیٹ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ وہی گیٹ جس کے سامنے کمانڈر افغانی نے اپنی جان دے کر خود کو سرخرو کیا تھا۔

گاڑی کو تیز رفتاری سے آتے دیکھ کر گرے فورس کے دو گارڈز نے رکاوٹی لیور کو نیچے گرانا چاہا مگر میری اور سیف کی چلائی ہوئی گولیوں نے انہیں زخمی کر کے گرا دیا۔ دو مزید گارڈز کو کچلتے ہوئے ہم ڈی پیلس سے باہر نکل آئے۔

شہر کی سڑکوں پر بھی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ کئی جگہ زخمی کراہتے اور مدد کے لیے پکارتے دکھائی دیے لیکن میری اولین ترجیح زینب اور ابراہیم کی حفاظت تھی۔ میں نے اس یتیم، بے آسرا لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور خود سے عہد کیا ہوا تھا کہ اسے اس گرداب سے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا۔ جہاں جہاں سے ہم گزر رہے تھے، وہاں کئی عمارتوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ گرے فورس کے لوگ وحشی ہو رہے تھے۔ ان کی گاڑیاں ہر طرف فراٹے بھر رہی تھیں اور اہل شہر میں موت کی سوغات بانٹ رہی تھیں۔ اپنے بیس تیس سپاہیوں کے قتل کے پاداش میں یہ لوگ شاید پورے جاماجی کو قبرستان بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ان مناظر سے اپنی نگاہ کو محفوظ رکھنے کے لیے زینب نے اپنا سر ابراہیم کے شانے سے لگا کر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ڈاکٹر ماریہ کی ہدایت پر انیق نے گاڑی کا رخ ایک بغلی سڑک کی طرف موڑ دیا۔ انیق گرے فورس کی وردی میں تھا مگر یہ ادھوری وردی تھی۔ اس نے کسی گرے فوجی کی جرسی اور ٹوپی پہن رکھی تھی۔ گاڑی تیزی سے جنوب کی طرف بڑھنے لگی۔

چند منٹ بعد گاڑی ایک ایسی جگہ پر رکی جو گھنے درختوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے اٹی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ماریہ تیزی کے ساتھ نیچے اتری۔ اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ پھر ہم سب اتر آئے۔ کہیں پاس ہی بلندی پر ایک اپاچی ہیلی کاپٹر چکرا رہا تھا۔ کیا پتا ہمیں ہی ڈھونڈ رہا ہو۔ میں نے عقبی نشستوں کے پیچھے جھانکا۔ یہاں سجاول انتا غفیل حالت میں موجود تھا۔ اس کی کنپٹی پر ایک نمایاں گومڑ نظر آ رہا تھا، جس کی سرخی اس کے رخسار تک چلی گئی تھی۔ انیق نے احتیاطاً اس کے ہاتھ نائیلون کی رسی سے پشت پر جکڑ دیے تھے۔ میں نے سجاول کی نبض دیکھ کر تسلی کی۔

ماریہ نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ بیس تیس میٹر آگے ایک دراڑ نظر آئی۔ ہم دراڑ میں داخل ہوئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ دراڑ اسی سرنگ میں داخل ہوئی ہے، جہاں سے گزر کر میں اور قسطینا چند روز پہلے نیوسٹی کے علاقے میں داخل ہوئے تھے۔ سمندر بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

ڈاکٹر ماریہ کی ہدایت پر ہم نے ایک بڑے تکونی پتھر کو دھکیلا۔ یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ بیسیوں ٹن وزنی یہ پتھر صرف میرے اور انیق کے دھکیلنے سے ایک طرف سرک گیا۔ پتھر کے نیچے باقاعدہ ایک مضبوط ریلنگ لگی ہوئی تھی مگر یہ پتھر کے سرکنے کے بعد ہی نظر آتی تھی۔

''یہ تو پکا انتظام لگ رہا ہے۔'' انیق نے سرگوشی کی۔

''ہاں اس ہنگامی پناہ گاہ کا انتظام قسطینا کی ہدایت پر کمانڈر افغانی نے تین چار ماہ پہلے کیا تھا۔'' ماریہ نے آگاہ کیا۔

چند زینے اتر کر ہم ایک تنگ راستے پر مڑے اور آٹھ دس قدم چل کر ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ ماریہ نے ایک بٹن دبا کر روشنی کی۔ ہماری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یوں لگا جیسے ہم ایک سرنگ سے نکل کر فائیو اسٹار ہوٹل کے ''سویٹ'' میں آ گئے ہیں۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ اوپر تلے چار بیڈ فکس کیے گئے تھے۔ دوسری دیوار کے ساتھ بھی اوپر تلے اسی طرح تین بیڈ تھے۔ فریج، ایل سی ڈی اور مائیکرو اوون وغیرہ بھی دکھائی دیتے تھے۔ ساتھ ہی دوسرا کمرا تھا اور اس کمرے میں واش روم کی سہولت موجود تھی۔ اس دوسرے کمرے میں دو الماریوں کے اندر کافی سارا خشک راشن اور پانی کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اسلحہ اور میڈیکل ایڈ کا سامان بھی تھا۔ ابراہیم نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں بکتر بند گاڑی فوراً وہاں سے ہٹا دینی چاہیے۔''

''ہاں یہ ضروری ہے۔'' انیق بولا۔ ''میں اسے کچھ فاصلے پر چھوڑ آتا ہوں۔''

ڈاکٹر ماریہ نے کہا۔ ''لیکن تم اس علاقے سے انجان ہو۔ واپسی میں تمہیں دشواری ہوگی۔ میں ساتھ چلتی ہوں۔''

''اوکے...... لیکن سیف کو بھی لے جاؤ۔'' میں نے مشورہ دیا۔

انیق، ماریہ اور سیف کے ساتھ باہر کی طرف لپکا۔ میں نے کہا۔ ''اوئے باندر! کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ سجاول کو نہیں اتارنا؟''

''آپ کی یادداشت بڑی تیز ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ بھول جائیں گے۔''

''یادداشت تو تمہاری بھی افلاطون سے کم نہیں مگر دماغ میں کیڑا ہے۔'' میں نے کہا۔

ہم سرنگ کی اسی بغلی دراڑ سے باہر نکلے۔ گرانڈیل سجاول کو بمشکل گاڑی کے پچھلے دروازے سے نکالا۔ سیف اور انیق نے اپنے ہاتھوں سے ایک کرسی کی شکل بنائی۔ سجاول کو اس پر نیم دراز کیا گیا۔ میں نے اپنے اکلوتے ہاتھ سے سجاول کے جسم کو سہارا دیا۔ اسی طرح ہم اسے پناہ گاہ میں لے آئے اور ایک بڑے بستر پر لٹا دیا۔

ہیلی کاپٹر کی آواز اب معدوم تھی۔ یہ اچھا موقع تھا۔ میں نے انیق اور ماریہ سے کہا کہ وہ فوراً گاڑی کو محفوظ فاصلے پر چھوڑ آئیں۔ سیف بھی ان کے ساتھ چلا گیا۔

زینب مسلسل صدمے کی کیفیت میں تھی۔ چاند گڑھی میں وہ پُرسکون اور خاموش زندگی گزار رہی تھی۔ اسے صرف اپنی بیماری سے لڑنا پڑتا تھا مگر اب تو وہ ایک طوفان کی زد میں تھی۔ اس بے چاری کی نگاہیں ایسے ایسے خونی مناظر دیکھ رہی تھیں کہ وہ بنیادوں تک ہل گئی تھی اور یہ ایسے مناظر تھے جو مجھ جیسے شخص کو بھی تحیر میں مبتلا کر رہے تھے۔ کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں، تڑپتے پھڑکتے جسم، شکم سے باہر نکل آنے والی انتڑیاں اور خون کی روانی...... میری نظر میں بار بار ڈی پیلس کا ایک منظر گھوم رہا تھا۔ ایک دہشت زدہ لڑکی نے جان بچانے کے لیے اپنا سر گرے سپاہی کے پاؤں پر رکھ دیا تھا اور اس نے اسی حالت میں اسے گولی مار دی تھی۔ ابھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ محل کے اندرونی حصے میں عورتوں، مردوں کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ابراہیم کے ہونٹ بار بار خشک ہو رہے تھے۔ وہ اپنی والدہ، بھائی اور والد کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا سیل فون نکالا۔ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ میں نے فون ابراہیم کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

''نہیں ابراہیم، ہم سیل فون استعمال نہیں کریں گے۔ یہ ہماری نشاندہی کر دیں گے۔''

میں نے اس کا سیل فون آف کر دیا۔ پھر اپنا اور دوسروں کے فون بھی آف کر دیے۔

انجکشنز کا اثر ایک بار پھر ختم ہو رہا تھا۔ ہاتھ میں کندھے سے لے کر بازو تک شدید ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ ہاتھ سوج بھی چکا تھا۔ پٹیوں کے اندر کندھے کی کیا صورتِ حال تھی، اللہ جانتا تھا یا پھر ڈاکٹر ماریہ اندازہ لگا سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ آتی ہے تو اینٹی بائیوٹک اور دردکش کی مزید ڈوز لیتا ہوں لیکن اس سے پہلے ہی ایک اور مصیبت کا سامنا ہو گیا۔ مجھے، کہیں بالکل پاس سے کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں، پھر کوئی بھاری مردانہ آواز میں بولا۔ یہ آواز انیق یا سیف کی ہرگز نہیں تھی۔

ابراہیم کی آنکھوں میں خوف کے سائے کچھ اور

گھیرے ہوگئے۔'' کہیں...... ہمیں ٹریس تو نہیں کرلیا گیا؟'' وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لائٹ آف کی اور اپنی ایم ایم جی سنبھال کر سلائڈ کرنے والے پتھر کی طرف بڑھا۔ اس پتھر کو اندر سے اسٹاپ کرنے کے لیے کوئی کھٹکا وغیرہ نہیں لگایا گیا تھا۔ اسے کسی بھی وقت باہر سے کھولا جاسکتا تھا۔ لیکن کھولتا وہی جس کو پتا ہوتا کہ یہ بے ڈھنگا پتھر سرک سکتا ہے۔ میں بالکل دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ ایم ایم جی کا وزن گیارہ کلوگرام سے کم نہیں تھا۔ یہ قریباً چار فٹ لمبی تھی۔ ایسی گنز سولہ سترہ سو میٹر تک بہ آسانی ٹارگٹ کو نشانہ بنالیتی ہیں۔ اسے ایک ہاتھ سے سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کی کہنی سے گن کو سہارا دے لیا اور انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔

یکا یک بھاری بھرکم پتھر نے ایک طرف سے سلائڈ کیا۔ پہلے ٹارچ کی روشنی نظر آئی پھر ایک وزنی فوجی بوٹ۔ ایک شخص اندر داخل ہوا۔ میں تڑپ کر سامنے آگیا۔ اس سے پہلے کہ میں ہینڈز اپ کی آواز بلند کرتا یا گولی چلاتا...... میری نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور میں جامد کھڑا رہ گیا۔ یہ قسطینا تھی۔ اس کے آگے میجر وارث اور پیچھے کمانڈر فارس جان تھا۔ کمانڈر فارس جان بھی میری طرف رائفل سیدھی کرچکا تھا۔ مجھے پہچانتے ہی اس کی رائفل جیسے خود بخود جھک گئی۔

''او برادر! آپ یہاں؟'' کمانڈر فارس جان نے کہا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

قسطینا کے چہرے پر غم، خوشی اور تحیر کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ بولی۔ ''اس کا مطلب ہے ڈاکٹر ماریہ بھی یہاں ہے۔''

''جی یور ہائی نس۔'' میں نے کہا۔ ''وہی ہمیں یہاں تک لائی ہیں۔ انیق کے ساتھ ذرا باہر گئی ہیں۔ ابھی آجاتی ہیں۔''

''ہم تمہارے لیے بہت پریشان تھے۔'' قسطینا دکھی آواز میں بولی۔ ''وہاں ڈی پیلس میں بہت برا ہو رہا ہے۔ اوپر والا عزت مآب اور پھوپی جان کی فیملی پر رحم کرے......''

اسی دوران میں ابراہیم بھی اندرونی دروازے پر نظر آیا۔ وہ اسی خادم والے لباس میں تھا۔ قسطینا جلدی سے آگے بڑھی اور ''بھائی'' کہہ کر اسے گلے سے لگالیا۔

ابراہیم نے کہا۔ ''سسٹر! والد اور والدہ کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں ابراہیم! بس دعا کرو۔ وہاں سب کچھ کنٹرول سے باہر ہے۔ ایجنسی کی سازش کامیاب رہی ہے۔ انہوں نے بھائیوں کو بھائیوں کے خون کا پیاسا بنایا ہے۔ رائے زل اور ہانا وانی ان کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے گرے فورس میں اتنی نفرت بھری ہے کہ وہ سب کچھ برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو بھی معاف نہیں کررہے۔ میں ہرگز آنا نہیں چاہتی تھی لیکن...... یہ دونوں...... انہوں نے مجھے مجبور کردیا۔'' اس کا اشارہ کمانڈر فارس اور میجر وارث کی طرف تھا۔

''آپ کا زندہ اور محفوظ رہنا ضروری ہے یور ہائی نس، ورنہ جاماجی بالکل بے سہارا ہوجائے گا۔'' میجر وارث نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں قسطینا کی نگاہ دوسرے کمرے میں موجود سجاول پر پڑگئی۔ وہ بستر پر بے ہوش پڑا تھا۔ وہ حیران رہ گئی۔ ''یہ کون ہے؟''

''میرا وہی دوست جو اسپتال پر ہونے والے حملے میں گم ہوا تھا۔''

قسطینا نے اسے سرتا پا دھیان سے دیکھا۔ ''اچھا...... یہ ہے وہ جسے پھوپو نورل بھائی کہتی ہیں...... لیکن یہ یہاں کیسے پہنچا...... اور اس نے گرے فورس کی وردی......''

''یہ ذرا لمبی کہانی ہے۔ آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں......''

اس سے پہلے کہ قسطینا مزید کچھ کہتی ایک بار پھر کمرے سے باہر کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ ڈاکٹر ماریہ کی سُریلی آواز ہم نے پہچان لی۔ میں نے آگے بڑھ کر سلائڈنگ پتھر کو حرکت دی۔ حیرانی ہوتی تھی کہ یہ پتھر اتنی آسانی سے حرکت کرتا تھا۔

انیق، سیف اور ماریہ اندر آگئے۔ ماریہ نے قسطینا کو دیکھا اور دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ دونوں غم واندوہ کی تصویر تھیں۔ شہر کی طرف اب بڑے دھماکے سنائی دے رہے تھے اور ہیلی کاپٹرز کی پروازیں بھی جاری تھیں۔

قسطینا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''عزت مآب نے رات کو ایک اور غلطی کی۔ انہوں نے گرین فورس کے زیادہ تر یونٹوں کو چھاؤنی میں بھیج دیا...... وہ چاہتے تھے کہ خیر سگالی کی فضا خراب نہ ہوجائے۔ اب ان تمام یونٹوں کو چھاؤنی کے اندر ہی بند کردیا گیا ہے۔ ان لوگوں کے پاس ایمونیشن نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو دستے باہر تھے انہیں بھی گھیر کر غیر مسلح کردیا گیا ہے۔ اب ہر طرف گرے فوجی

اور ایجنسی کے سفید سُور ہی دندنا رہے ہیں۔''

میجر وارث نے اپنی چوڑی ٹھوڑی کو کھجا کر انگلش میں کہا۔ ''ان ساری خبروں میں بس ایک چھوٹی سی خبر کو کچھ امید افزا کہا جا سکتا ہے۔ پتا چلا ہے کہ ایجنسی کے امریکن گارڈز نے عزت مآب اور بیگم نورل کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ گرے فوجی ان تک نہیں پہنچ سکیں گے۔''

دفعتاً میرا دھیان ماریہ کے فون پر گیا۔ میں نے کہا۔ ''ہمیں اپنے فون آف کر دینے چاہئیں یہ ہماری لوکیشن بتائیں گے۔''

''ہاں، یہ بالکل ٹھیک بات ہے۔'' قسطینا نے تائید کی اور اپنا فون نکال کر آف کر دیا۔ ڈاکٹر ماریہ نے بھی آف کر دیا۔ مگر آف کرنے سے پہلے اس نے قسطینا کو کچھ دکھایا بھی۔ قسطینا اور ڈاکٹر ماریہ کی طرح دیگر نے بھی فون آف کر دیے۔ یہی وقت تھا جب کمانڈر فارس جان کی نگاہ دوسرے کمرے میں بیٹھی زینب پر پڑ گئی اور وہ بالکل ہلدی نظر آنے لگا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر دوبارہ زینب کو دیکھا۔ زینب نے چہرہ پھیر لیا تھا مگر تب تک فارس جان کو پتا چل چکا تھا کہ یہ ابراہیم کی وہی دلہن ہے جو چند دن پہلے موت سے ''ہمکنار'' ہو چکی ہے۔ مجھے میجر وارث کے چوڑے چکلے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑتی نظر آئیں۔ اس نے بھی زینب کو دیکھا تھا۔ ''یہ ام...... کیا...... دیکھ رہا ہے... برادر؟'' فارس جان نے نہایت تحیّر آمیز سرگوشی کی۔ ''کک...... کہیں امارا آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہا؟''

پھر فارس جان نے میجر وارث کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی کی طرح حیرت کے سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ میں ان دونوں کو بازو سے تھام کر اس چیمبر کے گیلری نما کمرے میں لے گیا۔

''کیا ہماری نگاہیں دھوکا کھا رہی ہیں؟'' میجر وارث نے سنسناتی آواز میں پوچھا۔

''نہیں میجر! آپ ہز ہائی نس کی دلہن کو ہی دیکھ رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ زندہ ہے۔'' دونوں کے منہ شدید تعجب کے سبب کھلے تھے۔

میں نے انہیں مختصر ترین الفاظ میں اصل صورتِ حال کے متعلق اہم باتیں بتائیں اور آگاہ کیا کہ عزت مآب کی ضد کی وجہ سے زینب فدا کسی سازش کا شکار ہوئی تھی۔

اسی دوران میں بڑے کمرے کے اندر اٹھا پٹخ کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ ''شاہ زائب! جلدی آؤ۔'' قسطینا نے پکارتے ہوئے کہا۔

میں کمرے میں پہنچا تو گرانڈیل سجاول بستر سے اٹھنے کے لیے مچل رہا تھا۔ کیڈی شاہ سیفی نے اسے بازوؤں میں کسا ہوا تھا اور انیق نے اس کی ٹانگیں دبوچ رکھی تھیں۔ شکر کا مقام تھا کہ اس کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے تھے ورنہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا جبڑا تو ضرور توڑ دیتا اور غالب امکان یہی تھا کہ انیق کا توڑتا۔ انیق کو دیکھ کر ہمیشہ سے اس کا پارا چڑھ جاتا تھا، اور اب تو ویسے بھی وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔

اس کی شرابی نگاہیں مجھ پر پڑیں تو آنکھوں میں کچھ اور بھی خون اتر آیا۔ عجیب آواز میں دھاڑا۔ ''چھوڑوں گا نہیں تجھے...... مار ڈالوں گا۔ زندہ جلا دوں گا۔ یہ سب تیری وجہ سے ہے۔'' آخر میں اس نے ایک بھاری بھر کم گالی بھی میری طرف اچھالی۔

اس نے اتنا زور لگایا کہ سیفی سمیت فرش پر گر پڑا۔ سیفی نے پھر بھی اسے چھوڑا نہیں۔ ہاں انیق اس کی ٹانگیں کھا کر دور جا گرا...... اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ حکم ہو تو کوئی کاری چوٹ لگاؤں امریش پوری کو؟

اب کی بار کمانڈر فارس جان اور انیق نے مل کر سجاول کی ٹانگیں دبوچیں۔ میں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کیا ہوا ہے سجاول! ہمیں ہمارا قصور تو بتاؤ۔ ہم تو دیوانوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتے پھرے ہیں۔ ہر پل تمہارے لیے پریشان رہے ہیں۔''

''بکواس بند کرو۔ میں تمہیں بڑی چنگی طرح پہچان گیا ہوں...... تم نے میری زندگی تباہ کر دی۔ تم میری ماں کے قاتل ہو۔ وہ تمہاری وجہ سے مری ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا...... میں نے کہا تھا...... تمہاری وجہ سے اسے کچھ ہوا تو میں نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔''

وہ ایک بار پھر میری طرف جھپٹا، مگر سیفی کا جن جپھا بے مثال تھا۔ سجاول مسلسل بول رہا تھا۔ پتا نہیں کیا کیا اول فول بک رہا تھا۔ اس کی نگاہ انیق پر پڑتی تھی تو بھی اس کی آنکھوں میں بجلی سی کوند جاتی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ایک اجنبی کی آنکھیں تھیں۔ وہ کسی اثر میں تھا۔ پتا نہیں کیوں ہانا وانی کا تصور ابھر کر میرے سامنے آ گیا۔ اس کے بارے میں یہی تو کہا جاتا تھا، وہ لوگوں کے ذہن بدل دیتی ہے۔ انہیں اپنا مطیع کر لیتی ہے۔ تو کیا سجاول کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو چکا تھا......؟

وہ جنونی لہجے میں بول رہا تھا۔ ''تو نے میری ماں کو دھوکا دیا۔ میری بھتیجی کو دھوکا دیا۔ اس سے شادی کے جھوٹے وعدے کیے...... وہ کون تھی؟ وہ سجاول سیالکوٹی کی بھتیجی تھی۔ وہ مرگئی...... ماں بھی مرگئی۔ تمہیں بھگتنا پڑے گا، تمہاری نسلوں کو بھگتنا پڑے گا۔''

میں نے ڈاکٹر ماریہ کو اشارہ کیا۔ وہ جیسے پہلے سے ہی منتظر تھی۔ وہ میڈیکل ایڈ والی الماری کی طرف گئی۔ دو منٹ بعد وہ ایک انجکشن لیے نمودار ہوئی اور سجاول کے توانا بازو میں انجیکٹ کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ اس کی مزاحمت کمزور پڑ گئی اور پھر اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔

سب متحیر اور گم صم تھے۔ ان سب نے دیکھا تھا کہ سجاول اپنے حواس میں نہیں۔ اور ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ کسی دوا کے زیرِ اثر ہو یا اس نے کوئی نشہ وغیرہ کر رکھا ہو۔ وہ ایک غیر معمولی مدہوشی میں تھا۔ ڈاکٹر ماریہ نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم اسی گیلری نما چھوٹے کمرے میں آگئے۔ وہ دروازہ بند کر کے میرے سامنے بیٹھ گئی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آپ نے اپنے دوست کو اس حالت میں دیکھا ہے اور حیران ہوئے ہیں۔ ہم اس سے پہلے بھی کئی لوگوں کو اس سے ملتی جلتی کیفیت میں دیکھ چکے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو مادام ہاناوانی سے خاص ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنے اثر میں لے لیتی ہے......''

میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''ماریہ آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ آپ سے تو صرف اسی بات کی توقع کی جاسکتی ہے جو سائنس کے مطابق ہو۔''

''ہپناٹزم بھی تو ایک سائنس ہے، یہ پیرا سائیکالوجی کا وہ شعبہ ہے جس میں دن رات تحقیق ہو رہی ہے اور آئے دن نئے اسرار سامنے آرہے ہیں۔ بڑے بڑے سائیکاٹرسٹ، نیورو فزیشن اور مینٹل ہیلتھ ریسرچ یہ اعتراف کر رہے ہیں کہ انسانی ذہن کی دنیا لامحدود ہے۔ ہم فی الوقت ایک سمندر کے کنارے پر کھڑے ہیں۔''

''آپ کہنا چاہ رہی ہیں کہ میرا دوست کسی ٹرانس میں ہے؟''

''کوئی معمولی ٹرانس نہیں۔ ابھی تفصیل بتانے کا وقت نہیں۔ میں آپ کو پھر بتاؤں گی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ جو باتیں کر رہا تھا وہ تو......''

''وہ باتیں حقیقت میں نہیں ہیں۔'' ڈاکٹر ماریہ نے میری بات کاٹی۔ ''وہ باتیں اس کے ذہن میں بٹھائی گئی ہیں۔ وہ وہی کچھ دیکھ رہا ہے جو اُسے دکھایا جارہا ہے۔'' ماریہ کی آواز میں عجیب سی لرزش تھی۔

''لیکن کسی کو کیا معلوم کہ اس کی ماں اور بھتیجی......''

''کیا پتا کسی ''سیشن'' کے ذریعے یہ سب کچھ تمہارے دوست سے ہی اگلوایا گیا ہو۔'' ماریہ نے پھر میری بات کاٹی اور اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہپناٹزم اور مسمریزم پرانے الفاظ ہیں لیکن اب یہ علوم ایک نئے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ بے حد حیران کن اور ٹھوس صورت میں سامنے آرہے ہیں۔''

اچانک مجھے اور ڈاکٹر ماریہ کو ٹھٹکنا پڑا۔ اس پناہ گاہ کے بڑے کمرے سے قسطینا کی پریشان کن آواز ابھری تھی۔ ''او گاڈ...... او مائی گاڈ۔'' اس نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی کمانڈر فارس جان اور میجر وارث بھی ایک ساتھ کچھ بولے تھے۔ میں اور ڈاکٹر ماریہ بڑے کمرے میں پہنچے۔ یہاں ایل سی ڈی پر مقامی چینل آن تھا۔ جو خبر اسکرین پر چل رہی تھی، وہ بڑی دلدوز تھی۔ بریکنگ نیوز کے ساتھ نیوز کاسٹر چلا رہی تھی۔ ''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا...... لیکن اطلاعات یہی آرہی ہیں کہ عزت مآب پر حملہ ہوا ہے۔ ان کے شدید زخمی ہونے کی اطلاعات ہیں۔ بیگم نورل کے زخمی ہونے کی اطلاعات بھی ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے گرے فورس کے کچھ سپاہی، ایجنسی والوں کا حفاظتی گھیرا توڑ کر عزت مآب تک پہنچے ہیں۔''

دوسری نیوز کاسٹر مزید سنسنی خیز لہجے میں چلائی۔ ''ہم آپ کو تازہ ترین اطلاع دے رہے ہیں...... ہم بڑے افسوس کے ساتھ اعلان کر رہے ہیں۔ ہمارے باوثوق ذرائع بتا رہے ہیں کہ عزت مآب ریان فردوس اپنے محل کے اندر شدید زخمی ہو چکے ہیں۔ گرے فورس کے مشتعل سپاہی ان کے بیڈروم کا دروازہ توڑ کر اندر گھسے ہیں۔ وہاں کئی فائر بھی سنائی دیے ہیں...... صورتِ حال نازک ہے۔''

یکایک اسکرین پر بڑے بڑے سرخ حروف میں یہ دردناک الفاظ ابھرے...... ''ہم بڑے دکھ کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ عزت مآب اب ہم میں نہیں رہے۔'' نیوز کاسٹر چلانے والے انداز میں بولی۔ ''جی ہاں، ہم اپنے ناظرین تک بڑے دکھ سے یہ افسوس ناک خبر پہنچا رہے ہیں۔ عزت مآب اب ہم میں نہیں رہے۔ ذرائع کے مطابق ان کے سینے اور سر میں کم از کم دس گولیاں لگی ہیں۔

پہلے خبر آئی تھی کہ وہ شدید زخمی ہیں مگر اب بتایا جارہا ہے کہ وہ دم توڑ گئے ہیں۔ بیگم نورل اور ان کے دونوں بچوں کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ تاہم کچھ ذرائع کا کہنا ہے کہ انہوں نے بیگم نورل کو زخمی حالت میں دیکھا ہے۔''

اسکرین پر EXCLUSIVE نیوز چل رہی تھی اور کمرے میں قسطینا سمیت جتنے بھی افراد تھے، سب سکتے میں تھے۔

دس بیس سیکنڈ بعد ایک نیوز کاسٹر بے حد جذباتی لہجے میں بولا۔ ''اور ناظرین! یہ تازہ ترین وڈیو ہے جو ہم نے حاصل کی ہے...... آپ دیکھ سکتے ہیں...... اس میں گرے فوجیوں کو اندر گھستے اور عزت مآب پر حملہ آور ہوتے دکھایا گیا ہے۔ یہ دیکھیے...... یہ کچھ دیر پہلے کے مناظر ہیں۔ گرے سپاہی تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ وہ ایجنسی اہلکاروں کو دھکیلتے ہوئے عزت مآب اور بیگم نورل کی طرف بڑھ رہے ہیں......''

وڈیو کلپ واقعی دہلا دینے والا تھا۔ کیمرے کی آنکھ نے سنسنی خیز مناظر محفوظ کیے تھے۔ فی الحال یہ مناظر بغیر کسی ایڈیٹنگ کے آن ایئر کیے جارہے تھے۔ گرے فوجی چنگھاڑتے ہوئے ڈی پیلس کے خاص الخاص حصے میں گھسے۔ ریان فردوس اور بیگم نورل آپس میں بات کررہے تھے۔ گرے فوجی سیدھے ان کی طرف لپکے۔ ایجنسی کے امریکن اہلکاروں نے شاہی جوڑے کو اپنے گھیرے میں لینا چاہا مگر گرے فوجیوں نے اس حفاظتی حصار کو توڑ دیا۔ تب بیگم نورل اپنے خاوند کے سامنے ڈھال بنیں۔ ان کے سر پر بے دردی سے رائفل کے بٹ مارے گئے۔ وہ گر پڑیں، صورتِ حال مخدوش دیکھ کر ریان فردوس اپنے بیڈروم کی طرف بھاگا۔ اس نے بیڈروم میں گھس کر دروازے کو اندر سے بولٹ کرنا چاہا، لیکن اس سے پہلے کہ دروازہ مکمل طور پر بولٹ ہوتا، گرے فوجی اسے دھکیلتے ہوئے بیڈروم میں گھس گئے۔ ریان فردوس کے چہرے پر رائفل کے دستے سے جو تباہ کن ضرب لگائی گئی وہ ٹی وی اسکرین پر صاف نظر آئی۔ ریان فردوس کی مخملی ٹوپی اچھل کر دور جاگری تھی۔ اس کے بعد اوپر تلے پانچ چھ فائر سنائی دیے اور بیگم نورل کے دردناک انداز میں چلّانے کی آوازیں آئیں۔''

اس فوٹیج کو بڑی تیزی سے اسکرین پر بار بار دکھایا جانے لگا۔ ساتھ ساتھ نیوز کاسٹرز کا واویلا جاری تھا۔ وہ اب پورے یقین کے ساتھ ریان فردوس کی موت کی تہلکہ خیز اطلاع دے رہے تھے۔

میں نے دیکھا ابراہیم ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ زینب اس کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ قسطینا بھی دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گررہے تھے۔ یہ ایک برا دن تھا۔ بہت برا دن تھا۔ جارحیت کے سامنے کمزوری اور امن پسندی کا دوسرا نام موت ہے۔ یہ بات آج ثابت ہورہی تھی۔

ایل سی ڈی کی جہازی سائز اسکرین پر مختلف مناظر دکھائے جارہے تھے۔ چینل کا نمائندہ مائیک اور کیمرا مین کے ساتھ تہلکہ خیز مناظر کو آن ایئر کررہا تھا۔ ایک جگہ گرے فوجی، زخمیوں کو فائرنگ کے ذریعے اذیت سے نجات دلا رہے تھے۔ ایک جگہ دو دو، تین تین سالہ بچوں کی حسرت ناک لاشوں پر کچھ عورتیں نوحہ کناں تھیں۔ پس منظر میں تابڑ توڑ فائرنگ کی آوازیں تھیں۔ ایک لرزہ خیز منظر میں دکھایا گیا کہ ٹریفک جام میں درجنوں کاریں پھنسی ہوئی تھیں۔ چند گرے فوجیوں نے ایک پرائیویٹ گاڑی میں سے ایک نوجوان لڑکی کو گھسیٹ کر باہر نکالا اور اس کے وارثوں کے سامنے اسے اپنی گاڑی میں ڈال لیا۔ لڑکی کے ایک عمر رسیدہ وارث نے مزاحمت کی تو اس کی دونوں ٹانگوں میں گولیاں مار کر اسے سڑک پر لمبا لٹا دیا گیا۔

''بند کردو...... اسے بند کردو۔'' قسطینا دہاڑی۔

فارس جان نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ایل سی ڈی آف کردی۔

قسطینا کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ وہ بولی۔ ''یہ سب ڈراما ہے۔ کسی نے عزت مآب کو بچانے کی کوشش نہیں کی۔ ان حرامی ایجنسی والوں نے صرف لوگوں کو مطمئن کرنا چاہا ہے۔''

''آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں۔'' میجر وارث نے تائید کی۔ ''وڈیو میں بھی صاف نظر آرہا ہے، انہوں نے بس دکھاوے کے طور پر گرے سپاہیوں کو روکا ہے، کسی نے ایک گولی بھی نہیں چلائی، یہ سب ناٹک ہے۔''

قسطینا آنسو پونچھتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ابراہیم، زینب، ڈاکٹر ماریہ، فارس جان سب ماتمی کیفیت میں تھے۔ ہمارا حالات سے باخبر رہنا ضروری تھا۔ شہر پر گن شپ ہیلی کاپٹرز پرواز کررہے تھے اور گاہے بگاہے فائرنگ کی آوازیں بھی آتی تھیں۔ میں نے ایل سی ڈی دوبارہ آن کردی۔ تاہم اس کی آواز مدھم رکھی۔ نیوز میں کرفیو کی بات کی جارہی تھی اور لوگوں سے کہا جارہا تھا کہ

وہ اپنے گھروں میں رہیں۔
پھر اچانک اسکرین پر آقا جان کی صورت نظر آئی۔ وہ زاروقطار رو رہا تھا۔ سفید رومال سے بار بار اپنی ناک اور اپنا گنجا سر پونچھ رہا تھا۔
اینکر نے پوچھا۔ ”جناب! آپ کا کیا خیال ہے، ایجنسی کے درجنوں مسلح گارڈز عزت مآب کی جان کیوں نہ بچا سکے، لوگ کہتے ہیں کہ گارڈز کی طرف سے قرار واقعی مزاحمت دیکھنے میں نہیں آئی؟“
”یہ بالکل غلط ہے۔“ آقا جان گلوگیر آواز میں بولا۔ ”ایجنسی پوری ذمے داری سے عزت مآب کی حفاظت کر رہی تھی اور انہیں اس ڈیوٹی کے لیے کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ یہ ذمے داری ایجنسی نے خود اٹھائی تھی۔“
”تو پھر یہ سب کیسے ہوا؟ کہاں کوتاہی ہوئی؟“
”یہ بات تو طے ہے کہ عزت مآب پر حملہ کرنے والے فسادی فوجی باہر سے ڈی پیلس میں نہیں گھسے۔ یہ پہلے سے محل میں موجود تھے اور کسی قریبی جگہ چھپے ہوئے تھے۔ ان کا چارج اتنا شدید اور اچانک تھا کہ ایجنسی کے گارڈز فوری ری ایکشن نہ دے سکے۔“
”الو کا پٹھا...... حرام زادہ۔“ کمانڈر فارس جان دانت پیس کر بولا۔ ”یہ غدار ابنِ غدار ہے۔ کمینہ مگرمچھ کے آنسو بہا رہا ہے۔ ام کو یقین ہے کہ اس نے کتے کا موت مرنا ہے...... ایک دن پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں ہوگا اور لوگ اس کے جسم پر جوتیاں برسائے گا۔“ اس کا یہ تبصرہ آقا جان کے لیے تھا۔
اسکرین پر آقا جان اب مقامی لوگوں سے اپیل کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”یہاں جو کچھ بھی ہوا چند شرپسندوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ ان لوگوں کی حماقت نے بھائی چارے کی اس بے مثال فضا کو تباہ و برباد کر دیا جو کل رات تک یہاں موجود تھی۔ بہت سے بے گناہ لوگوں کی جانیں گئی ہیں اور مزید نقصانات کا اندیشہ ہے۔ میری اپنے لوگوں سے درخواست ہے کہ وہ عزت مآب کی موت کے صدمے کو صبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کریں اور شرپسندوں کی چالوں سے بچیں۔“
اینکر نے کہا۔ ”جناب! ابھی تک عزت مآب کی فیملی کے بارے میں واضح اطلاعات نہیں ہیں۔ بیگم نورل، ہز ہائی نس ابراہیم اور کمال احمد وغیرہ کہاں اور کس حال میں ہیں؟“
”اللہ کا شکر ہے کہ بیگم نورل محفوظ ہیں۔ انہیں کچھ زخم آئے ہیں اور وہ اسپتال میں ہیں۔ ابراہیم اور کمال احمد کے بارے میں صورتِ حال ابھی غیر یقینی ہے مگر بہت جلد ان کی خیریت کی تصدیق بھی ہو جائے گی۔“
”جناب! کہا جا رہا ہے کہ کمال احمد گریے فورس کی حراست میں ہیں اور وہ بھی شدید زخمی ہیں؟“
”یہ سب افواہیں ہیں۔“ آقا جان نے اپنی ناک پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں یہی تو گزارش کر رہا ہوں کہ شرپسندوں کی باتوں میں نہ آئیں۔“
”یہ بھی کہا جا رہا ہے جی کہ ایکسی لینسی رائے زل نے ان تمام افراد کو فوری گرفتار کرنے کا حکم دے دیا ہے جن پر کسی بھی طرح کے جنگی جرائم کا شبہ ہے۔ ان کو سرسری سماعت کے بعد پھانسیاں لگائے جانے کا پروگرام ہے۔“
”یہ سب افواہیں ہیں، نو کمنٹس۔“
”بتایا جا رہا ہے کہ عبدالکریم اور بیس دیگر شہریوں کو اہم جنگی مجرم قرار دے دیا گیا ہے اور ان کے سر کی قیمت مقرر کی جا رہی ہے؟“
”ابھی اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا۔ جیسے ہی کوئی فیصلہ ہوا آپ کو آگاہ کیا جائے گا...... تھینکس۔“ آقا جان نے کہا اور جان چھڑا کر ایک طرف نکل گیا۔ اس کے قریبی ساتھی عقب میں تھے اور ان میں تھری پیس سوٹ والا طلحی بھی تھا۔ بظاہر مغموم لیکن اندر سے یقیناً مسرور۔ ایک جگہ مظاہرین کی ایک چھوٹی سی ٹولی کو دکھایا گیا جو ریان فردوس کے قتل پر ڈرا ڈرا احتجاج کر رہی تھی۔
وہ رات بڑی سنسنی خیز اور تشویش ناک تھی۔ ہم اس محفوظ پناہ گاہ میں تھے لیکن شہر جنگ کے قاتل بادلوں میں چھپا تھا۔ میرے ذہن میں کئی سوال بری طرح چبھ رہے تھے۔ ہم یہاں کب تک محفوظ رہیں گے؟ سجاول کا کیا بنے گا؟ کیا وہ جلدی اپنے حواس میں واپس آجائے گا؟ ڈاکٹر ماریہ نے اس کے بارے میں جو تبصرہ کیا، وہ کس حد تک درست ہے۔ قسطینا اب کیا سوچ رہی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔
رات کا دوسرا پہر تھا۔ میں نے دیکھا قسطینا اور ماریہ ایک طرف صوفے پر بیٹھی سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر ماریہ بار بار اپنے آنسو پونچھنے لگتی تھی۔ میرے کندھے کا درد پھر پریشان کر رہا تھا لیکن نجانے کیا بات تھی اب درد میں شدت کم تھی۔ خدا خدا کر کے قسطینا اور ماریہ کی باتیں ختم ہوئیں اور میں نے ماریہ کو اپنی طرف بلایا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میری ”بینڈیج“ چیک کرے۔ یہاں میڈیکل بلکہ سرجری کا سامان بھی موجود تھا لیکن سرجری یہاں کیسے ہو سکتی

تھی۔ ڈاکٹر ماریہ نے میرے بازو کے زخموں کو صاف کرنے اور نئی پٹیاں باندھنے میں تقریباً آدھ گھنٹا لگایا۔

میں نے کہا۔ ''ویسے میرا درد اب کم ہے۔''

''اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ٹھیک ہو رہے ہیں۔''

''تو کیا مطلب ہے ڈاکٹر؟''

''انفیکشن کنٹرول ہو گیا ہے اور پین کلر کام کر رہی ہیں۔''

''مطلب یہ کہ ابھی ایسا چل سکتا ہے؟''

''ممکن ہے کہ آپ کی ہڈی غلط جڑنا شروع ہو گئی ہو۔ ایسی صورت میں بھی علاج تو کرانا پڑتا ہے۔ ورنہ زندگی بھر کی معذوری حصے میں آجاتی ہے۔''

''آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔'' میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''کیا یہاں کوئی ایسا بھی ہے جو پریشان نہیں ہے؟''

''لیکن آپ کچھ زیادہ ہیں۔ کہیں بچے کی فکرمندی تو نہیں؟''

''بچے کی فکرمندی کس ماں کو نہیں ہوتی۔'' اس نے اپنے بالوں کی براؤنش لٹوں کو کانوں کے پیچھے اُڑستے ہوئے کہا۔ ''پھر یہاں جو حالات ہیں وہ بھی تو سب کے سامنے ہیں مسٹر شاہ زیب۔''

مگر...... میں نے کچھ نوٹ کیا تھا اور جو میں نے نوٹ کیا تھا وہ مسلسل ذہن میں کچوکے لگا رہا تھا۔ جب میں نے سب کو فون بند کرنے کے لیے کہا تھا، اس وقت ڈاکٹر ماریہ اپنے فون کی اسکرین کو بڑے ٹھٹکے ہوئے انداز میں دیکھ رہی تھی اور اس نے یہ اسکرین قسطینا کو بھی دکھائی تھی۔

میری مرہم پٹی کے کچھ ہی دیر بعد ماریہ سکون بخش گولیاں کھا کر سو گئی۔ ابراہیم مسلسل نوافل پڑھ رہا تھا۔ زینب گٹھڑی سی بنی ایک کونے میں پڑی تھی۔ شہر کے طول و عرض سے اس پہر بھی فائرنگ کی صدائیں آرہی تھیں۔ کسی وقت کوئی بڑا دھماکا بھی سنائی دے جاتا تھا۔ اسی دوران میں مجھے قسطینا سے بات کرنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا۔ ''ایک سوال پوچھوں ناراض تو نہیں ہوں گی؟''

وہ سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''پوچھو۔''

''ڈاکٹر ماریہ بہت گم صم ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی خاص مسئلہ ہے؟''

''اس نے کوئی بات کی ہے تم سے؟''

''اس نے تو نہیں کی۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ کوئی بات ہے۔ آپ نے کل رات استقبالیہ جشن کے وقت بتایا تھا کہ بیگم نورل نے آپ اور ماریہ کو کھانے پر طعام گاہ میں بلایا ہے اور مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ آپ ماریہ کو وہاں رائے زل کے سامنے لے جانا نہیں چاہتیں۔ مجھے اس حوالے سے ماضی کی کچھ سن گن بھی ملی ہے......''

''مجھے لگتا ہے کہ تمہارے سونگھنے کی حس ضرورت سے زیادہ تیز ہے۔''

''اگر آپ دیکھنے کی حس کی بات کرتیں تو شاید زیادہ بہتر ہوتا۔''

''کیا مطلب؟''

''جب چند گھنٹے پہلے آپ یہاں پناہ گاہ میں آئیں تو میں نے ڈاکٹر ماریہ کو اپنے سیل فون کی اسکرین دیکھ کر چونکتے دیکھا تھا اور ڈاکٹر ماریہ کے ساتھ آپ بھی بری طرح چونکی تھیں...... کیا کوئی بڑا ''میسج'' تھا؟''

قسطینا کی آنکھوں میں پہلے جلالی کیفیت نظر آئی۔ پھر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔ ''اگر آپ مجھے کچھ بتائیں گی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ مجھ تک محدود رہے گا۔''

وہ یک ٹک مجھے دیکھتی چلی گئی۔ بول کچھ نہیں رہی تھی۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں ایک خوبرو لڑکا نظر آرہی تھی مگر اس خوبرو لڑکے کے اندر جو ذہین اور جنگجو عورت چھپی تھی، اس سے میں بخوبی آگاہ ہو چکا تھا...... ہماری خاموشی طویل اور بوجھل ہوتی چلی گئی۔ اس سے پہلے کہ میں کسی بہانے اس خاموشی کو توڑتا، وہ بول اٹھی۔ ''یہ رائے زل پرلے درجے کا مطلب پرست اور شیطان صفت آدمی ہے۔ اپنی ضد پوری کرنے کے لیے ہر حد تک جاتا ہے۔''

''کیا...... اُس نے...... ڈاکٹر ماریہ کے حوالے سے کوئی پیغام بھیجا ہے؟'' میں نے بھی قسطینا کی طرح مدھم آواز میں پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ ''وہ اسے بلا رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ اگر ماریہ نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ اپنے غم و غصے کو سنبھال نہیں سکے گا۔ اس کا خمیازہ ڈاکٹر ماریہ کے قریبی عزیزوں بلکہ پورے شہر کو بھگتنا پڑے گا...... اگر وہ آجاتی ہے تو وہ پچھلی ہر بات کو بھول جائے گا اور اس کے ساتھ کسی طرح کی کوئی زبردستی نہیں ہوگی۔''

قسطینا نے نفرت سے ڈسٹ بن کی طرف تھوک دیا۔ بولی۔ ''اس سے بڑی زبردستی کیا ہوگی کہ وہ جس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی، اس کے پاس چلی جائے گی۔ وہ ایک تین

سالہ بچے کی ماں بن چکی ہے۔ چار پانچ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں ان باتوں کو، لیکن وہ اب بھی اپنی سوئی کو وہیں پر اٹکا رہا ہے۔''

میں نے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر سوئی ہوئی ڈاکٹر ماریہ کو دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت نہیں تھی۔ عمر بھی اب تیس کے نزدیک تھی۔ تاہم اس کے چہرے پر ایک ذہانت آمیز دلکشی موجود تھی۔ جسم بھرا ہوا اور چہرے کی جلد میں گندمی اور گورے پن کا شفاف امتزاج تھا۔ وہ جیسے نیند کی حالت میں بھی کسی شدید بے چینی میں تھی۔

''آپ نے کیا سوچا ہے اس سلسلے میں؟''

قسطینا کے حساس نتھنے بے ساختہ پھول گئے وہ بولی۔ ''میں...... اس کو...... بھیجنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر ڈاکٹر ماریہ کہیں نہیں جائے گی۔'' میں نے کہا۔ میرے اندر کے انگارے دہک اٹھے۔ غصیلے مرد کی جانب سے عورت کی تذلیل اور بے حرمتی کا خیال مجھے ہمیشہ اندر سے دہکا دیتا تھا۔ برسوں پہلے گاڑی کے اندر میری دوست ڈیزی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ بھی میرے ذہن سے نکل نہیں سکا تھا۔

''تو کیا کرو گے تم؟'' قسطینا نے مجھ سے پوچھا۔

''کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ رائے زل کی شہ رگ بھی ناپی جا سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نہیں سمجھتی کہ کوئی ہمیں رائے زل کے نزدیک پر بھی مارنے دے گا۔ یہ تو دیوانے کا سپنا ہے۔''

''بڑے بڑے مشکل سپنے اپنی تعبیر پا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں نا کہ جہاں الجھن ہوتی ہے وہاں کوئی راستہ بھی ہوتا ہے۔''

''لیکن...... میں نہیں سمجھتی شاہ زائب کہ تم...... اپنے اس ایک بازو کے ساتھ کچھ کرنے کے قابل ہو، تم بہت ڈھیٹ واقع ہوئے ہو، میں نے تم سے کتنی بار کہا کہ سرجری کرا لو۔''

''اگر میں اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا تو اس وقت جاماجی کی سپریم کمانڈر کو تسلی کون دے رہا ہوتا؟ ویسے بھی ون آرمڈ باکسر نام کی فلم تو آپ نے دیکھی ہوگی۔''

''ہاں، میں نے بھی دیکھی ہے۔'' انیق اپنی زبان کی کھجلی روک نہیں سکا اور غنودگی کے عالم میں بول اٹھا۔ ''بہت مار پڑتی ہے اس میں وانگ یو کو۔ اور مجھے آپ کا مستقبل بھی زیادہ روشن نہیں لگتا۔''

انیق نے چونکہ یہ فقرہ اردو میں کہا تھا لہٰذا قسطینا کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''یہ کہہ رہا ہے کہ میں آپ کا دوسرا ہاتھ بن جاؤں گا، آپ کیوں فکر کر رہے ہیں۔''

''بہت برا وقت ہے اللہ سے توبہ کریں، سچ بولیں۔'' انیق درویشانہ انداز میں بولا۔

''تم اپنی بکواس بند کرو اور سو جاؤ۔'' میں پھنکارا۔

اس نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی اور کروٹ بدل لی۔ کروٹ بدلی تو سامنے بے ہوش سجاول کی شکل نظر آئی۔ اس نے ایک دم پھدک کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

قسطینا مزید دھیمی آواز میں بولی۔ ''جو کچھ بھی ہے ہانا وانی ایک عورت ہے۔ اس کو سوچنا چاہیے کہ اس کا بیٹا بے لگام ہو کر کیا ارادے کر رہا ہے۔ کاش میں اس سے فون پر ہی بات کر سکتی، مگر فون آن نہیں کیے جا سکتے۔''

اچانک قسطینا کو چپ ہونا پڑا۔ ماریہ کسمسائی تھی، پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''نہیں، نہیں...... یہ ٹھیک نہیں۔ ان لوگوں کا کوئی گناہ نہیں...... کوئی نہیں۔'' وہ بدحواسی میں دائیں بائیں ہاتھ چلانے لگی، پھر ایک دم سنبھل گئی۔ قسطینا نے اسے پانی پلایا اور دلاسا دیا وہ پھر سو گئی یا شاید اونگھنے لگی۔

صبح میں اور ابراہیم جاگے تو گھڑیاں صبح سات بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ ڈاکٹر ماریہ ہم سے پہلے ہی جاگ چکی تھی۔ وہ ایل سی ڈی کے سامنے سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ اسکرین پر جو مناظر نظر آ رہے تھے وہ واقعی ساکت کر دینے والے تھے۔ ہم نے ڈی پیلس کے پائیں باغ کو دیکھا۔ گلاب کے تختوں، ڈینی کی کیاریوں اور رنگ برنگے پانی کے درجنوں فواروں اور آبشاروں کے درمیان ایک جدا منظر تھا۔ درختوں پر جھولے نظر آ رہے تھے لیکن یہ ''وہ جھولے'' تھے جو ایک رسی کے ساتھ گردن کے بل جھولے جاتے ہیں۔ کم و بیش پندرہ افراد کی لاشیں درختوں سے جھول رہی تھیں۔

مقامی ٹی وی چینل کی زبان بھی بالکل بدل چکی تھی۔ نیوز کاسٹر دو دن پہلے تک جن لوگوں کو گرین فورس کے شیر اور حریت کے جانباز قرار دے رہے تھے، اب دہشت گرد اور جنگی مجرم گردان رہے تھے۔ پھانسی پانے والوں میں قسطینا کے کچھ قریبی ساتھی اور پاسبان بریگیڈ کے جوان تھے۔ پھانسی دینے کے بعد ان پر گولیاں بھی برسائی گئی تھیں۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ عورت کی آہستہ آہستہ گھومتی لاش کا چہرہ سامنے آیا تو میں تھرا گیا۔ وہ ریان فردوس کی ایک خوب صورت خواص تھی۔ عورت کو اس طرح پھانسی پر لٹکا کر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

رائے زل اور ہاناوانی نے اشارہ دے دیا تھا کہ وہ کس حد تک جاسکتے ہیں۔ کمال احمد کے بارے میں پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ یہ بھی کہا جارہا تھا کہ ریان فردوس کی تین چار پرانی خواصوں نے گرفتاری اور ذلت کے خوف سے خودکشی کرلی ہے۔

نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ''کل ساری رات چھاپوں کا سلسلہ جاری رہا۔ مختلف علاقوں سے کم و بیش دو سو ایسے افراد کو پکڑا گیا ہے جن پر جنگی جرائم میں شریک ہونے کے قوی امکان ہیں۔ ان میں دس افراد ایسے ہیں جنہوں نے ہوٹل واشنگٹن میں گھس کر امریکی خواتین سے ناروا سلوک کیا۔ ان میں سے کئی ایک کی فوٹیج بھی حاصل کرلی گئی ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ ڈاکٹر ماریہ اور بیگم نورل کے دو دو قریبی عزیز بھی ان میں شامل ہیں۔ جب ماریہ کے دو قریبی عزیزوں کی تصویریں دکھائی گئیں تو وہ چلا اٹھی۔ ''حرام زادے، جھوٹے، کمینے...... یہ کیسے ہوسکتا ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔''

ڈاکٹر ماریہ کی پکار پر سب جاگ گئے۔ وہ رو رہی تھی۔ مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''دیکھیں ذرا...... دیکھیں ان کی صورتیں، ان کی عمریں، کیا آپ سوچ بھی سکتے ہیں کہ یہ کسی ایسے جرم میں شریک ہوسکتے ہیں؟''

وہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ان دونوں کی عمریں پینتالیس پچاس کے قریب تھیں اور وہ صورتوں سے ہی نفیس اور شریف النفس قسم کے لوگ لگتے تھے۔

اس نے انتہائی جذباتی عالم میں گولیوں کی ایک وزنی بیلٹ ایل سی ڈی پر پھینکنے کی کوشش کی، قسطینا نے اسے روک لیا۔ اسے گلے سے لگایا اور اس کے براؤن بالوں کو سنوارنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ کہہ رہی تھی۔ ''حوصلہ رکھو ماریہ...... ہم یہ نہیں ہونے دیں گے۔ ہم کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے۔ ابھی وہ کسی کو سزائے موت دینے میں اتنی جلدی نہیں کریں گے۔''

کہنے کو تو قسطینا کہہ رہی تھی مگر آواز کا کھوکھلا پن شاید اسے بھی محسوس ہورہا تھا۔ انہوں نے کل سرسری سماعت کی بات کی تھی اور رات کو پندرہ لوگ لٹکا بھی دیے تھے...... وہ کچھ بھی کرسکتے تھے۔

وہ سارا دن بھی تشویش ناک خبروں کے نرغے میں گزر گیا۔ سجاول تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آیا تھا۔ اس نے پھر بدحواسی کی باتیں شروع کردیں۔ جونہی مجھ پر یا انیق پر اس کی نظر پڑتی تھی، وہ بالکل آگ بگولا ہوجاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات ہپناٹزم کا ماہر اپنے معمول کو کچھ لوگوں یا جگہوں وغیرہ کی تصویریں دکھاتا ہے...... اور اس حوالے سے معمول کے ذہن میں نفرت اور خوفناک عداوت بھر دیتا ہے، کیا سجاول کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا؟ میں اس بارے میں ڈاکٹر ماریہ سے سوالات کرنا چاہتا تھا لیکن وہ توصبح سے بالکل گم صم بیٹھی تھی۔ کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ رنگ زرد ہورہا تھا۔ ٹی وی پر اتنی منفی خبریں آرہی تھیں کہ ہم اسے بار بار بند کردیتے تھے۔ ابراہیم کے کندھے سے لگ کر بیٹھی ہوئی زینب بار بار امید بھری نظروں سے میری جانب دیکھتی تھی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو...... میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ابراہیم کو بھی بہت ڈر لگتا ہے۔ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی مصیبت بن گئی تو ہم آپ کی طرف ہی دیکھیں گے۔ ہمیں بہت بھروسا ہے آپ پر...... اور یہ بھروسا صرف زینب میں ہی نہیں تھا...... اور بہت سے لوگوں میں بھی تھا۔ پتا نہیں کہ یہ بھروسا کیسے پروان چڑھ گیا تھا؟ دو دن پہلے ڈی پیلس میں اور شہر میں گھومتے پھرتے ہوئے، یہ بھروسا میں نے کئی لوگوں کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ قسطینا کی طرح شاید وہ مجھے بھی کوئی نجات دہندہ قسم کی چیز سمجھنے لگے تھے۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی ذمے داری اٹھانے کا اہل تھا۔ غالباً ایک دو اتفاقیہ واقعات کی وجہ سے یہ سوچ پروان چڑھ رہی تھی۔ کسی وقت مجھے جھنجلاہٹ بھی ہونے لگتی تھی۔

رات کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ حالات کے بارے میں سوچتے سوچتے میں کچھ دیر کے لیے سوگیا تھا۔ ابراہیم نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ اس نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! ڈاکٹر ماریہ یہاں نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے اس کے خالی بستر کی طرف دیکھا۔

''وہ شاید باہر نکل گئی ہے۔ سسٹر قسطینا اُسے دیکھنے نکلی ہے۔''

میں اور انیق فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنی رائفلیں تھام کر اور ٹارچیں لے کر ہم داخلی راستے کی طرف بڑھے۔ دزنی پتھر اپنی جگہ سے ہٹا ہوا تھا۔ ہم سرنگ میں آگئے۔ یہ رات کے قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ گہری تاریکی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر قسطینا اور کمانڈر فارس جان کے ہیولے دکھائی دیے۔ ہم دوڑتے ہوئے ان کے پاس پہنچے۔ قسطینا مایوس لہجے میں بولی۔ ''وہ کہیں نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ شہر کی طرف نکل گئی ہے۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے پوچھا۔
''اس کا جواب تو وہی دے سکتی ہے۔'' قسطینا شدید غم و غصے میں تھی۔
قسطینا کی ہدایت پر دیگر لوگ اُسے سرنگ کے اندر اور آس پاس تلاش کرنے لگے لیکن وہ ٹارچیں روشن نہیں کر سکتے تھے اور نہ زیادہ آگے جا سکتے تھے۔ سیل فون بھی آن نہیں کیے جا سکتے تھے۔ قسطینا نے سب کو واپس بلا لیا۔
''قسطینا! آپ کو اندازہ ہے کہ وہ کتنی دیر سے غائب ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''شاید وہ ہمارے سونے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔'' قسطینا نے مدھم، دل گرفتہ آواز میں کہا۔
''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟''
قسطینا نے کاغذ کی ایک چھوٹی سی پرچی میری طرف بڑھائی۔ اس پر انگلش میں بس دو فقرے گھسیٹے گئے تھے۔ ''ڈیئر قسطینا! مجھے معاف کر دینا۔ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔''
میں نے قسطینا کی طرف دیکھا۔ ''کہاں گئی ہوگی وہ؟''
''جہاں اُس کو بلایا جا رہا تھا۔'' قسطینا نے غم و غصے میں ڈوب کر کہا۔ ''اس نے...... اپنے طور پر قربانی دی ہے...... اپنے عزیزوں کے لیے...... جاماجی کے شہریوں کے لیے...... پتا نہیں کہ وہ کہاں تک صحیح ہے۔''
میرے سینے کے انگارے ایک دم سے پھر دہک اٹھے۔ رائے زل کی نفرت انگیز صورت نگاہوں میں ابھری۔ کسی جنگلی ریچھ جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پھولا ہوا چہرہ اور تھل تھل کرتا جسم۔ جی چاہا وہ سامنے ہو اور اس کے ٹکڑے کر ڈالوں۔ لیکن وہ سات دروازوں اور سات پہروں میں تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اگلی رات نو بجے ایک اور دردناک سین ٹی وی چینل کی اسکرین پر ابھرا۔ ڈی پیلس کے مین گیٹ کے عین سامنے بیس مزید افراد کو پھانسی دے دی گئی۔ صرف اتنا لحاظ رکھا گیا کہ پھانسی کے عمل کو براہِ راست نہیں دکھایا گیا۔ چند منٹ بعد LIVE مناظر دکھا دیے گئے۔ پہلے کی طرح لاشوں پر یا پھر نیم جان جسموں پر گولیاں بھی برسائی گئی تھیں۔ کئی جسموں سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا۔ چہروں پر غلاف چڑھانے کی زحمت بھی نہیں کی گئی تھی اور وہ اذیت کے سبب بگڑے ہوئے تھے۔ ان میں ڈاکٹر ماریہ کے دو عزیزوں کے چہرے نہیں تھے...... اور اس کی وجہ بھی سمجھ میں آنے والی تھی۔
کچھ ہی دیر بعد ایک اسپتال کا منظر دکھایا گیا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا گوشت اور چربی کا ڈھیر، رائے زل اپنے لاؤ لشکر اور درجنوں مسلح گارڈز کے ساتھ اسپتال میں اپنے زخمی سپاہیوں کی عیادت کے لیے گیا تھا۔ وہ ان کے شانے تھپک رہا تھا اور مُکا کس کے ان کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ سویلین بھی موجود تھے۔ ان میں ہمیں ڈاکٹر ماریہ بھی نظر آئی۔ وہ رائے زل کے عقب میں سر جھکائے خاموش چل رہی تھی۔ رائے زل نے اس کی طرف متوجہ ہو کر ایک دو جملے بھی کہے۔ جیسے مریض سپاہیوں کی حالت کے بارے میں تبصرہ کر رہا ہو۔ یہ بڑے تکلیف دہ مناظر تھے۔ ڈاکٹر ماریہ، رائے زل کے قبضے میں جا چکی تھی۔
نیوز بلیٹن میں پورے شہر میں کرفیو کے مناظر دکھائے گئے۔ نیوز کاسٹر نے نمائندے سے پوچھا۔ ''کیا شہر میں امن ہے؟''
''جی ہاں، کہیں سے گڑبڑ کی کوئی اطلاع نہیں۔ آج بیس جنگی مجرموں کو سرِعام پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ ہر طرح کے حفاظتی انتظام موجود تھے۔ بس مین مارکیٹ کی طرف کچھ شرپسندوں نے ان سزاؤں پر ردِعمل دکھایا اور مٹھی بھر لوگوں نے توڑ پھوڑ کی کوشش کی۔ گرے فورس نے دس افراد کو گرفتار کر کے مقدمات درج کر لیے ہیں۔''
نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ ''شہر اور ڈی پیلس کی مجموعی صورتِ حال کیا ہے؟''
نمائندہ بولا۔ ''خدشہ تھا کہ ریان فردوس کی ہلاکت پر کچھ لوگ ردِعمل کا اظہار کریں گے مگر ابھی تک سکون ہے اور لوگ اپنے روزمرہ کے کاموں کی طرف متوجہ ہونے کے لیے کرفیو اٹھائے جانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ ریان فردوس کی تدفین کے بعد ہی کرفیو اٹھایا جائے گا۔ دوسری طرف قسطینا اور کمانڈر افغانی کے کئی قریبی ساتھیوں نے اپنی ہائی کمان کی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے خود کو سرنڈر کر لیا ہے۔ ایسے لوگوں میں سپریم کمانڈر قسطینا کی قریبی سہیلی اور مشیر ڈاکٹر ماریہ بھی شامل ہیں۔ آج وہ خود ڈی پیلس پہنچی ہیں اور عزت مآب رائے زل سے ملاقات کی ہے۔''
میں دانت پیس کر رہ گیا۔ رائے زل نے اپنی ضد پوری کی تھی اور ماریہ کو اپنی دسترس میں لے آیا تھا۔ انیق نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر ماریہ...... میرا مطلب ہے...... کیا ہماری یہ پناہ گاہ محفوظ رہ سکے گی؟''
میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جہاں تک میں ماریہ کو جانتا ہوں...... وہ جان تو

دے سکتی ہے لیکن اس طرح کی بے وفائی نہیں کر سکتی۔ وہ ہماری اس پناہ گاہ کے بارے میں کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنے دے گی۔"

"لیکن یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا نا؟"

"یقین سے تو پھر کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تمہیں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ تم جیسے اوٹ پٹانگ اور معصوم کے پیچھے کتنا خطرناک شخص چھپا ہوا ہے۔ داؤد بھاؤ جیسے گینگسٹر کا دستِ راست......"

"وہ تو پرانی بات ہوگئی جناب! اب تو میں آپ کا دستِ راست ہوں۔" دفعتاً مجھے اس دلچسپ خط کا خیال آ گیا جو پہلوان حشمت نے انیق کو لکھا تھا۔ وہ خط پتا نہیں کہاں کہاں کی خاک چھان کر ہم تک پہنچ گیا تھا۔ انیق نے ایک دوسرے خط کا ذکر بھی کیا تھا۔ لیکن حالات اتنے تیز رفتار تھے کہ میں ابھی تک وہ دوسرا خط دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔ میں انیق سے پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے اور انیق دونوں کو خاموش ہونا پڑا۔ قسطینا نے اٹھ کر ایل سی ڈی کی آواز مزید دھیمی کی۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ وہ اپنی یونیفارم کے ٹکڑے کر چکی تھی لیکن ایک "نادیدہ یونیفارم" جیسے اب بھی اس کے جسم پر موجود تھی۔ وہ مدھم آواز میں بولی۔

"ہم یہاں چوہوں کی طرح دبک کر بیٹھنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ نہ ہی ہم یہاں بیٹھ کر ٹی وی پر دل دوز مناظر دیکھ سکتے ہیں۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ میں آپ کو دعوت دیتی ہوں کہ آپ اپنے اپنے طور پر سوچیں کہ ہمارا آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہو۔ ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد ہم ایک اہم میٹنگ کریں گے۔"

سب نے اس بات کی تائید کی پھر سب خاموش ہو گئے۔ جیسے اپنے اپنے طور پر انہوں نے واقعی کچھ سوچنا شروع کر دیا ہو۔ میں نے کن انکھیوں سے زینب کی طرف دیکھا۔ جب سے اس نے ریان فردوس کے اندوہناک قتل کی خبر سنی تھی، مسلسل رو رہی تھی۔ حالانکہ ریان فردوس اس کا وہ جابر سسر تھا جو اس کا سایہ بھی ڈی پیلس میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا...... اور جس کی وجہ سے وہ زندہ ہونے کے باوجود مردہ تصور کر لی گئی تھی مگر وہ اس کے لیے بھی اشک بار تھی۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا کرتے ہیں، چوٹ لگے کسی کو تڑپتے ہیں ہم امیر...... سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ زینب شیشے جیسی شفاف لڑکی تھی۔ ابراہیم جیسے "پرنس" نے اسے چاہا تھا اور وہ واقعی اس قابل تھی کہ اسے چاہا جاتا۔ سناٹے میں ایک مدھم نغمہ ابھرا اور سب کو متوجہ کر گیا۔ کمانڈر فارس ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کھویا کھویا خاموش۔ قسطینا کی طرح اس کے بازو پر بھی پٹی نظر آ رہی تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ اس پر وہی ترانہ ریکارڈ تھا جو جاماجی کے طول و عرض میں فوجی اور لشکری اکثر گنگناتے تھے۔

ہم نے جی جان سے جینا ہے...... اب سینہ تان کے جینا ہے

ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے

ہم سچے سویرے تک لڑیں گے (اور اس کے آخری بول تھے) اور اگر ہم واپس نہ آ سکے...... ہمارے بچوں سے کہنا ہم سرخرو ہوئے۔ قسطینا کی پُرحرارت گفتگو کے بعد اس ترانے نے سب کے دلوں میں مایوسی کی تاریکی کو تھوڑا کم کیا۔ حتیٰ کہ ابراہیم کے چہرے پر بھی کچھ روشنی نظر آئی۔ کہیں دور شہر میں اچانک آٹومیٹک رائفلوں کے کئی طویل برسٹ چلے...... اور پھر پہلے کی طرح خاموشی چھا گئی۔ اسی دوران میں سجاول ایک بار پھر کسمسانے لگا۔ اس کی مشکیں بدستور کسی ہوئی تھیں۔ بے ہوشی کی حالت میں اسے میجر وارث نے گلوکوز ڈرپ کے ذریعے کچھ توانائی مہیا کر دی تھی۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے کھانے پر مجبور کیا جا سکتا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کی نگاہ سیدھی مجھ پر پڑی۔ بڑی بڑی عقابی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ جب وہ ہاتھ پاؤں ہلانے میں ناکام ہوا تو کراہا اور پھر گرج کر بولا۔ "تم اچھا نہیں کر رہے۔ تمہیں پچھتانا پڑے گا، سب کو پچھتانا پڑے گا۔"

"لیکن میرا قصور تو بتا دو سجاول۔" میں نے قریب آتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تم دونوں بے قصور ہو سارے قصور میرے ہیں۔" اس نے بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی وحشت میں کمی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ ایک خوش آئند بات تھی۔ اگر واقعی یہ سب کچھ خاص قسم کے ہپناٹزم کی وجہ سے تھا تو پھر ہو سکتا تھا کہ سجاول آہستہ آہستہ اپنے "ٹرانس" سے باہر نکل رہا ہو۔ ڈاکٹر زینب نے بھی تو اسی قسم کی بات کہی تھی۔

وہ غنودگی میں تھا۔ میں نے میجر وارث سے کہا کہ اسے دوبارہ بے ہوشی کی ڈوز دے دیں تو بہتر رہے گا۔ میجر وارث نے میری تائید کی اور انجکشن بھرنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ میجر وارث کا پیٹ خراب تھا۔ اسے بار بار واش روم جانا پڑ رہا تھا (لیکن یہ کسی ذہنی تناؤ یا

گھبراہٹ کے سبب نہیں تھا۔ وہ ایک مانا ہوا دلیر آفیسر تھا)
سجاول کو دوبارہ انجکشن لگ گیا تو انیق کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔ میں سجاول کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا اس نے اپنی خاص کیفیت میں مجھ پر بے سروپا الزام لگائے تھے۔ وہ جیسے مدہوشی کی حالت میں بولتا چلا گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنی ماں یعنی ''ماؤ'' سے بہت محبت کرتا ہے اور اس نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ماؤ ہر صورت میں اپنی پوتی مانی کی شادی میرے ساتھ کرنا چاہتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ مر جائے گی۔ لیکن وہ نہیں مری تھی اور نہ اس کی افلاطون پوتی کی صحت پر کچھ زیادہ اثر پڑا تھا۔ اب پتا نہیں یہ باتیں سجاول کے ذہن میں کیسے بیٹھ گئی تھیں کہ وہ دونوں مر چکی ہیں اور میں ان کا قاتل ہوں۔ برین واشنگ ایک سائنسی طریقہ کار ہے۔ کیا سجاول کی برین واشنگ ہو چکی تھی؟

ٹی وی چینل درختوں سے جھولتی لاشوں کو وقفے وقفے سے دکھاتا چلا جا رہا تھا۔ ان میں زیادہ تر قسطینا کے قریبی ساتھی ہی تھے۔ چار پانچ لوگ ایسے تھے جو میرے ساتھ ہی ''آشیانے'' نامی جگہ پر ٹارچر جھیلتے رہے تھے۔ قسطینا میرے پاس ہی دیوار سے ٹیک لگائے قالین پر بیٹھی تھی۔ اس نے چینل بدل دیا۔ یہاں پر بھی ایک ہنگامہ ہی تھا۔ آٹھ دس مردوں اور چار پانچ عورتوں کی ایک ٹولی کسی اندرونی سڑک پر مظاہرہ کر رہی تھی۔ ایک لڑکی جو شاید کالج کی طالبہ تھی بار بار اپنی عینک سنبھال رہی تھی اور مائیک کے سامنے دہاڑ رہی تھی۔ ''اس کے سر کی قیمت مقرر کرنے والے بھول رہے ہیں کہ بہادری اور جانبازی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور وہ جانباز لوگ ہیں۔ ہمارے ہم وطن نہیں لیکن ہم وطنوں سے بڑھ کر انہوں نے ساتھ دیا ہے ہمارا...... اور وہ تھپڑ جو ایک ظالم کے گال پر پڑا تھا، اس کی گونج کبھی ختم نہیں ہو گی...... کبھی نہیں۔''

لڑکی کے ساتھی نوجوان نے بھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ گرے فورس کے مسلح جوان ان پر ٹوٹ پڑے۔ مظاہرین پر نہایت بے دردی سے رائفلوں کے کندے برسائے گئے۔ عورتوں کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا گیا۔ ایک زنانہ فورس بھی نظر آئی۔ لیکن غور سے دیکھنے کے بعد پتا چلا کہ یہ زنانہ نہیں، یہ کیل کانٹے سے لیس چار پانچ تنومند ہیجڑے تھے۔ وہ عورتوں کو بے دردی سے بید رسید کر رہے تھے۔ میری رگوں میں خون سنسنا گیا۔ یقیناً انیق کی بھی یہی کیفیت ہوئی ہو گی۔ ہمیں خیام دانش بھی نظر آیا۔ وہ عینک والی لڑکی کو بری طرح پیٹتا ہوا فورس کی گرے گاڑی میں دھکیل رہا تھا...... بے شک وہ خیام ہی تھا۔

کلپ ختم ہو گیا۔ نیوز کاسٹر نے جو خبر دی اس کا تعلق حیران کن طور پر براہِ راست مجھ سے تھا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے سر کی ایک معقول قیمت مقرر کی گئی ہے۔ میں ایک ''گھس بیٹھیا'' دہشت گرد قرار پایا تھا اور شاید میرا اس سے بھی بڑا ''کارنامہ'' یہ تھا کہ میں نے آقا جان کو ڈی پیلس کے گیٹ پر ایک یادگار تھپڑ سے نوازا تھا۔ انیق میری بائیں جانب بیٹھا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔ ''آپ کو مبارک ہو، پاکستانی کرنسی میں قریباً تین کروڑ روپیا اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔''

شاید وہ کچھ مزید کہتا لیکن اسی دوران میں قسطینا بول اٹھی۔ ''شاہ زیب! تم بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے ہو جن کو ڈھونڈنے کے لیے یہ خبیث ہر حد تک جائیں گے۔ تمہیں اب حد سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''اور آپ کو بھی۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے لوگوں کو آپ کی کتنی ضرورت ہے۔''

اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا پھر میرے بازو کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کرب ابھر آیا۔ انیق کی وجہ سے کچھ بولی نہیں۔

اور یہ اسی رات کا درمیانی پہر تھا۔ میرے ذہن میں پریشان خیالات کا ہجوم تھا۔ نیند ابھی نہیں آ رہی تھی، باقی قریباً سب ہی سو چکے تھے۔ اچانک مجھے آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے میجر وارث کو دیکھا۔ وہ ایک بار پھر واش روم کی طرف گیا لیکن چند ہی سیکنڈ بعد نکل آیا۔ وہ بے آواز چلتا اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ مجھے الجھن سی ہوئی۔ میں بھی دبے پاؤں اٹھ کر میجر کے پیچھے گیا۔ دل اچھل کر رہ گیا۔ یقین نہیں آیا کہ میجر وارث ایسا کر سکتا ہے۔ میجر کے ہاتھ میں اس کا سیل فون تھا۔ وہ اس کا چارجر علیحدہ کر چکا تھا اور اب اسے ''آن'' کر رہا تھا۔

''میجر۔'' میں نے کہا۔

وہ پلٹا اور تب اس نے حیران کن تیزی کے ساتھ اپنے کوٹ میں سے نائن ایم ایم پستول نکال لیا۔ میں نے جھک کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے لیتا ہوا فرش پر گرا۔ اسی دوران میں اس نے گولی چلا دی۔ دھماکے کی آواز پناہ گاہ میں بڑی شدت سے گونجی تھی۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

حادثہ

اقبال کاظمی

واقعات... احساسات اور زندگی کے تجربات ایک وسیع تر سمندر کے مانند ہیں... جس کی گہرائیوں میں لاتعداد سیپیاں بکھری ہوتی ہیں... ان میں سے موتی چننے والے کو سمندر کی پُراسرار گہرائیوں میں لگاتار تلاش جاری رکھنے کے لیے نہ تھکنے والی ہمت کی ضرورت پڑتی ہے... کچھ ایسے بھی باہمت ہوتے ہیں کہ جو اپنی اس توانائی کو غیر نصابی سرگرمیوں میں صرف کر دیتے ہیں... مکمل اور شاندار منصوبے نے ان کی مہم کو آسان تر بنا دیا... پیچیدہ اور تاریک راستے ہموار تھے... مگر حادثات کا سلسلہ بھی قدم قدم ساتھ تھا۔

ایک ایسے عقلمند کی بپتا جو ہر لمحہ سوچتا رہتا تھا......

سفید پتھروں کی بنی ہوئی وہ خوب صورت دو منزلہ عمارت آبادی سے قدرے ہٹ کر واقع تھی۔ اس کے چاروں طرف خوب صورت ملان تھا جس کی دیکھ بھال پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ اینٹوں کی چار دیواری اگرچہ صرف تین فٹ اونچی تھی لیکن اس کے اوپر تاروں کا بلند جنگلا تھا۔ چار دیواری کا گیٹ بھی آہنی جنگلے ہی کا تھا جس کے اندر کی طرف ایک مختصر سا کیبن بنا ہوا تھا۔ کیبن میں ایک مسلح محافظ بھی موجود تھا جو اسٹول پر بیٹھا متجسس نگاہوں سے اس ٹیکسی

کو دیکھ رہا تھا جو متوسط رفتار سے گیٹ کی طرف چلی آرہی تھی۔ اس سڑک پر کاروں کی آمدورفت محافظ کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن تجسس محض ٹیکسی کی وجہ سے تھا۔ یہاں ہمیشہ چمکتی ہوئی پرائیویٹ کاریں ہی آیا کرتی تھیں جبکہ کوئی ٹیکسی پہلی مرتبہ یہاں نظر آئی تھی۔

ٹیکسی کے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی محافظ ہولسٹر میں لٹکے ہوئے ریوالور کو ٹٹولتا ہوا کیبن سے باہر آچکا تھا۔ ٹیکسی گیٹ کے سامنے رک چکی تھی۔ محافظ گیٹ کے اندرونی سمت کھڑا متجسس نگاہوں سے اس شخص کی طرف دیکھنے لگا جو سو سو کے دو نوٹ ڈرائیور کی طرف بڑھاتے ہوئے دروازہ کھول کر نیچے اتر رہا تھا۔ گیٹ کا محافظ یہاں آنے والے تقریباً ہر مہمان کو پہچانتا تھا لیکن یہ چہرہ اس کے لیے اجنبی تھا۔

وہ ٹیکسی سے اُتر کر چند لمحوں تک اسی جگہ کھڑا رہا اور جب ٹیکسی یوٹرن لیتی ہوئی مین روڈ کی طرف روانہ ہوگئی تو وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کے قریب پہنچ گیا۔ محافظ ایک ہاتھ ہولسٹر پر جمائے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں مسٹر دارا سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرا یہ کارڈ ان تک پہنچا دو۔'' اجنبی نے کوٹ کی اوپر کی جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

محافظ نے دایاں ہاتھ ریوالور کے دستے سے ہٹائے بغیر دوسرے ہاتھ سے کارڈ لے لیا پھر محتاط انداز میں چلتا ہوا کیبن میں داخل ہوگیا۔ انٹرکام کا بٹن دبانے سے پہلے اس نے کارڈ پر نظر ڈالی پھر بٹن دبا کر آگے کو جھکتا ہوا بولا۔

''بندرعباس سے پروفیسر منوچہر باس سے ملنا چاہتا ہے۔''

''انتظار کرو۔ میں باس سے بات کرتا ہوں۔''

دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ محافظ وہیں کھڑا جواب کا انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ گزر گیا۔ اس دوران اس نے کئی مرتبہ گیٹ کے سامنے کھڑے ہوئے اجنبی کی طرف دیکھا پھر انٹرکام کی طرف متوجہ ہوگیا جس سے ابھرنے والی وہی بھاری آواز کہہ رہی تھی۔

''یہ نام اگرچہ باس کے لیے اجنبی ہے لیکن بہرحال اسے اندر بھیج دو۔ باس یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے اور اس سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بھیج رہا ہوں۔''

محافظ نے باہر آکر گیٹ کھولا اور اجنبی کو اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اسے بتانے لگا کہ وہ سیدھا چلا جائے۔ عمارت کے برآمدے میں ملنے والا آدمی اسے باس تک پہنچا دے گا۔

پُروقار شخصیت کا مالک پروفیسر منوچہر محافظ کا شکریہ ادا کرتا ہوا عمارت کی طرف چل دیا جو گیٹ سے تقریباً سو گز دوری پر تھی۔ اس نے برآمدے کی آخری سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے کا دروازہ کھلا اور گرے سوٹ میں ملبوس ایک پستہ قامت شخص سامنے آگیا۔

''میرے ساتھ آئیے پروفیسر۔'' اس نے گہری نظروں سے پروفیسر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

پروفیسر اس پستہ قامت شخص کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ اوپر کی منزل کے ایک دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ شخص رک گیا اور دروازے کی طرف رخ کر کے اپنے باس کو مخاطب کرتے ہوئے اسے پروفیسر کی آمد کی اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے، تم واپس جاؤ۔''

فضا میں آواز اُبھری۔ پروفیسر یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ یہ آواز کہاں سے اُبھری تھی۔ پستہ قامت شخص پروفیسر کی طرف دیکھتا ہوا واپس مڑ گیا۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد دروازہ خودبخود کھل گیا اور اس آواز نے پروفیسر کو اندر داخل ہونے کی دعوت دی۔ پروفیسر کسی جھجک کے بغیر اندر داخل ہوگیا۔ اس نے دوسرا قدم جیسے ہی دروازے کے اندر رکھا دروازہ خودبخود بند ہوگیا۔

یہ ایک وسیع کمرا تھا جس میں چاروں طرف الماریاں اور فائل کیبنٹ آراستہ تھے۔ دیواروں پر خوب صورت پینٹنگز آویزاں تھیں۔ سامنے ہی شیشے کے ٹاپ والی بہت بڑی آفس ٹیبل تھی جس کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر ایک دراز قامت آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ صحت مند جسم کا مالک تھا، عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ آنکھوں میں عیاری کی چمک اور چہرے پر سردمہری کے آثار تھے۔

''مجھے علم نہیں تھا کہ تم سے ملنے کے لیے اتنے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑے گا۔'' پروفیسر نے میز کے سامنے رک کر اس شخص کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''ارے تم۔'' وہ شخص ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''لیکن یہ پروفیسر کب سے بن بیٹھے۔ غالباً کوئی ڈگری کہیں سے ہاتھ لگ گئی ہوگی۔''

''میرے نام ایم اے کی ڈگری میرے والدین کے شوق کا نتیجہ کہہ سکتے ہو جو مجھے بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے۔

میں نے ڈگری تو حاصل کر لی لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کا خیال میرے ذہن میں بہت عرصے بعد آیا تھا۔''

''بیٹھو، یہ باتیں بعد میں ہوں گی کہ تم نے اس ڈگری سے کیا فائدہ اٹھایا تھا۔ ہم غالباً پانچ سال بعد ملے ہیں۔''

''ٹھیک سمجھے۔ ہماری آخری ملاقات غالباً اتنا ہی عرصہ پہلے ہوئی تھی لیکن اس وقت تمہارے یہ ٹھاٹ نہیں تھے دارا۔'' پروفیسر نے اس کے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری طرح ڈگریوں کے چکر میں نہیں رہا۔ محنت کی ہے...... یہ سب کچھ اسی محنت کا نتیجہ ہے۔ اگر آج میں اس شہر کا بے تاج بادشاہ کہلاتا ہوں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ تم بتاؤ، اتنا عرصہ کہاں غائب رہے، اپنے پیشے سے ریٹائر ہو گئے ہو کیا؟''

''جو شخص اس پیشے میں آجائے، وہ کبھی ریٹائر نہیں ہوتا۔ میں نے بھی اس عرصے میں محنت کی ہے اور اب اس کا ثمر حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن اس کے لیے مجھے کسی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ میری نظروں میں تم سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکے۔''

''میں معاملے کی نوعیت اور تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔'' دارا نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

پروفیسر چند لمحے خاموش رہا پھر اسے معاملے کی نوعیت اور تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ دارا بڑی دلچسپی اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

''اس کے بارے میں مجھے پانچ سال پہلے معلوم ہوا تھا۔ وہ عمارت دراصل اس کمپنی کا ساحلی دفتر ہے۔ جہاں مہینے میں صرف ایک مرتبہ صرف چوبیس گھنٹے کے لیے مال رکھا جاتا ہے۔ اس کمپنی کا طریقۂ کار یہ ہے کہ کانوں سے حاصل ہونے والے ہیرے تراش خراش کے مرحلوں سے گزرنے کے بعد ایکسپورٹ کے لیے بندر عباس کی اس عمارت میں پہنچا دیے جاتے ہیں جہاں سے انہیں بیرونِ ملک بھیج دیا جاتا ہے۔ یہاں ہر ماہ کی ایک مقررہ تاریخ کو دو کروڑ روپے کی مالیت کے ہیرے آتے ہیں۔ جہاں کی انچارج شہپر نامی ایک عورت ہے۔

''یہ عمارت تین منزلوں پر مشتمل ہے جس کی پہلی اور تیسری منزل پر دفاتر اور دوسری منزل پر وہ اسٹرونگ روم ہے جس میں وہ ہیرے رکھے جاتے ہیں۔ عمارت میں داخلے کا صرف ایک ہی دروازہ ہے جہاں کم سے کم نصف درجن مسلح محافظ موجود رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ عمارت میں داخلے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک اسکول کی عمارت ہے جو اس عمارت کی طرح تین منزلوں پر مشتمل ہے۔ ڈائمنڈ کمپنی کی اس عمارت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے میں اسکول کی عمارت تک رسائی حاصل کروں۔ اس کے لیے میں نے محکمۂ تعلیم میں ملازمت حاصل کی۔ ایم اے کی ڈگری ملازمت کے حصول کے سلسلے میں میری بہترین معاون ثابت ہوئی۔ دو سال تک دارالحکومت کے ایک کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے بعد میں نے بندر عباس کے اس ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے اپنا تبادلہ کروا لیا۔ میری رہائش بھی اسکول کی عمارت سے ملحق ایک بنگلا نما عمارت میں تھی جس کی وجہ سے میں دن یا رات کے کسی بھی وقت اسکول کی عمارت میں آمدورفت رکھ سکتا تھا۔

''میں نے اسکول کی عمارت کے ان کمروں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جہاں سے ڈائمنڈ کمپنی کی عمارت اور اس کے دروازے پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ میں نے تین سال تک محنت کی اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے ڈائمنڈ کمپنی کی اس عمارت کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔'' پروفیسر نے خاموش ہو کر جیب سے ایک نقشہ نکالا اور اسے میز پر پھیلا کر اس کے بارے میں تفصیلات بتانے لگا۔

''یہ اس عمارت اور اس کے آس پاس کا نقشہ ہے۔ اس جگہ پر عمارت میں داخلے کے لیے لوہے کی موٹی سلاخوں والا گیٹ ہے۔ گیٹ کے دائیں طرف یہ وہ دفتر ہے جہاں دفتر کی انچارج شہپر کی میز ہے۔ کھڑکیوں پر بھی لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں ہیں لیکن اگر کھڑکیوں کے اندرونی پٹ کھلے ہوئے ہوں تو اسکول کے کمرے سے دفتر کے اندر کا منظر بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان دونوں عمارتوں کے درمیان چالیس فٹ چوڑی سڑک ہے جس کے نیچے گٹر کی طرح سرنگ بنی ہوئی ہے جس میں بجلی کے کیبل بچھے ہوئے ہیں۔ اس سرنگ میں ایک آہنی پائپ کے ذریعے بجلی کے موٹے موٹے تار عمارت کے نیچے سے اوپر تک گئے ہیں۔ یہ پائپ دوسری منزل سے اس کمرے کے اندر سے بھی گزرتا ہے جسے اسٹرونگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

''اسٹرونگ روم تک پہنچنے کے لیے تین دروازوں سے گزرنا پڑتا ہے جو آٹومیٹک میکنزم کے ذریعے کام کرتے

ہیں۔ اسٹرونگ روم کے اندر راہداری کے اختتام پر رائل سیف کمپنی کی 64 ماڈل کی ایک مضبوط تجوری ہے جس کی چابی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ چابی کا ایک حصہ شہپر کی تحویل میں رہتا ہے اور دوسرا حصہ جو ایک لمبی سلاخ پر مشتمل ہے تجوری ہی میں رہتا ہے۔

''ڈائمنڈ کمپنی کی بکتربند گاڑی ہر ماہ کی سات تاریخ کو سخت حفاظتی انتظامات اور کمپنی کے دو افسروں کی معیت میں یہاں پہنچتی ہے۔ ایک دہرے بریف کیس میں بند ہیرے شہپر اور ان افسروں کی موجودگی میں تجوری میں رکھے جاتے ہیں جس کی چابی کا دندانے دار اگلا نصف حصہ شہپر کی تحویل میں رہتا ہے۔ اگلے روز ایک مقررہ وقت پر انہی لوگوں کی موجودگی میں یہ ہیرے نکال کر کسی نامعلوم مقام کی طرف بھیج دیے جاتے ہیں۔''

عمارت میں بھی حفاظتی انتظامات خاصے کڑے ہیں۔ دو محافظ ہر آدھے گھنٹے بعد پوری عمارت کا گشت کرتے ہیں۔ وہ پہلے دو دروازے کھول کر تیسرے دروازے کی میجک آئی سے سامنے نظر آنے والی تجوری کو دیکھ کر اطمینان کرنے کے بعد دروازے بند کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ تجوری کے قریب دائیں بائیں کی دونوں دیواروں میں آٹھ فٹ کی بلندی تک ایسے خفیہ آلات نصب ہیں کہ اگر مکھی یا مچھر بھی سامنے سے گزر جائے تو الارم بج اٹھتے ہیں۔ عمارت کے گارڈ روم اور دیگر اہم مقامات کے علاوہ الارم کا رابطہ پولیس اسٹیشن سے بھی قائم ہے۔ الارم بجنے کے دو منٹ کے اندر اندر پولیس وہاں پہنچ سکتی ہے۔

''شہپر کے بارے میں بھی میں نے تفصیلی معلومات حاصل کی ہیں۔ عمر تیس سال کے لگ بھگ اور غیر شادی شدہ ہے۔ انتہائی خشک مزاج اور مردم بیزار قسم کی عورت ہے۔ ڈائمنڈ کمپنی کی اس عمارت کے قریب ہی ایک شاندار فلیٹ میں اکیلی رہتی ہے۔ فلم یا دیگر تفریحات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ دفتر کے علاوہ اس کا زیادہ وقت گھر ہی میں گزرتا ہے۔ ان تین برسوں میں یہ معلومات جمع کرنے کے علاوہ میں نے ڈائمنڈ کمپنی کی عمارت اور اس کے اندر اور باہر کی سرگرمیوں کی ایک فلم بھی تیار کی ہے جس کے لیے مجھے خاصے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا۔ یہ فلم دیکھنے کے بعد تمہیں صورتِ حال کو سمجھنے میں یقیناً مدد ملے گی۔'' پروفیسر نے کہتے ہوئے جیب سے آٹھ ملی میٹر فلم کی ایک چھوٹی ریل نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔

دارا نے ایک الماری سے پروجیکٹر نکالا اور اسکرین پر اس فلم کو دیکھنے لگا۔ پروفیسر نے ڈائمنڈ کمپنی کی عمارت کے اندرونی حصے کی فلم کس طرح تیار کی تھی، یہ ایک الگ بات تھی لیکن اسے دیکھنے سے ہر بات کی وضاحت ہو جاتی تھی۔

''بہت خوب!'' دارا نے پروجیکٹر بند کرتے ہوئے توصیفی انداز میں کہا۔ ''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''تعاون۔'' پروفیسر معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔

''کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟''

''مجھے کم سے کم چار آدمیوں کی ضرورت ہے جو ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہوں۔''

''منصوبہ کیا ہے؟'' دارا نے دریافت کیا۔

''میں نے جو منصوبہ بنایا ہے اس پر عمل درآمد کے لیے ہمیں مزید دو مہینے انتظار کرنا ہوگا۔ گزشتہ تین سال کے عرصے میں، میں نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ مہینے کی اکیس تاریخ کو اگر چھٹی کا دن بھی ہو تو ڈائمنڈ کمپنی کی اس عمارت میں سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اس روز بھی مقررہ وقت پر ہیرے وہاں لائے جاتے ہیں اور پھر اگلے روز انہیں وہاں سے کہیں اور بھیج دیا جاتا ہے۔ دو ماہ بعد یعنی اکیس مارچ کو نوروز کی چھٹی ہے لیکن ہیرے اس روز بھی شیڈول کے مطابق لائے جائیں گے۔ اکیس مارچ کی رات کو ہمیں اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں آسانی رہے گی کیونکہ اس روز شہر میں جشن کا سا سماں ہوتا ہے۔ قریبی قصبوں اور دیہاتوں کے لوگ بھی اس جشن میں شریک ہونے کے لیے بندر عباس پہنچ جاتے ہیں۔ ڈائمنڈ کمپنی کی عمارت والی سڑک پر رات بھر ہنگامہ رہتا ہے۔ ہزاروں لوگ وہاں جمع رہتے ہیں۔ دیہاتوں سے آئے ہوئے لوگ اس جگہ مختلف کھیل تماشے اور لوک رقص پیش کرتے ہیں۔ ایسے میں ہمیں ڈائمنڈ کمپنی کی عمارت میں داخلے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔''

''لیکن عمارت میں داخل کس طرح ہوا جا سکتا ہے جبکہ تمہارے کہنے کے مطابق وہاں چوبیس گھنٹے مسلح محافظ موجود رہتے ہیں۔'' دارا نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''عمارت میں داخل ہونے کے لیے ہم اسکول کی عمارت کو استعمال کریں گے۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔

''سمجھ گیا لیکن...... محافظوں کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن ہے؟'' دارا نے اعتراض کیا۔

''محافظ ہر آدھے گھنٹے بعد عمارت کا چکر لگاتے ہیں۔ آدھے گھنٹے کے اس درمیانی وقفے میں ہمیں کسی قسم کا خطرہ

نہیں ہو گا اور یہ بات بھی مت بھولو کہ اس وقت سڑک پر جشن منانے والوں کا ہنگامہ ہو گا۔ اس طرح ہماری طرف کسی کی توجہ نہیں ہو گی۔ منصوبے کی پوری تفصیل میں انہی لوگوں کو بتاؤں گا جو اس میں شامل ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ تم نے واقعی زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ڈگری سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن اس میں میرا کیا حصہ ہو گا۔'' دارا نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''لوٹ کا پچیس فیصد، یہ صرف تمہارا حصہ ہو گا۔ منصوبے پر کام کرنے والے دیگر چار آدمیوں کے معاوضہ دینے کے علاوہ مہم کے اخراجات بھی میں برداشت کروں گا۔'' پروفیسر نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' دارا نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔''میں تمہیں چار ایسے آدمی فراہم کر دوں گا جو نہ صرف ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہوں گے بلکہ انہیں اپنے اپنے شعبے کا ماہر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے تمہیں کل شام تک انتظار کرنا پڑے گا۔ چاہو تو یہیں رک جاؤ۔''

''نہیں۔'' پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔''اس سلسلے میں مجھے کچھ دیگر ضروری کام بھی نمٹانے ہیں۔ میں بلبرو ہوٹل کے کمرا نمبر بیس میں مقیم ہوں۔ کل پانچ بجے کے بعد میں ہوٹل میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں اطلاع کر دوں گا۔'' دارا نے جواب دیا۔

پروفیسر فلم کی ریل اور نقشہ سنبھالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ دارا نے ہاتھ ملاتے ہوئے بتایا کہ اس کا آدمی اسے گاڑی پر شہر تک چھوڑ آئے گا۔ پروفیسر جب اس کے کمرے سے نکل کر نیچے آیا تو ہال میں وہی پستہ قامت آدمی اس کا منتظر تھا۔

برآمدے کے سامنے سفید رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ پستہ قامت شخص نے پروفیسر کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا...... پھر آگے آ کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ انجن اسٹارٹ ہوا اور اس کے چند سیکنڈ بعد کار سلاخوں والے آہنی گیٹ سے نکل کر کشادہ سڑک پر دوڑنے لگی۔

☆☆☆

دارا نے پروفیسر کو اس کے مطلوبہ آدمیوں کے صرف ایڈریس فراہم کیے تھے۔ ان سے رابطہ خود پروفیسر کو قائم کرنا تھا۔ ان میں ایک الیکٹریشن تھا، دوسرا انجینئر، تیسرا ہر قسم کی تجوریاں توڑنے کا ماہر اور چوتھا ایک چھوٹی سی لانچ کا مالک تھا۔ لانچ کے مالک محسن کو قیمتی اشیا اسمگل کرنے کا بہت وسیع تجربہ حاصل تھا۔ اس کی لانچ عام طور پر بندر عباس کے ساحل پر ہی لنگر انداز رہتی۔ مصدق، اردشیر اور فریدون بھی مختلف شہروں میں تھے۔ وہ چاروں اپنے اپنے شعبوں کے فنکار سمجھے جاتے تھے اور انہیں اب تک اپنے کسی کام میں ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ پولیس میں ان میں سے کسی کا بھی ریکارڈ نہیں تھا۔

ہر ایک کے سامنے اپنا منصوبہ بیان کرنے کے بعد پروفیسر نے انہیں پانچ پانچ لاکھ روپے کی پیشکش کی تھی۔ اس مہم میں اگرچہ قدم قدم پر خطرات تھے مگر اتنے گرانقدر معاوضے کی پیشکش پر ان میں سے کسی نے بھی انکار نہیں کیا تھا۔

محسن سے دوسری ملاقات اسی لانچ میں ہوئی جو فش ہاربر پر لنگر انداز تھی۔ پروفیسر کچھ دیر تک اس سے منصوبے کی تفصیلات پر تبادلۂ خیال کرتا رہا پھر بولا۔''آپریشن کے دوران تمہاری اس لانچ کو ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ وہ چاروں اس جگہ جمع ہوں گے۔ مصدق یہاں اسی ماڈل اور میک کی تجوری کا قفل توڑنے کی مشق کرنا چاہتا ہے جبکہ فریدون بھی الارم سسٹم کو ناکام بنانے کے لیے کچھ تجربات کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے مناسب ہو گا کہ لانچ کو فش ہاربر سے ہٹا کر کسی اور محفوظ مقام پر لنگر انداز کیا جائے۔''

''یہ محفوظ ترین جگہ ہے پروفیسر۔'' محسن نے جواب دیا۔''کسی غیر آباد ساحل پر لنگر انداز لانچ سی کسٹمز کی گشتی لانچوں کی توجہ کا مرکز بن سکتی ہے جبکہ یہاں ان لوگوں کی آمدورفت پر کسی کو شبہ نہیں ہو گا۔ مچھلیوں کے بیوپاری ہاربر پر آتے ہی رہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ وہ لوگ کل سے یہاں پہنچنا شروع ہو جائیں گے۔ میں اب بدھ کی رات کو یہاں آؤں گا تاکہ تم سب کی موجودگی میں اپنے منصوبے کی وضاحت کر سکوں۔'' پروفیسر کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

بدھ کی رات جب پروفیسر لانچ پر پہنچا تو وہ سب ہی موجود تھے۔ مصدق رائل کمپنی کی چونسٹھ ماڈل کی ایک تجوری لانچ میں لے آیا تھا جس کے ساتھ الارم سسٹم بھی منسلک تھا۔ فریدون اور مصدق اپنے اپنے کام میں مصروف تھے جبکہ اردشیر اور محسن دلچسپ نگاہوں سے ان کی اس کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔

محسن اٹھائیس برس کی عمر کا ایک دبلا پتلا سا نوجوان تھا۔ چہرے پر کرختگی اور آنکھوں میں عیاری کی جھلک

نمایاں تھی۔ اس کا باپ ماہی گیر تھا جس نے بیٹے کو بی ایس سی تک تعلیم دلائی تھی۔ وہ اسے ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا لیکن باپ کی موت کے بعد بیٹا ڈاکٹر کے بجائے اسمگلر بن گیا۔ اس نے ایک ایسے گروہ سے رابطہ قائم کرلیا تھا جو پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔ دارا اس ملک میں اس گروہ کا سربراہ تھا۔

مصدق کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ اپنے کیریئر کی ابتدا اس نے رائل سیف کمپنی کی ملازمت سے کی تھی۔ اسے کمپنی کا بہترین انجینئر سمجھا جاتا تھا لیکن چند سال قبل بعض وجوہات کی بنا پر اس نے ملازمت چھوڑ دی اور دارالحکومت میں ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ کھول لیا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ دنیا کی کوئی تجوری ایسی نہیں تھی جسے وہ نہ کھول سکتا ہو۔ اس نے دارا کے ساتھ مل کر بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔

فریدون درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ پیشے کے لحاظ سے الیکٹریکل انجینئر تھا۔ بجلی کا کوئی کام ایسا نہیں تھا جسے وہ نہ سمجھ سکتا ہو۔ ان دنوں وہ بجلی اور ڈرائی سیل سے چلنے والے کھلونے بنانے والی ایک کمپنی میں کام کررہا تھا۔ کبھی کبھار وہ دارا کے لیے بھی کام کیا کرتا تھا۔

اردشیر ایک تعلیم یافتہ اور خوبرو نوجوان تھا۔ عورتوں کے لیے اس میں خاص کشش تھی۔ اپنی اس مردانہ وجاہت سے وہ بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ وہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھا کہ عورتیں اس سے فوراً متاثر ہوجاتی ہیں۔ وہ عورتوں کی اس کمزوری سے اس طرح فائدہ اٹھاتا کہ وہ انہیں دامِ محبت میں پھنسا کر ان سے لمبی لمبی رقمیں بٹورتا۔

پروفیسر نے ان چاروں کو لانچ کے ایک کیبن میں جمع کرلیا اور اپنے منصوبے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں اگرچہ الگ الگ تم سب کو اپنے اس منصوبے کے بارے میں بتا چکا ہوں لیکن ایک بار پھر اس کی وضاحت کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر انہیں اپنے منصوبے کی باریکیوں سے آگاہ کرنے لگا۔

''محسن اس مشن کا انچارج ہوگا۔ میں اور دارا دور رہ کر مشن کی نگرانی کریں گے۔ ہر شخص اپنے کام پر توجہ دے گا۔ ایکس مارچ میں ابھی کئی دن باقی ہیں۔ اس سے ایک دن پہلے فریدون سڑک پر گٹر والی سرنگ میں داخل ہوکر وہ پائپ کاٹے گا جہاں سے بجلی کی تاریں اس عمارت کی آخری منزل تک چلی گئی ہیں۔ اردشیر ڈائمنڈ کمپنی کی انچارج مس شہپر سے تعلقات بڑھائے گا۔ تجوری کی چابی کا نصف حصہ مس شہپر کی تحویل میں رہتا ہے۔ اردشیر وہ چابی حاصل کر کے محسن کے حوالے کردے گا اور محسن یہ چابی مصدق کے سپرد کردے گا۔ تجوری کھولنے کے بعد مصدق یہ چابی تجوری والے کمرے سے اس پائپ میں ڈال دے گا جو نیچے تک چلا گیا ہے۔ محسن نیچے موجود ہوگا وہ یہ چابی دوبارہ اردشیر کے حوالے کردے گا جو مس شہپر کے علم میں آئے بغیر دوبارہ اسی جگہ رکھ دے گا جہاں سے حاصل کی گئی تھی۔ یہ بات تم سب کے ذہن میں رہے کہ اس تمام کارروائی کے لیے تم لوگوں کے پاس صرف آدھے گھنٹے کا وقت ہوگا۔ پروگرام میں ایک بھی لمحے کی تاخیر تم سب کی موت کا باعث بن سکتی ہے۔ محافظوں کو یہ حکم ہے کہ وہ عمارت کے اندر کسی کو دیکھتے ہی گولی ماردیں۔ مجھے اُمید ہے کہ تم لوگ وقت کی اہمیت کو ذہن میں رکھو گے۔ ہیروں والا بریف کیس حاصل کرنے کے بعد اسے کھولے بغیر محسن کی لانچ پر پہنچادیا جائے گا جو اس وقت فش ہاربر سے نصف میل شمال کی طرف پرانے گھاٹ پر لنگر انداز ہوگی۔ اس لانچ پر ہی تم لوگوں کو معاوضہ ادا کرنے کے بعد رخصت کردیا جائے گا اور اس کے بعد تم سب لوگ ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جاؤ گے۔ اب میں مصدق اور فریدون سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ انہیں اپنے کام میں اب تک کس حد تک کامیابی ہوئی ہے؟''

''اگر ڈائمنڈ کمپنی کی عمارت میں رکھی ہوئی تجوری رائل کی چونسٹھ ماڈل کی ہے تو اس کے بارے میں شاید تمہیں مکمل معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔'' مصدق نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' پروفیسر نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ درست ہے کہ اس تجوری کی ایک ہی چابی ہوتی ہے جو دو حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ یعنی اس کا آگے کا دندانے دار حصہ سلاخ کی جھری سے الگ کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا دوسرا تالا ایک ڈائل کی مدد سے ہی کھولا جاسکتا ہے۔ ہر تجوری کے ڈائل کا نظام خاصا پیچیدہ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں دوسرا تالا کھولنے کے لیے خاصے وقت کی ضرورت ہوگی۔ ظاہر ہے ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا کہ ہم اطمینان سے وہاں بیٹھ کر اس پر کام کرسکیں۔ اس کے لیے ہمیں تھوڑا سا رسک لینا پڑے گا۔''

''کس قسم کا رسک؟'' پروفیسر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں کوشش کررہا ہوں کہ لانچ پر موجود تجوری ہی کی مدد سے ڈائل کا میکنزم سمجھنے میں کامیاب ہوسکوں۔ دوسری

صورت میں ہمیں تالا توڑنے کے لیے ایک ہلکا سا دھماکا کرنا پڑے گا۔'' مصدق نے بتایا۔

''یہ خطرناک بات ہوگی۔ دھماکے کی آواز سن کر محافظوں کو وہاں پہنچنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔'' پروفیسر نے اعتراض کیا۔

''تم نے بتایا تھا کہ عمارت کے سامنے والی سڑک پر جشن منانے والوں کا ہنگامہ ہوتا ہے اگر اس دوران وقفے وقفے سے آتش بازی میں استعمال ہونے والے گولے بھی چھوڑے جاتے رہیں تو اسٹرونگ روم میں ہونے والے معمولی سے دھماکے کی آواز کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔ کیا تم آتش بازی کا انتظام کر سکتے ہو؟'' مصدق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں، یہ انتظام بھی ہوسکتا ہے۔'' پروفیسر نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا پھر فریدون کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''الارم کے سلسلے میں کیا رہا؟''

''سیف سے منسلک الارم کو ناکارہ بنانا زیادہ دشوار نہیں ہوگا لیکن سیف کے سامنے راہداری کی دونوں دیواروں میں نصب خفیہ الارم میرے لیے ایک پیچیدہ مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ وہ الارم صرف آٹھ فٹ کی بلندی تک مؤثر ہیں۔ میرا مطلب ہے آٹھ فٹ سے اوپر اگر کوئی چیز ان کے سامنے سے گزاری جائے تو وہ کام نہیں کرتے۔'' فریدون نے کہا۔

''ہاں، یہ درست ہے کہ دیواروں میں نصب وہ خفیہ الارم آٹھ فٹ کی بلندی سے اوپر کام نہیں کرتے۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے۔ الارم کے سلسلے میں اب کسی پریشانی کی ضرورت نہیں۔ سمجھو یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا۔'' فریدون نے پُریقین لہجے میں کہا۔

''اردشیر تم!'' پروفیسر، اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''اس مشن میں تمہارا کام سب سے اہم اور وقت طلب ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم کل ہی سے اپنے پروگرام پر عمل شروع کردو۔ میری اطلاع اور مشاہدے کے مطابق وہ خاصی سرد مزاج ہے۔ اس پر قابو پانے کے لیے تمہیں خاصی محنت کرنی پڑے گی۔''

''مطمئن رہو پروفیسر۔'' اردشیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے اپنے مقصد میں کبھی ناکامی نہیں ہوئی۔''

''اوکے دوستو!'' پروفیسر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب ہماری ملاقات اس وقت ہوگی جب تم لوگ اپنا مشن پایۂ تکمیل تک پہنچا دو گے۔ لیکن...... ایک بات میں تم سب کو ذہن نشین کروا دینا چاہتا ہوں کہ غداری یا بددیانتی کی صورت میں تمہیں دنیا کے کسی گوشے میں بھی مجھ سے پناہ نہیں ملے گی۔ یہ آخری بات تھی جو میں تم لوگوں سے کہنا چاہتا تھا۔''

پروفیسر کیبن سے باہر جاچکا تھا۔ وہ چاروں چند لمحوں تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر ایک ایک کر کے وہ بھی اس کیبن سے باہر آ گئے۔

☆☆☆

مارچ کی اٹھارہ تاریخ تھی۔ ڈائمنڈ کمپنی کا دفتر بند ہو رہا تھا۔ گیٹ سے ملحق دفتر میں بیٹھی ہوئی مس شہپر نے زیرِ مطالعہ فائل بند کر کے کیبنٹ میں رکھی اور میز کے ایک سرے پر رکھا ہوا ہینڈ بیگ اٹھا کر چیک کرنے لگی پھر مطمئن انداز میں سر ہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جب وہ گیٹ سے باہر نکلی تو دیوار گیر کلاک کی سوئیاں چارج کر ایک منٹ کا وقت بتا رہی تھیں۔ اس کے گیٹ سے باہر آتے ہی اندر کھڑے ہوئے محافظ نے گیٹ بند کر کے تالا لگا دیا اور ٹہلتا ہوا عمارت کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔

مس شہپر نے عمارت کے سامنے کھڑی ہوئی کتھئی رنگ کی کسٹرسوزوکی کار کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرنے لگی۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ کار کو ہلکی رفتار سے چلاتی ہوئی چند گز آگے چوراہے پر پہنچی ہی تھی کہ بائیں طرف سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار اسپورٹس کار کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ اسپورٹس کار رائفل سے نکلی ہوئی گولی کی طرح سیدھی اسی کی طرف آرہی تھی۔ شہپر نے بڑی عجلت سے بریک دبا دیا۔ عین اسی لمحے فضا ٹائروں کی تیز چرچراہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اسپورٹس کار کے ڈرائیور نے بھی شاید پوری قوت سے بریک پیڈل دبایا تھا لیکن اس کے باوجود اسپورٹس کار ایک ہلکے سے دھماکے کی آواز سے مس شہپر کی کار کے اگلے حصے سے ٹکرا گئی۔ گاڑی کی باڈی کا کچھ حصہ پچک جانے کے علاوہ اس طرف کے ہیڈ لیمپ کا شیشہ بھی چکناچور ہوگیا تھا۔

تصادم ہوتے ہی لوگ اس طرف دوڑ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے متصادم کاروں کے چاروں طرف اچھا خاصا ہجوم لگ گیا۔ شہپر نے نیچے اتر کر اپنی کار کے نقصان کا جائزہ لیا اور پھر اسپورٹس کار کے ڈرائیور پر برس پڑی جو بظاہر گھبرائے ہوئے انداز میں دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر وہ نیچے اترنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

''میڈم، قصور آپ کا ہے۔ آپ نے چوراہے کے عین وسط میں گاڑی کھڑی کیوں کی تھی۔'' اسپورٹس کار سے اترنے والا خوبرو نوجوان ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے بولا۔ غالباً اسے کار کے نقصان کی زیادہ فکر نہیں تھی۔

''قصور میرا ہے؟'' شہپر چیخی۔ ''اگر میں بروقت بریک نہ لگاتی تو شاید تم کار کے ساتھ مجھے بھی کچل چکے ہوتے۔''

''قصور تمہارا ہے مسٹر! تمہیں اتنی تیز رفتاری سے گاڑی نہیں چلانا چاہیے تھی۔'' مجمع میں سے ایک شخص نے شہپر کی حمایت کی۔ ایسے موقعوں پر یوں بھی لوگ عورتوں کی حمایت میں ہی بولتے ہیں۔

''کوئی نو دولتیا ہے۔ حرام کی دولت ہاتھ لگ گئی ہو گی اس لیے تو کسی بات کی پروا نہیں۔'' ایک اور دل جلے کی آواز سنائی دی۔

''مجھے یقین ہے کہ اس ہجوم میں کوئی بھی میری حمایت نہیں کرے گا۔'' خوبرو نوجوان شہپر کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''بہرحال، میں آپ کا نقصان پورا کرنے کو تیار ہوں۔ اپنا ایڈریس دے دیجیے، میں چیک بھجوا دوں گا۔''

شہپر چند لمحے گھورتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی پھر کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر اپنی گاڑی میں سے پرس اٹھایا اور اس میں سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''شکریہ، آج شام یا کل صبح بینک کھلنے سے پہلے پہلے آپ کو چیک مل جائے گا۔ اگر اس حالت میں گاڑی چلانے سے خوف زدہ ہوں تو میں آپ کو ڈراپ کر سکتا ہوں۔'' نوجوان نے پیشکش کی۔

شہپر اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی اور انجن اسٹارٹ کر کے ہارن بجاتی ہوئی اسے ریورس میں لینے لگی۔ چند گز پیچھے جانے کے بعد اس نے گیئر بدلا اور گاڑی کو سائڈ میں لیتی ہوئی اسپورٹس کار کے سامنے سے نکال لے گئی۔ ہجوم چھٹنے لگا۔ نوجوان کار کی باڈی سے ٹیک لگائے اس کی گاڑی کو جاتے دیکھتا رہا۔

''وہ جا چکی صاحب! اب آپ بھی تشریف لے جائیے۔ ٹریفک جام ہو رہا ہے۔'' قریب سے گزرتے ہوئے ایک آدمی نے آواز کسی۔

نوجوان نے پہلے اس شخص کی طرف دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑے ہوئے کارڈ پر نظر ڈالتا ہوا کار کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے کارڈ کو احتیاط سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور انجن اسٹارٹ کر کے کار آگے بڑھا دی۔

ڈائمنڈ کمپنی کے ریکارڈ کے مطابق شہپر کا تعلق تہران کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ وہ ابھی چند برس ہی کی تھی کہ اس کے والدین ایک ہوائی حادثے کا شکار ہو گئے۔ اس کے والد کے ایک دوست نے اس کی پرورش کی جسے وہ انکل کہتی تھی۔

گریجویشن کرنے کے بعد اس نے ایک انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا جہاں سیکریٹری شپ کی تربیت دی جاتی تھی۔ پھر کورس مکمل کرتے ہی اسے انکل کی سفارش سے ڈائمنڈ کمپنی کے صدر دفتر میں سیکریٹری کی ملازمت مل گئی۔

اب تک کی ملازمت کے دوران شہپر نے بہترین کارکردگی اور دیانت کا ثبوت دیا تھا۔ اتفاق سے ان دنوں کمپنی کی بندرعباس برانچ میں انچارج کی جگہ خالی تھی۔ شہپر کو اس دفتر کی انچارج بنا کر بھیج دیا گیا۔ یہاں آئے ہوئے اسے سات برس ہوئے تھے۔ کمپنی اس کے کام سے مطمئن تھی۔

بزر کی آواز نے شہپر کو چونکا دیا۔ چائے وہ پی چکی تھی۔ وہ اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے اٹھ کر دروازے کی طرف چل دی۔ دروازہ کھولا تو باہر وہی خوبرو نوجوان کھڑا تھا جس نے اسپورٹس کار سے اس کی گاڑی کو ٹکر ماری تھی۔

''فرمایئے!'' شہپر نے خشک لہجے میں کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ چیک پیش کرنے آیا ہوں۔'' نوجوان نے کہتے ہوئے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں تازہ پھولوں کا ایک گلدستہ بھی نظر آ رہا تھا۔

شہپر نے لفافہ لے کر کھولا۔ اس میں سے برآمد ہونے والے چیک پر پانچ ہزار کے ہندسے کو دیکھ کر اس نے مطمئن انداز میں چیک کو دوبارہ لفافے میں رکھ لیا۔

''شکریہ مسٹر! ویسے مجھے امید نہیں تھی کہ تم اس قدر شرافت کا ثبوت دو گے۔''

''اپنی شرافت کا ایک اور ثبوت بھی پیش کرنا چاہتا ہوں خانم شہپر۔'' نوجوان نے کہتے ہوئے گلدستہ آگے بڑھا دیا۔

''یہ ثبوت اپنے پاس ہی رکھو۔ میں بے تکلفی پسند نہیں کرتی۔'' شہپر کہتے ہوئے دروازہ بند کرنے لگی۔ اس نوجوان نے پیر پھنسا کر دروازہ روکنے کی کوشش کی مگر شہپر نے زوردار دھکے سے دروازہ بند کر دیا اور بولٹ چڑھا کر

دوبارہ ڈرائنگ روم میں آگئی۔

نوجوان کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر دروازے کے قریب ہی لگے ہوئے ایک ہک میں گلدستہ لٹکا کر زینے کی طرف بڑھ گیا۔

شہپر صبح دفتر جانے کے لیے گھر سے باہر نکلی تو دروازے کے قریب ہک میں ٹنگا ہوا گلدستہ دیکھ کر چونک سی گئی۔ اس نے گلدستہ اٹھا کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا اور پرس سنبھالتی ہوئی زینے کی طرف بڑھ گئی۔ ڈائمنڈ کمپنی کی عمارت والے چوراہے سے گاڑی گھماتے ہوئے اس کی نظر بائیں طرف اٹھ گئی جہاں موڑ پر وہی نوجوان کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی طرف توجہ دیے بغیر شہپر نے آگے جا کر گاڑی روک لی اور نیچے اُتر کر عمارت کے دروازے کی طرف بڑھ گئی جہاں سلاخوں والے دروازے کے اندر کھڑا محافظ اسے آتے دیکھ کر دروازے کا تالا کھول رہا تھا۔ دروازے میں داخل ہونے سے پہلے شہپر نے غیر ارادی طور پر پیچھے گھوم کر دیکھا۔ وہ عمارت کے موڑ پر کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بے پروائی کے انداز میں سر جھٹکتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔

لنچ کا وقفہ ہوتے ہی شہپر نے کام چھوڑ دیا اور اپنے ایک ماتحت کو کچھ ہدایات دے کر پرس سنبھالتی ہوئی اٹھ گئی۔ لنچ کے لیے اسے عمارت کی عقبی سڑک پر واقع ایک ریسٹورنٹ میں جانا پڑتا تھا۔ وہ دروازے سے نکل کر عمارت کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی جیسے ہی موڑ گھومی، اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔

”ہیلو خانم شہپر!“ وہی نوجوان اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”کیا بات ہے۔ تم میرے پیچھے کیوں لگ گئے ہو؟“ شہپر نے اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

”کریش اینڈ کیری میں لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ نوجوان نے بدستور ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”شٹ اپ! میں اجنبیوں سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتی۔“ شہپر نے اسے ڈانٹ دیا۔

”یہ ہماری تیسری ملاقات ہے اور میرا خیال ہے کہ اب تک اجنبیت ختم ہوجانی چاہیے۔“

”شٹ اپ۔“ شہپر اسے گھورتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس مرتبہ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

وہ لنچ کر کے واپس آئی تو وہ نوجوان دکھائی نہیں دیا۔

شام چار بجے جب وہ دفتر سے نکل کر گھر کے لیے روانہ ہوئی تو اس نے سفید اسپورٹس کو سڑک کے موڑ پر کھڑے دیکھا جس کے اسٹیئرنگ پر وہی نوجوان بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

گھر پہنچے..... چند منٹ ہی گزرے تھے کہ بزر کی آواز سن کر اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے وہی نوجوان کھڑا تھا۔

”یہ آپ کے لیے ہے خانم شہپر۔“ نوجوان نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تازہ پھولوں کا خوب صورت سا گلدستہ اس کی

طرف بڑھا دیا۔

شہپر چند لمحے ناگواری نگاہوں سے نوجوان کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے غیر ارادی طور پر ہاتھ بڑھا کر گلدستہ لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی نوجوان نے قدم بڑھا کر اندر داخل ہونا چاہا لیکن شہپر نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائنگ روم میں آکر شہپر عجیب سی نگاہوں سے گلدستے کی طرف دیکھنے لگی پھر اس کی نظر پھولوں میں اٹکے ہوئے ایک کارڈ پر جم گئیں۔ اس نے کارڈ نکال لیا۔ کارڈ ایک طرف سے سادہ تھا جبکہ دوسری طرف پنسل سے ایک مختصر سی تحریر تھی۔

خانم شہپر!

مجھے غلط مت سمجھیے۔ میں اس شہر میں قطعی اجنبی ہوں۔ ایک حادثے نے آپ سے ملاقات کروادی۔ چند روز یہاں رہنے کا پروگرام ہے۔ اس عرصے میں آپ کی دوستی کا خواہاں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی معیت میں خوشگوار وقت گزرے گا۔''

اس مختصر سی تحریر کے آخر میں فریدون کا نام لکھا ہوا تھا۔

دو دن تک وہ خوبرو نوجوان اس کے گرد منڈلاتا رہا۔ شہپر نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھی ایک ہی ڈھیٹ ثابت ہوا تھا۔ سترہ تاریخ کی صبح کو جب وہ دفتر جانے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ سے نکلی تو وہ نوجوان عمارت کے صدر دروازے پر کھڑا تھا۔ اس وقت آس پاس کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ شہپر جیسے ہی اپنی گاڑی کی طرف بڑھی نوجوان نے اس کا راستہ روک لیا۔

''اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا خانم شہپر۔''

''تو کیا کرو گے؟'' شہپر نے اسے گھورا۔

''دوستی کی ایک اور درخواست...... اب اگر آپ نے میری یہ درخواست مسترد کر دی تو میں آپ کے دفتر کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ جاؤں گا اور جب تک آپ میری دوستی قبول نہیں کریں گی اس وقت تک وہاں سے نہیں ہلوں گا۔''

''میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ لیکن خدا کے لیے مجھے بدنام کرنے کی کوشش مت کرو۔'' شہپر ملتجی لہجے میں بولی۔

''میں صرف آج کا دن یہاں ہوں۔ کل صبح ہی چلا جاؤں گا۔ اگر آپ آج کا دن میرے ساتھ گزارنے کا وعدہ کریں تو بات بن سکتی ہے۔'' نوجوان کے اس مطالبے پر شہپر چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے۔ چار بجے دفتر سے چھٹی کے بعد میں تم سے ملوں گی۔''

''اس سے پہلے لنچ بھی میرے ساتھ کرنا ہوگا۔ میں سلور سینڈ ریسٹورنٹ کے کیبن نمبر تین میں انتظار کروں گا۔ لنچ پر ہی ہم شام کی تفریح کا پروگرام بنائیں گے۔'' نوجوان کہتے ہوئے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

شہپر چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر سر جھٹکتے ہوئے اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گیارہ بجے حسب معمول کڑے حفاظتی انتظامات میں بکتر بند گاڑی پہنچ گئی۔ چند سیکنڈ بعد گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا اور تین آدمی نیچے اترے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں اور ایک کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بریف کیس۔ ہتھکڑی کے ایک جوڑے نے بریف کیس کے ہینڈل اور اس شخص کی کلائی کو جکڑ رکھا تھا۔ شہپر کے دفتر میں پہنچ کر اس کے ساتھ آنے والے ایک محافظ نے جیب سے چابی نکال کر ہتھکڑی کھولی۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی اس شخص نے بریف کیس کھول دیا جس کے اندر ایک اور بکس رکھا ہوا تھا۔ کھڑکی کی راہ سے آنے والی دھوپ کی کرن میں بکس کے اندر رکھے ہوئے ہیرے اس طرح جگمگا اٹھے کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

بکس دوبارہ بند کر دیا گیا اور پھر محافظوں کی معیت میں بریف کیس اسٹرونگ روم میں پہنچا دیا گیا۔ شہپر نے تجوری کی چابی کا دندانے دار حصہ پرس میں سے نکال کر اس شخص کی طرف بڑھا دیا جو بریف کیس لے کر آیا تھا۔ اس نے تجوری کی چابی کی سلاخ باہر نکالی۔ دندانے دار حصہ اس میں پھنسایا اور چابی گھما کر دوسرا ڈائل ایک مخصوص نمبر تک گھما دیا۔ بریف کیس اندر رکھنے کے بعد اسی طریق کار پر عمل کرتے ہوئے تجوری بند کر کے اس نے چابی کا دندانے دار حصہ الگ کر کے شہپر کے حوالے کر دیا جسے اس نے پرس میں محفوظ کر لیا۔ محافظوں نے اسٹرونگ روم کا دروازہ بند کیا اور وہ سب لوگ دوبارہ دفتر میں آگئے۔

دوپہر ایک بجے شہپر دفتر سے نکل کر لنچ کے لیے جب سلور سینڈ ریسٹورنٹ پہنچی تو وہ نوجوان کیبن نمبر تین میں اس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھ کر شہپر کے ہونٹوں پر پہلی بار خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ جواباً وہ نوجوان بھی مسکرا دیا۔

کھانے کے بعد نوجوان نے شہپر کو اس وقت جانے دیا جب تک کہ اس سے شام کی تفریح کا وعدہ نہ لے لیا۔ اور پھر شام کو دفتر سے نکلتے ہی نوجوان نے اسے جھپٹ لیا اور اسے گھر جانے کا موقع دیے بغیر اپنی اسپورٹس کار میں بٹھا کر ساحل کی طرف روانہ ہوگیا۔ ساحل کے ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں شہپر نے جب اپنی کہانی سنائی تو وہ نوجوان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ رات آٹھ بجے جب وہ نوجوان شہپر کو سی آف کر کے رخصت ہوا تو وہ کتنی دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ اس کے خیال میں یہ نوجوان بُرا نہیں تھا۔

☆☆☆

پرانے ماڈل کی وہ کار ڈائمنڈ کمپنی کی عمارت سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر اس طرح رکی کہ سڑک پر گٹر کا ڈھکنا اس کے نیچے چھپ گیا۔ اسٹیئرنگ پر محسن بیٹھا ہوا تھا۔ انجن بند کرنے کے بعد بھی وہ چند لمحوں تک اپنی سیٹ پر ہی بیٹھا رہا پھر دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا اور کار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا جسے اس نے اس طرح اپنے سامنے پھیلا لیا جیسے کوئی بہت دلچسپ خبر یا مضمون پڑھ رہا ہو، لیکن دراصل اس کی نظریں سرچ لائٹس کی طرح چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔

سڑک اس وقت دور تک ویران تھی۔ اس نے ایک ہاتھ کی انگلی سے پچھلی کھڑکی کا شیشہ بجایا۔ پچھلی سیٹ پر جھک کر بیٹھے ہوئے فریدون نے اوپر جھانک کر دیکھا اور پھر محسن کا اشارہ پا کر دوبارہ نیچے جھک گیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اس نے ایک طرف سمٹ کر سیٹ اوپر اٹھادی۔ سیٹ کے نیچے فرش نہیں تھا۔ نیچے سڑک اور گٹر کا ڈھکنا نظر آرہا تھا۔ فریدون نے جھک کر ڈھکنا ایک طرف ہٹادیا اور ایک تھیلا سنبھال کر گٹر کے اندر سلاخوں والی سیڑھیوں پر اُتر گیا۔ چوتھی سیڑھی پر رک کر اس نے ڈھکنا دوبارہ اس کی جگہ پر رکھا اور تھیلا سنبھال کر نیچے اتر گیا۔

یہ ایک کشادہ اور طویل سرنگ تھی جس کی چھت اور دیواروں پر موٹے موٹے کیبل بچھے ہوئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف واقع عمارتوں کو بجلی کے کنکشن انہی تاروں سے دیے گئے تھے۔ جا بجا موٹے موٹے تار ان کیبلز سے الگ ہوتے نظر آرہے تھے۔ فریدون تھیلا سنبھالے سرنگ میں تقریباً سو قدم چلنے کے بعد رک گیا۔ وہ چند لمحے چھت اور دیواروں میں غائب ہوتے ہوئے تاروں کا جائزہ لیتا رہا پھر دائیں طرف کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے ایک پائپ

تاوان

سردار جی کی بیوی کو اغوا کرلیا گیا۔ اغوا کاروں نے ان کو بیوی کی ایک انگلی کاٹ کر بیس لاکھ روپے کے مطالبے کے ساتھ بھیجی۔ نیچے فون نمبر بھی دیا تھا۔ انہوں نے انگلی کا جائزہ لے کر فوراً فون ملایا اور بگڑ کر بولے۔ ''یہ انگلی تو کسی کی بھی ہوسکتی ہے۔ اس کی منڈی کاٹ کے بھیجو تو پیسے دے دوں گا۔''

کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ پائپ تقریباً چھ انچ قطر کا تھا جو سرنگ کی چھت میں داخل ہو کر اوپر کسی جگہ غائب ہوگیا تھا۔ یہی وہ پائپ تھا جس کے ذریعے ڈائمنڈ کمپنی کی عمارت کو بجلی کا کنکشن مہیا کیا گیا تھا۔

فریدون نے اپنا تھیلا کھولا اور اس میں سے مختلف قسم کے اوزار نکالنے لگا۔ ایک الیکٹرک آری تھی جس سے ایک لمبا تار منسلک تھا۔ اس نے کیبل کا ایک تار چھیل کر آری کے تار کو اس سے جوڑا اور آری کی مدد سے پائپ کاٹنے لگا۔ سرنگ میں گرر گرر کی آواز گونجنے لگی۔ لیکن فریدون کو یقین تھا کہ یہ آواز سرنگ سے باہر نہیں جارہی ہوگی اس لیے وہ کسی مداخلت کے خدشے کے بغیر اطمینان سے اپنے کام میں مصروف رہا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد پائپ کا چھ انچ ٹکڑا الگ ہو گیا۔ اس نے اس ٹکڑے کو باہر کھینچ لیا۔ پائپ کے اندر اوپر جانے والے تار خاصے ڈھیلے تھے جس کی وجہ سے پائپ کا ٹکڑا باہر نکالنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے ٹکڑا دوبارہ اس جگہ پھنسا دیا اور تھیلے میں اوزار سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

گٹر کا ڈھکنا ہٹا کر پہلے اس نے تھیلا گاڑی کے اندر پھینکا اور پھر خود اوپر آکر ڈھکنا بند کردیا۔ سیٹ درست کر کے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے اس نے کھڑکی کا شیشہ بجادیا۔ کار کے باہر کھڑے ہوئے محسن نے اخبار بند کر کے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

''کیا رہا؟''

''کام ہوگیا۔ پائپ اس جگہ پھنسا دیا ہے۔ تمہیں اسے باہر نکالنے میں دشواری نہیں ہوگی۔'' فریدون نے جواب دیا۔

''اب معلوم نہیں اردشیر بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہوا یا نہیں؟'' محسن خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''یہ تو وہاں پہنچ کر ہی معلوم ہوگا۔'' فریدون نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے جواب دیا۔

محسن نے مزید کچھ نہیں کہا اور گاڑی کو مختلف سڑکوں پر گھماتا رہا۔ بالآخر شہر بار بر کے قریب اس نے ایک گودام کے سامنے گاڑی روک لی اور دونوں نیچے اتر آئے۔ جب وہ لانچ پر پہنچے تو مصدق موجود تھا لیکن اردشیر ابھی تک نہیں آیا تھا۔

اردشیر تقریباً ایک گھنٹے بعد آیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یعنی وہ کامیاب لوٹا تھا۔ سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے محسن نے اسے دیکھ کر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''اس وقت نو بجے ہیں۔ شہر کی سڑکوں پر جشن کے ہنگامے شروع ہو چکے ہیں۔ ہم بھی ساڑھے دس بجے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیں گے۔ میں ڈائمنڈ کمپنی کے سامنے اسکول کی عمارت کے گیٹ پر تمہارا انتظار کروں گا، تم ٹھیک گیارہ بجے چابی مجھے پہنچاؤ گے۔ جو پندرہ منٹ بعد تمہیں واپس پہنچا دی جائے گی۔ ساری کارروائی میں ایک ایک لمحے کا خیال رکھا جائے گا۔ شہپر کے ساتھ ڈنر کے بعد تم کہیں اور جانے کے بجائے اس کے گھر جاؤ گے۔ چابی واپس تمہیں وہیں پہنچائی جائے گی۔ اب میرا خیال ہے کہ تمہیں رخصت ہو جانا چاہیے۔''

اردشیر کے رخصت ہوتے ہی وہ لوگ بھی تیاری کرنے لگے۔ دو بڑے بکس تیار کیے گئے جن میں مختلف نوعیت کے آلات بھرے ہوئے تھے۔ ایک بکس میں بڑی سی ریل بھی تھی جس پر چھوٹے تاروں سے بٹے ہوئے تقریباً نصف انچ موٹے تار لپٹے ہوئے تھے۔ اس تار کے سرے پر ایک آہنی آنکڑا بھی لگا ہوا تھا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے انہوں نے اپنا سامان لانچ سے نکال کر ڈیک پر کھڑی ہوئی کار پر لادا اور شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسٹیئرنگ وہیل کے سامنے محسن بیٹھا ہوا تھا۔ شہر میں جشن نوروز کے ہنگامے تھے سڑکوں پر لوگوں کی مختلف ٹولیاں کھیل تماشے پیش کر رہی تھیں۔ ہر سڑک پر اتنا ہجوم تھا کہ پیدل چلنے کے لیے بھی ایک دوسرے کو دھکے دینے پڑتے تھے۔ لیکن مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے انہیں اسکول کے عقبی دروازے تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

اسکول کی عمارت میں داخل ہوتے ہی انہوں نے دونوں بھاری بکس دوسری منزل کے اس کمرے میں پہنچا دیے جس کی کھڑکیاں سڑک کے رخ پر تھیں۔ یہاں سے ڈائمنڈ کمپنی کی عمارت کی دوسری منزل بالکل سامنے تھی۔ ڈائمنڈ کمپنی کی عمارت کی ہر منزل پر ایک لمبی بالکونی تھی جس کی بیرونی دیوار تقریباً چار فٹ اونچی تھی جس پر کنگورے سے بنے ہوئے تھے۔

محسن نے ایک بکس کھول لیا اور مصدق کی مدد سے اس میں سے مختلف چیزیں نکال نکال کر باہر رکھنے لگا۔ ان میں بجلی کے کچھ تار بھی تھے۔ ان تاروں کو جوڑ کر اس نے ایک سرا دیوار میں نصب ساکٹ سے ملا دیا۔ اور بٹے ہوئے تاروں والی ریل نکال کر کھڑکی کی کارنس پر رکھ دی۔ ریل کے اندر بھی ایک چھوٹی الیکٹرک موٹر لگی ہوئی تھی جس کے تار اس نے دوسرے تار سے ملا دیے۔ اس کے بعد اس نے دوسرے بکس کو کھولا اور وہ تینوں اس میں رکھے ہوئے سامان کو چیک کرنے لگے۔

گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب محسن کمرے سے باہر نکل کر نیچے آ گیا۔ سڑک پر ہجوم تھا۔ ہزاروں لوگ تھے۔ شعبدے باز اور رقاص اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ سڑک پر دونوں طرف بوائے اسکاؤٹس نے رسے تان رکھے تھے تاکہ فٹ پاتھ کے لوگ سڑک پر نہ آسکیں۔ محسن ایک جگہ رک کر سامنے ڈائمنڈ کمپنی کی عمارت والے فٹ پاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔

☆☆☆

ڈنر کے بعد شہپر نے فلم دیکھنے کی تجویز پیش کی لیکن اردشیر نے بڑی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا اور گھر چلنے کا مشورہ دیا۔ شہپر بڑی تھکن سی محسوس کر رہی تھی۔ چند منٹ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد وہ لباس تبدیل کرنے کا عذر کر کے بیڈ روم میں آ گئی۔ بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ اردشیر نے اسے سلیپنگ سوٹ اٹھا کر باتھ روم میں جاتے دیکھا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر گربہ قدمی سے چلتا ہوا بیڈ روم کے سامنے رک کر اندر جھانکنے لگا۔ ملحق باتھ روم کا دروازہ بند تھا اور اندر سے پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ غالباً وہ منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔

اردشیر بیڈ روم میں آ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ بالآخر شہپر کا پرس اسے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا نظر آ گیا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر پرس کھولا اور ہاتھ اندر ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ اس کی نظریں باتھ روم کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے پرس میں سے چابیوں کا ایک گچھا نکال لیا جس میں تین چار چابیوں کے علاوہ ڈائمنڈ کمپنی کی تجوری کی چابی کا اگلا دندانے دار حصہ بھی موجود تھا۔ اس نے

دندانے دار حصہ نکال کر جیب میں رکھا اور پرس بند کر کے اسی طرح محتاط انداز میں چلتا ہوا دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ابھی وہ صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ شہپر بھی بیڈ روم سے نکل آئی۔ ڈھیلی ڈھالی نائٹی میں وہ کچھ اور بھی حسین لگ رہی تھی۔

باتوں میں اردشیر کو وقت گزرنے کا احساس نہیں رہا تھا۔ جب اس نے گھڑی دیکھی تو گیارہ بج چکے تھے۔ وہ ایک دم گڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا ہوا؟'' شہپر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اوہ، کچھ نہیں۔ میں ذرا سگریٹ لے آؤں۔'' اردشیر کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''ارے رکو۔ باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے میز کی دراز میں سگریٹ کا ایک پیکٹ موجود ہے۔'' شہپر نے اٹھ کر میز کی دراز کھولی اور اس میں سے گولڈ لیف کا پیکٹ نکال کر اردشیر کی طرف بڑھا دیا۔

پیکٹ میں چند سگریٹ تھے۔ اردشیر نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ اس کی نظریں بار بار کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ دائرے میں چکر کاٹتی ہوئی سیکنڈ کی سوئی اس کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔

گیارہ بج کر چار منٹ ہو چکے تھے۔ وہ بار بار بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ اسے چابی ٹھیک گیارہ بجے محسن تک پہنچانی تھی لیکن وہ چار منٹ لیٹ ہو چکا تھا۔ اگر وہ چابی محسن تک نہ پہنچا سکا تو ان کا سارا منصوبہ خاک میں مل جائے گا اور محسن تو واقعی اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ گیارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''منہ کا ذائقہ خراب ہو رہا ہے، میں دوڑ کے کچھ کھانے کو لے آؤں۔''

شہپر نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔ سڑک پر مختلف گروہ اپنے فن کا مظاہرہ پیش کر رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر چلنے کو جگہ نہیں تھی۔ وہ لوگوں کو ادھر ادھر دھکیلتا ہوا ڈائمنڈ کمپنی کی عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ وہاں تک پہنچنے میں مزید ایک منٹ لگ گیا۔ سڑک کے سامنے والے فٹ پاتھ کے ہجوم میں اسے محسن کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے سڑک پر آنا چاہا مگر کانسٹیبل نے روک لیا۔ اردشیر نے محسن کو اشارہ کیا اور چابی اس کی طرف اچھال دی جو فٹ پاتھ کے قریب سڑک پر گری۔ محسن چابی اٹھا کر لوگوں کو دھکیلتا ہوا اسکول کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

چابی ملتے ہی محسن دوسری منزل پر پہنچ گیا جہاں مصدق اور فریدون بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ محسن نے چابی فوراً ہی مصدق کے حوالے کر دی اور وہ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی کارروائی میں مصروف ہو گئے۔ ریل کے تار کا آنکڑا درست کر کے محسن نے موٹر کا بٹن دبا دیا۔ آنکڑا کسی اسپرنگ کی طرح اوپر کو اچھلا اور ریل پر لپٹا ہوا تار کھلتا چلا گیا۔ آنکڑا ڈائمنڈ کمپنی والی عمارت کی بالکونی میں گرا۔ محسن نے دوسرا بٹن دبا کر الٹی ریل چلا دی۔ ڈھیلا تار ریل پر لپٹنے لگا اور آنکڑا بالکونی کی نکڑ میں پھنس گیا۔ موٹا تار اس طرح تن گیا کہ اس پر منوں وزن بھی لاد دیا جائے تو اس میں لچک پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

محسن نے ایک ہک تار میں پھنسا دیا اور مصدق جسم پر ایک بیلٹ باندھنے لگا۔ یہ بیلٹ پتلون کے گیلس کی طرح تھا۔ جس کا ایک حصہ کمر پر لپٹ گیا اور اوپر والے حصے نے اس کے سینے اور گردن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس بیلٹ کے اوپر بھی ایک آہنی ہک لگا ہوا تھا جسے محسن نے تار میں پھنسے ہوئے ہک میں پھنسا دیا۔ مصدق نے کھڑکی پر چڑھ کر نیچے جھانکا۔ فضا میں لوگوں کی آوازوں کے ساتھ ڈھول تاشوں کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں۔ رقص کے ساتھ قومی عظمت کے گیت گائے جا رہے تھے۔ سب لوگ اپنے حال میں مست تھے، کسی کی نظریں اوپر نہیں اٹھ سکتی تھیں۔ مصدق کا اشارہ پا کر محسن نے ایک اور بٹن دبا دیا۔ مصدق نیچے لٹک کر تار میں دوڑتے ہوئے برقی رو کے سہارے دوسری طرف پھسلنے لگا۔

دونوں عمارتوں کے درمیان تقریباً ساٹھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اگرچہ سڑک پر سب لوگ اپنے حال میں مست تھے لیکن اگر کسی کی نظر اوپر اٹھ جاتی تو مصدق فوراً ہی اس کی نظروں میں آ سکتا تھا مگر خیریت گزری۔ کسی نے اوپر نہیں دیکھا۔ مصدق بحفاظت ڈائمنڈ کمپنی والی عمارت کی بالکونی میں پہنچ گیا۔ مصدق کے بعد اسی طریقے پر عمل کرتے ہوئے دوسرے [illegible] بکس اور فریدون کو بھی اس طرف پہنچا دیا گیا۔ وہ دونوں بکس اٹھا کر تیزی سے ایک دروازے میں داخل ہو گئے لیکن انہیں فوراً ہی رک کر ایک اونچی الماری کے پیچھے چھپ جانا پڑا۔

یہ ایک مختصر سا کمرا تھا جس کے اندرونی دروازے کے دوسری طرف راہداری میں بھاری قدموں کی آواز گونج

رہی تھی۔ وہ یقیناً محافظ تھے جو معمول کے مطابق گشت کررہے تھے۔ آواز دروازے کے سامنے سے گزر کر معدوم ہوگئی لیکن تین منٹ بعد پھر سنائی دینے لگی۔ محافظ راؤنڈ مکمل کرکے واپس آرہے تھے۔ جیسے ہی وہ دروازے کے سامنے سے گزرے فریدون الماری کی آڑ سے نکل کر دروازے کے قریب آگیا۔ چند لمحوں تک وہ قدموں کی آواز سنتا رہا پھر دروازہ کھول کر اس میں معمولی سی جھری پیدا کی اور باہر جھانکنے لگا۔ محافظ راہداری کے اختتام پر دائیں جانب لفٹ میں داخل ہورہے تھے۔ لفٹ جیسے ہی نیچے کے لیے روانہ ہوئی فریدون نے مصدق کو اشارہ کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

دونوں کمرے سے باہر آکر تیزی سے دائیں طرف چلنے لگے۔ جہاں راہداری کے اختتام پر ایک بھاری دروازہ نظر آرہا تھا۔ اس دروازے کے قریب پہنچتے ہی مصدق نے بکس کھولا اور اس میں سے مختلف قسم کے آلات نکال کر تالے پر زورآزمائی کرنے لگا۔ دروازہ کھلنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ اس دروازے کے دوسری طرف بھی ایک راہداری تھی جس کی دونوں دیواریں سپاٹ اور اختتام پر ویسا ہی ایک دروازہ نظر آرہا تھا۔

اس دروازے میں تالے سے اوپر ایک میجک آئی تھی۔ مصدق نے اس میجک آئی سے آنکھ لگادی۔ اس دروازے کے دوسری طرف بھی راہداری ہی تھی جس کے اختتام پر وہ عظیم تجوری نظر آرہی تھی جس میں اس وقت دس کروڑ...... کی مالیت کے ہیرے موجود تھے۔ مصدق میجک آئی سے آنکھ ہٹا کر تالے پر جھک گیا۔ اس تالے کو کھولنے میں بھی ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا۔ اندر آتے ہی انہوں نے دروازہ بند کردیا اور وہ دونوں تقریباً پچاس فٹ کے فاصلے پر رکھی ہوئی اس تجوری کو دلچسپ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اس راہداری کی دیواریں بھی بالکل سپاٹ اور چھت تقریباً بارہ فٹ اونچی تھی۔ تجوری سے چار فٹ پہلے دیواروں میں دونوں طرف اسپیکر نصب تھے۔ یہ الارم کے اسپیکر تھے جو نظروں میں تھے۔ خفیہ الارم کہاں نصب تھے، یہ معلوم کرنے کے لیے کئی گھنٹے کا وقت درکار تھا اور ظاہر ہے ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔

فریدون نے بکس کھول کر تین مربع فٹ کا ایک فریم سا نکالا۔ یہ فریم ایسا تھا جیسے نیچے اوپر کئی فریم رکھے گئے ہوں۔ اس سے بجلی کا ایک تار بھی منسلک تھا۔ اس نے یہ تار بکس کے اندر ایک ساکٹ میں فٹ کرکے سوئچ آن کردیا۔ فریم کی تہیں اسپرنگ کی طرح کھلنے لگیں اور اس کا اوپر والا حصہ اوپر اٹھتا چلا گیا۔ ساڑھے آٹھ فٹ کی بلندی پر پہنچ کر فریم رک گیا۔ فریدون اس کے کراس کرتے ہوئے ڈنڈوں پر پیر رکھ کر اوپر چڑھ گیا اور اس کا سب سے اوپر والا حصہ سامنے کی طرف موڑ دیا۔ دوبارہ بٹن دبانے سے فریم کے اوپر کا حصہ اب سامنے کی طرف آگے کو بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ دائیں بائیں کی دیواروں میں نصب الارم سے تقریباً ایک فٹ آگے نکل کر رک گیا۔ یہ فریم دیواروں میں نصب الارم سے تقریباً چھ انچ اوپر تھا۔

فریدون نے بکس میں سے تھیلا نکالا اور اس سیڑھی نما فریم پر چڑھ کر پیٹ کے بل آگے کو رینگنے لگا۔ فریم کے آخری سرے سے تجوری کا فاصلہ تین فٹ کے قریب تھا۔ اس نے فریم پر لیٹے لیٹے تھیلے میں سے ایک آلہ نکال کر تجوری کی طرف بڑھایا۔ یہ الیکٹرک ٹیسٹر تھا جس سے وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تجوری میں برقی رو تو نہیں دوڑ رہی۔ اس بات کا خدشہ بھی تھا کہ ٹیسٹر کو تجوری سے چھوتے ہی الارم نہ بج اٹھیں۔ جیسے جیسے فاصلہ کم ہورہا تھا اس کی پیشانی پسینے سے تر ہوتی جارہی تھی۔

ٹیسٹر تجوری سے ٹچ ہوگیا مگر کوئی خلافِ توقع بات نہیں ہوئی۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد فریدون تجوری پر چڑھ گیا۔ اور دوسری طرف اتر کر مختلف آلات کی مدد سے تجوری کو چیک کرنے لگا۔ بالآخر چند منٹ کی کوشش کے بعد وہ تجوری سے منسلک الارم کو ناکارہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے کچھ دیر بعد مصدق بھی بکس میں سے ایک تھیلا نکال کر سیڑھی والے فریم کی مدد سے تجوری کے پاس پہنچ گیا... پھر دی ہوئی چابی کا دندانہ جیب سے نکال کر اسے سلاخ میں پھنسا کر تجوری کے ہول میں گھمادیا اور دوسرے ڈائل پر کام کرنے لگا۔ چند منٹ تک وہ اس کوشش میں مصروف رہا کہ آلات کی مدد سے دوسرا تالا کھل جائے مگر اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔ بالآخر وہ تھیلے میں سے ننھا سا ڈیٹونیٹر نکال کر ڈائل پر فٹ کرنے لگا۔ اس کے لیے اسے ڈائل میں برقی آلے کی مدد سے ایک چھوٹا سا سوراخ بھی کرنا پڑا تھا۔

تقریباً ایک منٹ کے وقفے کے بعد باہر سے ڈھول تاشوں کے شور کے ساتھ دھماکوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان پر گولے پھٹ رہے

ہوں۔ مصدق نے ڈیٹونیٹر کا فیوز آن کردیا۔ چند سیکنڈ بعد ایک ہلکا سا دھماکا ہوا۔ تجوری کے اندر ہونے والے دھماکے کی یہ آواز فضا میں ہونے والے دھماکوں کی آواز میں دب کر رہ گئی تھی۔

فریدون نے تجوری کے دونوں ڈائل گھما کر دیکھے۔ تجوری کھل چکی تھی۔ اس نے چابی نکال کر اس کا دندانے والا حصہ الگ کیا اور دیوار کے قریب پائپ کا ڈھکنا نکال کر چابی پائپ میں ڈال دی۔

اس ساری کارروائی میں اٹھائیس منٹ ہوچکے تھے۔ پروگرام کے مطابق اب صرف دو منٹ رہ گئے تھے۔ اور انہیں اس مختصر سے وقت کے اندر اندر یہاں سے نکل جانا تھا۔ مصدق نے آگے بڑھ کر تجوری کا دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی وہ بریف کیس رکھا تھا جس میں دو کروڑ روپے مالیت کے ہیرے موجود تھے۔ اس نے بریف کیس نکال کر دروازہ بند کیا اور ڈائل کو اس طرح سیٹ کردیا کہ پہلی نظر میں معلوم نہ ہوسکے۔ پھر دونوں نے اپنے اوزار سنبھالے اور تجوری پر چڑھ کر فریم پر پہنچ گئے اور آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف سرکنے لگے۔

ابھی وہ فریم سے نیچے اترے ہی تھے کہ دروازے کے دوسری طرف سے بھاری قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ ان دونوں کے دل اچھل کر حلق میں آگئے۔ دونوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ فریدون نے بڑی پھرتی سے فریم کا ایک بٹن دبا دیا۔ فریم کا آگے کو بڑھا ہوا حصہ سمٹنے لگا۔ قدموں کی آواز قریب آتی جارہی تھی۔ ان دونوں نے فریم کو کھینچ کر دروازے کے ساتھ لگا کر اس طرح کھڑا کردیا کہ اگر باہر سے میجک آئی سے دیکھا بھی جائے تو فریم راستے کی رکاوٹ نہ بنے۔

قدموں کی آواز دروازے پر آکر رک گئی۔ وہ دونوں بھی دروازے کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنے سانس تک روک رکھے تھے۔ جسم پسینے سے تر ہورہے تھے۔ چند لمحے گزر گئے اور یہ چند لمحے بھی صدیوں پر بھاری محسوس ہورہے تھے۔ بالآخر واپس جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ محافظ اپنا راؤنڈ ختم کر کے نیچے جاچکے ہوں گے، وہ دونوں بھاری بکس اٹھا کر باہر آگئے۔ ہیروں والا بریف کیس اس بکس میں موجود تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ بالکونی کی گگر کے قریب کھڑے اسی طریقے سے واپس جانے کی تیاری کررہے تھے جس طریقے سے یہاں تک آئے تھے۔

☆☆☆

محسن گٹر نما سرنگ میں پائپ کے پاس بیٹھا اوپر سے چابی پھینکے جانے کا منتظر تھا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چابی جیسے ہی نیچے گری وہ اسے اٹھا کر باہر نکلنے والے راستے کی طرف دوڑ پڑا۔ گٹر سے باہر نکلنے میں بھی اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ لوگوں کو ادھر ادھر دھکیلتا ہوا وہ سڑک کے کنارے پر آگیا۔ دوسرے فٹ پاتھ پر اردشیر موجود تھا۔ محسن نے چابی اس کی طرف پھینکی اور اسکول کی عمارت میں داخل ہوگیا۔

چابی واپس ملتے ہی اردشیر، شہپر کے فلیٹ کی طرف دوڑ پڑا۔ گلی کے کونے پر واقع کیبن سے اس نے چپس کے دو پیکٹ خریدے اور عمارت میں داخل ہوگیا۔ شہپر صوفے پر بیٹھی بے چینی سے اس کا انتظار کررہی تھی۔

''کہاں رہ گئے تھے؟'' اس نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

''سڑک پر لوک ڈانس ہورہا تھا۔ میں وہ دیکھنے کے لیے رک گیا تھا۔ چپس کھاؤ گی تمہارے لیے بھی لے آیا ہوں۔'' اردشیر نے اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں، میرا چائے کا موڈ ہورہا ہے۔ میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔''

شہپر چائے بنانے کے لیے جیسے ہی کچن میں گئی اردشیر اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے بیڈروم میں پہنچ گیا۔ اس نے میز پر رکھا ہوا پرس اٹھا کر کھولا لیکن یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ اس میں چابیوں کے دو گچھے تھے۔ ہر گچھے میں تین چار چابیاں تھیں۔ وہ الجھ کر رہ گیا کہ اس نے چابی کون سے گچھے میں سے نکالی تھی۔ بالآخر اندازے کی بنا پر اس نے ایک گچھے میں چابی ڈال دی اور دوبارہ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد شہپر چائے لے کر آگئی۔

چائے پینے کے بعد اردشیر زیادہ دیر تک نہیں رکا۔ وہ دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے تیزی سے باہر نکل گیا۔ یہ بات تو صرف وہی جانتا تھا شہپر اب اسے کبھی نہ دیکھ سکے گی۔

منصوبے کے مطابق ایک مقررہ مقام تک پہنچنے میں

اسے صرف تین منٹ لگے۔ سنسان سڑک پر درختوں کے سائے میں سیاہ رنگ کی ایک گاڑی کھڑی تھی اور اس کے تینوں ساتھی اس میں موجود تھے۔ مصدق اور فریدون پچھلی سیٹ پر اور محسن اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ اردشیر کے بیٹھتے ہی محسن نے گاڑی آگے بڑھا دی اور ایکسلیریٹر پر پیر کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔

☆☆☆

اردشیر کے جانے کے کچھ دیر بعد بھی شہپر اس جگہ پر بیٹھی اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کے خیال میں وہ کوئی برا آدمی نہیں تھا۔ وہ اسے پسند بھی کرنے لگی تھی لیکن وہ اتنی احمق بھی نہیں تھی کہ اتنی جلد کسی سے توقعات وابستہ کر لیتی۔ وہ ان خیالات کو جھٹک کر جماہی لیتی ہوئی اٹھ کر بیڈ روم میں آگئی۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے نجانے کیا چیز نکالنے کے لیے اس نے پرس کھولا۔ اس چیز کی تلاش میں اس کی نظریں چابیوں کے دونوں گچھوں پر جم گئیں۔ دفتر کی تجوری کی چابی اس گچھے میں نہیں تھی جس میں وہ رکھا کرتی تھی۔ اس نے وہ گچھا باہر نکال لیا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی اور ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔

''یس!''

''خانم شہپر آپ فوراً دفتر پہنچ جائیے۔ گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' ریسیور پر ایک محافظ کی جانی پہچانی آواز ابھری۔

''ابھی آرہی ہوں۔'' شہپر نے ریسیور رکھ دیا۔ اس نے یہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ دفتر میں کیا گڑبڑ ہوئی تھی۔

چند منٹ بعد جب وہ دفتر پہنچی تو تمام محافظوں کے علاوہ اس کے تینوں ماتحت بھی موجود تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ سب بڑی تجوری کے سامنے کھڑے تھے جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور دو کروڑ روپے مالیت کے ہیروں والا وہ بریف کیس غائب تھا جو آج صبح ہی اس کی نگرانی میں وہاں رکھا گیا تھا۔

☆☆☆

''اے! اس طرف کہاں جا رہے ہو۔ پروفیسر تو لانچ پر ہمارا منتظر ہوگا۔'' اردشیر نے محسن کی طرف پہلو بدلتے ہوئے کہا جو گاڑی کو بندرگاہ کے بجائے شہر کے شمالی حصے کی طرف لے جا رہا تھا۔

''تم شاید دارا کی ہدایت بھول گئے ہو۔'' محسن نے ایک موڑ پر گاڑی گھماتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' اردشیر نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''دارا کے حکم کے مطابق یہ ہیرے ہمیں شاہ پور پہنچانے ہیں۔ جہاں دارا ہمارا منتظر ہوگا۔ رہا پروفیسر تو اسے لانچ میں انتظار کرتا رہنے دو۔ ہماری محنت کا معاوضہ دارا ہی ادا کرے گا۔'' محسن نے رفتار بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

ممکن ہے دارا نے یہی پروگرام بنایا ہو لیکن اردشیر کو محسن پر بھی بھروسا نہیں تھا۔ وہ اس وقت بات کر کے کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے ذرا سا گھوم کر مصدق اور فریدون کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں بھی خاموش تھے چنانچہ اردشیر نے بھی خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا۔

گاڑی کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ شاہ پور چالیس میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ انہیں وہیں پہنچنا تھا لیکن ابھی یہ لوگ شہر کی حدود سے باہر نکلے ہی تھے کہ انہیں چونک جانا پڑا۔ بہت دور سڑک پر سرخ بتی نظر آرہی تھی۔ قریب پہنچے تو صورت حال واضح ہو گئی۔ سڑک پر رکاوٹ کھڑی کر کے راستہ بند کر دیا گیا تھا اور تقریباً ایک درجن مسلح پولیس والے مستعد کھڑے تھے۔ انہی میں سے ایک پولیس والا سرخ بتی سے انہیں رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

''کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے ہیروں کی چوری کا راز کھل گیا ہے۔ میں گاڑی روک رہا ہوں۔ تم لوگ ہوشیار رہنا۔'' محسن کہتے ہوئے گاڑی کی رفتار کم کرنے لگا۔

گاڑی لکڑی کی بنی ہوئی رکاوٹ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ دو کانسٹیبل اور ایک سب انسپکٹر کار کے قریب آگئے۔

''تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آرہے ہو؟'' سب انسپکٹر نے کھڑکی پر جھکتے ہوئے بارعب لہجے میں پوچھا۔

''ہم لوگ شاہ پور کے رہنے والے ہیں۔ جشن میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ اب واپس جا رہے ہیں۔'' محسن نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''اپنے شناختی کارڈ دکھائیے۔'' سب انسپکٹر نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مصدق نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے محسن کے سامنے لگے ہوئے آئینے میں دیکھا۔ ایک لمحے کو دونوں کی نگاہیں ملیں۔ سب انسپکٹر مصدق کی طرف متوجہ تھا کہ محسن نے ایک زبردست جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سب انسپکٹر دھکا لگنے سے سڑک پر گر گیا۔ دونوں کانسٹیبل بھی اچھل کر پیچھے ہٹ گئے۔ کار لکڑی کی رکاوٹ کو توڑتی ہوئی زنانے کی آواز سے آگے بڑھ گئی۔ اس وقت عقب سے ان پر فائرنگ شروع کر دی گئی۔

”جھک جاؤ، نیچے جھک جاؤ۔“ محسن رفتار بڑھاتے ہوئے چیخا۔

عین اسی لمحے کار کا عقبی شیشہ ٹوٹنے کی آواز ابھری۔ اردشیر اور فریدون بڑی پھرتی سے نیچے جھک گئے لیکن مصدق بالکل سیدھا بیٹھا رہا۔ اس کی گردن سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ گولی نے اس کی گردن میں سوراخ کر دیا تھا۔

پولیس والوں نے جیپ پر ان کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ جو چند میل سے زیادہ دور تک جاری نہ رہ سکا۔ کیونکہ تیز رفتار جیپ سڑک کا ایک موڑ کاٹتے ہوئے الٹ گئی تھی۔ شاہ پور سے دو میل پہلے محسن نے کار ایک ذیلی سڑک کی طرف موڑ دی جو جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ گھومتی ہوئی شاہ پور سے جا ملی تھی۔ جھیل کے کنارے جھاڑیوں کے پاس اس نے کار روک لی۔

”یہاں گاڑی کیوں روکی؟“ اردشیر نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

محسن نے کوئی جواب دینے کے بجائے اچانک ہی اچھل کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ اس کی آنکھوں میں خون سوار تھا۔ اب اس کی نیت واضح ہو گئی تھی۔ مصدق پولیس کی گولی سے ختم ہو چکا تھا۔ اور اب ان دونوں کو ختم کر کے وہ ہیروں پر قبضہ کر لینا چاہتا تھا۔ دونوں کی جدوجہد میں دروازہ کھل گیا اور وہ دونوں باہر لڑھک گئے۔ اردشیر کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ وہ اٹھ کر ایک طرف کو بھاگ نکلا۔ محسن نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے جیب سے پستول نکال کر فائرنگ شروع کر دی۔ ایک گولی اردشیر کی کھوپڑی میں لگی اور وہ ڈھلان پر لڑھک کر قلابازیاں کھانے لگا۔

محسن اس کی لاش گھسیٹ کر کار کی طرف لا رہا تھا اور کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا فریدون متوحش نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا پھر اچانک ہی جیسے وہ ہوش میں آ گیا۔ وہ کار سے اتر کر چیختا ہوا ایک طرف کو بھاگ اٹھا۔ محسن، اردشیر کو چھوڑ کر اس کی طرف دوڑا اور ایک ہی گولی میں اس کا کام بھی تمام کر دیا۔ اس نے دونوں کی لاشوں کو کار میں ٹھونسا۔ کار میں سے بریف کیس نکالا اور کار کو ڈھلان پر دھکیلتے ہوئے جھیل میں گرا دیا۔

وہ بریف کیس اٹھائے جھیل کے کنارے والی سڑک پر دوڑتا ہوا شاہ پور کے پہلے چوراہے پر پہنچ کر رک گیا۔ دارا سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہیرے حاصل کرنے کے بعد ان تینوں کو ہر صورت میں ختم کر کے اسے اس چوراہے پر دارا سے ملنا تھا۔ دارا نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہیرے آدھے آدھے کر لیں گے اور وہ اسے ملک سے نکلنے میں بھی مدد دے گا۔

محسن کو وہاں کھڑے ابھی چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ سیاہ رنگ کی ایک کار کسی طرف سے نکل کر اس کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

”ہیلو محسن، کیا رہا؟“ کار کے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے دارا نے پوچھا۔

”کامیابی باس! ہیرے اس بریف کیس میں موجود ہیں۔“ محسن نے جواب دیا۔

”لاؤ، یہ بریف کیس مجھے دو اور پیچھے بیٹھ جاؤ۔“

محسن نے بلا تامل بریف کیس اس کے حوالے کر دیا۔ وہ پچھلی نشست کا دروازہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ دارا کے پستول سے نکلی ہوئی دو گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔ وہ منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔

دارا نے پستول جیب میں ڈال کر بریف کیس کھولا۔ اس میں ایک اور بکس تھا۔ دارا نے اس بکس کا ڈھکنا بھی کھول دیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی۔ بکس خالی تھا۔

☆☆☆

اس واقعے کے ایک ہفتے بعد پروفیسر منوچہر، دارالحکومت کے ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں بیٹھا کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کی میز فٹ پاتھ کی طرف تقریباً دو فٹ اونچی دیوار کے عین قریب تھی۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کی نظریں سڑک سے گزرنے والے ہر چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کا انداز بتا رہا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ ایک نسوانی آواز سن کر پیچھے گھوم گیا۔ خانم شہپر سیاہ رنگ کا ایک ویٹیٹی بیگ اٹھائے میز کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔

''ہیلو شہپر! بہت دیر کر دی۔'' پروفیسر منوچہر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''ہاں، سواری نہ ملنے کی وجہ سے چند منٹ کی تاخیر ہو گئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' شہپر مسکراتے ہوئے اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ ویٹیٹی بیگ بھی اس نے میز پر رکھ لیا تھا۔

پروفیسر منوچہر نے اس کے لیے کافی منگوائی اور جب ویٹر کافی کے برتن رکھ کر چلا گیا تو شہپر مسکراتے ہوئے بولی۔

''مبارک ہو پروفیسر! تمہارا منصوبہ کامیاب رہا۔ وہ چاروں مارے گئے۔ دارا کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور ہیرے...... '' اس نے خاموش ہو کر ویٹیٹی بیگ کے ہینڈل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک ننھا سا بٹن دبا دیا۔ بٹن دبتے ہی ویٹیٹی بیگ کا نچلا حصہ دراز کی طرح کھل گیا۔ اس دراز میں ڈائمنڈ کمپنی کے دس کروڑ کی مالیت کے وہ ہیرے بھرے ہوئے تھے۔ ہیروں کی طرح پروفیسر کی آنکھیں بھی جگمگا اٹھیں۔ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر دراز کو بند کر دیا۔

''بہت خوب!'' پروفیسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''میں دارا کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ڈبل کراس کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے میں نے یہ لمبا چوڑا منصوبہ بنایا تھا۔ تم نے عمارت کے اندر کی تفصیلات اور فلمیں مہیا کر کے اس منصوبے کو کامیاب بنانے میں بڑی مدد دی، تمہیں ہیرے نکالنے میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی تھی؟''

''مجھے خاصے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا تھا لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ کمپنی کو مجھ پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا۔ میں ان کے لیے اب بھی اتنی ہی قابلِ اعتماد ہوں جتنی پہلے تھی۔''

''گڈ! ہم تین دن کے اندر اندر اس ملک کو خیر باد کہہ دیں گے۔ سوئٹزر لینڈ میں یہ ہیرے فروخت کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ تم اپنی تیاری مکمل کر لو۔ فلائٹ کا طے ہوتے ہی میں تمہیں اطلاع کر دوں گا۔ اب کافی پیو، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' پروفیسر نے کافی کی طرف اشارہ کیا۔

شہپر نے کافی کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ ابھی اس نے ایک گھونٹ بھرا ہی تھا کہ فضا بریکوں کی چرچراہٹ کی تیز آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی لوگ ایک طرف کو بھاگ اٹھے۔ کوئی راہ گیر تیز رفتار کار کے نیچے آ گیا تھا۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اٹھ اٹھ کر سڑک کی طرف دیکھنے لگے۔ شہپر اور پروفیسر بھی اپنی میز سے اٹھ کر دو فٹ اونچی دیوار کے قریب آ گئے اور سڑک پر ہجوم کی طرف دیکھنے لگے۔

''ارے، میرا پرس! اسے پکڑو...... میرا پرس لے گیا۔''

شہپر کے چیخنے کی آواز سن کر پروفیسر منوچہر اس طرف دیکھنے لگا۔ ایک شخص شہپر کا ویٹیٹی بیگ اٹھائے ریسٹورنٹ کی دیوار پھلانگ کر سڑک کی طرف دوڑ رہا تھا۔ شہپر کے چیخنے پر ایک اور شخص نے دوڑ کر اس رہزن کو پکڑنا چاہا لیکن رہزن ایک اسکوٹر پر سوار ہو کر بھاگ نکلا تھا۔

شہپر اب بھی چیخ رہی تھی اور پروفیسر اسے خاموش کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگ اب ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ لوگ انہیں پولیس کو اطلاع دینے کا مشورہ دے رہے تھے۔

''آپ لوگ اپنی اپنی میزوں پر جائیے۔ پرس میں ایسی کوئی قیمتی چیز نہیں تھی۔ ہم سو پچاس ریال کے لیے پولیس کی لمبی چوڑی تحقیقات میں نہیں الجھنا چاہتے۔ آپ لوگ جائیے پلیز۔'' پروفیسر نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

لوگ اپنی اپنی میزوں پر چلے گئے۔ کچھ لوگ اب بھی سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں حادثہ ہوا تھا۔

''بیٹھو شہپر! کافی پیو، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' پروفیسر نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کافی کی طرف اشارہ کیا۔

شہپر کے چہرے پر ایک دم ویرانی چھا گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان کی محنت پر اس طرح ڈاکا پڑ سکتا تھا۔

''یہ حادثہ......'' وہ سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

''ہاں! یہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے جسے ہم کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔'' پروفیسر نے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ویٹر کی طرف متوجہ ہو کر اسے اپنے لیے کافی لانے کا اشارہ کرنے لگا۔

مجھے گزشتہ کئی برسوں میں جو سب سے زیادہ عجیب چیز ملی، وہ ایک شیشے کی آنکھ تھی جسے عرف عام میں گلاس آئی کہا جاتا ہے۔ جب ڈیٹیکٹر کی آواز آئی تو میں نے اپنا کھرپا ریت میں ڈالا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ معمول کے مطابق مجھے کچھ سکے مل جائیں گے۔ میں نے تھوڑی سی کھدائی کر کے کنکر ہٹائے تو ایک موٹی بھورے رنگ کی آئی بال میری چھلنی میں آگئی۔ وہ میرے تصور سے زیادہ بھاری تھی اور ربر یا پلاسٹک کی نہیں بلکہ اصلی شیشے کی تھی۔ مجھے اس بات پر

ساحلوں کی ریت میں مدفن گوہر مقصود کی تلاش کا سلسلہ......

حماقت

تمکین رضا

ڈر خوف اور سوچوں کی طنابیں وقت سے پہلے گرفت میں لے لیتی ہیں... سوچنا بہتر ہے... مگر کچھ لوگ وقت آنے سے پہلے وہ کچھ سوچ لیتے ہیں جس کا ممکن ہونا ناممکن ہو... لیکن ان کو کوئی روک نہیں سکتا... کچھوؤں سے محبت کرنے والے ایک سادہ لوح شخص کا قصہ... چھوٹی سی ایک غلطی نے اسے انجانے خوف اور ناکردہ جرم کا مجرم بنا دیا...

حیرت ہو رہی تھی کہ اتنا عرصہ سمندر کی موجوں میں ڈوبنے کے باوجود یہ اپنی اصلی حالت میں کس طرح موجود ہے۔ میں نے اسے اپنی ہتھیلی پر رکھا اور اسے انگلی سے گھما کر دیکھا کہ اس پر کسی قسم کے نشانات تو نہیں ہیں۔ جب سورج کی روشنی اس پر پڑی تو وہ بالکل بے داغ تھی۔

میرے ذہن میں فوراً ایک سوال اُبھرا۔ اس کا مالک کون تھا۔ آپ شیشے کی آنکھ کس طرح خریدتے ہیں۔ کیا اس کی کوئی دکان ہے یا آن لائن خریداری کی جاتی ہے۔ کیا آپ دوسری اشیا کی طرح اضافی آنکھ بھی اپنی دواؤں کی الماری میں رکھتے ہیں۔ سب سے اہم بات کہ یہ گم کیسے ہوئی۔ لگتا ہے کوئی بڑی لہر کسی کے چہرے سے ٹکرائی اور شیشے کی آنکھ، بوتل کے ڈھکنے کی طرح تیزی سے اڑ گئی۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ آنکھ کا مالک سمندر کی موجوں پر ہاتھ پاؤں مارتا چلا آرہا ہے۔ ساحل پر ریت کے گھروندے بناتے ہوئے بچوں نے جب اس کے چہرے پر سوراخ دیکھا تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے۔

اس کی دریافت کو دس سال ہو چکے ہیں اور اس کے بعد سے اب تک میں کوئی اور عجیب یا انوکھی چیز تلاش نہیں کر سکا۔ گو کہ میں نے اس طرح کی کئی مشہور کہانیاں پڑھ رکھی ہیں۔ جیسے میساچوسٹس میں سولہویں صدی کے سکوں سے بھرا ہوا ڈبا پایا گیا یا کسی تباہ شدہ ہسپانوی جہاز میں چھپا ہوا چاندی کا ذخیرہ مل گیا لیکن مجھے ہمیشہ وہی پرانی چیزیں ملیں جیسے سکے، بالیاں یا کوئی دوسرا چھوٹا موٹا زیور۔ ایک دفعہ ٹیگ ہیور گھڑی بھی ملی تھی لیکن آج کل ایسی گھڑیاں کون پہنتا ہے۔

میں اکثر ٹاپ سیل آئی لینڈ میں بلیک بیرڈ کا مدفون خزانہ تلاش کیا کرتا تھا۔ یہ نارتھ کیرولینا مین لینڈ سے متصل ایک تنگ سی جگہ تھی اور اسے بحری قزاق لوٹ کا سامان چھپانے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے کیونکہ یہ کٹی ہاک اور کیپ ہیڈ اس کی طرح مشہور نہیں تھی اور یہ بات میرے حق میں جاتی تھی۔ سیاح صرف موسم گرما میں یہاں آتے لیکن ہم جیسے چند مقامی یہاں سارا سال گھومتے رہتے تھے۔ میں گزشتہ برس سے اپنے ایک کمرے کے مکان میں رہ رہا تھا اور اپنے آپ کو دوسرے لوگوں کی نظروں سے چھپا کر رکھتا تھا کیونکہ ان میں زیادہ تر موجودہ دور کے قزاق تھے۔ سوائے ان لوگوں کے جن کے چہروں پر نقاب اور ہاتھ میں تلواریں نہیں ہوتی تھیں۔ یہ لوگ نفیس سوٹ، سلک کی قمیص اور سونے کی چین پہنتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک چوری کی واردات ہمارے لیے کتنی بڑی مصیبت بن گئی تھی۔ اس وقت میں کم عمر اور بے وقوف تھا۔ وہ دونوں دوست اب بھی کبھی کبھی مجھے یاد آنے لگتے ہیں اور میں انہیں سر جھٹک کر بھلانے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں اس بارے میں ہر روز نہیں سوچتا لیکن عقل کا تقاضا ہے کہ انہیں بالکل نہ بھلا دیا جائے۔ جیسے کبھی کبھی اسکول کے زمانے میں لگے ہوئے بازو کے زخم کو دیکھنا۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ سب کچھ اتنی جلدی بدل جاتا ہے اگر ہم ان پر توجہ دینا چھوڑ دیں۔

ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ گزشتہ ہفتے پیش آیا جب میں گزشتہ شب کو آنے والے طوفان کے بعد ریت کے ٹیلوں کے نزدیک اپنے کام کی چیزیں تلاش کر رہا تھا۔ ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اچھی خاصی تباہی ہوئی ہے۔ پانی کے مسلسل بہاؤ کی وجہ سے مرکزی سڑک بند ہو چکی تھی اور تارکول کی سطح کو موجوں نے نگل لیا تھا۔ چھوٹے مکانات تباہ ہو گئے تھے۔ ان کا ملبا جگہ جگہ بکھرا ہوا تھا۔ ڈرائیو وے میں سمندری گھاس اور لکڑی کے تختوں کا ڈھیر لگ گیا تھا اور عام لوگوں کے لیے مطلوبہ مقام تک پہنچنا مشکل تھا لیکن میرے لیے یہ ایک بہترین موقع تھی۔

میں سورج نکلنے تک وہاں پہنچ گیا تھا۔ آسمان صاف تھا لیکن ہوا چل رہی تھی۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے میری قمیص اڑ رہی تھی جس سے میرا پیٹ ننگا ہو رہا تھا۔ میری کھال پسینے سے چپکی ہوئی تھی اور میں بھی اپنے آپ کو تیس سال کا ایتھلیٹ سمجھنے کے بجائے ایک پچاس سالہ شخص سمجھتا جو بہت زیادہ بیئر پیتا اور تلے ہوئے جھینگے کھاتا ہے۔

میں نے ایک سگریٹ سلگایا جو یقیناً میری صحت کے لیے مضر ہے لیکن اس وقت مجھے صحت سے زیادہ مکان کے کرائے کی فکر تھی۔ میں ای زیڈ مارٹ پر کام کرتا ہوں لیکن دکان میں مندی کی وجہ سے مالک نے میرے گھنٹے کاٹ لیے۔ لہٰذا کھدائی کے نتیجے میں ملنے والے سکے اور چھوٹے موٹے زیورات ہی بے روزگاری کے موسم میں میری آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ جو کچھ مجھے ملتا ہے، وہ اپنے دوست ٹومی کو فروخت کر دیتا ہوں جس کی مین لینڈ میں پرانی چیزوں کی خرید و فروخت کی دکان ہے۔

ڈیٹیکٹر کی آواز نے کسی قیمتی چیز کی موجودگی کا اشارہ دیا۔ ابھی میں نے صرف چھ انچ ہی کھدائی کی تھی کہ میری کھرپی کسی بڑی اور سخت چیز سے ٹکرائی۔ میں نے کھرپی ہٹائی اور ہاتھوں سے مٹی ہٹانے لگا لیکن اس وقت مجھے پیچھے

ہٹنا پڑا جب مجھے اپنی انگلی میں چبھن محسوس ہوئی اور اس میں سے خون نکلتا دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ وہ ایک ہلکی سی خراش تھی جو کسی کیکڑے کے پنجوں اور سیپ کے ٹکڑے کے لگنے سے آئی ہوگی یا زیادہ سے زیادہ کوئی زنگ آلود ہک یا ناخن لگ گیا ہوگا۔ میں نے گزشتہ چالیس سال سے تشنج کا ٹیکا نہیں لگوایا اور نہ ہی کسی ڈاکٹر کے پاس گیا اس لیے مجھے کبھی فارم بھرنے کا موقع نہیں ملا البتہ یہ تمام معلومات انٹرنیٹ میں موجود تھیں۔

میں نے زخم کی جگہ کو ہونٹوں سے چوسا اور زمین پر تھوکنے کے بعد اپنا کام جاری رکھا۔ میں تیزی سے ریت ہٹا رہا تھا اور پھر مجھے وہ چیز مل ہی گئی جس کی نشان دہی ڈیٹیکٹر نے کی تھی۔ وہ ایک سونے کی انگوٹھی تھی جس میں ایک بڑا سا ہیرا جڑا ہوا تھا اور اس کے اطراف میں پانچ چھوٹے ہیرے ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے لیکن اس انگوٹھی کو باہر نکالنے میں ایک مسئلہ تھا جس کی وجہ سے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جی ہاں وہ انگوٹھی ایک انگلی میں پھنسی ہوئی تھی بلکہ مجھے پورا ہاتھ نظر آرہا تھا جس کی تمام انگلیوں کے ناخن انگشتِ شہادت کے سوا بڑے خوب صورت اور گلابی تھے۔ یہ انگلی ٹوٹی ہوئی تھی اور اس پر تازہ خون کا دھبا نظر آرہا تھا اور یہ خون میرا تھا جو میری انگلی سے ٹپکا ہوگا۔

میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہاں سی گل پرندوں اور بطخوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ ساحل بالکل سنسان تھا۔ منہ زور موجیں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں اور سمندر بپھرا ہوا تھا۔ میں نے مزید ریت ہٹائی۔ وہ بے حد ملائم ہاتھ تھا جیسے اس کی بڑی حفاظت کی گئی ہو۔ میرے تصور میں ایک پُرکشش عورت کا سراپا گھوم گیا جس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو لیکن صرف ہاتھ ہی اس کی آتش جانچنے کا پیمانہ نہیں ہو سکتے۔ میرے دل میں خواہش ابھری کہ مزید کھدائی کر کے اس کی زندگی بچالوں۔ شاید مصنوعی تنفس سے وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے۔

میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ مزید ریت ہٹائی تاکہ وہ زخمی نہ ہو جائے پھر میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ بازو سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے نیچے مجھے سفید پتلون میں کچلی ہوئی ٹانگیں نظر آئیں۔ میں نے ایک بار پھر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ٹیلوں پر اگی ہوئی اونچی گھاس نے میرے اور سڑک کے بیچ ایک پردہ حائل کر دیا تھا۔ میرے ننگے ٹخنوں پر ریت کے ذرات جم گئے تھے جن کی وجہ سے کھال میں چبھن ہو رہی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے اپنا کام جاری رکھنا چاہیے یا نہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں چند لاشیں دیکھی تھیں اور جانتا تھا کہ کسی مردہ چہرے کو دیکھتے ہی مجھے فوراً متلی ہونے لگے گی۔ البتہ اس کی خشک پتلون دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا لگا، اگر طوفان کے دوران سمندر نے اس لاش کو ساحل پر پھینکا تھا تو اسے پانی میں بھیگا ہوا ہونا چاہیے تھا۔ اگر کسی نے گڑھا کھود کر اسے دفن کیا تھا تب بھی گزشتہ رات ہونے والی بارش میں اسے بھیگ جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ بالکل خشک تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے چند گھنٹے قبل ہی یہاں پھینکا گیا ہے۔ میں نے کھدائی جاری رکھی پھر مجھے ایک کہنی نظر آئی۔ اس کے بعد بلاؤز، کندھا، سر کے بال اور گلے پر زخموں کے نشان پڑے ہوئے تھے۔

ابھی تک ساحل پر سناٹا تھا۔ مجھے سگریٹ کی شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ افق کے پار مجھے ایک جال کھینچنے والی کشتی نظر آئی جو بہت آہستگی سے حرکت کر رہی تھی۔ اب مجھے اس کا چہرہ دیکھنا تھا گو کہ میں ایسا نہیں چاہ رہا تھا۔ گلے سے اوپر اس کی ٹھوڑی، رنگین ہونٹ، غازہ لگے رخسار، ایک کان کی لو میں ہیرے کی بالی، بند آنکھیں جن پر نیلا مسکارا لگا ہوا تھا۔ بالوں کے قریب کنپٹی پچکی ہوئی تھی۔ کان کے اوپر بالوں میں خون کی دھار جم گئی تھی۔ اس جگہ سے کھال ادھڑ گئی تھی۔

مجھے اس کے علاوہ کچھ اور دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس کے چہرے، گردن، کندھے اور کہنی کو دوبارہ ریت سے ڈھک دیا۔ یہاں تک کہ صرف اس کا ہاتھ باہر رہ گیا۔ میں نے انگوٹھی کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھا۔ بھاری ہیرے نے میری آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ ساحل پر بدستور سناٹا تھا۔ اب تو آبی پرندے بھی پانی میں چلے گئے تھے۔ میں نے اس مردہ ہاتھ کو پکڑا اور سوجی ہوئی انگلی سے انگوٹھی اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اسے مسلسل گھماتا رہا بالآخر اسے اتار کر اپنی جیب میں حفاظت سے رکھ لیا۔ اس کے بعد میں نے کان کی بالیوں کے بارے میں سوچا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر کے گھر کی جانب چل دیا۔

گھر پہنچ کر میں بہت دیر تک اس انگوٹھی کو دیکھتا رہا۔ میرے اندازے کے مطابق اس انگوٹھی کی قیمت بیس ہزار ڈالر تھی۔ پھر اس عورت کا خیال آیا جو کسی کی بیوی یا ماں تھی اور اسے ارادتاً وہاں سورج نکلنے سے پہلے دفن کیا گیا تھا۔ وہ جہاز یا کشتی سے پانی میں نہیں گری تھی اور نہ ہی سمندر میں ڈوبی تھی۔ میرے نزدیک یہ کوئی حادثہ بھی نہیں تھا بلکہ اسے

قتل کیا گیا تھا۔

پھر مجھے اپنی سابق گرل فرینڈ پچیس سالہ ترِیشا کی یاد آئی۔ میرے اور اس کے تعلقات میں ہمیشہ اتار چڑھاؤ رہا۔ ہم نے کچھ عرصہ ہائی اسکول کے زمانے میں ڈیٹنگ کی پھر علیحدگی ہوگئی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہم دونوں کا بار بار ٹکراؤ ہوتا رہا۔ کبھی ٹریفک سگنل پر، کبھی پیزا کی دکان پر۔ یہاں تک کہ ہمیں ملازمت بھی ایک ہی جگہ ملی۔ اس طرح ہمارا تعلق دوبارہ قائم ہوگیا اور ہم کبھی کبھی ایک ساتھ ڈرنک کرنے لگے۔ اس سے پہلے کہ میں اسے پوری طرح جان سکتا ہم نے شادی کرلی۔ ہمارے درمیان کبھی بھی حقیقی محبت نہیں رہی۔ لیکن کبھی نفرت یا تلخی بھی نہیں ہوئی۔ ہم دونوں میں سے کسی کے پاس پیسا تھا نہ جائداد۔ اس لیے اس بات پر کبھی جھگڑا نہیں ہوا کہ یہ میرا ہے اور یہ تمہارا۔ میں اپنے اپارٹمنٹ میں ہی رہا اور جب اس کے پاس ٹکٹ کے پیسے جمع ہوگئے تو وہ دل بہلانے کے لیے ہوائی چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔

چند برس قبل میں ٹی وی پر ڈاگ دا باؤنٹی ہنٹر، دیکھ رہا تھا جب مجھے ترِیشا پردے پر نظر آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے کسی بدکار کو دیکھ لیا ہو۔ وہ ایک مکان کے پورچ میں کھڑی تھی جہاں صحن میں مرغیاں، کوڑا کرکٹ اور ملبا بکھرا ہوا تھا۔ وہ ڈاگ اور اس کے سپاہیوں پر چیخ رہی تھی کیونکہ ڈاگ نے اس کے بوائے فرینڈ کو پکڑ کر ہتھکڑیاں لگائیں اور اسے سامان کی طرح اپنے ٹرک میں ڈال دیا۔ اس کے باوجود وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ''ترِیشا! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' ڈاگ کی بیوی بیتھ، ترِیشا کا راستہ روک رہی تھی لیکن وہ ایک ہی بات کہے جا رہی تھی۔ ''اسے جانے دو۔'' اس نے گندی سی گالی دے کر کہا گو کہ اس کے آخری الفاظ نہیں سنائی دیے لیکن میں اس کے ہونٹوں کی حرکت سے سمجھ گیا کہ اس نے کیا کہا ہوگا۔

غصے میں ہونے کے باوجود وہ اب بھی خوب صورت نظر آرہی تھی۔ اس کا متناسب جسم، لمبے بال اور چست سفید لباس جس میں اس کا انگ انگ نمایاں تھا۔ البتہ اس کا رنگ کچھ دب گیا تھا اور چہرے پر دھبے نظر آرہے تھے جیسے وہ کئی سالوں تک سڑک کے کنارے بنے ہوئے غسل خانوں میں منہ دھوتی رہی ہو۔ تاہم ان تمام مشکلات کے باوجود وہ خوب صورت نظر آرہی تھی۔ ایک ایسی عورت کو دیکھنا کچھ عجیب اور غیر حقیقی لگا جسے میں کبھی جانتا تھا۔ اس وقت تک ہم اتنے معصوم تھے کہ اس طوفان کا اندازہ نہ لگا سکے جو ہماری زندگی میں آنے والا تھا۔

جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ یہ کہ ڈاگ کی بیوی سے لڑتے وقت وہ بہت پُرجوش نظر آرہی تھی۔ ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں نے اسے کوئی دیوانی یا مدہوش عورت سمجھا ہو جو شراب کے نشے میں دھت ہوکر اول فول بک رہی تھی لیکن میں نے اسے مختلف انداز سے دیکھا۔ وہ اس لڑکے سے واقعی محبت کرتی تھی اور اس کے چہرے کے تاثرات حقیقی تھے۔ قسط کے اختتام پر ایک پیراگراف میں بتایا گیا کہ دو ہفتے بعد اس کے بوائے فرینڈ نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن سپاہیوں کی فائرنگ سے مارا گیا۔ میں نے بیئر کا گلاس اٹھا کر اس کے لیے دعائے خیر کی۔

اس کے بعد میں پھر اپنے مسئلے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس عورت کی لاش ساحل پر پڑی ہوئی تھی اور اس کی شادی کی انگوٹھی میرے گھر میں تھی۔ میں نے اسے اپنی دوسری نادر اور عجیب چیزوں کے سگار بکس میں چھپا دیا تھا جن میں وہ گلاس آئی بھی شامل تھی۔ میں مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ اسے کس نے قتل کیا۔ وہ کون تھی۔ میں جب بھی اس کے چہرے کا تصور کرتا تو اس کی کوئی واضح تصویر ذہن میں نہ آتی کیونکہ اس کے چہرے کے نقوش بگڑ چکے تھے۔

رات گئے مقامی خبروں میں ایک ممتاز شخصیت نے اعلان کیا کہ اس کی بیوی لاپتا ہے۔ اس کا نام شیلڈن بلیک واٹر تھا اور وہ ساحلی علاقوں پر عمارتیں تعمیر کرتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ٹاپ سیل ٹرٹل پروجیکٹ کا سب سے بڑا مخالف ہے۔ میں اس منصوبے میں کئی سال پہلے اتفاقی طور پر شامل ہوگیا تھا۔ ایک روز میں ساحل پر گھوم رہا تھا کہ میری نظر ایک ننھے سے کچھوے پر گئی۔ اس کے پر غائب تھے اور وہ اپنے آپ کو ظالم بطخوں کے حملوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور اسے جزیرے کے اس مرکز میں لے گیا جہاں کچھوؤں کا تحفظ کیا جاتا تھا۔ میں چھ ماہ تک باقاعدگی سے اسے دیکھنے جاتا رہا جب تک کہ وہ صحت یاب نہیں ہوگیا۔

شیلڈن بلیک واٹر کے چہرے پر بھی خراشوں کے نشان تھے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ وہ اور اس کی بیوی گزشتہ شب آنے والے طوفان میں پھنس گئے تھے۔ فوٹیج میں دکھایا گیا کہ اس کی تباہ شدہ کار کے ہڈ میں ڈینٹ پڑ گیا اور سامنے کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ غالباً اس کی کار کسی ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹکرائی تھی۔ شیلڈن کا کہنا تھا کہ وہ کسی کی مدد مانگنے گیا اور جب واپس آیا تو اس کی بیوی غائب تھی۔ اس کی یہ

بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

جب اس کی بیوی ایڈرین کی تصویر پردے پر نمودار ہوئی تو مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ کیونکہ یہ اسی مردہ عورت کی تصویر تھی۔ گو کہ وہ ریت میں دبی ہوئی تھی۔ اس کے اعضا مڑے تڑے تھے اور سر میں ایک سوراخ بھی تھا لیکن یہ وہی عورت تھی۔ میرے لیے شیلڈن کو تباہ کرنے کا یہ ایک اچھا موقع تھا لیکن بدقسمتی سے میں پولیس کو فون نہ کرسکا کیونکہ میرے ساتھ بھی ایک مسئلہ تھا۔ اس عورت کی انگلی کے ناخن پر میرے خون کا قطرہ گر گیا تھا اور جرسی کے ریکارڈ میں میرا ڈی این اے اور انگلیوں کے نشانات فائل میں موجود تھے۔

گو کہ جب پولیس والوں نے میرے خون کا نمونہ لیا۔ اس وقت تک کسی نے ڈی این اے کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ انہیں میری یا میرے کزن مائیک کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم بہت چھوٹے مہرے تھے۔ انہیں ہمارے باس کی تلاش تھی جو چوری کی گاڑیوں کو دوبارہ بنا کر فروخت کرتا تھا۔ ہم اس کے لیے گاڑیاں چوری کرتے اور وہ ہمیں ان کا معاوضہ دیا کرتا۔ میری اور مائیک کی وجہ سے پولیس والے اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس پر دو آدمیوں کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ ہم دونوں کا جرم معمولی نوعیت کا تھا اس لیے چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اب ایڈرین کی انگلی پر لگے ہوئے خون کے نشان کی وجہ سے میرے لیے مشکل کھڑی ہوسکتی تھی۔

بہت سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے ایک بار پھر ساحل پر جانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے ہر صورت میں اس خون کے نشان سے نجات حاصل کرنا تھی۔ اس بار میں خالی ہاتھ نہیں تھا۔ میرے پاس اوزاروں کا باکس بھی تھا جس میں ایک چھوٹی آری اور تین بلیڈ رکھے ہوئے تھے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ ایک سے زیادہ بلیڈ کی ضرورت ہوگی لیکن اس سے پہلے میں نے کبھی انسانی ہڈی کاٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ صرف اس کی انگلی کاٹ لوں گا پھر یاد آیا کہ میں نے اس کی انگلی سے انگوٹھی بھی اتاری تھی۔ عین ممکن ہے کہ اس جگہ بھی خون کا دھبا یا میری انگلیوں کے نشان ہوں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ کلائی پر سے پورا ہاتھ ہی کاٹ کر سمندر میں پھینک دیا جائے۔ پہلے میں نے اس کام کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا لیکن جب بھی اس کی لاش دریافت ہوتی وہ خون کا دھبا میرے گلے کا پھندا بن جاتا اور اس کے ڈی این اے کے بعد مجھ تک پہنچنا کچھ مشکل نہ تھا۔

علاقے کے زیادہ تر لوگ اور مقامی پولیس مجھے جانتے ہیں۔ اس لیے نصف شب کے بعد مجھے ساحل پر گھومتا دیکھ کر انہیں کوئی حیرانی نہیں ہوگی۔ وہ جانتے ہیں کہ اندھیرے میں بھی میٹل ڈیٹیکٹر کی مدد سے چیزیں تلاش کی جا سکتی ہیں لیکن میرے پاس آری اور بلیڈ کی موجودگی سے انہیں شبہ ہوسکتا تھا لہٰذا میں نے یہ دونوں چیزیں بیگ میں رکھ لیں اور ڈیٹیکٹر باہر نکال لیا۔

میں نے سڑک کے ذریعے جانے کا ارادہ کیا تھا پھر میں اس چوڑے راستے پر ہو لیتا جو اس مقام تک جاتا تھا لیکن جیسے ہی میں سیڑھیاں اتر کر اس راستے کی جانب بڑھا۔ مجھے اندھیرے میں سرخ اور نیلی بتیاں جھلملاتی ہوئی نظر آئیں۔ ابھی میں نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ ایک پولیس والے نے میرا راستہ روک لیا۔

''تمہیں واپس جانا ہوگا دوست۔'' اس نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا جس سے میری آنکھیں چندھیانے لگیں۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ، یہ تم ہو فرینک؟'' وہ بولا۔

''ہاں، میں فرینک ہی ہوں، وہاں کون ہے؟''

''آفیسر رینالڈ۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں آگے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''یہاں کیا ہو رہا ہے گریگ؟'' میں اسے بہت پہلے سے جانتا تھا۔ وہ جوان آدمی تھا اور میں جس کافی شاپ میں کام کرتا تھا، وہاں وہ اپنی شفٹوں کے دوران مفت میں کافی پیتا تھا۔ بہرحال وہ پولیس والا ہونے کے باوجود ایک اچھا انسان تھا۔

''مجھے کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔'' اس نے اپنی ٹارچ کا رخ میرے چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ اس کے جواب سے میرے اندر مزید جاننے کی خواہش ابھری۔

''کیا یہاں کوئی پارٹی ہو رہی ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر یہ لائٹس کیوں روشن ہیں؟''

''میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرسکتا فرینک۔''

''کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گے؟''

اس نے ساحل کی طرف دیکھا کہ اس کا کوئی افسر تو قریب میں نہیں ہے۔ ''تم نے ایک لاپتا عورت کے بارے میں سنا ہوگا۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''شیلڈن بلیک واٹر کی بیوی۔''

''ہاں، میں نے ٹی وی کی خبروں میں دیکھا تھا۔''

''یقیناً ہم نے اسے تلاش کر لیا ہے لیکن مردہ حالت میں۔ آج صبح ایک شخص اپنے کتے کے ساتھ یہاں سے گزر رہا تھا جب اس کے کتے نے کوئی بو محسوس کی۔ وہ ٹیلوں کی طرف گیا اور اس جگہ کی کھدائی شروع کر دی۔ وہاں ایک لاش دیکھی تو فوراً ہی پولیس کو فون کر دیا۔''

اس لاش کی انگلی پر میرے خون کا دھبا تھا گو کہ زیادہ بڑا نہیں لیکن اس کی وجہ سے میری بقیہ زندگی جیل میں گزرتی۔

''اوہ میرے خدا۔'' میں نے کہا۔

''میں جانتا تھا کہ تمہارے لیے یہ ایک دلچسپ اطلاع ہے۔''

''ہاں گریگ! بہت زیادہ دلچسپ۔'' میں نے کہا اور سوچنے لگا کہ اگر میرا ڈی این اے پچھلے ریکارڈ سے مل گیا جو لامحالہ مل ہی جائے گا تب بھی مقامی پولیس مجھے اس نام سے نہیں پہچان سکے گی لیکن جب وہ جرسی میں لی گئی میری تصویریں دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں گو کہ میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور میں پہلے سے زیادہ موٹا اور گنجا ہو گیا ہوں۔

صبح کی خبروں میں شیلڈن بلیک واٹر کی نیوز کانفرنس دکھائی گئی۔ اس کے سامنے کئی مائیکروفون ایک گل دستے کی شکل میں رکھے ہوئے تھے۔ اس نے سوٹ کے ساتھ ٹائی لگا رکھی تھی اور بال سلیقے سے پیچھے کی جانب سنورے ہوئے تھے جو کنپٹیوں سے سفید ہونا شروع ہو گئے تھے۔ البتہ اب اس کے چہرے پر خراشوں کے نشان نظر نہیں آرہے تھے۔ شاید میک اپ کے ذریعے انہیں چھپا دیا گیا ہو۔ وہ تقریباً میری ہی عمر کا تھا لیکن دیکھنے میں چالیس سال سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ بیوی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ایسے شخص کے لیے ایک لاکھ ڈالر کے انعام کا اعلان کیا جو قاتل کی گرفتاری میں مدد دینے کے لیے ٹھوس اطلاع فراہم کرے۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اس پر یقین آ گیا ہو لیکن میں جان گیا تھا کہ وہ کس حد تک غیر سنجیدہ ہے۔

اس سے ایک بار میرا سامنا ٹاپ سیل، ٹرٹل پروجیکٹ کی میٹنگ کے موقع پر ہو چکا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ جزیرے کی جنوبی پٹی کے ساحل پر عمارتیں تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اس طرح کچھوؤں کی پناہ گاہیں ختم ہو جائیں گی۔ وہ اس سے پہلے شمالی پٹی پر بڑے بڑے مکانات اور فلیٹ بنا کر اسے بدنما کر چکا تھا۔ اب اس کی نظریں ساحل کے اس چھوٹے سے حصے پر تھیں جو میرے نام سے منسوب تھا اور فرینکس بیچ کہلاتا تھا۔ زیادہ تر رضا کار اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ کچھوؤں کے تحفظ کی تحریک کے بانی کیرل نے نقشے پر نشاندہی کرتے ہوئے کہہ دیا تھا۔

''ظاہر ہے کہ یہ حصہ فرینک کے نام پر ہے کیونکہ وہ یہاں ہر روز آتا ہے۔'' مجھے اعتراف ہے کہ یہ ٹائٹل میرے لیے باعثِ فخر تھا۔ یہ حصہ ایک میل پر پھیلا ہوا تھا اور مجھے واقعی یہ محسوس ہونے لگا کہ ساحل کا یہ حصہ میرا ہے اور نومولود کچھوے میرے بچے ہیں۔

میں رضا کارانہ طور پر انہیں تلاش کرتا اور ان کے گھونسلوں کی نگرانی کرتا۔ موسم بہار میں مادہ کچھوے ساحل پر آتے۔ ان کا وزن تین سے چار پونڈ ہوتا۔ وہ اپنے بازوؤں کی مدد سے ٹیلوں کے نزدیک گڑھے کھودتے۔ مادہ سو سے زائد انڈے دیتی۔ ان گڑھوں کو ڈھکتی اور واپس سمندر میں چلی جاتی۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس کے بچے زندہ رہیں گے یا نہیں۔ ان میں سے کچھ بچ بھی جاتے تھے۔ ان انڈوں سے جو بچے نکلتے ان میں سے غالباً ایک ہی بلوغت کی عمر کو پہنچ پاتا۔ لہٰذا رضا کار اس سلسلے میں سرگرم رہتے تھے۔ موسم بہار میں اپنے کام کے دوران میری توجہ خاص طور پر اس جانب ہوتی، جب مادہ کچھوا سمندر سے باہر آتا تو اس کے وزن کی وجہ سے گیلی ریت پر نشان بن جاتے جس سے ان کے گھونسلوں کا پتا چل جاتا۔ وہ رات میں انڈے دیتے اور صبح سمندر میں واپس چلے جاتے۔ اگر مجھے کوئی ایسا گھونسلا نظر آجاتا تو میں اس کی اطلاع کیرن کو دیتا اور اس کے آنے پر میں اس گھونسلے کے گرد گلابی ٹیپ باندھ دیتا۔

کئی برس قبل شیلڈن ہماری ایک میٹنگ میں اپنے نقشے لے کر آیا اور بولا۔ ''میں یہ جگہ خرید رہا ہوں اور یہاں کثیر المنزلہ عمارت تعمیر کروں گا اور تم کچھوؤں کے تحفظ کی آڑ لے کر مجھے نہیں روک سکتے۔'' ممکن ہے کہ اس نے بعینہٖ یہ الفاظ استعمال نہ کیے ہوں لیکن ان کا مفہوم یہی تھا۔

تین دن گزر گئے لیکن کوئی مشتبہ شخص نہیں پکڑا گیا۔ البتہ اخبارات کے مطابق ایک گمنام ذریعے کا کہنا تھا کہ اس سلسلے میں کافی ثبوت مل گیا ہے اور اسے لیبارٹری میں بھیج دیا گیا ہے۔ یہ پڑھنے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا کہ ایڈرین کی انگلی کے ناخن پر میرے خون اور کھال کے علاوہ بھی کچھ ہوسکتا ہے اور کیا اس کی کوئی اہمیت ہو گی۔ شیلڈن اس کا

شوہر تھا لہٰذا اس کے ڈی این اے کو بہ آسانی نظرانداز کیا جا سکتا ہے لیکن میرے ڈی این اے کا نتیجہ کیا رنگ لائے گا۔ اگر میں بائبل پر ہاتھ رکھ کر بھی سچ بیان کروں تو کسی کو اس پر یقین نہیں آئے گا۔ اس لیے مجھے اپنے بچاؤ کے لیے بہت تیزی سے کچھ کرنا تھا۔

☆☆☆

میں شیشے کے کاؤنٹر پر جھکا ہوا اس کے نیچے ترتیب سے رکھے ہوئے پستولوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے علاوہ دکان میں گٹار، ایمپلی فائر، گھڑیاں، سائیکلیں اور جیولری بھی کافی تعداد میں موجود تھی۔

''مجھے دس ہزار ڈالر کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔

''جبکہ تم جانتے ہو کہ یہ اس سے دگنی مالیت کا ہے۔''

ٹومی لمبے قد کا دبلا پتلا شخص تھا۔ اس نے اپنے چشمے کو ناک پر جمایا اور انگوٹھی کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔

''اوہ دس ہزار ڈالر۔''

''یہ بیس قیراط سونے کی انگوٹھی ہے۔''

''تمہیں اتنی مہارت ہے کہ اس کا تخمینہ لگا سکو؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

''مجھے دوبارہ یاد دلاؤ کہ تم نے کرسٹی ز کیوں چھوڑا؟ تم نے اس نیلام گھر کو کیوں دھوکا دیا اور ساحل پر سکے تلاش کرنے لگے؟''

''دفع کرو۔ تم بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ مجھے یہی کام مناسب لگا۔''

ٹومی نے مجھے گھورا اور اپنے دفتر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس نے کاؤنٹر پر ایک تصویر رکھی اور اپنی درمیانی انگلی اس پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم اس تصویر کو پہچانتے ہو؟''

میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ میں نے کہا۔

''خدا کے واسطے ٹومی۔''

''میں نے کہا کہ کیا تم اس تصویر کو پہچانتے ہو؟''

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں ٹومی کہ وہ محض ایک پاگل پن تھا۔ تم یقین نہیں کرو گے کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔''

وہ تصویر ایڈرین کی انگوٹھی کا کلوز اپ تھی اور اس میں وہ انگلی بھی نظر آ رہی تھی جس سے میں نے یہ انگوٹھی اتاری تھی۔

''یہ تمہیں کہاں سے ملی؟''

''یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے۔'' اس نے انگوٹھی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے وہ انگوٹھی کاؤنٹر سے اٹھائی اور دروازے کی طرف دوڑ لگانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ''ہم ایک دوسرے کو کتنے عرصے سے جانتے ہیں۔ بیس برس تو ہو گئے ہوں گے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا فرینک۔ سراغ رساں کل یہ تصویر میرے پاس چھوڑ گئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ جیسے ہی یہ انگوٹھی مجھے نظر آئے۔ میں فوراً پولیس کو اطلاع کروں اور اب یہ میرے پاس آ گئی ہے۔''

''خدا کے واسطے ٹومی۔ میری بات کا یقین کرو۔ میں نے اس عورت کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بری حرکت تھی لیکن......''

''یہ بری نہیں بلکہ بدترین دکھائی دے رہی ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔''

''تم میرے لیے زہر لے کر آئے ہو، انتہائی مہلک زہر اور اس کے عوض دس ہزار ڈالر مانگ رہے ہو۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا دوست۔ اگر انہوں نے یہ تصویر مجھے نہ دی ہوتی تو میں اس بارے میں کچھ سوچتا لیکن اب مجھے تمہارا ستارہ گردش میں نظر آ رہا ہے۔''

میں نے اپنا سر ہلایا اور انگوٹھی کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''سنو۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے پورا قصہ بتا دیا۔ جب میں جرسی میں اپنے کزن نکی کے ساتھ کاریں چوری کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک واقعے کے دوران نکی کے ہاتھوں دو آدمیوں کا قتل ہو گیا۔ ایک ہفتے بعد ہم دونوں پکڑے گئے لیکن اس سے پہلے ہی نکی نے گن اور لاشیں ٹھکانے لگا دیں اور سارا

اعتماد

ڈاکٹر مریضہ کو معائنے کے لیے ملحق کمرے میں لے گیا تو خاتون نے جھجکتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔ ''پلیز! نرس کو بھی بلا لیجیے۔''

ڈاکٹر کو فرمائش ناگوار گزری اور اس نے تیوریوں میں بل ڈال کر کہا۔ ''مریض اور معالج میں پہلا تعلق اعتماد کا ہوتا ہے۔ اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں تو آپ کسی اور ڈاکٹر سے رجوع کریں۔''

خاتون نے بوکھلا کر کہا۔ ''یہ بات نہیں، مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے...... دراصل آپ کے کمرے میں میرے شوہر نرس کے ساتھ اکیلے بیٹھے ہیں، مجھے ان پر ذرا بھی بھروسا نہیں ہے!''

کراچی سے افشین بلال کا خیال

الزام گیرج کے مالک پر ڈال دیا جس کے لیے ہم کام کرتے تھے۔ پولیس نے ہمیں چھوڑ دیا تا ہم ہمارے خون کے نمونے اور انگلیوں کے نشانات لے لیے۔

جب میں اپنی بات پوری کر چکا تو ٹومی نے کہا۔ ''تم بہت زیادہ مانگ رہے ہو۔'' اس نے اپنی تین دن کی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرا اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میں زیادہ سے زیادہ ایک ہزار ڈالر دے سکتا ہوں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ اس لیے یہ پیشکش کر رہا ہوں کیونکہ شیلڈن انتہائی گندا شخص ہے اور مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہی اپنی بیوی کی موت کا ذمے دار ہے۔ اس کے باوجود میں اپنی ذمے داری پوری کرنے کا پابند ہوں؟ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

''ہاں اور میں تمہارے خیالات کی تعریف کرتا ہوں لیکن کیا تم مجھے اس انگوٹھی کے دو ہزار دے سکتے ہو۔ میں بالکل قلاش ہو چکا ہوں ٹومی اور مجھے روزمرہ اخراجات کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔''

''پندرہ سو۔ یہ میری زیادہ سے زیادہ پیشکش ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ میری مجبوری سے فائدہ اٹھا رہا تھا لیکن میرے پاس اس کی پیشکش قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

ریلی در ہم انٹرنیشنل ائرپورٹ پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ مجھے طرح طرح کے وسوسوں نے گھیر رکھا تھا۔ موت کا خوف، فضائی سفر کا خوف، سیکیورٹی عملے کا خوف، پکڑے جانے کا خوف وغیرہ وغیرہ لیکن ٹومی نے مجھے بنیادی باتیں سمجھا دی تھیں۔ سیکیورٹی والوں نے مجھے بیلٹ اور جوتے اتارنے کے لیے کہا۔ والٹ کو پلاسٹک کی ٹرے میں رکھ دیا گیا۔ اب میرے بیگ کو چیک کرنے کے لیے ایلومینیم کے رولر سے گزارا جا رہا تھا۔ میں نے سانس خارج کی اور گھبراہٹ کے عالم میں میٹل ڈیٹیکٹر سے گزرنے والا۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی سر ہو گیا۔

اب میں دوسری جانب کھڑا بیگ کا انتظار کر رہا تھا۔ میری نظریں اس سیاہ فام عورت پر تھیں جو ایک اونچی کرسی پر بیٹھی مانیٹر اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ میرا بیگ ابھی تک رولر پر ہی تھا۔ پھر اس نے ایک محافظ کو کوئی اشارہ کیا۔ وہ ایک چوڑے شانوں والا طویل قامت سفید فام شخص تھا۔ اس کے چہرے سے ہی کرختگی جھلک رہی تھی۔ اس نے جھک کر عورت کی سرگوشی سنی اور اثبات میں سر ہلایا۔ جب اس

عورت نے اسکرین کی جانب اشارہ کیا تو وہ جھک کر یوں دیکھنے لگا جیسے ریفری ری پلے دیکھتے ہیں۔

وہ مانیٹر کے پیچھے اور قریب ہو گیا پھر سیدھا کھڑے ہو کر نظریں مجھ پر جما دیں۔ شاید اب میری عمر ایسی نہیں تھی کہ مزید دباؤ برداشت کر سکوں۔ میرا وزن بڑھ گیا تھا اور ناقص غذا کے سبب میرا خون گاڑھا ہو چکا تھا جس کی وجہ سے دل کو زیادہ زور لگانا پڑتا تھا۔ میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ اگر یہاں سے بچ نکلا تو غذا میں تبدیلی کر کے اپنے جسم کو مناسب شکل میں لانے کی کوشش کروں گا البتہ شاید سگریٹ نوشی نہ ترک کر سکوں۔ محافظ نے آگے بڑھ کر مشین پر سے میرا بیگ اٹھا لیا اور اسے اپنے جسم سے اس طرح دور رکھ کر پکڑا جیسے اس میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا ہو۔

''یہ تمہارا ہے؟'' اس نے کہا۔ اس کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ یا خوشگواری نہیں تھی۔

''ہاں، کیا کوئی مسئلہ ہے؟''

''میرے ساتھ آؤ۔'' وہ ایک کونے کی میز کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ میرا دل انجانے وسوسوں سے بھر گیا اور دماغ میں جیل کے مختلف مناظر گھومنے لگے۔

''مجھے تمہارا ٹکٹ اور شناختی کارڈ چاہیے۔''

میں نے اسے اپنا ٹکٹ پکڑا دیا۔

''شناختی کارڈ؟''

میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا۔ ''وہ میرے بٹوے میں ہے جو ابھی تک پلاسٹک کی ٹرے میں پڑا ہوا ہے۔''

''جاؤ، لے کر آؤ۔''

میں اس کے ساتھ اپنی بیلٹ اور جوتے بھی لے آیا اور اسے اپنا نارتھ کیرولینا کا لائسنس پکڑا دیا جس پر میرا نام فرینک ٹاؤٹ نہیں بلکہ مائیک امگی لکھا ہوا تھا اور یہ ٹومی کا کارنامہ تھا۔

اس نے میرا لائسنس اور ٹکٹ دیکھا اور پھر زور سے ہوں کر کے بولا۔ ''اس میں کیا ہے؟'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھوں پر دستانے چڑھا لیے اور بولا۔ ''اپنا بیگ کھولو۔''

میں نے کانپتے ہاتھوں سے بیگ کی زپ کھولی اور اس نے ایک ایک کر کے اس میں سے چیزیں نکالنا شروع کر دیں۔ سینڈوچ کا پیکٹ، ٹوتھ برش، پرفیوم، چیونگم کا پیکٹ اور آخر میں ایک لینن کا تہ کیا ہوا کپڑا، اس نے اسے کھولا اور اس میں رکھی ہوئی شے کو انگوٹھے اور انگلی سے پکڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''یہ...... یہ میری خوش قسمتی کی علامت ہے۔''

اس نے براؤن رنگ کی آئی بال کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''کیا یہ اصلی ہے؟''

''ہاں، یہ واقعی اصلی گلاس آئی ہے۔''

''اسی کی وجہ سے مانیٹر اسکرین پر سرخ نشان ظاہر ہو رہا تھا۔'' اس نے سیاہ فام عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لیے اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ ہمیں ہر حال میں اپنا اطمینان کرنا ہوتا ہے۔''

اس نے آئی بال دوبارہ کپڑے میں رکھی اور کہا۔ ''تم شاید خود اسے لپیٹنا چاہو گے، میں نہیں چاہتا کہ یہ ٹوٹ جائے۔''

''ہاں، کیوں نہیں۔'' میں نے آئی بال کے گرد احتیاط سے کپڑا لپیٹتے ہوئے کہا جیسے وہ کوئی نایاب ہیرا ہو۔

''تم پہلے بھی وہاں گئے ہو؟'' اس نے میرا ٹکٹ اور لائسنس واپس کرتے ہوئے کہا۔ اب اس کا لہجہ دوستانہ ہو چکا تھا۔

''معاف کرنا، میں سمجھا نہیں۔''

''میرا مطلب ہے ہوائی۔ میں وہاں ہنی مون منانے جا چکا ہوں، وہ زمین پر جنت ہے۔''

''ہاں، میں نے بھی یہی سنا ہے۔ میں پہلی بار وہاں جا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ اس سفر سے لطف اندوز ہو۔ تمہیں جو زحمت ہوئی، اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم گیٹ ڈی تک میری رہنمائی کر سکتے ہو؟''

☆☆☆

اخبارات سے معلوم ہوا کہ شیلڈن نے جو کہانی بیان کی، اس میں کوئی سچائی نہیں تھی۔ پولیس والے پورے جزیرے میں ایک بھی زمیں بوس ٹیلی فون کا کھمبا دریافت نہ کر سکے۔ شیلڈن نے ایک جگہ کے بارے میں بتایا جہاں ممکنہ طور پر ان کی کار کی ٹکر ہوئی تھی اور جب پولیس والوں نے زور دیا تو اس نے ایک اور جگہ کی نشاندہی کی لیکن وہاں بھی ٹیلی فون کا کوئی کھمبا نہیں تھا تب اس نے بیان بدل دیا اور کہا کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کی گاڑی پر کھمبا ہی گرا تھا شاید کوئی درخت ہو کیونکہ تاریکی اور بارش کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ابھی تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی لیکن پولیس سرگرمی سے قاتل کو تلاش کر رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میرے ڈی این اے کی مدد سے شیلڈن کے مہنگے ترین وکیلوں کو مجھ پر شبہ کرنے کا موقع مل جائے گا جس کی انہیں اشد ضرورت تھی۔ خون کے چند قطرے، کھال کے چھوٹے ذرات اور پھر میرا غائب ہو جانا۔ ان سب چیزوں کو ملا کر دیکھا جائے تو نتیجہ بالکل واضح تھا۔ یقیناً میری تلاش شروع ہو چکی ہو گی۔ ایئرپورٹ سیکیورٹی کیمروں اور محافظ سے ہونے والی گفتگو سے وہ جان جائیں گے کہ میری منزل ہوائی تھی۔

میں نے اپنا ماتھا ہوائی جہاز کی کھڑکی سے ٹکا دیا اور نیچے سے گزرتے ہوئے بادلوں کو دیکھنے لگا۔ میں نے انٹرنیٹ پر پڑھا تھا کہ ہوائی میں سبز کچھوؤں کی جان خطرے میں رہتی ہے کیونکہ ساحل پر بھیڑ ہونے کی وجہ سے وہ لوگوں کے پاؤں تلے روندے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میں اور ترِیشا ساحل کی سیر کو جائیں۔ ہمیں وہاں پکنک منانے کا موقع ملے اور پھر ایک ساتھ سمندر میں تیراکی کریں لیکن یہ صرف میرا تصور تھا۔ کون جانے مجھے اور ترِیشا کو ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے کا موقع بھی ملتا ہے یا نہیں۔

ممکن ہے کہ ہم دونوں میں تجدیدِ تعلق ہو جائے اور ہم ایک بار پھر نئے سرے سے اکٹھے زندگی گزارنے لگیں لیکن شاید ایسا نہ ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے کسی ایسی ہستی کو تلاش کرنا چاہیے جس پر بھروسا کر سکوں جو میرا ساتھ دے سکے چاہے مختصر عرصے کے لیے ہی سہی۔

میں نے اپنا مووی اسکرین بند کیا اور چھوٹا سا تکیہ گردن کے نیچے رکھ لیا۔ میں نے کبھی سگریٹ کے بغیر تین گھنٹے سے زیادہ نہیں گزارے اور اب مجھے شدت سے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی۔ مجھے بالکل بھی یقین نہیں تھا کہ اتنی طویل پرواز سے کیسے نمٹوں گا بلکہ اس کے بعد جو کچھ ہونے والا تھا، اس سے نمٹنے کا بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔

میں نے آخری بار کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی۔ بادلوں کے ٹکڑوں کے درمیان سے وسیع سمندر کے کنارے صاف نظر آ رہے تھے۔ اس وقت میں زمین سے چھ میل اوپر تھا اور جہاز تیزی سے نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ سمندر کی سطح پر سورج کی لاتعداد کرنیں منعکس ہو رہی تھیں۔ جیسے موسیقی کی دھن پر رقص کر رہی ہوں۔ میں نے اس تصور کو بھی یادداشت کے خانے میں دفن کر دیا۔ اب میری زندگی کا سیاہ ترین دور شروع ہونے والا تھا۔

بچپن سے سنتا آیا ہوں کہ جرم خواہ چھوٹا ہو یا بڑا وہ قابلِ سزا ہے لیکن میری ایک حماقت نے چھوٹے جرم کو بڑے جرم میں تبدیل کر دیا۔ کاش میں وہ انگوٹھی اتارنے کی غلطی نہ کرتا جس کا خمیازہ مجھے عمر قید کی صورت میں بھگتنا ہو گا۔

[illegible]

پال لی کا ایسا کے نام نہاد رہنماؤں کو جیسے کھاتے ہیں الزامات میں نکالا ہے ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اُسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

[illegible]

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہوجاتی ہے۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوتلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوتلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلاتے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوتلسی کے چندرناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوتلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوتلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جونگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہوچکی تھی۔ جونگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ وہاں سے فرار ہوجاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندرناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے

ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیرِ اثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کا یا کلپ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو تلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کی گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا گینگسٹر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ نانا شکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آ جاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں بری مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم بری مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آ جاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ایئرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ڈیول کیج بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہو جاتا ہے۔ داور کو قابو کر کے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میری نظریں شلپا کے چہرے پر جم سی گئی تھیں۔ میں اُس کی اپنی جانب یوں گھورتی ہوئی نگاہوں کا مطلب نہیں جان سکا تھا۔

''کک...... کوئی خاص بات ہے......؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔ میری بات پر وہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور حلق سے ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''نہیں، کوئی خاص بات نہیں ہے......''

''آپ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے سلسلے میں جس طرح ... پُر اُمید نظر آ رہی تھیں، اب جنرل صاحب کے کمرے سے لوٹنے کے بعد اُتنی ہی مایوس سی دکھائی دے رہی ہیں، کیا اندر میرے سلسلے میں کوئی خاص بات ہوئی ہے؟''

میں نے اپنے اندر کی بے چینی کو رفع کرنے کی غرض سے شاید کچھ جلد بازی سے کام لیا تھا۔ شلپا میری طرف سے کسی تشکیک میں مبتلا ہو سکتی تھی۔ وہ سوچ سکتی تھی کہ آخر میرے اندر ایسا کون سا چور تھا جس نے مجھے یہ سوال پوچھنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ تاہم میں نے فوراً ہی اپنی اس جلد بازی کو ''کور'' کرتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب تھا کہ میں اِدھر ہی آپ کے ساتھ کام کرتا، لیکن مجھے لگتا ہے، میرے بارے میں اور کوئی فیصلہ کر لیا گیا ہے اور آپ کے سفارشی نوٹ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔''

میری بات سن کر اُس کے لبوں پر بے تاثر سی

مسکراہٹ ابھری تھی، پھر وہ بولی۔ ''ہاں! تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے، مسٹر دیال! کچھ ایسی ہی بات ہے، بہرحال اندر جاؤ...... پھر دیکھتے ہیں۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی۔ شلپا کا میری بات کو درست تسلیم کرنا، اس بات کا غماز تھا کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ ایک بار پھر جنرل کے ایل ایڈوانی کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

''یس......!'' اندر سے ایک گمبھیر سی آواز اُبھری تھی۔ یہ بلراج سنگھ تھا۔ نجانے ان دونوں نے شلپا کے میرے ساتھ لیے گئے انٹرویو کا کیا نتیجہ نکالا جس کا شاید شلپا کو تو کچھ اندازہ ہو چکا تھا مگر میں ہنوز اس طرف سے ابھی مخمصے کا ہی شکار تھا۔

میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ سامنے جنرل ایڈوانی اپنی مخصوص چیئر پر براجمان تھا اور اس کے قریب ہی بلراج سنگھ موجود تھا۔ دونوں کی برماتی ہوئی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے پہلے ہی کی طرح فوراً انہیں سلام کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔

''شلپا کی زبانی ہمیں تمہارے نیک.... خیالات کا تفصیلی علم ہوا ہے۔'' بلراج سنگھ نے مجھ سے مخاطب ہونے کے انداز میں کہا۔ جنرل ایڈوانی خاموش مگر بہ غور مجھ پر اپنی نظریں جمائے ہوئے تھا۔

''ہمیں خوشی ہے کہ تم ہم سے وفاداری کے لیے پُرعزم ہو اور یہاں پوری دیانت داری سے کام کرنا چاہتے ہو۔ تمہارے انٹرویو پر جنرل صاحب نے مکمل اطمینان کا اظہار کیا ہے، تمہیں پہلا کام سونپا جا رہا ہے مگر کوئی خاص عہدہ سونپنے سے پہلے، تمہیں ایک آزمائش سے گزارا جائے گا جو ایک طرح سے تمہارا امتحان بھی ہو گا۔ اگر تم اس مشن میں کامیاب ہو گئے تو سمجھو اس عظیم ریاست میں سونپے جانے والے عہدوں میں تمہارا عہدہ سرِفہرست ہو گا۔'' وہ اتنا کہہ کر ذرا رکا۔ میری فدویانہ سی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں مگر اندر سے میں بے چینی کا شکار تھا۔ میں نے اپنے سر کو خفیف سا جھکانے کے انداز میں کہا۔

''میری ہمیشہ کی طرح یہی خواہش اور کوشش ہو گی کہ مجھے جو بھی کام، مشن اور ذمے داری سونپی جائے، میں اپنی ذہنی فراست سے ہی نہیں بلکہ اپنی جان پر بھی کھیل کر اسے پورا کرنے کی کوشش کروں......''

''گڈ......'' بلراج کے منہ سے نکلا۔ پھر بولا۔ ''آج کا دن تم آرام کرو...... شلپا کے پاس جاؤ...... کل صبح تمہیں ایک اہم کام میں مصروف کر دیا جائے گا...... یاد رکھنا یہ کام، ہماری اس عظیم ریاست کی تعمیر میں ایک اہم ستون کی حیثیت بھی رکھتا ہے، اب تم اس مشن کی اہمیت کا اندازہ خود ہی لگا سکتے ہو...... جا سکتے ہو اب۔''

اس نے میرے اندر کی بے چینی بڑھا کر بات ختم کر دی۔ مشن کی نوعیت جاننے کا اصرار کرنا مناسب نہ تھا اور یوں بھی میں اب ان کے ایک اہم ملازم کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ تاہم یہ اچھا ہوتا اگر مجھے اس مشن کی نوعیت کا ابھی علم ہو جاتا تو اپنے تئیں کچھ غور و خوض کرنے کا موقع مل جاتا یوں آئندہ کی ''پری پلاننگ'' کرنے میں مجھے آسانی ہوتی۔ میں سر جھکائے شلپا کے پاس لوٹ آیا مگر وہ اپنی سیٹ پر موجود نہ تھی۔ میں اطراف میں نظریں ڈالتا ہوا کرسی پر براجمان ہو گیا۔

تھوڑی دیر گزری کہ ایک دروازے سے شلپا نمودار ہوئی، میں نے دیکھا اس کا موڈ خراب سا ہو رہا تھا۔ وہ اسی کمرے سے نمودار ہوئی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ جھکی پروفیسر ہیرا لال بڑبڑاتا ہوا داخل ہوا تھا۔

''خیریت ہے مس شلپا! آپ خاصی اَپ سیٹ سی لگ رہی ہیں۔'' میں نے اس کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا تو وہ فوراً اپنے ہونٹوں پر دلآویز سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہیں، بس یہ بڈھا کھڑوس پروفیسر ہیرا لال میرا موڈ خراب کرتا رہتا ہے۔ ایک تو اس کے کام کی رفتار چیونٹی کی طرح ہے، اُوپر سے نخرے بہت دکھاتا ہے، اپنی دے...... تم بتاؤ، اندر سے ہو آئے......؟''

''جی ہاں!'' میں نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا پھر اسے بتا دیا کہ مجھ سے اندر کیا کہا گیا تھا۔ ''میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ اب میرا امتحان ختم ہوا مگر اب مجھے ایک نئی چنا کھائے جا رہی ہے کہ پتا نہیں وہ مشن کیا ہو گا اور آیا میں اسے پورا کر بھی پاؤں گا کہ نہیں۔''

میری بات پر وہ...... مسکرائی تھی۔ مجھ سے باتیں کرنے کے بعد اس کا موڈ شاید کچھ بہتر ہو گیا تھا، بولی۔ ''پریشانی کوئی بات نہیں، تمہیں کل جو بھی مشن دیا جائے گا، وہ تم ضرور کامیابی سے پورا کر لو گے، کیونکہ تمہیں اس سلسلے میں مکمل طور پر نہ صرف بریف کیا جائے گا بلکہ گائڈنس بھی دی جائے گی۔''

''یہی تو میں چاہ رہا تھا کہ اگر مشن کی نوعیت کے بارے میں کچھ پتا چل جاتا تو میں بھی اس کی کامیابی کی کوئی اُمید رکھتا۔'' میں نے چالاکی سے فطری تجسس کے اظہار کے طور پر کہا۔ ''اب مجھے یہی چنتا ہو رہی ہے کہ پتا نہیں اس مشن کے لیے مجھے کہاں جانا پڑے گا؟''

''تمہیں کہیں نہیں جانا پڑے گا۔'' شلپا میری طرف دیکھ کر اسرار بھرے لہجے میں بولی۔ ''وہ مشن اسی چہار دیواری کے اندر ہی رہتے ہوئے تمہیں انجام دینا پڑے گا۔'' اس کی بات پر میں چونکا، میرا دل یہ سوچ کر تیزی سے دھڑکنے لگا کہ وہ اس مشن کے بارے میں جانتی تھی۔

''کیا مطلب؟ شلپا جی! میں سمجھا نہیں؟'' میں نے متحیرانہ لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا اور دانستہ اسے لُبھانے والے انداز میں اس کے نام کے ساتھ ''جی'' کا اضافہ بھی کر دیا۔ جس پر وہ بھی اپنی سیاہ گھری پلکوں کا جال اُٹھا کر دل موہ لینے والی مسکان سے بولی۔

''مجھے تمہارا شلپا جی کہنا اچھا لگا۔''

''تھینک یُو۔'' میں نے تھوڑی سی شرمانے کی اداکاری کی۔ وہ ریجھ گئی۔ تاہم پھر ایک دم متانت سے بولی۔

''مجھے صحیح جان کاری تو نہیں مگر ایک محتاط انداز سے اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ تمہیں وہی مشن سونپا جانے والا ہے جو اس وقت چھوٹی اور بڑی سرکار کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے، کیونکہ اندر تم سے یہی کہا گیا تھا ناں کہ تمہارا یہ مشن کس قدر اہم ہے جو اس عظیم ریاست کے لیے ایک ستون کا درجہ رکھتا ہے۔''

''ہاں!'' میں نے مختصراً یہ کہتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

''بس تو پھر اس سلسلے میں بے فکر رہو۔'' وہ بولی۔ ''مشن مشکل ضرور ہے، پر تمہیں کہیں جانا نہیں پڑے گا۔''

پھر وہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''آؤ...... میں تمہارا کمرا دکھادوں، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ بھی کچھ بتانے سے کترا رہی تھی۔ میں نے بھی مزید اس معاملے کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا اور کرسی چھوڑ کر اس کے ساتھ ہولیا۔

مختلف راہداریوں سے گزرتی ہوئی وہ مجھے دوسری منزل کے قدرے کونے میں واقع ایک کمرے میں لے آئی۔ کمرا آرام دہ اور کشادہ تھا، جہاں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ مختصر سا مگر دیدہ زیب فرنیچر، میز کرسی، الماری اور صاف ستھرا اٹیچ باتھ۔ ایک طرف فریج رکھا تھا۔ اے سی بھی آن تھا۔ آرام دہ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر ایک ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ ''کسی شے کی ضرورت ہو تو ڈبل زیرو ون پر کال کر کے بتا دینا۔ پیش کر دی جائے گی۔ اب تم ڈارک کیسل کے ایک اہم عہدے دار ہو۔'' شلپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر جب وہ جانے لگی تو میں نے اسے روکا۔

''شلپا جی! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ڈنر ہم دونوں اسی کمرے میں کریں؟''

وہ میری بات پر معنی خیز انداز میں مسکرائی پھر بولی۔ ''حلوہ گرم کھاؤ گے تو منہ جل جائے گا...... ٹھنڈا کھانے میں مزہ آئے گا...... مشن پورا کر کے اپنے اعتماد کی آخری کیل ٹھونک دو...... پھر کوئی دوری نہیں...... ہمارے بیچ......'' یہ کہتے ہوئے شلپا نے میرے ہونٹوں پہ اپنے نرم و گداز لبوں کا بوسہ دے دیا اور دلنشیں انداز میں مسکراتے ہوئے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

میں اس کی اس حرکت پر ہک بک سا رہ گیا۔ مجھے شلپا سے اس قدر جلد بے باکی کی توقع بالکل نہ تھی۔ میں تو ابھی اسے دور دور سے ریجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ اس کا عملی مظاہرہ بھی کر گئی تھی۔

بہرحال...... میں سر جھٹک کر بیڈ پر لیٹ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن صبح مجھے شلپا نے ہی آکر جگایا۔ میں نے غسل کیا، پھر ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد شلپا مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے کر پہنچی۔ یہ اسی فلور پر دوسری راہداری کے سرے پہ واقع تھا۔ یہ ایک بالکل سپاٹ کمرا تھا جس کے وسط میں فقط ایک میز اور آمنے سامنے کے رخ پر دو کرسیاں رکھی تھیں، چھت پر عین میز کے اُوپر بلب جھول رہا تھا۔ عجیب سا ماحول تھا کمرے کا...... کمرا بھی چھوٹا تھا، بمشکل دس بائی بارہ کا، چھت بھی نیچی سی تھی۔ دیواریں بھی سکڑی ہوئی تھیں۔

کمرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ شلپا نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور چلی گئی، اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ یہ بلونت سنگھ تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے غیر محسوس انداز میں سانس اندر کھینچی تھی۔ وہ نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا میز کے قریب آیا اور میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا۔ ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور پھر پیکٹ سمیت میرے سامنے

میز پر رکھ دیا۔

''سگریٹ پیو۔'' اس نے ایک گہرا کش لیتے ہوئے ہلکے سے کہا۔ میں نے بھی اپنے لیے ایک سگریٹ سُلگا لیا۔

''دیال! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم ہمارے وفاداروں میں شامل ہو چکے ہو۔ تم سے اب اُونچی سطح کا کام لینا چاہتے ہیں، تاکہ تمہارے شایانِ شان تمہیں کوئی عہدہ دے سکیں۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ میرا دھیان اسی کی بات پر تھا۔

''اس لیے تمہیں اب ثابت کرنا ہوگا کہ تم کس طرح اس عظیم ریاست ڈارک کیسل کے اعلیٰ عہدے داروں میں شامل ہو سکتے ہو۔ تمہیں سونپا جانے والا یہ اہم مشن بھی کم معمولی بات نہیں کیونکہ ہم نے تمہیں اس کا اہل سمجھا ہے۔ مشن بظاہر آسان بھی لگتا ہے، مگر یہ اتنا ہی مشکل بھی ہے اور مشن بھی ایسا ہے کہ تمہیں ڈارک کیسل کی اس عمارت کے اندر ہی رہتے ہوئے انجام دینا ہوگا۔ بس اُسی حد تک ہی یہ آسان ہے، اس کے بعد تمہارا اصل امتحان ہوگا اور وہی اصل، مشکل ترین مرحلہ ہوگا تمہارے لیے......''

اس کے بعد وہ مجھے مشن سے متعلق ڈھیرے ڈھیرے بتانے لگا۔

☆☆☆

میں نیم بے ہوشی کی حالت میں اپنے منہ سے بے ربط سی آوازیں خارج کر رہا تھا۔ اپنی آنکھیں بھی میں نے نیم وا سی کر رکھی تھیں، تاکہ کچھ دیکھتا بھی رہوں۔ جہاں مجھے لا کر پھینکا گیا تھا وہ جگہ بھی خاصی گھٹن آمیز اور سیلن زدہ سی لگتی تھی۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ یہ جگہ ساحلی علاقے کے قریب واقع تھی۔ یہاں بیمار سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میری متلاشی نظروں نے اس ہیولے کو دیکھ لیا تھا، جو زنجیروں کی جھنکار کے ساتھ ایک کونے سے میری جانب کو سرکا تھا...... یہی میرا اصل شکار تھا۔

''کک...... کون ہو تم......؟'' اس نے میرے مضروب جسم کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''آ...... آہ......'' میں نے کراہنے کی اداکاری کی اور کافی حد تک ہوش میں آنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے خوف زدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تت...... تم کون...... کون ہو تم؟''

''یہی سوال تو میں تم سے کر رہا ہوں......'' وہ بولا۔

اس کے چہرے کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور وہ ایک پختہ العمر ہی شخص تھا، جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا اس کے بارے میں۔ شانے چوڑے مگر جسم کمزور سا نظر آتا تھا، شاید طویل اسیری کے باعث ایسا ہوا تھا۔

''میرے خدا......! تت...... تو کیا تم بھی میری طرح یہاں قید ہو......؟'' میں نے کہا۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ تم ان کے کوئی ساتھی ہو؟''

میری بات سُن کر اس نے اپنے پیروں میں پڑی ہوئی آہنی بیڑیوں کو ہلایا، ایک جھنکار سلاسل کی صدائے جرس جیسی آواز کو سن کر بے اختیار میرے حلق سے ایک کراہتی ہوئی آواز خارج ہوگئی۔

''اللہ...... رحم کرنا مجھ پر......''

''اوہ...... تم مسلمان ہو......؟'' اس نے پوچھا۔

''الحمدللہ......'' میرے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا تھا۔ ''کیا تم بھی......؟''

''الحمدللہ...... میں بھی مسلمان ہوں...... لگتا ہے تم بھی ان کے چنگل میں پھنس چکے ہو اور میری طرح تم نے بھی ان کے ناپاک ارادوں کے آگے سپر نہیں ڈالی ہوگی۔'' وہ بولا۔ میں نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''میرا ذہن ماؤف سا ہو رہا ہے، مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں آرہی ہے، کک...... کیا، پپ...... پانی مل سکتا ہے؟''

''یہاں کچھ نہیں ملتا، وہی ملتا ہے، جو یہ لوگ ایک مقررہ وقت پر لا کر دیتے ہیں...... پھر اسی پر گزارا کرنا ہوتا ہے۔''

''آہ...... یہ تو بڑی عذاب ناک قید ہے۔ شش...... شاید میں یہاں بچ نہ پاؤں...... مم...... میں سانس کا مریض ہوں۔''

یہ کہہ کر میں نے اپنی ہانپتی ہوئی سانسوں کے تموج میں اضافہ کر دیا اور ساتھ ہی کھانسنے بھی لگا۔ میرا ہاتھ سینے پر تھا۔ وہ آدمی تشویش میں مبتلا ہو گیا اور اس کے منہ سے میرے لیے دعائیہ کلمات برآمد ہونے لگے۔

''یا اللہ میرے اس مسلمان بھائی کی خیر فرمانا۔''

میرے اندر خوشی کے سوتے پھوٹنے لگے تھے۔ میں اسے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میرے مشن کا پہلا مرحلہ کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔ لیکن...... نہیں، میں اسے کب بے وقوف بنانا چاہتا تھا۔ میرا اصل مشن تو خود اس کی مدد کرنا اور ایڈوانی کے اس ناپاک منصوبے کو سبوتاژ کرنا تھا۔ لیکن اس وقت میں انہی کے مشن کو پورا کرنے کے لیے یہاں لایا گیا تھا بلکہ ''پھینکا'' گیا تھا۔

بلراج نے مجھے اس مشن کے سلسلے میں بریف کرتے ہوئے یہی بتایا تھا کہ نصیر شاہ نامی وہ انڈین مائننگ انجینئر...... ان کے گلے کی ہڈی بنا ہوا تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے جاوا ریاست میں ہیروں کی کان دریافت کی تھی، مگر سرمائے کی کمی کی وجہ سے وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے، یوں نصیر شاہ کو جنرل ایڈوانی کے ہتھے چڑھنا پڑا۔ ایڈوانی نے اس کے نیک منصوبے کے لیے سرمایہ دینے کی ہامی بھری تھی۔ مگر نصیر شاہ ایڈوانی کے ناپاک منصوبے سے ناواقف تھا۔ پھر جب اسے پتا چلا کہ جس قبیلے (جاوا) کی حالت سدھارنے کے لیے وہ اس منصوبے پر کام کرنا چاہتا تھا، اُسے پہلے ہی جنرل ایڈوانی اپنے کسی مذموم مقاصد کے لیے ''ہائی جیک'' کرچکا تھا۔ (اگرچہ ابھی بھی شاید نصیر شاہ کو جنرل ایڈوانی کے ''ورلڈ بگ بینگ'' کے منصوبے کا علم نہیں ہوگا) لہٰذا اس کے بعد نصیر شاہ نے ان کے کام آنے اور کان کی نشاندہی اور اسے کھدوانے کی جملہ ذمے داریوں سے صاف انکار کر دیا۔ ایڈوانی سے ایک غلطی یہ ہوگئی تھی کہ وہ نصیر شاہ کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ اس کے اندر بھی عام بشری کمزوریاں ہوں گی اور وہ اس کے لالچ میں آکر ان کے ساتھ مل جائے گا، انہوں نے نصیر شاہ کو سب سے پہلے یہ پٹی پڑھائی کہ وہ اپنے اس آرٹیکل کی تردید کردے جو ایک بین الاقوامی جریدے میں شائع ہی اسی لیے کروایا گیا تھا تاکہ اس سلسلے میں دنیا کے مشہور بینک اس سے رابطہ کریں، مگر ماسوائے چند ایک بینکوں کے مالکان کے کسی نے دلچسپی نہیں لی، امریکا اور یورپی مالیاتی اداروں کے ان سربراہان نے بھی اس شرط پر اس سے ملاقات کرنا چاہی تھی کہ اگر وہ نو دریافت شدہ کان کے سلسلے میں انہیں مطمئن کردیتا ہے تو پھر ہی اسے سرمایہ فراہم کرنے کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔ مگر نصیر شاہ پُراُمید تھا کہ وہ انہیں خاطر خواہ طریقے سے بریف کرکے مطمئن کرلے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ نیویارک اور لندن میں مذکورہ سربراہان کے ساتھ میٹنگ کا کوئی حل برآمد نہ ہوسکا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ نصیر شاہ نے ہیروں کی جو کان دریافت کی تھی وہ ایک ایسے پُرخطر اور پہاڑی علاقے میں تھی، جہاں کھدائی وغیرہ کے سلسلے میں کی جانے والی یہ مہم جوئی ناممکنات میں سے تھی۔ ایک تو وہ پہاڑی سلسلہ، جسے نصیر شاہ نے ''ڈی، ایم، ایم'' (ڈائمنڈ ماؤنٹین مائنز) کا نام دے رکھا تھا، اس کی بلندی کسی ہمالیائی پہاڑی سے کم نہ تھی۔ لہٰذا وہاں تک کان کنی سے متعلق بھاری مشینری کی ترسیل بالکل بھی ممکن نہ تھی۔ یہ سرمایہ ضائع کرنے والی بات ہوتی۔ ان کے انکار سے نصیر شاہ عارضی طور پر بددل ہوا تھا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ ایک اور یورپی مالیاتی ادارے ''سان اینڈ جیک کمپنی'' کے سربراہ سے اس نے رابطہ کیا۔ یہ کمپنی یورپین ڈائمنڈ مارکیٹ کی ممبر بھی تھی۔

ایک فری لانسر پراسپیکٹر کی حیثیت سے نصیر شاہ پہلے بھی ان کے لیے کام کرتا رہا تھا۔ وہ اس کی مہمات پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔ آج تک انہوں نے اس کی مہمات کے سلسلے میں جو بھی اسے سرمایہ فراہم کیا تھا اس میں نقصان نہیں ہوا تھا اگرچہ وہ چھوٹے پروجیکٹ تھے، مگر آج تک مذکورہ کمپنی اس کے رائلٹی نواز بن کر دو ملین سے زیادہ کما چکے تھے، جس میں چالیس سے تیس فیصد نصیر شاہ کی بھی حصے داری تھی۔ لیکن موجودہ ''ڈی ایم ایم'' منصوبہ ان میں ایک میگا پروجیکٹ کی حیثیت رکھتا تھا، یہ ایک ''بونینزا'' تھا، جس کا مطلب تھا کہ آج تک دریافت ہونے والی ایک بڑی کان۔ اسی طرح اس کے لیے سرمائے کی بھی زیادہ ضرورت تھی اور اتنا بڑا رسک لینے کو کوئی تیار نہ تھا، حتیٰ کہ مذکورہ کمپنی، سان اینڈ جیک نے بھی نصیر شاہ سے معذرت کرلی، نصیر شاہ بددل ہوکر واپس بھارت آگیا تو جنرل ایڈوانی نے اس کا آرٹیکل پڑھ کر اس سے فوراً رابطہ کرلیا۔

ایڈوانی اسے بھی دولت کا پجاری سمجھا تھا مگر یہ حقیقت اُسے بعد میں معلوم ہوئی تھی کہ نصیر شاہ بے شک دولت کمانا چاہتا تھا، مگر جائز طریقے سے اور وہ ایک کٹر مسلمان بھی تھا، اس کا اصل مقصد یہ بھی تھا کہ جاوا قبیلے کی حالت سدھر جائے، وہ اسے ایک مضبوط اسلامی ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتا تھا، کیونکہ بھارت کی مسلم تبلیغی جماعتیں جاوا قبیلے کا دورہ کرتی رہتی تھیں اور یہ قبیلہ واقعی اسلام سے کافی حد تک متاثر بھی تھا۔ نصیر شاہ نہیں چاہتا تھا کہ بھارت ان پر اپنا تسلط قائم کرے اگرچہ وہ اب تک ایسا کر بھی نہیں پایا تھا۔ مگر ہیرے کی کان دریافت ہونے کے بعد نصیر شاہ چاہتا تھا کہ وہ یہاں اپنی مہم جوئی شروع کرنے سے پہلے انہیں مکمل اعتماد میں لے کر ان کی ریاست کو ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے منظم کرے۔

بھارت میں جنرل ایڈوانی سے ملاقات دوستانہ طرز کی تھی۔ نصیر شاہ خوش تھا کہ اب اُسے اپنی مہم کو سر کرنے کا موقع ملنے والا تھا۔ ایڈوانی نے اسے کہا کہ وہ اپنے چھپنے والے آرٹیکل کی فوراً نفی میں ایک اور مضمون پبلش کروائے کہ اس کے پہلے والے آرٹیکل میں کوئی سچائی نہیں تھی۔ اس

منصوبے میں خطیر سرمایہ لگنے کے باوجود اس کے وہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے تھے جس کے باعث کسی کمپنی کو مالی فوائد حاصل ہوتے۔

اگرچہ یہ مضمون خود نصیر شاہ کی ساکھ کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا، مگر اسے اس کی پروا نہ تھی کیونکہ یہ کامیگا پروجیکٹ اتنا بڑا تھا کہ اس کی کامیابی کے بعد نصیر شاہ کو اتنی دولت مل جاتی کہ پھر ساری عمر اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

یوں وہ ایک نیک کام کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتا۔ ایڈوانی یہ تردیدی آرٹیکل اس لیے بھی چھپوانا چاہتا تھا تاکہ بھارتی حکومت کے مالیاتی ادارے یا خود ان کی اعلیٰ قیادت کہیں اس میں ذاتی طور دلچسپی لے کر یہاں کا رخ نہ کر بیٹھے۔

یوں نصیر شاہ کے علاوہ بھی ایڈوانی نے اس کے مضمون کے خلاف چند ایک اور آرٹیکل بھی مختلف ناموں سے پبلش کروا دیے جس میں نصیر شاہ کے اس دعوے کو جھوٹا اور لغو قرار دیا گیا تھا کہ یہ صرف پیسا اینٹھنے کے ذریعے کے سوا کچھ نہ تھا۔

اپنے اپنے مفادات کا کھیل تھا یہ، گویا شطرنج کی ایک بڑی بازی تھی یہ...... لیکن اس میں نیک مقصد فقط نصیر شاہ کا ہی تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اُسے مفاد پرست ایڈوانی ”یوز ٹو“ کرنا چاہتا ہے، ادھر ایڈوانی سے یہی غلطی ہوئی تھی کہ اس نے نصیر شاہ کو یہاں لا کر جب جاوا قبیلے پر اپنی اجارہ داری دکھائی اور اسے لالچ دے کر ہمیشہ کے لیے اپنے لیے ”ہائر“ کرنے کی کوشش چاہی تو نصیر شاہ کا ماتھا ٹھنکا۔ اُسے ایڈوانی کے مکروہ منصوبے کا علم ہوتے ہی اس بات پر پشیمانی ہونے لگی اور اس سے زیادہ اسے اپنی اس غلطی کا تب احساس ہوا جب اس کے انکار پر ایڈوانی نے اسے ڈارک کیسل کے ہی ایک خفیہ تہ خانے میں قیدی بنا لیا۔ اُس وقت تک جب تک وہ ان کی بات نہیں مان لیتا۔

یہ سب باتیں مجھے مشن سے متعلق بریف کرتے ہوئے بلراج نے بتائی تھیں، کیونکہ میرا کردار ان کے سامنے مثبت سے زیادہ منفی تھا (یعنی مجھے انہوں نے اپنے ہی قبیل کا سمجھا تھا) اسی لیے مجھ سے اس نے کوئی بات نہیں چھپائی تھی، جو شاید ان کے مشن کا حصہ بھی تھیں اور مجبوری بھی۔

اگر میں ان کے ایک وفادار ساتھی کی حیثیت سے اس مشن کو دیکھتا ہوں تو یہ ناممکن حد تک ایک مشکل مشن تھا۔ نصیر شاہ جیسے کٹر مسلم شخص سے، جو ان کے ناپاک اور مذموم مقاصد سے آگاہ بھی ہو چکا تھا، یہ سب کروانے کے لیے رضامند کرانا آسان نہ تھا۔ وہ مرجاتا مگر ان کی بات کبھی نہیں مانتا۔ ایسا ہی ایک کردار ہشام چھنگلری بھی مجھے نہیں بھولا تھا جس نے تن تنہا اسپیکٹرم اور لولوش سے ٹکر لی تھی اور انہیں طلسم نور ہیرے کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی بلکہ خاموشی سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ بالآخر وہ بدنصیب سے جی کو ہارا اور اس کے بے رحم ساتھی بھوتک کے ہاتھوں بیدردی سے مارا گیا تھا۔

دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اللہ ربّ العزت کی مرضی اور حکمت کے تحت ہی ہوتا ہے۔ اللہ کے حکم سے کسے کہاں اور کیا کام انجام دینا ہوتا ہے اس کا صرف اللہ کو ہی علم ہوتا ہے، انسان کو اللہ نے کسی نہ کسی مقصد کے لیے پیدا کیا ہے، بے کار سے بے کار شخص بھی خواہ وہ کسی بھی ملک اور مذہب و نسل سے تعلق رکھتا ہو، بے محل و بے مصرف نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے اس سے بھی کوئی نہ کوئی کام لینا ہی ہوتا ہے۔

میں یہاں کسی اور مشن کے لیے آیا تھا، مگر اب یہ کام بھی ایک نیک فریضہ سمجھ کر مجھ کو نمٹانا تھا۔ اگرچہ ایک طرح سے یہ بھی میرے اصل مشن کا حصہ ہی تھا۔

نصیر شاہ نے ایک نیک مقصد کو نا کام اور اس کی جگہ باطل اور ناپاک مقصد کو ظاہر ہوتے دیکھا تو اس نے جان کی پروا کیے بغیر ایڈوانی کے سامنے انکار کر دیا۔ پابند سلاسل ٹھہرایا گیا تو بھی اس نے ہار نہیں مانی۔ اسے ہلاک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس سے کام لیا جانا تھا، اپنی مرضی کا...... جو اس نے نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی، مگر اس سے وہ کام کروانے کے لیے رضامند کرنے پر مجھے یہ ٹاسک دے دیا گیا تھا۔ یہ کام مجھے... کس طرح انجام پذیر کرنا تھا، اس سلسلے میں بھی مجھے بلراج نے آگاہ کر دیا تھا۔ مشن ان کا تھا اور کام میرا...... جو سر دست میں ان کی مرضی کے مطابق کر رہا تھا۔

شکر ہے کہ میں پہلے مرحلے میں کامیاب ہو چکا تھا، یعنی نصیر شاہ اس چالاکی کو نہیں سمجھ پایا تھا جو دشمنوں نے چلی تھی۔

جب اسے میں نے اپنے بارے میں یہ کہتے سنا کہ ”یا اللہ میرے اس مسلمان بھائی کی خیر فرمانا“ تو میں نے انجان بنتے ہوئے اس سے کہا۔

”کک...... کیا تم بھی...... میرا مطلب ہے، تم بھی مسلمان ہو؟“

''الحمدللہ......'' وہ زیرِلب بولا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے ہانپتے ہوئے اس سے پوچھا (اگرچہ میں اس کا نام جانتا تھا)۔

''نصیر شاہ......'' اس نے اپنا نام بتایا۔

''کک......کیا......؟ تم...... نصیر شاہ ہو......؟ لیکن نہیں، شاید میں ہی غلط سمجھا ہوں...... اس نام کے تو اور بھی بہت سے لوگ ہو سکتے ہیں، ضروری نہیں کہ تم وہی ہو۔'' میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا تو وہ بولا۔

''تم کس نصیر شاہ کی بات کر رہے ہو......؟''

''وہی...... جس نے نارتھ انڈیمان کی ایک دور اُفتادہ ریاست میں ہیروں کی کان ڈھونڈنے کا دعویٰ کیا تھا۔'' میں نے کہا تو وہ جیسے چونک کر بولا۔

''اوہ...... تو...... تو پھر تم کون ہو......؟ اور ان ظالموں نے تمہیں کس مقصد کے لیے یہاں قید میں ڈال دیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے اس سے منصوبے کے مطابق وہی کہا جو بلراج نے مجھے بتایا تھا۔

''میں ممبئی کے ایک بڑے بزنس مین حاجی ریاست علی خان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے۔ ان لوگوں نے میرے والد سے ایک معاہدہ کیا تھا، کچھ بھاری مشینریز امپورٹ کروانا تھیں انہوں نے جاپان اور جرمنی سے۔ سودا خاصا منافع بخش تھا۔ میرے والد نے معاہدہ کر لیا۔

'' جب آرڈر وغیرہ کا سلسلہ چلا تو درآمد و برآمد کے سلسلے میں ڈیوٹی پے منٹ کے مسئلے میں معاملہ اٹک گیا۔ مگر اصل مسئلہ تب پیدا ہوا جب میرے والد صاحب کو یہ معاملہ راز میں رکھنے کا کہا گیا، وہ چونک پڑے، انہیں شبہ ہوا کہ معاملہ کچھ اور تھا، وہ اُصول پرست تھے اس لیے اس بات پر اڑ گئے کہ انہیں بتایا جائے کہ اس کے درپردہ معاملہ کیا ہے؟ کیونکہ اُنہوں نے آج تک کسی ہیرا پھیری اور غیر قانونی کام میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ پارٹی کوئی بھی ہو، اُن سے صاف اور شفافیت کی بنیاد پر سودے بازی ہو۔ بہرحال، جب والد صاحب کی تسلی نہیں ہوئی تو اُنہوں نے معذرت کر لی۔

''چونکہ میرے والد صاحب کی کمپنی بین الاقوامی طور پر ایک ساکھ رکھتی تھی اور یہ لوگ بھی انہی سے ہی اپنا کام کروانا چاہتے تھے، انہوں نے والد صاحب کو جھکانے کے لیے دھمکیاں بھی دینا شروع کر دیں، بالآخر انہیں زبردستی اپنے مطابق کام پر رضامند کرنے کے لیے مجھے اغوا کر لیا گیا آگے کا مجھے کچھ پتا نہیں کیا ہوا۔'' میں اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اس سے وہی کہا تھا جو بلراج نے مجھے بتایا تھا۔ یہ لوگ بڑے چال باز تھے، مخالف کی فطرت کو بھانپ کر ہی انہوں نے یہ چال چلی تھی۔ نصیر شاہ کس قبیل کا آدمی تھا اور کیا تھا، اسی کے مطابق ہی انہوں نے مجھے مسلم ظاہر کروایا تھا ان کے سامنے (اگرچہ الحمدللہ میں مسلمان ہی تھا لیکن بلراج وغیرہ کے لیے تو ظاہر ہے میں نے دیال داس کا بھیس بھر رکھا تھا)

نصیر شاہ کو میرے اس جھوٹ پر فوراً یقین آ گیا اور کیوں نہ آتا، یہ جھوٹ سچ کے پردے میں لپیٹ کر بولا گیا تھا۔

''تمہارے والد صاحب نے ان مردودوں کی بات نہ مان کر بہت اچھا کیا۔'' نصیر شاہ بولا ''لیکن...... بیٹا! نام کیا ہے تمہارا؟'' وہ رکا۔

''جمال حسن۔'' میں نے غلط نام بتایا۔

''ہاں، جمال بیٹا! مجھے اس بات پر تشویش ہے کہ یہ ظالم لوگ کہیں تمہیں جانی نقصان... پہنچانے کی کوشش نہ کریں، لیکن یہ بھی کچھ اچھا نہ ہوگا اگر تمہارے والد حاجی ریاست علی نے ان کے دباؤ میں آ کر ان کم بختوں کی بات مان لی...... لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ لوگ میرے بغیر تو اپنے مکروہ منصوبے میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتے، تو انہوں نے اتنی مہنگی اور بھاری مشینری کی تیاری ابھی سے کیوں شروع کر دی؟''

اس کا کھٹکنا خالی از علت نہ تھا۔ یہ اس کی واقعی درست بات تھی، ایڈوانی وغیرہ کا کام تو تب ہی آگے بڑھ سکتا تھا جب یہ نصیر شاہ ان کے آگے ہتھیار ڈال دیتا۔ اسی طرح کی کچھ ایسی باتیں تھیں جو مجھے اپنی عقلِ سلیم کے مطابق سمجھتے ہوئے ان کا جواب دینا تھا۔ میں چونکہ ابھی اس کی ''حقیقت'' سے واقف نہ تھا اسی لیے دانستہ قدرے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مستفسر ہوا۔

''کیا مطلب؟ آ...... آپ سے انہیں کیا پرخاش ہے؟'' میرے استفسار پر اُس کے ہونٹوں پہ ایک تلخ سی مسکراہٹ عود کر آئی۔ ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

''درحقیقت میں ہی وہ اصل آدمی ہوں جو ان کے گلے میں ہڈی بن کر پھنسا ہوا ہوں۔ میرے بغیر یہ اپنا کام ایک انچ بھی آگے نہیں سرکا سکتے ہیں اسی لیے تو میں حیران

ہوا ہوں اس بات پر...... کہ انہوں نے اپنے ناپاک منصوبے پر عمل کیسے شروع کر دیا ہے؟''

''ان کا وہ ناپاک منصوبہ کیا ہے؟'' میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔ کیونکہ اس پر بھی ظاہر کرنا تھا کہ میں نہ ان کے منصوبے سے واقف ہوں اور نہ ہی اس حقیقت سے کہ نصیر شاہ کون تھا اور اسے یہاں کیوں قیدی بنا رکھا تھا، مگر میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد مجھ سے ساری بات کہہ ڈالے، تاکہ میں اپنے منصوبے کو آگے بڑھاتا۔ خود سے تو میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں سب جانتا ہوں۔ ورنہ وہ سمجھ جاتا کہ میں اس کے دشمنوں کا آدمی بن کر اسے دھوکا دینا چاہتا ہوں۔ جبکہ اصل بات یہی تھی کہ میں خود ایڈوانی وغیرہ کے ساتھ ''ڈبل کراس'' کرنے والا تھا مگر اس کے لیے مجھے موقع اور نصیر شاہ کو اعتماد میں لینے کی ضرورت تھی۔ یہاں میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، کیونکہ ہماری ایک ایک گفتگو ایڈوانی یا بلراج سنگھ خفیہ مائیکروفون بلکہ کوئی بعید نہ تھا کہ خفیہ کیمروں کے ذریعے ہماری اور بالخصوص میری باڈی لینگویج پر بھی کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔

میری بات پر بالآخر نصیر شاہ نے وہ ساری حقیقت بیان کر کے میرا کام مختصر کر دیا۔

''او...... کک...... کیا واقعی ایسا ہی ہے؟'' میں نے دانستہ حیرت کا اظہار کیا۔ میری پھٹی پھٹی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''ہاں! ایسا ہی ہے......''

''تت...... تو اس کا مطلب ہے کہ میرے والد صاحب نے بالکل صحیح کہا تھا۔''

''کیا کہا تھا انہوں نے؟'' نصیر شاہ اپنی بھویں اُچکا کر سوالیہ نظروں سے میرے چہرے کو تکنے لگا۔

''یہی کہ...... پچھلے کچھ عرصے سے تبلیغی جماعتوں پر نامعلوم افراد کے حملے ہوتے رہے ہیں۔ یہ جماعتیں انڈیمان کے دور دراز آباد آزاد قبائلی علاقوں میں اسلام پھیلانے کے مشن پر جاتی رہی ہیں مگر جاوا قبیلے کی طرف آنے والی جماعتوں پر وحشی قبائلیوں کے حملے کروا کر ان کا راستہ روکنے کا مطلب اب سمجھ میں آیا...... کیونکہ جیسا کہ میں نے ابھی تمہیں بتایا کہ میرے والد حاجی ریاست علی صاحب بھی دیگر متمول افراد کی طرح ایسی جماعتوں کی مالی سپورٹ کے لیے چندے وغیرہ دیتے ہیں۔ انہیں جب معلوم ہوا تو انہیں بھی اس بات کا افسوس ہوا تھا۔ مگر حقیقت پھر بھی کوئی نہیں جان سکا ہے اب تک کہ یہاں کیسا بھیانک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ میرے والد ایک مذہبی انسان ہیں، وہ ایک تبلیغی جماعت کو باقاعدگی سے چندے دیتے ہیں۔ کبھی کبھی خود بھی اس میں شامل ہوتے رہتے ہیں، ریاست جاوا قبیلے سے متعلق آرٹیکل ان کی نظروں سے بھی گزرا تھا۔ جب مشینریز وغیرہ کی ترسیل کے سلسلے میں میرے والد کو یہاں کا وزٹ کروایا گیا تو ان کا بھی ماتھا ٹھنکا تھا۔ بے اختیار انہوں نے نصیر شاہ کے اس آرٹیکل کا ذکر کر دیا جس پر وہ بدک گئے کہ یہ بات تو میرے والد کو بھی معلوم ہے، تاہم انہوں نے میرے والد کو ہر طرح کا لالچ دیا مگر وہ نہ مانے۔''

میری بات سے نصیر شاہ اب پوری طرح سے متاثر ہو چکا تھا۔ ہم دونوں کافی دیر تک آپس میں گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔

میں بلراج کے منصوبے کے دوسرے مرحلے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اب اس کے تیسرے اور آخری منصوبے کی طرف قدم بڑھانا باقی رہ گیا تھا۔ یہی سب سے نتیجہ خیز مرحلہ بھی تھا، بلراج وغیرہ کے لیے نہیں بلکہ میرے لیے...... کیونکہ منصوبے کے اس اہم ترین مرحلے میں، مجھے نہ صرف ایڈوانی وغیرہ کو ڈبل کراس کرنا تھا بلکہ اپنی اصل شناخت کے ساتھ نصیر شاہ کو بھی اعتماد میں لینا تھا اور یہی مرحلہ سب سے زیادہ خطرناک اور حساس بھی تھا۔

بلراج سنگھ کے حوالے سے نصیر شاہ کے ساتھ آگے چل کر مجھے...کون سی گیم کھیلنا تھی، اب میں اس کی تیاری میں تھا۔

نصیر شاہ بے چارہ خود سے زیادہ میرے لیے فکر مند نظر آ رہا تھا۔ وہ میری فرضی کہانی پر بھروسا کرنے کے بعد مجھ سے بہت زیادہ کلوز ہونے لگا تھا۔ تب ہی ایک موقع پر جب میں نے دیکھا کہ اب کافی دیر بھی گزر گئی ہے تو میں نے کہا۔

''ہمیں یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرنا ہوگی۔''

''ناممکن ہے یہ......'' وہ تہ خانے کی سیلن زدہ سی دیوار سے اپنی پشت ٹکا کر بولا۔ وہ مجھے خاصا مایوس دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''ہمیں کوشش تو کرنی چاہیے۔''

''کر لو کوشش ...... یہ تہ خانہ اس منحوس عمارت کے جانے کون سے گوشے میں واقع ہے، ہمیں تو اس کا بھی کوئی

اندازہ نہیں ہے، اس میں کھڑکی تو کیا روشن دان تک نہیں ہے، سامنے دروازہ ہے، وہ بھی غار جیسا، باقی اس کی دیواریں تو تم دیکھ ہی رہے ہو...... کس قدر ٹھوس اور مضبوط ہیں۔ کم خوراکی بھی یہاں کسی جان لیوا عذاب سے کم نہیں، میں بھی تمہاری طرح صحت مند اور قابلِ رشک جسمانی مضبوطی کا حامل شخص تھا، مجھے تو تم پر ترس آرہا ہے، باقی میں تو مایوس ہوگیا ہوں۔“

”مسلمان ہوکر مایوسی جیسے گناہ کا ارتکاب کیوں کر رہے ہو، دوست؟“ میں نے نیم بازسی مسکراہٹ سے کہا۔

”مایوس تو نہیں ہوں، پر دعا ہی کر سکتے ہیں صرف......“ وہ بولا۔

”یہاں رہتے ہوئے کیا تم نے فرار ہونے کے کسی منصوبے پر غور کیا ہے کبھی؟“ میں نے اس سے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”اس قبر جیسی جگہ پر بھلا فرار کا کیا منصوبہ بنایا جاسکتا ہے۔“ وہ پھیکے پھیکے سے لہجے میں بولا۔ ”یہاں سے اگر نکلنے میں کامیاب ہو بھی جاتا ہوں تو جاؤں گا بھی کہاں؟ یہ سارا علاقہ ان کی دسترس میں ہے، انہوں نے تو ایک وحشی قبیلے کو بھی اپنا غلام بنا رکھا ہے۔“ وہ شاید کلی منجارین قبیلے کی بات کررہا تھا۔

”یہاں سے نکل جائیں ایک بار تو ان کے علاقے سے بھی باہر نکلنے میں کامیاب ہو ہی جائیں گے۔“ میں نے اپنے لہجے کو باعزم بناتے ہوئے کہا۔

”میرے ذہن میں پہلے تو اس منحوس تہ خانے سے آزادی حاصل کرنے کا منصوبہ آرہا ہے، بشرطیکہ تم ساتھ دو اور ہمت کرو......“

وہ بغور طلب نظروں سے میرے چہرے کی طرف تکے جارہا تھا۔ بولا۔ ”تم نوجوان ہو اور تمہارے ذہن میں ضرور ایسا کوئی منصوبہ آسکتا ہے، میں تمہاری بات سے متفق ہوں، یہاں پڑے رہ کر مرنے سے بہتر ہے کہ کوشش کرکے ہی کیوں نہ مرا جائے۔“

”انشاء اللہ ہم زندہ بھی رہیں گے اور یہاں سے نکل بھی جائیں گے۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”منصوبہ بتاؤ مجھے......“

”یہاں کھانا وغیرہ دینے تو کوئی آتا ہی ہوگا ناں...... ہم پہلے اسے قابو کرنے کی کوشش کریں گے۔“ میں نے وہی کہا جو بلراج نے مجھے بتایا تھا۔ فرار کا منصوبہ اسی کا تھا اور اس کے بعد بلراج وغیرہ کا (اور بعد میں میرا بھی) اصل منصوبہ شروع ہوتا۔

نصیر شاہ میری بات پر ہنس کر بولا۔ ”وہ اکیلا نہیں آتا ہے، دو آتے ہیں اور مسلح ہوتے ہیں۔“

”تمہیں نہیں معلوم کہ میں بلیک بیلٹ ہوں۔ ممبئی کے فائٹنگ اینڈ شوٹنگ کلب کا باقاعدہ ممبر ہوں۔ مگر انہیں میری اصلیت معلوم نہیں۔“

”اچھا......!“ وہ بولا۔ مجھے اس کا لہجہ طنزیہ محسوس ہوا جو میرے منصوبے کے لیے خطرناک تھا۔

”تم اتنے لڑاکا مار ہو تو پھر چوہے کی طرح ان کے پھندے میں کیسے پھنس گئے؟“ اس نے کہا۔ اس کی بات بھی منطقی لحاظ سے غلط نہیں تھی۔ میں نے بھی اس کے طنز کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔

”میں تو تمہیں خاصا ذہین سمجھا تھا مگر تم...... خیر! دھوکے سے تو شیر کو بھی گیدڑ گھیر لیتے ہیں۔ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکی۔ مجھ پر ایک سے زیادہ افراد نے اچانک اور بے خبری میں حملہ کردیا تھا۔“

وہ ہنسا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”تم بُرا مان گئے میری بات کا دوست! جوان ہوناں، اینگری ینگ مین بھی، میں مذاق کررہا تھا، تمہاری بات صحیح ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ مجھے تمہاری فکر ہے، معاملہ گلے پڑ گیا تو سب سے پہلے تم جان سے جاؤ گے۔“

مجھے خوشی تھی کہ وہ میرے جھانسے میں آرہا تھا۔ اب اسے کیا معلوم تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا، کیونکہ ہمارے مشترکہ فرار کا یہ منصوبہ ہی جعلی تھا اور یہ انہی لوگوں کا ہی بنایا ہوا تھا جنہوں نے ہمیں قید میں ڈالا تھا۔ یہ تو ہم نے نصیر شاہ کو ”بلف“ کرنے کے لیے کرنا تھا تاکہ بعد میں وہ متاثر ہوکر مجھ پر کامل بھروسا کرنے لگے اور پھر میں اصل مشن کا آغاز کرسکوں۔

اصل مشن ہمارا (بلراج وغیرہ کا) کا یہی تھا کہ نصیر شاہ کو میں اپنے ساتھ فرار کروا کر ایک طے شدہ مقام پر جاکر روپوش ہوجاؤں جس کا بندوبست بلراج نے اسی علاقے میں ایک ایسے مقام پر پہلے سے کر رکھا تھا جو ”ڈائمنڈ ماؤنٹین مائنز“ کے اطراف میں یا قریب تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے منصوبے کے مطابق نصیر شاہ کے اس عزم کو مہمیز کرتے ہوئے ایک نیا کھیل شروع کرنا تھا۔ بظاہر یہ کھیل بلراج وغیرہ کے خفیہ منصوبے کا ہی حصہ ہوتا مگر اس کے درپردہ میں نے اپنا کھیل کھیلنا تھا۔ میری بیدار مغزی اور تقدیر کے دیے گئے مواقع میری رہنمائی کررہے تھے۔

چنانچہ نصیر شاہ میرے ساتھ اس ''جعلی فرار'' کے لیے تیار ہوگیا۔

مقررہ وقت پر جب تہ خانے کا دروازہ کھلا اور دو اسلحہ بدست افراد اندر داخل ہوئے تو میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک پر قابو پالیا اور اسے گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے اس کے ساتھی کو بھی نہتا ہونے پر مجبور کر دیا۔ سوچی سمجھی بلکہ ''تیار شدہ'' اسکیم تھی تو پھر بھلا اس میں کیا مشکل ہوتی، مگر نصیر شاہ اس چال بازی کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ یا پھر شاید وہ ان حالات سے پہلے کبھی نہیں گزرا تھا، یوں بھی پلاننگ مربوط تھی۔ اگرچہ ان دونوں ہتھیار بندوں نے اس ''ڈرامے'' میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے آسانی سے ہار نہیں مانی تھی، دکھاوے کے لیے تھوڑی بہت ہمارے درمیان کشاکشی ہوئی تھی۔ نصیر شاہ اپنی آنکھیں پھاڑے یہ سب ''ڈراما'' دیکھ رہا تھا۔

''آؤ، نکل چلو جلدی......'' میں نے ان دونوں افراد کو ''زیر'' کرنے کے بعد ہک دک سے کھڑے نصیر شاہ سے کہا اور پھر وہ جیسے یکدم چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آیا۔

میں اُسے لیے تہ خانے سے باہر آگیا۔ سامنے ویران اور نیم تاریک سی راہداری تھی۔ میں اسے لیے اسی طرف کو بھاگا۔ وہ تھوڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ شاید اتنا عرصہ پابندِ سلاسل رہنے کے بعد چلنے میں اُسے دقت ہو رہی تھی۔

مجھے نکاسی کے سارے راستے بتا دیے گئے تھے۔ میں انہی پر چلتا ہوا ایک زینے پر پہنچا اور وہاں سے میں نے عمودی سفر شروع کیا، راہ میں ایک دو ہتھیار بندوں سے میرا مصنوعی ٹاکرا ہوا اور پھر وہاں سے میں عمارت کی ایک ایسی فصیل پر آگیا جو نامکمل اور مختصر سی تھی۔ یہاں سے ایک راستہ نشیب میں جا رہا تھا، یہ کوئی باقاعدہ راستہ تو نہیں تھا تاہم اسے چور راستہ ضرور کہہ سکتے تھے۔

رات نصف پہر میں تھی اور اسی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم دونوں فصیل سے اُترتے ہوئے، مختصر سے ایک جنگل میں اور پھر وہاں سے ساحل کی طرف آگئے، وہاں میں ذرا ٹھہر کر کچھ سوچنے لگا۔ میں اپنی حرکات و سکنات سے بدستور یہی ظاہر کرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا ''ریئل'' تھا۔

''ہمیں سمندر میں چھلانگ لگا دینی چاہیے، کسی نہ کسی کنارے تو پہنچ ہی جائیں گے ہم......'' نصیر شاہ نے بچکانا مشورہ دیا۔ اس سے مجھے اس کی ذہنی سطح کا اندازہ ہوا۔

''سمندر کے اس حصے میں شارک مچھلیوں کی بہتات ہے، کسی دوسرے قریبی ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہم مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر ان کے شکم میں ہوں گے۔''

''اوہ......'' اس کے منہ سے ابھی اتنا ہی نکلا تھا کہ وہی ہوا جس کا مجھے انتظار تھا، یعنی فصیل کی طرف سے ہم پر فائرنگ ہوئی، رات کی تاریکی میں فصیل کی طرف سے شعلے لپکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ نصیر شاہ کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔

''اس طرف دوڑو...... جلدی......'' میں چیخا اور بھاگا، اس نے بھی فوراً ہی میری تقلید کی۔ ہم ساحل کے کنارے کنارے دوڑتے ہوئے، یہ جا وہ جا کے مصداق، ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں ہمیں ساحل سے لگی کھڑی ایک موٹر بوٹ نظر آئی۔ یہ چھوٹی سی اسپیڈ بوٹ تھی۔ ہم اس میں سوار ہوگئے، میں نے تھرو ٹل کھینچا اور پھر اس کا انجن بیدار ہوتے ہی میں نے اسے آگے بڑھا دیا...... تاریکی میں بوٹ سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی ایک طرف کو لپکی۔

یہ سب دیکھ کر نصیر شاہ نے بھی اب خاصی ہمت پکڑلی تھی۔ رہائی پانے کی جستجو اب ایک دم ہی اس کے اندر بھی جاگ اُٹھی تھی۔

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ ہم اس منحوس جگہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ یہ بوٹ ہمیں اس جزیرے سے نکال سکتی ہے۔'' نصیر شاہ مسرت سے بولا تو میں اندر سے کھٹکا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اس کے لیے یہاں سے نجات ناممکن بات تھی، تاہم میں نے اس کی خوش فہمی کو رفع کرنے کی غرض سے کہا۔

''خاطر جمع رکھو، ہنوز دلی دور است...... اس بوٹ میں اتنا فیول نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہی بہت ہوگا کہ ہم نزدیکی ساحل پر پہنچ کر وہاں سے آگے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کریں۔'' میری بات سن کر اس کے اُمید بھرے چہرے پر اُداسی چھاگئی۔

''مگر کم از کم پورٹ بلیئر تک ہی پہنچنے کی کوشش کرو۔''

''ناممکن، وہاں تک جانے کے لیے اتنا فیول نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو خود ہی ڈائل دیکھ لو...... تمہاری ضد سے مجبور ہو کر اگر میں پورٹ بلیئر کا رخ کر بھی لوں تو خطرہ ہے، فیول گہرے سمندر میں ختم ہو جائے گا اور ہمارے تعاقب میں آنے والے اسی طرح کی بوٹس میں ہمیں بہ آسانی گھیر لیں گے۔''

اسے اب میری بات سمجھ میں آئی اور وہ چپ ہو رہا۔
میں منصوبے کے مطابق بالآخر بوٹ کو ساحل کے ساتھ ساتھ ہی دوڑاتا رہا اور پھر ایک طرف روک کر بوٹ سے اُتر گیا اور نصیر شاہ کو بھی جلدی سے نیچے اُترنے کا کہا۔
ہمارے سامنے اب نیم پہاڑی علاقہ تھا، جس کی سنگلاخ ڈھلانوں پر جنگل اُگا ہوا تھا۔ ہماری اصل اور خفیہ کمین گاہ کا ادھر ہی ٹھکانا بنایا گیا تھا۔ میں اسے لیے مقررہ سمت بڑھا مگر آگے بڑھنے سے پہلے نصیر شاہ کو دکھانے کی غرض سے میں نے بوٹ کو اسٹارٹ کر کے خالی ہی اس کا رخ کھلے سمندر کی طرف کر کے بڑھا دیا۔ تاکہ تعاقب میں آتے ہوئے دشمنوں کو ہماری کمین گاہ کا شبہ نہ ہو سکے، یہ بات بھی میں نے نصیر شاہ کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھا تھا تاکہ وہ اس ڈرامے کے بھرپور رنگ میں رنگ جائے۔ اس کے بعد ہم دونوں تاریکی میں آگے بڑھ گئے۔ میری کوشش تھی یہ سب کچھ نصیر شاہ کو اچانک اور بالکل فطری لگے۔
مجھے اس راستے پر جس خفیہ ٹھکانے کے بارے میں بتایا گیا تھا وہ یہاں سے بمشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہمارا تعاقب بھی کیا گیا تھا غرضیکہ ان سارے ''لوازمات'' کا استعمال کیا گیا تھا جو کسی قیدی کے اس طرح فرار کے مواقع پر کیا جاتا ہے۔ جس کے تحت ہمارا تعاقب بھی کیا گیا تھا اور فائرنگ بھی کی گئی تھی۔
بالآخر ہم دونوں گرتے پڑتے اس نیم چٹانی جنگل میں داخل ہونے کے بعد اس پرانے کاٹیج کے قریب جا پہنچے، جو ہماری ''خفیہ'' کمین گاہ کے طور پر استعمال ہونے والی تھی۔
بظاہر یہ ایک شکاری کیبن ہی نظر آتا تھا۔ ہم اس کے اندر داخل ہو گئے۔ یہ دو چٹانوں کے درمیان ایک ایسے درے کے بیچ میں اور قدرے نشیب میں واقع تھا کہ بادی النظر میں کسی کی اس طرف نگاہ ہی نہیں جا سکتی تھی۔
اندر گھپ تاریکی تھی۔ باہر سناٹا تھا۔ دور کہیں کسی جنگلی جانور کے چلانے کی اچانک آواز ابھرتی تو سناٹے کی چادر پر جیسے خنجر چل جاتا اور وہ دور تک چاک ہوتی چلی جاتی تھی۔
چاند کی سنہری روشنی ہر سو ایک طلسماتی سی اثر پذیری چھوڑے ہوئے تھی۔ کیبن کے اندر بھی اس کی ضوفشانی بکھری ہوئی تھی۔
یہ ایک مکمل طور پر لکڑی کا کیبن تھا جو زیادہ خستہ حالی کا تو شکار نہ تھا مگر کچھ متروکہ سا ضرور نظر آتا تھا۔ چونکہ ساحل سے یہ زیادہ دور نہ تھا اسی لیے یہاں قریب میں ہی ایک قدرتی پہاڑی نالا بھی بہہ رہا تھا جس کی بلندی سے آبشار کی طرح کا بہاؤ ایک تسلسل سے گر رہا تھا۔ یہ پانی یقیناً کسی قدرتی بننے والی ''کاریز'' کا شاخسانہ ہی ہو سکتا تھا جو سمندر کی طرف سے کسی کٹاؤ کا رہین منت تھا۔ بیک وقت جھرنے اور آبشار کا احساس دلاتا پانی گرنے کا شور رات کی دم بہ خود سی خاموشی میں عجیب سا جلترنگ پیدا کرتا تھا۔
کیبن کی حالت اندر سے بھی خاصی سالخوردہ تھی۔ ہر شے بکھری ہوئی تھی۔ یہی میں چاہتا تھا، ورنہ ہر شے اپنی جگہ اور نتھری ستھری ہوتی تو نصیر شاہ کے دل میں کوئی کھٹک پیدا ہو سکتی تھی۔ تاہم اس بہانے سے کچھ ایسی ضروری اشیا بہم پہنچا دی گئی تھیں، جو ہمارے یہاں کچھ عرصہ رہتے ہوئے کام آسکیں، میں نے اور نصیر شاہ نے ان ساری اشیا کو ترتیب سے لگا دیا۔ ایک دو لیمپ ملے، جن میں تھوڑا بہت کیروسین آئل بھی تھا۔ ایک کو میں نے روشن کر دیا تھا۔ لکڑی کے تختہ نما دو بستر تھے۔
''لگتا ہے یہاں کوئی شکاری ٹیمیں آکر رہتی رہی ہیں اسی لیے ان کی اشیا بچی ہوئی ہیں۔'' میں نے خیال ظاہر کیا تو نصیر شاہ بولا۔
''لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے، مگر کیا تمہارا یہاں زیادہ دن ٹھہرنے کا پروگرام ہے؟''
''پتا نہیں۔'' میں نے شانے اُچکائے۔ ''حالات دیکھ کر ہی کچھ فیصلہ کیا جا سکتا ہے مگر ہمیں کسی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔'' میں کچھ ٹھہر کر بولا۔
''کچھ عرصہ ہمیں ادھر ہی روپوش رہتے ہوئے دشمنوں پر یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ ہم ان کے علاقے سے ہی نہیں بلکہ اس جزیرے سے بھی نکل چکے ہیں، میں نے وہ بوٹ اسی لیے کھلے سمندر میں چھوڑ دی تھی مگر ابھی ہماری پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔''
''تم بہادر ہی نہیں بلکہ.... ذہین بھی ہو جمال! بہت کمال کر دیا تم نے یہ سب کر کے۔'' نصیر شاہ نے میری بہادری سمیت میری ذہانت کی بھی توصیف کر ڈالی تو میں دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا کہ اب اسے کیا پتا تھا کہ یہ سب کچھ ''پلانٹڈ'' تھا۔
کچھ خشک خوراک کے ڈبے اور ٹن تھے۔ کونے میں کچن تھا، اس کی بھی حالت کچھ ابتر سی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر کچن کی حالت سدھاری۔
یہ بالکل ایک ایسا ہی ایڈونچر لگتا تھا، جیسے ہم کسی غرقاب شدہ جہاز سے اپنی جانیں بچا کر ایک ویران سے

جزیرے میں آن بسیں ہوں اور اب ہماری بقا کی جنگ شروع ہونا تھی۔

یہ سب نمٹانے کے بعد میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ''اپنا کام'' سے میری مراد یہی تھی کہ اس میں بلراج وغیرہ کے منصوبے کا کوئی دخل نہ تھا اور وہ کام یہ تھا کہ میں نصیر شاہ کو اصل حقیقت بتانے سے پہلے یہ تسلی کر لینا چاہتا تھا کہ کہیں یہاں بھی تو کوئی خفیہ کیمرا یا مائیکروفون نصب تو نہیں، جن سے ہماری یہاں ہونے والی ساری گفتگو ڈارک کیسل کی اُدھوری عمارت میں فروکش، کے ایل ایڈوانی اور بلراج سنگھ سن رہے ہوں۔

اگرچہ اس کا امکان کم ہی تھا کیونکہ میں ان دونوں پر اپنا اعتماد قائم کر چکا تھا تب ہی تو اُنہوں نے مجھے اپنے اس اہم ترین راز اور مشن کے لیے منتخب کیا تھا۔

پوری طرح تسلی ہو جانے کے بعد میرے وجود میں عجیب سی سنسنی دوڑنے لگی تھی۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ میں اب نصیر شاہ سے وہ بات کرنے والا تھا جس کا تعلق خالصتاً میرے پلان سے تھا۔ یعنی اس کا تعلق بلراج سنگھ وغیرہ سے نہ تھا۔ نصیر شاہ کے لیے یہ دوسرا ''شاک'' ہو سکتا تھا اور میرے لیے خطرے کا باعث بھی، اگر وہ ڈرپوک ثابت ہوتا اور انکار کر دیتا، تو میرے لیے دونوں ہی صورتوں میں مصیبتیں کھڑی ہو جاتیں، مگر زندگی نے مجھے یہی تو سکھایا تھا کہ رسک لیے بغیر کوئی بھی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ تاہم نصیر شاہ کا اپنی دریافت کے سلسلے میں پُرعزم ہونا ظاہر کرتا تھا کہ وہ ضرور میرا ساتھ دینے پر تیار ہو جاتا۔

بہرحال معاملہ حساس اور نازک بھی تھا مگر کامیابی کی صورت میں میرا ڈبل کراس منصوبہ دوررس نتائج کا حامل بھی کہلاتا۔ یہ رسک لینے کا فیصلہ اور اس پر عمل درآمد کرنے کے سوا اب میرے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں بچا تھا۔ کیونکہ میرے نزدیک ایڈوانی کے اس بھیانک منصوبے کو اس نامراد سمیت سبوتاژ کرنا ہی اوّلین مقصد تھا۔

جب رات کچھ مزید سرک گئی اور میں یونہی اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد... کیبن کے ایک کمرے میں نصیر شاہ کے سامنے بیٹھا تو میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اصل بات کی ابتدا کرتے ہوئے کہا۔

''نصیر شاہ! مجھے ایک بات بتاؤ، تم نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر اور اتنی محنت اور دشوار گزار سفر کے بعد ایک یونینزا پروجیکٹ کے حامل دریافت کا سہرا اپنے سر پر سجایا تھا، کیا تم نہیں چاہتے کہ وہ پایۂ تکمیل تک پہنچے؟''

نصیر شاہ میری بات سن کر کچھ ہکا بکا سا ہو کے میرا منہ تکنے لگا۔ لیمپ کی مدھم سی روشنی میں اس کے چہرے اور آنکھوں سے کچھ ایسے تاثرات اُمڈتے ہوئے نظر آنے لگے جیسے اُسے مجھ سے ایسی بات کرنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ جو شخص اپنی آزادی کے لیے یہاں تک جستجو میں مصروف تھا بھلا اسے کیا پڑی تھی ایسی بات کرنے کی۔ غالباً یہی بات اس کے لیے حیرت کا سبب بنی تھی۔ وہ بولا۔

''میرا عزم اور عہد اپنی جگہ مگر تم کیوں ایک دم اس میں اتنی دلچسپی دکھانے لگے؟''

اس کی بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا ذہن اب میری طرف سے شکوک و شبہات کا شکار ہونے والا ہے تو میں نے اسے سب کچھ بتا دیا...... جسے سُن کر وہ کئی ثانیوں تک ہکا بکا سا میرا چہرہ تکتا رہا تھا۔

''ہاں، میرے بھائی! نصیر شاہ......! حقیقت یہی ہے کہ میں وہ نہیں جو تم سمجھ رہے تھے مجھے یا جو کچھ میں نے تمہیں اپنے بارے میں بتایا تھا۔'' میں نے آخر میں جیسے اپنی سچائی اور بات کا احاطہ کرنے کی غرض سے کہا۔

''جیسے میں اب تک اپنے نیک عزائم کے آگے ڈٹا ہوا ہوں تو میں تم سے بھی یہی اُمید کروں گا کہ تم بھی انسانیت کی بھلائی کی خاطر اپنے اس نیک مقصد سے پیچھے نہیں ہٹو گے۔ تمہارا مقصد صرف دولت اور اپنی فیلڈ میں شہرت کمانا ہی نہیں ہونا چاہیے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ تم ایک ایسے قبیلے کو اپنی اس مہم کے ذریعے خوش حال کر دو جو بے چارے پہلے ہی ان غاصبوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور اپنی ہی سرزمین میں قیدی بن کر بیگار کاٹ رہے ہیں جبکہ یہ لوگ اسلام سے بھی متاثر ہیں۔ انسانیت اور مذہب کے حوالے سے بھی کیا تم پر فرض نہیں بنتا کہ ان کی مدد کرو......؟ ورنہ یہ مت سمجھنا کہ اگر تم کان کھودنے سے باز رہو گے اور اپنی جان بچا کر بھاگ بھی جاؤ گے تو یہ جنرل...... ایڈوانی اور اس کے ہم عصر جنرلز بڑے اثرورسوخ والے اور بے پناہ وسائل کے حامل ہیں، تم نے یہ راز آشکارا تو کر ہی دیا ہے کہ یہاں ہیروں کی کان ہے، یہ لوگ دوسرے ذریعے سے اسے کھدوانے کی کوشش کریں گے، پھر سوچو کیا ہوگا؟ یہ صرف ایک جاوا قبیلے کا نقصان نہیں ہوگا میرے مسلم بھائی نصیر شاہ! بلکہ یہ پوری دنیائے انسانیت پر ستم ہوگا۔ ان کا ''ورلڈ بگ بینگ'' جیسا بھیانک منصوبہ پورا ہو جائے گا۔ وہ کریہہ تاریخ پھر دہرادی جائے گی جو آج سے کئی سال پہلے ہٹلر نے نجانے کتنے بے گناہ انسانوں کے لہو سے لکھی تھی۔

کہیں پھر کوئی ملک کوئی شہر بلکہ کیا خبر پوری دنیا ہی ہیروشیما اور ناگاساکی بنا دی جائے۔ سوچو...... غور کرو...... فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے...... میرا ساتھ دو گے یا پھر فرار کو ترجیح دو گے، میرا وعدہ ہے، تم اگر فرار چاہتے ہو تو میں تمہاری اب بھی پوری مدد کروں گا، مگر پھر تم اپنے ضمیر پر یہ بوجھ لے کر کتنا عرصہ جی لو گے؟ پانچ سال، دس سال، پندرہ سال یا پچیس سال، آخر تو تمہیں اور ہم سب کو مرنا ہی ہے ناں...... تو کیوں نہ کوئی نیک کام کر جائیں جو ہماری آخرت بھی سنوارنے کا باعث بنے۔''

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کاٹیج کے باہر تاریک سناٹا تھا۔ ہر سو ہو کا عالم تھا، پاس ہی جھرنے بہنے کا اسرار بھرا سرسراتا ہوا ہلکا شور اُبھر رہا تھا۔ کاٹیج کی فضا بھی جیسے ایکا ایکی دم بہ خود سی ہو گئی تھی۔ تب پھر اسی دھڑکتی ہوئی خاموشی میں نصیر شاہ کی فرط جوش و جذبے تلے آواز ابھری۔

''خدا کرے کہ تم نے ابھی جو مجھے ساری حقیقت بتائی ہے، وہ سب سچ ہو...... اللہ کرے کہ تم نے اب بھی مجھ سے کوئی جھوٹ نہ بولا ہو اور واقعی تم اپنے کاز میں سچے بھی ہو تو یقین کرو شہزی! میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھوں گا کہ میں نے یہ نیک کام کرنے کی بالآخر وہ عظیم سعادت حاصل کر لی جس کی تکمیل اب میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکی ہے۔ میں بھی تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا بھرپور ساتھ دوں گا، میں تو زندگی سے مایوس ہی ہو گیا تھا مگر موت سے پھر بھی نہیں ڈرتا تھا، بس ایک ہی قلق تھا کہ میرا مشن ادھورا رہ جائے گا، لیکن اب مجھے خوشی ہو گی کہ میرا مشن ضرور پورا ہو گا۔ تب مجھے موت بھی آجائے تو میرا ضمیر اور دل تو مطمئن ہو گا۔''

اس کی بات سن کر میں نے بے اختیار اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور بولا۔ ''یہی سچ ہے دوست! میرے مسلم بھائی! جو میں نے تم سے کہا اور تمہیں پوری تفصیل سے بتایا بھی ہے...... تم اگر اسی طرح میرا ساتھ دیتے رہے تو یقین کرو، یہ کھیل کچھ دنوں کا ہے، کیونکہ میں اور میرے ساتھی ان دشمنوں کی جڑیں کاٹنے میں پہلے سے ہی مصروف ہیں اور ہم یہاں بہت سی پلاننگ کی ابتدا کر چکے ہیں، بس اب دشمن پر آخری وار کرنے کی دیر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اسے اپنے تینوں جری ساتھیوں، کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ سمیت جادی حسینہ باربیہ کے بارے میں بھی بتا دیا، جو روپوش سردار خاندان اور ان کے ساتھیوں کی جاسوس بھی تھی۔

''تب پھر میں یہی کہوں گا کہ آفرین ہے تم پر بھی...... اور تمہارے ساتھیوں پر کہ تم سب یہاں ایک نیک مقصد کے لیے اپنی جانیں جوکھم میں ڈالے ہوئے ہو...... لیکن اب مجھے بھی اپنے ساتھ ہم رکاب و ہم قدم ہی سمجھو۔'' نصیر شاہ یہ کہتے ہوئے مجھ سے ایک بار پھر بھرپور طرح بغل گیر ہوا اور بڑی گرم جوشی سے ہاتھ بھی ملایا۔

''مجھے بتاؤ شہزی! اب تمہارے ذہن میں کیا پلاننگ آتی ہے؟'' اس نے آخر میں پوچھا تو میں ایک گہری اور پُرسوچ ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

''پلاننگ تو میرے ذہن میں بہت پہلے سے ہی تھی، مگر اب ایڈوانی کے تازہ ترین مگر ناپاک عزائم جان کر میں نے اس میں کچھ ترمیم کی ہے۔ بس یوں سمجھو سب کچھ ویسا ہی کرنا ہو گا، جیسا یہ چاہ رہے ہیں...... اس طرح ہمیں دہرا فائدہ ہو گا، سرمایہ ان کا لگے گا، مدد بھی ان کی ہو گی لیکن آخر میں جب سب کچھ ہماری اور ان کی مرضی کے مطابق کام پورا ہو جائے گا تو پھر ایڈوانی اور بلراج سمیت ان کے زرخرید کتوں کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی جائے گی، تب تک میں اور میرے ساتھی اندر ہی اندر دونوں سانپوں کی جوڑی کی باموں میں آگ گرم رکھیں گے۔''

نصیر شاہ میری بات سن کر بڑے کھلے دل سے متاثر کن مسکراہٹ سے بولا۔ ''ویل ڈن شہزی! بلاشبہ تمہارا منصوبہ شاندار ہے...... مگر یہ بتاؤ اب تم میرے سلسلے میں انہیں کیسے اعتماد میں لو گے؟ کیا ایڈوانی اور بلراج اتنے ہی بے وقوف ہوں گے کہ تمہاری اس بات کا یقین کر لیں گے کہ تم نے مجھے راضی کر لیا ہے؟''

''یہ میں نے کب کہا؟'' میں نے کہا۔ ''ان کا منصوبہ یہ تو ہرگز نہ تھا کہ میں تمہیں رضامند کروں کیونکہ یہ تو انہیں بھی پتا ہے کہ تم کبھی مان کے نہیں دو گے، ان کا تمہیں فرار کرانے کا اور ہی مقصد تھا، وہ یہ کہ میں تمہیں فرار کے بہانے یہاں طے شدہ مقام پر لاکر روپوشی اختیار کیے رکھوں اور پھر تمہارے سامنے میں خود کو بھی ان کا ایک قیدی ظاہر کرتے ہوئے خود کو ممبئی کے کسی تاجر کا اکلوتا بیٹا بتاؤں اور تمہیں اس بات پر رضامند کروں کہ میرا باپ جس کا شمار ممبئی کے ہی نہیں بلکہ پورے بھارت کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے، اور مزید یہ کہ یہاں رہتے ہوئے مکمل اعتماد میں لینے کے بعد تمہیں کان کی نشاندہی اور اس کی کھدائی کے لیے رضامند کروں، اپنے فرضی باپ سے تمہارے اس میگا پروجیکٹ کے لیے سرمائے کا بھی بندوبست کروں، اس کے بعد خفیہ

طور پر تم کان کی کھدائی کا کام شروع کر دو، اس سلسلے میں تمہیں لیبر (مزدور) بھی فراہم کیے جائیں گے جو درحقیقت ایڈوانی کے ہی آدمیوں کی وہ ٹیم ہوگی جن میں مائننگ انجینئرز بھی شامل ہوں گے۔ تب تک ایڈوانی وغیرہ یہی ظاہر کریں گے کہ وہ تمہاری اور میری تلاش میں ناکام ہو کر اس پروجیکٹ سے ہی بددل ہو گئے ہیں اور اب یہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے ہیں، کیونکہ اب حکومت کی مداخلت بھی اس خطے میں ہونے لگی تھی وغیرہ......''

میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''بس! دوست، یوں سمجھو سب کچھ ویسا ہی ہوگا جیسا کہ وہ چاہتے تھے، مگر تب تک میں اور میرے ساتھی، موقع پاتے ہی اور ایک مناسب وقت میں ایڈوانی اور بلراج کا خاتمہ کر ڈالیں گے، کلی منجارین کو مار بھگانے میں جاوا کے روپوش جنگجو کافی ہوں گے، یوں بھی ایڈوانی وغیرہ کے مارے جانے کے بعد کلی منجارین کی طاقت ختم ہو جائے گی۔''

''شاندار منصوبہ ہے۔'' نصیر شاہ نے کہا۔

اس طے شدہ لائحہ عمل کے بعد دو راتیں اور دو دن کیبن میں گزار کے میں اکیلا ہی ڈارک کیسل پہنچا اور ایڈوانی وغیرہ کو ''گرین سگنل'' دے دیا۔

''ویل دیال داس......! ویل۔ تم ہماری توقعات پر پورے اُترے ہو۔ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے، ایسا کام جو ہم نہ کر سکے۔'' ایڈوانی نے مجھے اپنے گلے لگاتے ہوئے بے پناہ مسرت سے کہا، بلراج بھی وہیں موجود تھا اور اس کے مکروہ چہرے پر بھی شادمانی کے آثار تھے۔ شلپا بھی اسی کمرے میں موجود تھی۔ وہ بھی میری اس ''کامیابی'' پر خوش تھی۔

میں نے کسرِ نفسی کے طور پر کہنا ضروری سمجھا۔ ''جناب! میں کیا اور میری اوقات کیا ہے، یہ تو سب آپ لوگوں کی جامع اور مربوط منصوبہ بندی کا کارنامہ ہے، میں نے تو بس آپ کے وفادار کی حیثیت سے اس پر عمل کیا ہے۔''

''گڈ......'' بلراج نے کہا۔ ''جنرل صاحب ایک اعلیٰ دماغ اور فہم و فراست کے حامل انسان ہیں، اور ایسے ہی لوگ حکمرانی کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔''

وہاں ہلکے پھلکے جشن کا اہتمام کیا گیا۔ رتن لال اور سچانند جیسے ان کے کئی قریبی اور وفادار ساتھیوں کے علاوہ اور بھی لوگوں کو اس جشن میں شریک کیا گیا تھا۔

چند گھنٹوں بعد ایڈوانی اور بلراج سنگھ کمرے میں اکیلے رہ گئے تو میں نے انہیں پوری تفصیل کے ساتھ بریفنگ دے ڈالی کہ نصیر شاہ پر میں نہ صرف اپنا اعتماد قائم کر چکا ہوں بلکہ اسے کان کی کھدائی پر رازدارانہ طریقے سے رضامند بھی کر چکا ہوں، اور اب جزیرے سے نکلتے ہی میں ممبئی کا رخ کروں گا، جہاں اپنے فرضی باپ کو سرمایہ دینے کے لیے راضی کروں گا، جس کی مجھے پوری اُمید ہے کہ وہ انکار نہیں کریں گے، وغیرہ۔

لہٰذا اب میں چند دن یہاں ڈارک کیسل میں گزاروں گا اور تب تک کان کنی سے متعلق سارے سازوسامان کا بندوبست کر دیا جائے۔

میری اس بریفنگ کے بعد تیزی سے ترسیل کام شروع کر دیا گیا۔ یہ لوگ پہلے ہی سے ایک جرمن کمپنی سے کان کنی میں مستعمل ہونے والی بھاری مشینریز وغیرہ کا معاہدہ کر چکے تھے۔ جبکہ کھدائی والے مقام کی نشاندہی کے فوراً بعد ہی وہاں تک ایمرجنسی بنیادوں پر مزدور قیدیوں کو دن رات لگا کر سڑک کی تعمیر اور ایک ائراسٹرپ (ہوئی پٹی) بنوانے کا کام شروع کروانا تھا۔ اس ائراسٹرپ کو ''ہائی ٹیل'' کا نام دے گیا تھا۔

اس سلسلے میں بلراج کے ساتھ میری میٹنگ جاری تھی اور میں نے اسے نصیر شاہ کی ہدایت کے مطابق بتایا کہ کھدائی کے مقام پر قیدی مزدوروں اور مسلح محافظوں کے مستقل ٹھکانے کے لیے ایک بیس کیمپ ٹائپ کی ''خیمہ بستی'' قائم کرنا بھی ازبس ضروری تھا۔

بلراج سنگھ کا برتاؤ اب میرے ساتھ آفیسر اور ماتحت جیسا نہیں رہا تھا بلکہ اب وہ میرے ساتھ ایک ''کولیگ فرینڈ'' کی حیثیت سے پیش آ رہا تھا۔ میری حیثیت تو اب ایڈوانی تک کو تسلیم ہو چکی تھی، بلراج بھلا کس کھیت کی مولی تھا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ایڈوانی کی نظروں میں بلراج کی اہمیت کم اور میری زیادہ ہو گئی تھی۔ میرے لیے یہ کیا کم تھا کہ میں ان دونوں کا بھرپور اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اب اسی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے تینوں ساتھیوں کو ساتھ ملانے کا بھی بہترین موقع میرے ہاتھ آ چکا تھا، جس کے میں انتظار میں تھا۔ بلراج نے میری خواہش کے مطابق مجھے ایسے ساتھی چننے کا اختیار دے دیا تھا جو میری ٹیم میں شامل رہتے ہوئے ''افسرانہ شان'' کے ساتھ اس سارے کام کی دیکھ بھال کریں کیونکہ ظاہر ہے اب اس پورے پروجیکٹ کا ''سپروائزر'' لامحالہ مجھے بنا دیا گیا تھا۔ بلراج کے ذمے بیرونی کام تھے، تاہم اس کا اور

میرا عہدہ مساوی ہوگیا تھا، فقط وہ سینئر تھا، جبکہ رتن لال اور سچانند سرحدوں کے محافظ بٹالنوں کی سرکردگی میں مصروف تھے اور یہ دونوں ایک حد تک میری ماتحتی میں تھے۔ تاہم ان کے ذمے دشمن ٹولوں کی تلاش اور ان کی سرکوبی کرنا تھا، جن میں کوہارا اور شاکا سمیت اب بھولا ناتھ کا ٹولا بھی شامل ہو چکا تھا، ان کی تلاش جاری تھی۔ وہ میرے مقابلے میں بھی آسکتے تھے، کیونکہ وہ میرے دشمن تھے۔ ان میں کوریلا کا کیا بنا تھا؟ اور وہ کوہارا سے ناراض ہوکر کدھر غائب ہوگئی تھی، یہ مجھے نہیں معلوم تھا جبکہ سوشیلا کی طرف سے تو میں بالکل ہی مایوس ہو چکا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھی۔ آیا زندہ بھی تھی یا نہیں۔

میں اندرونی اور داخلی معاملات کے ''سیاہ وسفید'' کا مالک بن چکا تھا۔ بلراج مجھے فارملٹی کی حد تک سُپر ویژن کرتا تھا مگر اختیار میرا چلتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ ڈارک کیسل کے مجھ سمیت چار بڑے عہدے داروں، بلراج سنگھ، رتن لال اور سچانند کو کسی پاس کی ضرورت نہیں تھی، تاہم دوسروں کے لیے پاس جاری کرنے کا اختیار صرف بلراج سنگھ کو تھا۔ میں نے ایڈوانی اور بلراج کی خواہش کے مطابق وفاداروں کی ٹیم وغیرہ تشکیل دینے کے بہانے بلراج سے ڈارک کیسل میں آزادانہ آنے جانے کے لیے کچھ پاس جاری کرا لیے جن پر کے ایل ایڈوانی کے دستخط ہوتے تھے۔ جبکہ ہم چار بڑے عہدے داروں کو کسی پاس کی ضرورت سرے سے ہی نہیں تھی مگر یہ پاس میرے ساتھیوں، کبیل دادا اور اول خیر کے کام آسکتے تھے، یا وہ جاوی جنہیں میں باریہہ کی مدد سے اپنے ساتھ ملا لیتا۔

لہٰذا اس سے پہلے کہ قیدی مزدوروں کو ایک نئی جفاکشی میں لگاتا میں کبیل اور اول خیر وغیرہ کو اپنی ٹیم میں شامل کر لینا چاہتا تھا۔

اس مقصد کے لیے میں نے ایک سروے کے بہانے سب سے پہلے کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ سمیت چند اور بھی جاوی قیدیوں کے دانستہ ''انتخاب'' میں حصہ لیا۔ یہ جاوی ساتھی وہی تھے جن کے بارے میں باریہہ مجھے بتا چکی تھی۔

باریہہ بھی اب میری ''ٹیم'' میں شامل ہونے والی تھی۔ کبیل دادا کو یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اتنی بڑی کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ وہ مجھے اُستاد ماننے لگا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ یہ سب آسانی سے ہاتھ نہیں آیا تھا میرے، اس کے لیے میں بڑی صبر و استقامت اور کئی مواقع پر اپنی جان

خطرے میں ڈال کر اس سنہری موقع کی تلاش میں تھا، بے شک اس میں تقدیر کے ساتھ کا بھی دخل تھا.... تاہم اب موقع کی تلاش میں اور اپنے اہم مشن یعنی ایڈوانی کے قبضے سے وہ طلسمِ نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے میرا یہ مشن پہلے جس سست روی کا شکار ہوگیا تھا اب اس میں تیزی آگئی تھی۔

''کبیل دادا! تم اور باریہہ بظاہر میرے نائبین کی حیثیت سے رہو گے مگر ہم سب مشترکہ طور پر ہی اندر ہی اندر اپنا اصل مشن جاری رکھے ہوئے ہوں گے۔'' میں نے باریہہ کے جھونپڑے میں آکر کبیل دادا اور باریہہ کو ساری باتوں سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''باریہہ! تمہاری نگاہ میں جو جاوی ساتھی ہیں جن پر تم مکمل بھروسا اور اس حوالے سے اعتماد رکھتی ہو کہ وہ بغیر کسی ڈر و خوف کے ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں، انہیں ساتھ ملا لینا۔ یاد رہے، انہیں سمجھا دینا کہ انہوں نے اپنی کارکردگی سے خود کو ریاست ڈارک کیسل اور جنرل ایڈوانی کا وفادار ہی ظاہر کرنا ہے، انتخاب کے سلسلے میں غیر معمولی احتیاط سے کام لینا۔ ساتھی بے شک تھوڑے ہوں مگر پرفیکٹ اور کام کے ہونے چاہئیں۔''

باریہہ نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

''ایک کام اور کرنا ہوگا تمہیں باریہہ!'' میں نے ذہن میں ابھرنے والے ایک فوری خیال کے تحت اس سے کہا۔

''شنگرال اور رنالیہ کو بھی جا کر تمہیں بریف کرنا ہوگا، بلکہ موقع نکال کر کبھی میں بھی تمہارے ساتھ ہولوں گا ان کے پاس...... مگر تم یہ بتاؤ کہ میری تم سے اُس روز والی ملاقات کے بعد کیا تمہاری ان سے ملاقات ہوئی؟''

''میں تو اگلے دن کی صبح ہی اُن کے پاس یہ خوش خبری سنانے چلی گئی تھی کہ تمہاری صورت میں ہماری مظلوم قوم کو ایک نجات دہندہ مل چکا ہے۔'' باریہہ نے پورے جوش سے بتایا اور بولی۔ ''شنگرال اور رنالیہ نے تم پر بھرپور اعتماد کا بھی اظہار کیا ہے۔ ان کی بھی یہی خواہش ہے کہ وہ جلد از جلد تم سے مل سکیں۔''

''بس تو ٹھیک ہے پھر، انہیں اب تازہ ترین صورتِ حالات کے بارے میں جا کر آگاہ کر دینا اور اب بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا، ورنہ میری اب تک کی ساری محنت اور وقت تو ضائع جائے گا ہی بلکہ ہم سب کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ بڑی مشکلوں سے میں نہ صرف اپنے بلکہ اپنے ساتھیوں کے بھی یہاں قدم جمانے میں

کامیاب ہوا ہوں۔'' باربیہ اور گبیل دادا نے پورے استحکام کے ساتھ اپنے سروں کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے ہر طرح سے احتیاط روی سے کام کرنے کا اظہار کیا تھا۔

میرے جسم پر اب ایڈوانی کے سالار عہدے داروں والی مخصوص وردی تھی۔ اس کے بعد میں نے گبیل دادا اور باربیہ کو خصوصی پاس تھما کر قید خانے کی طرف اول خیر اور شکیلہ کو بھی ساتھ ملانے کے لیے روانہ کر دیا۔ ساتھ ہی باربیہ کو بھی یہ ہدایت کی کہ وہ ابھی سرِ دست صرف انہی ساتھیوں کو پاس تھمائے، جن پر اسے پورا اعتماد ہے اور بعد میں یہ سب ڈارک کیسل پہنچیں اور شلپا نامی ایک لڑکی سے ملاقات کریں، میں تب تک اُس سے وائرلیس سیٹ پر رابطہ کرتا ہوں۔ (ویسے مجھے ایک بٹن جتنا چھوٹا ٹرانسمیٹر بھی دے دیا گیا تھا تاکہ میں فوری طور پر رابطے میں رہ سکوں، یہ بٹن نما جدید طرز کا اسپائی ٹرانسمیٹر میرے دائیں کالر کے نیچے لگا ہوا تھا) بلکہ ہوسکتا ہے میں وہیں چلا جاؤں اور اب ہماری ملاقات ڈارک کیسل میں ہوگی، کیونکہ آگے میں نے ہی تم لوگوں کو ایڈوانی کے ''وفاداروں'' کی حیثیت سے گائڈ بھی کرنا ہے، مگر خبردار! وہاں کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکلنی نہ پائے، جو انہیں ہمارے حوالے سے شک وشبہے میں مبتلا کر ڈالے، کیونکہ وہاں جگہ جگہ خفیہ کیمرے اور مائیکروفون نصب ہیں۔ کوئی بات کرنی ہو، کوڈ میں کریں گے، جس کے بارے میں بعد میں تمہیں بتاؤں گا، تاہم میری پہلی کوشش یہی ہوگی کہ تم سب کو بیس کیمپ میں منتقل کر دوں، تاکہ ہم آرام سے اور بغیر کسی خوف کے اپنا آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرتے رہیں۔

ان دونوں کو رخصت کر کے میں جیپ میں اپنے ماتحت ساتھیوں (دشمن کے ساتھیوں) کے ساتھ اس جگہ پہنچا جہاں اور بھی مسلح ساتھی موجود تھے۔ وہ سب مجھے دیکھ کر ایک دم الرٹ اور دست بستہ ہو گئے۔ میں نے انہیں ایڈوانی سے ملنے والے احکامات سے آگاہ کرتے ہوئے کچھ معمول کی ضروری ہدایات دیں اس کے بعد وہاں سے ڈارک کیسل پہنچا۔

بلراج بیرونی معاملات نمٹانے کے لیے پورٹ بلیئر گیا ہوا تھا۔ اب وہاں بلراج کے بعد میرا ہی حکم چل رہا تھا۔ حتیٰ کہ شلپا بھی میری ماتحتی میں آ گئی تھی۔ مگر میں نے اس سے پہلے جیسے ہی دوستانہ تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دل کش انداز میں مسکرائی ....

''نیا عہدہ ملنے کی تمہیں بھرپور طریقے سے بدھائی تو مل ہی چکی ہے مسٹر دیال داس! مگر اب ہمیں مت بھول جانا۔'' اُس نے یہ بات مجھ سے ایک نرالی ادا کے ساتھ کہی تھی اور میں بھی جیسے عاشقانہ سے انداز میں بولا۔

''آپ جیسی حسین ساتھی کو بھلا کون کافر بھول سکتا ہے۔''

''او......'' اس نے مسرت آمیز انداز میں اپنے نرم و گداز لبوں کو گولائی کی شکل دی تو ایسے میں اس کے حسن کی خرمستی دیکھنے کے لائق تھی، مگر میرا اس میں دلچسپی لینا مجبوری تھی۔ اس کا ''افسر'' بننے کے بعد میں کم از کم شلپا کے ساتھ ایسی کوئی فضا قائم نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے ہمارے درمیان.... کسی قسم کی ''پروفیشنل جیلسی'' جیسے جذبات پروان چڑھتے بلکہ شلپا ہی کیا، میں تو رتن لال اور سچانند کے ساتھ بھی ایسا ہی دوستانہ برتاؤ رکھنے کی کوشش کرتا۔ کیا خبر اس جیلسی کی آڑ میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے اور بلاوجہ کی مشکل کھڑی ہو جاتی۔

بہر حال شلپا کو تھوڑا اُلجھانے کے بعد میں ایڈوانی کے کمرے میں گیا اور اسے معمول کی رپورٹ پیش کی، اس کے بعد شلپا کو بھی نئے بھرتی ہونے والے وفاداروں اور ساتھیوں سے متعلق بریف کیا جو یہاں آنے والے تھے۔ ان کی یہاں رہائش اور لاجسٹک کی فراہمی کے سلسلے میں اسے کچھ ہدایات دیں اور پھر اپنے کمرے میں آ کر تھوڑا آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔

شلپا میری قربت کے لیے بے قرار ہوئی جا رہی تھی اور میں بدستور بہانے بہانے سے اسے ٹالے ہوئے تھا۔ اس نے جب جگانے کے لیے میرے کمرے میں انٹری دی تو میں فقط ٹائٹ پینٹ میں بیڈ پر بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ میرا کمرا کشادہ اور آرام دہ تھا۔ ضرورت کی ہر شے وہاں موجود تھی جیسی کہ کسی عہدے دار کو تفویض کی جانی چاہیے۔

میں جب آنکھیں ملتا ہوا بیڈ پر اُٹھ بیٹھا تو وہ ہاتھ میں چائے کا کپ تھامے کھڑی تھی۔ اس کے گداز اور نرم لبوں پہ بڑی سیکس اپیل مسکراہٹ رقصاں تھی اور وہ مجھ پر بیباکانہ انداز میں جھک آئی تھی۔

میرے جی میں تو آئی کہ اسے پرے دھکا دے دوں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ڈارک کیسل کے اندر میرا اس سے ایسا سلوک گویا ایسا ہی تھا جیسے سمندر میں رہتے ہوئے مگرمچھ سے بیر لینا۔

لہٰذا میں نے مصلحت کوشی کا گھونٹ بھرتے ہوئے جبراً محبت بھری مسکراہٹ سے اسے خود سے لپٹا لیا اور

دھیرے سے اور کچھ شرمیلے پن کی اداکاری کرتے ہوئے اس کا نرم و نازک گال چوم لیا کہ مجھے اپنی جانب مائل بہ اُلفت سمجھے کہ میں اس کے حسنِ تجلی کا شکار ہونے لگا ہوں، اسے خود سے پیار بھرے انداز میں دور کرتے ہوئے بیڈ سے اُٹھ بیٹھا اور اس حرکت پر جھینپتے ہوئے بولا۔

''یہاں خفیہ کیمرے نصب ہیں، کہیں چھوٹی یا بڑی سرکار کو ہماری کوئی حرکت بُری نہ لگے۔''

''تم ڈرپوک ہی نہیں خاصے شرمیلے بھی ہو، ایسی کوئی بات نہیں، یہاں جو بھی ایک دوسرے سے اپنی اپنی انڈراسٹینڈنگ کے مطابق اگر ایک دوسرے کا قریبی ساتھی یا دوست بن جاتا ہے تو اس پر کسی بھی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ چاہے وہ ایک ہی کمرے میں کیوں نہ رات گزار لیں.....'' وہ کھنکتی ہوئی ہنسی سے بولی۔

اس کی ''رات گزارنے'' والی بات پر مجھے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

''یہاں کے مینرز میں، بڑی یا چھوٹی سرکار کے لیے جو سب سے زیادہ ناپسندیدہ بات ہے وہ دو ساتھیوں کا آپس میں تکرار اور جھگڑا ہے۔ یہ بات یہاں ناقابلِ معافی سمجھی جاتی ہے اور پھر تمہیں کیا پروا ہے تم بھی تو اب چھوٹی سرکار بن چکے ہو، نہیں معلوم کہ تم اب بلراج کے بعد یہاں سیکنڈ اِن چیف ہو۔'' وہ آخر میں معنی خیز مسکراہٹ سے بولی۔

''پھر بھی میں تو نیا ہوں اور اب بھی خود کو بلراج صاحب کی ماتحتی میں ہی سمجھتا ہوں۔''

میں نے کہا اور پھر چائے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ چائے کی چسکی لی اور موضوع بدلنے کی غرض سے کہا۔ ''میں نے حسبِ وعدہ نئے ساتھیوں اور وفاداروں کی کھیپ تیار کر لی ہے۔ وہ آنے ہی والے ہوں گے۔ انہیں ابتدائی ہدایات دینے کے بعد روم نمبر سیون میں بھیج دینا۔''

''کتنے ساتھی ہیں؟''

''ابھی فی الحال تو آٹھ، دس کے قریب ہوں گے مگر ان میں چند ایک مستقل طور پر میرے ساتھ ہی ہوں گے، باقی کو تم ہی ڈیل کرو گی اور ہاں شلپا جی! ان میں زیادہ تر قیدیوں جیسی حالت میں ہیں، پہلے انہیں فریش ہونے اور نیا لباس دینے کے علاوہ کچھ کھانے پینے کا ان کے لیے بندوبست کر دینا۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جنہیں میں نے ہر طرح جانچ اور پرکھ لیا ہے۔ یوں بھی ہمارے نئے میگا پروجیکٹ کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت پڑے گی جو ٹیم ورک کی صورت میں ہمارے کام آتے رہیں۔''

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ چلی گئی۔ میں نے بھی قدرے سکون کی سانس لی۔ وہ خاصی ''تیاری'' کے ساتھ اور ''خاص'' مقصد کے لیے ہی اس طرح یوں میرے کمرے میں آ گئی تھی۔ اب میں نے بھی اس سے ''محتاط'' رہنے کا سوچ لیا تھا، اس کا یہی طریقہ تھا کہ میں خود کو یہاں ریاست کے کاموں میں اس قدر مصروف کر لوں کہ اسے بھی میرے پاس تنہائی میں آنے اور ایسی کسی ''خرمستی'' کے لیے موقع ہی نہ مل سکے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے غسل وغیرہ کر کے نئی وردی چڑھا لی۔ ڈارک کیسل کا پورا عملہ اب میری نظروں میں تھا۔ کس کا کمرا کہاں تھا اور کون کیا کرتا تھا۔ باقی کمرے کن کاموں کے لیے مستعمل تھے، وہ سب میں نے ایک دو روز میں جان لیے تھے۔

مجھے طلسم نور ہیرے کی تلاش تھی۔ ایڈوانی اور بلراج کو جہنم واصل کرنے سے پہلے میں اپنے ملک کی...... امانت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا حصول یوں از بس ضروری ہو چکا تھا۔ کیونکہ ورلڈ بگ بینگ کا کریہہ ناک منصوبہ اسی ہیرے پر ہی انحصار کرتا تھا۔ ظاہر ہے وہ نادر اور قیمتی ہیرا کمرے کی میز پر تو مجھے رکھا ہوا نہیں ملنا تھا۔ اس کے بارے میں صرف مجھے ایڈوانی ہی بتا سکتا تھا اور اس سے ہیرے کے بارے میں پوچھنا اپنی موت کو آواز دینے کے ہی مترادف تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اب چونکہ میں بھی ان کے قریبی وفاداروں میں شامل ہو چکا تھا، ہوسکتا ہے کسی حوالے وہ مجبور ہو کر کبھی مجھ سے خود ہی اس کا ذکر بھی کر دے، مگر میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس نے ہیرے کے بارے میں سوائے بلراج سنگھ کے کسی اور کو بھی بتایا ہوگا۔

میں ابھی کمرے سے نکلنے ہی والا تھا کہ انٹرکام پر شلپا نے مجھے بتایا کہ نئی کھیپ آ چکی تھی اور اب وہ ان کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہے، اس کے بعد وہ ان سب کو میری ہدایت کے مطابق روم نمبر سیون میں پہنچا دے گی۔

''گڈ مس شلپا! میں ایک گھنٹے بعد وہیں، ملوں گا اور تم بھی ذرا وہاں آ جانا۔'' میں نے کہا اور دانستہ اسے بھی ساتھ رکھنے کا ارادہ کیا۔

ایک گھنٹے بعد میں روم نمبر سیون میں تھا جہاں شلپا لگ بھگ نو افراد کے ساتھ موجود تھی۔

مذکورہ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنے جذبات اور چہرے کے تاثرات کو مکمل طور پر ایک افسرانہ انداز کا روپ دے دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ

میرے چہرے اور لب و لہجے سے میرے اندر کے اُن جذبات کی ایک ذرا جھلک بھی ظاہر ہونے پائے جو یقینی طور پر اول خیر اور شکیلہ کو دیکھنے کے باعث ہوتی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس سارے ''منظرنامے'' کی ایک ایک جھلک اس وقت بلراج سنگھ نہیں تو ایڈوانی تو ضرور ہی کسی کمرے میں بیٹھا بہ غور دیکھ رہا ہوگا۔ بعد میں یہی ''ویڈیو ٹیپ'' بلراج سنگھ بھی ملاحظہ کرتا تھا۔

کبیل دادا سے تو میں ملتا رہتا تھا۔ مگر اول خیر اور شکیلہ کے سامنے میں دوسری بار جا رہا تھا۔ ان میں باریہہ کے علاوہ، کچھ جاوی قبیلے کے بھی لوگ شامل تھے، جو درونِ خانہ باریہہ کے ساتھی اور اپنے سابقہ سردار اور اس کے بیٹے اور بیٹی کے وفاداروں میں سے تھے مگر ایک مشترکہ مفاد کے لیے وہ میرا ہر طرح سے ساتھ دینے کے لیے تیار تھے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے بظاہر ایک طائرانہ سی نگاہ حاضرین پر ڈالی تھی۔ ان میں میری متلاشی نظروں نے اول خیر اور شکیلہ سمیت، کبیل دادا اور باریہہ کو بھی بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی منظر تھا جیسے کسی کلاس روم کا ہونا چاہیے۔

میری کرسی ان کے سامنے والی کرسیوں سے آٹھ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ جس کے برابر میں شلپا بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے اپنی مخصوص وردی میں دیکھ کر میں نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا۔ کبیل دادا کا لنگ اب بہتر ہونے لگا تھا، ٹانگ کی ہڈی پر کافی دن کھپچیاں باندھے رکھنے سے وہ اپنی جگہ آگئی تھی اور اس کا زخم بھی بھر چکا تھا جبکہ کوڑھ کے داغ جو ظاہر ہے مصنوعی ہی تھے، وہ بھی نئے حالات کے مطابق اور میرے ہی مشورے سے رفتہ رفتہ مٹانے لگا تھا اور اب برائے نام ہی داغ رہ گئے تھے۔

میز پر کچھ اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ میں اپنی کرسی پر آ کر براجمان ہوگیا۔ ایک نگاہ حاضرین پر ڈالی۔ اپنے ساتھیوں کے بشروں پہ ایک بے پایاں مسرت آمیز حیرت اور خوشی کے تاثرات میں دیکھ سکتا تھا، یقیناً وہ مجھے خطرناک دشمنوں کے درمیان میں اس ''پوزیشن'' میں دیکھ کر متحیر اور متاثر بھی ہو رہے تھے۔ تاہم میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کبیل دادا نے اول خیر وغیرہ کو اس سلسلے میں خاص طور پر بریف کر دیا تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھ کر اپنے اندرونی بلکہ ''بیرونی جذبات'' کو بھی خصوصی طور پر کنٹرول رکھیں، مگر...... میں اول خیر اور شکیلہ کے چہروں کو دیکھ رہا تھا کہ وہ باوجود کوششِ ضبط کے ایسا کرنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ ممکن تھا، تھوڑی دیر بعد ہی اس طرح کے جذباتی ہیجان سے نجات پا لیتے۔

میں نے ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے پہلے تو معمول کے مطابق انہیں ریاست اور جنرل ایڈوانی کی وفاداری کا دم بھرتے رہنے کا حلف لیا اور پھر انہیں اس ''وفاداری'' کے فوائد گنوائے اور انہیں جنرل ایڈوانی کا شکریہ بھی ادا کرنے کو کہا کہ جس نے ان سب کو اپنی وفاداری میں آنے کا موقع فراہم کیا جس کے عوض وہ اب شاہانہ زندگی گزارنے والے تھے، وغیرہ۔

اس کے بعد میں نے انہیں ان کا کام سمجھایا جو سرِدست عمومی نوعیت کا تھا۔ پھر انہیں نئے تعمیر ہونے والے بیس کیمپ کے بارے میں بھی بتایا جو میگا پروجیکٹ کی تیاری کے سلسلے میں اُس نو دریافت شدہ کان کے علاقے میں قائم کیا جانے والا تھا، جہاں ان سب نے ایک ٹیم ورک کے طور پر کام کرنا تھا۔

اس کام میں مجھے کم و بیش ایک سے ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا اور پھر سب کو رخصت کر دیا۔

اس کے کچھ دیر بعد جب میں جنرل ایڈوانی کو معمول کے مطابق اس کی رپورٹ کرنے اس کے کمرے میں پہنچا تو چونک پڑا۔

☆☆☆

وہاں شلپا موجود تھی اور جنرل ایڈوانی اس سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ چونکہ مجھے اور بلراج کو دستک دیے بغیر جنرل کے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت تھی اس لیے میں نے شلپا کو ایڈوانی سے آخری جملہ کہتے ہوئے سن لیا تھا۔

''سر! آپ بالکل چنتا نہ کریں، دیال داس، بلراج صاحب کی غیر موجودگی میں بھی سارا کام بہ خوبی سنبھالے ہوئے ہے۔''

شلپا کو میرے بارے میں ایڈوانی سے یہ کہتے سن کر مجھے اپنی احتیاط پسندی اور زود فہمی پر ازخود ناز ہونے لگا... کہ میں نے اب تک شلپا کے بارے میں جو اندازے اور اس سے اپنے برتاؤ کے لیے جو فیصلے کر رکھے تھے وہ ایسے غلط بھی نہ تھے۔ میرے علاوہ ایڈوانی اب بھی شلپا سے ہی کچھ خاص باتوں کی جان کاری لیا کرتا تھا۔ مجھے شلپا کی اہمیت کا بھی اچھی طرح احساس ہوگیا تھا۔ باقی میرے چونکنے کی وجہ اس سے زیادہ اہم تھی، جس نے مجھے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا تھا۔

جنرل ایڈوانی کی بھاری بھرکم چیئر کے دائیں جانب

جو بڑی سی اسکرین تھی۔ اس میں مجھے ایک جگہ پر اُس کیبن کا منظر نظر آیا تھا جہاں میں اور نصیر شاہ فروکش تھے۔ یہ بظاہر ہم دونوں کی خفیہ کمین گاہ تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ یہاں ابھی کوئی خفیہ کیمرا نصب نہیں کیا گیا ہوگا، مگر اب یہ سب میری نظروں کے سامنے تھا، ڈر مجھے اس بات کا تھا کہ یہ کب اور کس وقت نصب کیا گیا ہوگا؟ اس وقت، جب میں نصیر شاہ کو اپنے اس ڈبل کراس منصوبے سے متعلق تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا یا تب جب ان سب باتوں سمیت میں نصیر شاہ کو اپنے اعتماد میں لے چکا تھا؟ یقینی طور پر بعد میں ہی ایسا ہوا ہوگا، ورنہ میرا پول کھل جانے کے بعد میں اس وقت زندہ ہی کب ہوتا، میری اصلیت جان لینے کے بعد تو ایڈوانی مجھے بلاتاخیر ختم کروا دیتا۔ مگر اب بھی یہ میرے لیے پریشانی اور انتہائی تشویش والی بات تھی، کیونکہ اس طرح میں اب نصیر شاہ سے آزادی سے باتیں نہیں کر سکتا تھا، نہ وہ مجھ سے کرتا۔ اس سے بھی بڑھ کر اب فوری طور پر ہم دونوں کو یہ خطرہ لاحق ہو چلا تھا کہ میں اب کیسے نصیر شاہ کو یہ بات بتاتا کہ اب ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے؟ وہ مجھے دیکھتے ہی کہیں کوئی ایسی ویسی بات اپنے منہ سے نکال دیتا کہ یہاں بیٹھا ہوا ایڈوانی چونک جاتا۔ اس کے بارے میں مجھے بعد میں سوچنا تھا۔

''آؤ...... آؤ...... دیال داس! آجاؤ...... تمہارے ہی بارے میں شلپا جی سے باتیں ہو رہی تھیں۔'' مجھ پر نظر پڑتے ہی ایڈوانی نے کہا۔ شلپا بھی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں بھی بظاہر اپنے اندر کی تشویشناک بے چینی کو ایک فدویانہ سی مسکراہٹ تلے دباتا ہوا، قریب گیا اور ایک کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''جناب! میری تو یہی کوشش ہے کہ مجھ سے غیر دانستہ طور پر بھی ذرا سی غلطی نہ ہونے پائے......'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ میں اب ریاست کے معاملات اور اس کی حساسیت کو سمجھنے لگا ہوں۔ اس میں بلاشبہ بلراج صاحب اور شلپا جی کا بڑا ہاتھ اور ساتھ ہے۔''

میرے نپے تلے جملوں اور الفاظ کی ادائیگی میں ریاست اور ایڈوانی سے وفاداری کی وہ ساری جھلکیاں موجود تھیں، جس سے ایڈوانی جیسے مطلق العنان اور جابر شخص کی انانیت کو تقویت ملتی تھی۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم نے اپنے چند ہی کارناموں سے خود کو ہماری نوازشوں کے قریب کر لیا ہے، مگر تمہیں نئے وفادار ساتھیوں کی بھرتی اور انہیں غیر معمولی اہمیت دینے کے سلسلے میں احتیاط ضرور کرنا ہوگی۔ ہمارا تجربہ ہے کہ دشمن ہمیشہ وفاداری کے بھیس میں ہی دھوکا دیا کرتے ہیں۔'' جنرل ایڈوانی نے کھرکھراتے لہجے میں کہا تو مجھے اس کے ''تجربے'' کا دل سے قائل ہونا پڑا، کیونکہ ایک ایسا ہی ''وفادار'' میری صورت میں اس کی لنکا ڈھانے کے لیے اس کے بے حد قریب آچکا تھا اور وہ بے خبر تھا۔ یہاں وہ شاید اپنے کسی تجربے میں مار کھا گیا تھا یا پھر تقدیر میرا ساتھ دینے پر تلی ہوئی تھی۔

''آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے جناب!'' میں نے اپنے سر کو ذرا خم کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن ہمیں بہرحال افرادی قوت کی ضرورت پڑتی رہے گی اور اس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ ہم کچھ ایسے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملاتے رہیں جو بظاہر ہمارے ساتھی ہوں مگر حقیقت میں ہمارے ملازم نما غلام ہی ہوں، ان کی حیثیت اب بھی قیدیوں ہی کی سی رہے گی، ہم ان پر پوری نگاہ رکھیں گے۔ کامل بھروسا صرف ہم اپنے ہی چند آدمیوں پر کریں گے۔''

''گڈ...... ہمیں تمہاری یہ کارکردگی بھی پسند آئی۔ ایسا ہی ہونا چاہیے، میں ابھی شلپا کو بھی کچھ ایسی ہی ہدایت دے رہا تھا۔'' ایڈوانی نے کہا۔ اس کے بعد میں نے اسے معمول کی تھوڑی تفصیل سے آگاہ کیا پھر ایک نگاہ اسکرین پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''جناب! میرا تو خیال نہیں تھا کہ اس کیبن میں کسی خفیہ کیمرے کی ضرورت تھی۔ لیکن چونکہ یہ آپ ہی کا فیصلہ ہو سکتا ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔''

''ہاں! یہ ہمارا ہی فیصلہ تھا۔'' ایڈوانی نے ایک نگاہ اسکرین پر ڈالتے ہوئے کہا۔ اسکرین میں وہ نصیر شاہ کو دیکھ رہا تھا جو کیبن کی چوبی کھڑکی سے باہر جنگل کی طرف جھانک رہا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک بنیان اور پتلون نظر آرہی تھی۔

''ایک بات بتاؤ...... دیال داس!''

''یس باس!''

''کیا نصیر شاہ کو تم پر ذرا بھی شُبہ نہیں ہوا کہ جو کچھ تم نے ہمارے طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق اس سے کہا، اس پر اس نے اتنی آسانی سے اعتبار کر لیا؟''

''اس سلسلے میں آپ کی تشویش اور شُبہ غلط نہیں ہے۔'' میں نے چالاکی سے کہا۔ وہ اپنی بھویں سکیڑ کر بہ غور سوالیہ نظروں سے میرے چہرے کی طرف تکتا رہا۔ میں نے مزید کہا۔

''جناب! دراصل میں یہ کہتے ہوئے پہلے آپ سے معافی چاہوں گا کہ جو منصوبہ آپ نے نصیر شاہ کے سلسلے میں بنایا تھا، وہ اپنی جگہ درست سہی مگر اس میں کچھ ابہام تھا۔ ایسی کسی بھی منصوبہ بندی کے نقائص اور سقم عموماً اس پر عمل پیرا ہونے کے بعد ہی سمجھ میں آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہر طرح سے مکمل اور جامع اور مربوط منصوبے اور اس طرح کی گہری چالیں بُری طرح سے ناکامی سے بھی دوچار ہوتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا، جب میں نصیر شاہ کے ساتھ فرار ہو کے اس خفیہ پناہ گاہ پہنچا اور منصوبے کے مطابق میں نے اسے جب اعتماد میں لینے کی کوشش چاہی تو..... مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ نصیر شاہ سے یہ ساری باتیں ہضم نہیں ہو رہی تھیں اس لیے اس سے پہلے کہ وہ میری طرف سے بھی کسی شبہے کا شکار ہوتا، میں نے فوراً اپنے تئیں اس میں ذرا ترمیم کر ڈالی۔ اب وہ بالکل مطمئن ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے جنرل ایڈوانی کو اپنی چند ایک اضافی ترامیم سے آگاہ کیا جو میرے ذہن میں ہی تھیں اور مجھے اپنے ''ڈبل کراس'' منصوبے میں کام آنے والی تھیں۔ ایڈوانی یہ سن کر بے حد خوش ہوا۔ تاہم بولا۔

''مجھے بھی ڈر تھا کہ کہیں وہ ہماری طرف سے کسی شبہے میں نہ پڑ جائے اور تمہیں بھی ہمارا آدمی نہ سمجھنے لگے، کیونکہ بلراج نے جب یہ منصوبہ بنایا تھا تو اس میں مجھے کچھ خامیاں محسوس ہوئی تھیں، بلراج میرا پرانا اور وفادار ہی نہیں ذہین آدمی بھی ہے، لیکن یہ بات بھی ماننے والی ہے کہ اگر اس کے منصوبے میں خامیاں تھیں بھی تو تم نے اپنی ذہنی فراست کے مطابق اس میں حقیقت کا رنگ خوب بھرا۔ کیوں مس شلپا؟'' آخر میں اس نے شلپا کی طرف دیکھا تو وہ جھٹ سے میری تعریف میں ایک نگاہِ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''بالکل جناب! آپ کی بات درست ہے۔ ایک ایسے ضدی اور قیدی شخص کو یہاں رکھتے ہوئے کان کی کھدائی پر رضامند کرنا کچھ کم بڑا کارنامہ نہیں ہے، مگر دیال داس نے کھیل ہی ایسا کھیلا کہ وہ نہ سمجھ سکا۔''

''میں نے درحقیقت اس کی کمزوری بھانپ لی تھی۔'' میں نے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا۔ اور بھلا میں کیا کہتا۔ اگرچہ ان کی بات بھی غلط نہیں تھی، منصوبے میں کئی سقم موجود تھے، یہ تو میں نے ان کا بھانڈا پھوڑ کر اپنی اصلیت بتا کر نصیر شاہ کو رضامند ہی نہیں بلکہ اپنا ہم خیال بھی بنا لیا تھا، اس میں ان کے یا بلراج کے منصوبے کی کامیابی کا کیا دخل تھا بھلا۔

''میں چاہ رہا تھا کہ اس سے پہلے وہ کسی شک و شبہے کا شکار ہو، ہمیں تیزی سے کام کی ابتدا کر دینی چاہیے۔''

''کام کی ابتدا تو ہو چکی ہے، بیس کیمپ بن رہا ہے، عارضی ائر اسٹرپ اور سڑک کا کام ہنگامی بنیادوں پر جاری ہے، بھاری مشینری اور دیگر سامان تیسرے دن پہنچ جائے گا۔ سی اور اوٹر طیارے بھی ائر اسٹرپ بنتے ہی آ جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہم نے کچھ اور پروفیشنل مائننگ انجینئرز کا بھی بندوبست کیا ہے، بلراج انہیں لے کر پہنچنے والا ہے، ان کے کام سنبھالتے ہی، نصیر شاہ کی پھر ضرورت نہیں رہے گی اور پھر اسے اگلے جہاں پہنچا دیا جائے گا۔ باقی کام تو تمہارے سپرد ہے۔'' ایڈوانی نے سفاکی سے یہ کہتے ہوئے بات ختم کر دی۔ میں نے دل ہی دل میں اس رذیل انسان پر لعنت بھیجی کہ نصیر شاہ تو نہیں البتہ تیری قضا جلد آنے والی ہے۔

میں نے خفیہ کیمرے کے سلسلے میں ایڈوانی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے کمرے کے علاوہ اس کی ایک اسکرین شلپا کے کمرے میں بھی تھی۔ وہیں شلپا کے ساتھ بیٹھ کر اس کے ساتھ چند میٹھی میٹھی باتوں کے دوران میں نے کیمرے کی لوکیشن اور اس کی تعداد وغیرہ کا اس سے چالاکی سے اُگلوا لیا۔ اس کے بعد میں کام کے بہانے شلپا سے بھی جان چھڑا کر نکل آیا۔ مجھے کیبن کا رخ کرنا تھا اور پریشانی میں مبتلا تھا کہ اب نصیر شاہ سے کیونکر بات ہو سکتی ہے؟ بہت سوچ بچار کے بعد مجھے یہی ایک صورت سمجھ میں آسکی کہ اسے کسی طرح کیبن سے باہر لا کر ہی خطرے کی خبر کروں۔

میں وہاں پہنچا اور کیبن کے باہر کھڑا ہوا تو مجھے وہ کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوا نظر آ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اندر سے ہی کچھ بول نہ پڑے۔ تاہم میں نے اپنے ہونٹوں پہ اُنگلی رکھ کر اسے کیبن سے باہر آنے کا اشارہ کیا، تو وہ کچھ اُلجھن کا شکار نظر آنے لگا۔

اس نے بیک وقت اپنے ہاتھ اور سر کو سوالیہ انداز میں حرکت دی، جیسے پوچھنا چاہ رہا ہو کہ معاملہ کیا تھا، مجھے سخت کوفت ہوئی کہ وہ میری بات یا اشارہ سمجھنے کے بجائے خاموش سی بحث کر رہا تھا، بالآخر میں نے ہاتھوں کے اشارے سے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور اپنی ایک آنکھ پر مٹھی رکھ کر اسے خفیہ کیمرے اور دوسرے ہاتھ کا اُدھورا سا

بھونپو بنا کر اپنے کان پر رکھا۔ پھر کانیج کے اندر اشارہ کیا۔ وہ میرا اشارہ سمجھے بغیر کھڑکی میں کھڑے کھڑے ہی گردن موڑ کر اپنے پیچھے دیکھنے لگا اور میں نے دانت بھینچ کر اپنا سر پیٹ لیا۔ مگر پھر اچانک میں نے دیکھا کہ وہ ایک دم کھڑکی سے ہی باہر کود پڑا اور سرپٹ میری طرف دوڑ کر آنے لگا، اس کی اس حرکت پر میں خود بھی گھبرا سا گیا کہ کہیں اس کے کیبن میں کوئی جنگلی جانور تو نہیں گھس آیا۔ اس نے ہنوز جسم پر بنیان پہن رکھی تھی اور نیچے پتلون تھی۔ میرے قریب آتے ہی وہ رک گیا اور ہانپنے لگا۔

''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی سوال تو میں تم سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ تم اندر کیوں نہیں آ رہے؟'' جب میں نے اسے ساری بات بتائی تو وہ ایک دم پُرسکون ہو گیا اور بولا۔

''یار! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں سمجھا شاید تم مجھے کسی دشمن کی آمد کے اشارے دے رہے ہو۔'' اس کی بات سن کر میں بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ بہرحال میرے پاس وقت کم تھا اور میں نے اسے بتا دیا کہ اب ہم اپنی کوئی رازدارانہ گفتگو کیبن کے اندر نہیں کر سکتے، ممکن ہوا تو لکھ کر یا کسی ایسے گوشے میں جا کر کریں گے جہاں کیمرے کی خفیہ آنکھ اس گوشے کا احاطہ نہ کر سکتی ہو، مگر اس میں بھی یہ دھیان رکھنا ہوگا کہ ہمیں زیادہ دیر اس طرح نہیں کرنا ہوگا، ورنہ شبہ پیدا ہونے کا احتمال پیدا ہو سکتا تھا۔ کیمرے کے سامنے ہم دونوں بالکل ویسے ہی باتیں کریں گے، جیسا کہ دشمن کا منصوبہ تھا۔

''مگر یہ ہوگا کیسے؟ اس خفیہ کیمرے کو کس طرح تلاش کرنا ہوگا۔'' نصیر شاہ نے سرگوشی میں پوچھا۔

''اس کی لوکیشن میں نے جانچنے کی کوشش تو کی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''تم اندر چلو، میں دیکھتا ہوں اور ہاں نارمل رہنے کی کوشش کرنا اور غلطی سے بھی کوئی ایسا ویسا جملہ اپنے منہ سے نہ نکالنا جو ہمیں پھنسا دے۔ ورنہ جو چال ہم دشمن پر اُلٹنے میں مصروف ہیں اس کا شکار ہم خود ہی نہ ہو جائیں۔''

اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی اور کیبن کی طرف لپک گیا۔ میں نے خود کو کیموفلاج کیا اور جنگلی پتوں اور گھنے پودوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا، کیبن کے گرد چکر لگانے لگا، بظاہر میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں یونہی اطراف میں گردش کر رہا ہوں۔

جلد ہی مجھے ایک درخت کی جھولتی ہوئی موٹی شاخ پر وہ گھونسلا سا بنا نظر آ گیا جو کیبن کے اس روشندان پر جھکی ہوئی تھی، جس کا رخ کیبن کے وسط میں تھا۔ شاخ کو اس طرح اندر کی طرف جھکا کر گھونسلا بنایا گیا تھا کہ کوئی پرندہ اس طرف نہ آ سکے۔ میں اس درخت پر چڑھا تو مجھے مزید اس کی مضبوطی کا احساس ہوا، گھونسلے کے اندر تنکوں کے بیچ میں باریک فولادی تاروں سے ایک ننھے کیمرے کو فوکس بھی کر رکھا تھا، اس طرح کہ اُسے مرضی کے مطابق حرکت دی جا سکے اور وہ گھونسلا بھی نہ ٹوٹنے پائے، یقیناً یہ کیمرا ایڈوانی کے کسی آدمی نے رات کے کسی ایسے پہر میں نصب کیا ہوگا جب ہم بے خبر سو رہے ہوں گے، یہ تو شکر تھا کہ اس کم بخت نے ہماری باتیں نہیں سنی تھیں، سنتا بھی کیسے، میں نے اس سلسلے میں غیر معمولی احتیاط کا مظاہرہ کیا تھا، اور نصیر شاہ سے اصل موضوع پر بات کرنے سے پہلے اچھی طرح کیبن کے اطراف کا بھی جائزہ لیا تھا، نیز ہم نے یہ باتیں کیبن کے کونے والے حصے میں بیٹھ کر کی تھیں۔ تاہم اب اس خفیہ کیمرے کی آنکھ کیبن کے اسّی فیصد حصے کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

میں اسے چھیڑے بغیر درخت سے نیچے اُتر آیا۔ مجھے احساس تھا کہ میری یہ حرکت مجھے پھنسا بھی سکتی کہ کیا خبر دوسرا کیمرا ادھر ہی کہیں سے اپنی خفیہ آنکھ سے مجھ گھور رہا ہو۔ لیکن ایک تو میں اس کا سدباب ڈارک کیسل سے روانہ ہوتے وقت ہی کر آیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی ایک ہی کیمرا نصب کیا گیا تھا۔ دوسرا نصب کرنے کا دشمن کا کیا ارادہ تھا اس سے میں ابھی واقف نہیں تھا مگر مجھ سے یہ بھی چھپا نہ رہتا۔

میں کیبن کے اندر آ گیا۔ نصیر شاہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ میں نے اسی فیصد جگہ چھوڑ کر کیبن کے بقیہ بیس فیصد جگہ کا تعین کیا اور نصیر شاہ کو لے کر اس طرف چلا۔ اب ہم دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔

وہ اس خفیہ کیمرے کی وجہ سے خاصا تشویش زدہ سا نظر آ رہا تھا، میں نے اسے حوصلہ دیا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، جب تک میری ڈارک کیسل میں آوک جاوک جاری رہے گی، میں دشمن کے ہر ایسے ''ٹریپ'' اور ''بوبی ٹریپ'' کو ٹریس کرتا رہوں گا، لیکن ہمیں پھر بھی احتیاط کا دامن تھامے رکھنا ہوگا۔ میں نے اسے موجودہ صورت حالات کے بارے میں بتایا اور پھر ایک ڈراما کرنے کی غرض سے ہم دانستہ کیمرے کی ''آنکھ'' کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ اب ہماری گفتگو کا لب لباب اور ہو گیا تھا۔ یعنی میں اب نصیر شاہ سے ایڈوانی کے منصوبے کے مطابق ہی گفتگو کر

رہا تھا اور اُسے بتا رہا تھا کہ اب ایڈوانی وغیرہ ہماری تلاش سے مایوس ہو چکے ہیں نیز میں نے بھی آنے جانے کا ایک راستہ بنا لیا ہے، جس کے تحت خفیہ راستے سے میں پہلے پورٹ بلیئر اور پھر وہاں سے ممبئی چلا گیا تھا اور اپنے باپ کو اس کام کے لیے رضامند کر لیا ہے، جلد ہی وہ نہ صرف بھاری مشینریز اور آدمیوں کی کھیپ روانہ کرنے والا ہے بلکہ انڈین آرمی کے افسر سے بھی ایک وفد کی صورت میں ملاقات کر کے انہیں، ایڈوانی وغیرہ کے خلاف ریڈ لگانے کا بھی بندوبست کیا جا رہا ہے تاکہ ہم یہاں بلاخوف اور آزادی کے ساتھ اپنا ''کام'' جاری رکھ سکیں، وغیرہ۔ اس پر نصیر شاہ نے بھی مصنوعی طور پر مسرت کے اظہار کے ساتھ میری تعریف بھی کی اور ساتھ ہی میرے فرضی باپ کے لیے بھی توصیفی کلمات ادا کیے۔

سب کچھ منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ ڈی، ایم، ایم (ڈائمنڈ ماؤنٹین مائنز) کا مقام جسے بعد میں ''بونینزا'' (سب سے بڑی نو دریافت شدہ کان) کا نام دے دیا گیا تھا۔ وہاں بیس کیمپ قائم کر دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ نصیر شاہ، باربیہ اور کبیل دادا سمیت اول خیر اور شکیلہ کو وہاں منتقل کر دیا۔ ان میں باربیہ کے جاوا قبیلے کے تین ساتھی، تورا کی، سلاسکو اور لوبو بھی تھے۔ میں انہیں جانچ چکا تھا اور اُنہوں نے مجھ پر بھی مکمل اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ان میں بیشتر ہندی اُردو جانتے تھے۔ یہ زبانیں سکھانے کا فریضہ بھارتی مسلم تبلیغی جماعتوں نے پہلے سے انجام دے رکھا تھا۔ جو یہاں انہیں اسلامی تعلیمات کے دوران عربی اردو اور تھوڑی بہت ہندی بھی سکھاتے تھے۔

ایک مکمل ٹیم کی صورت میں دشمنوں کے ٹھکانے سے الگ تھلگ مقام پر قدم رکھتے ہی اول خیر اور شکیلہ مجھ سے کھل کر ملے۔ شکیلہ تو میرے شانے پہ سر رکھے رو ہی پڑی تھی۔ اول خیر کی شرارتی نس پھڑکی اور بولا۔

''نازو (نازک) بی بی! اب یہ آنسو بہانے کا وقت نہیں ہے، تمہاری یہ جذبات نگاری کہیں ہمارے شہزی کا کے کا اتنی محنت اور جان جاکھم میں ڈال کر بنایا ہوا منصوبہ ہی نہ فیل کر ڈالے، اس لیے ذرا خود پر کنٹرول کرنا بھی سیکھو۔'' کبیل دادا منہ دبا کر ہنسنے لگا۔ شکیلہ نے غصے بھری نگاہوں سے اول خیر کو گھورا اور پھر مجھ سے الگ ہو کے بولی۔

''شاید قید اور بیگار کاٹتے کاٹتے تمہاری نظروں پہ اثر پڑا ہے، یہاں ہمارے سوا اور کون ...... نظر آ رہا ہے جو ہم پر شک کرے گا؟''

''دیواروں کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔'' اول خیر باز آنے والا کب تھا تو چپ رہنے والی شکیلہ بھی نہیں تھی۔

''پہلے محاورے تو صحیح بولنا سیکھ لو...... دیواروں کی آنکھیں نہیں کان ہوتے ہیں۔''

کبیل دادا نے انہیں ٹوکنا چاہا، مگر میں نے اسے آنکھ کے اشارے سے خاموش کر دیا۔ میں ان کی نوک جھونک پر مسکرا رہا تھا۔ اتنے عرصے بعد تو اپنے پیارے اور دل و جان سے عزیز دوستوں کا یوں اپنا پن دیکھنے کا موقع ملا تھا، اور شاید حالات کی کچھ موافقت بھی تھی کہ ان کی زندہ دلی لوٹ آئی تھی۔

''ایک ہی بات ہے، جو دیواریں کان رکھتی ہیں تو آنکھیں بھی رکھتی ہوں گی۔'' اول خیر پیچھے ہٹنے والا نہ تھا۔

''تو پھر منہ بھی رکھتی ہوں گی...... تمہاری طرح، بھاڑ سا......'' شکیلہ بولی۔

''میرا خیال ہے میں تمہیں اب کام کی کچھ باتیں سمجھا دوں۔'' میں نے اپنی مسکراہٹ پر ذرا سنجیدگی کا پرتو چڑھانا ضروری سمجھا تو وہ سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔

میں نے ان سب کو ایک بار پھر پیش آئند حالات کے بارے میں بریف کیا اور کچھ ہدایات بھی دیں کہ انہیں یہاں رہتے ہوئے کرنا کیا تھا۔

''اب وسائل سارے دشمن کے ہوں گے اور فائدہ ہم حاصل کریں گے۔'' میں نے آخر میں کہا۔ ''کان کنی کے کام کی جب ٹھیک ٹھاک ابتدا ہو جائے گی تو ہم ایڈوانی اور بلراج سنگھ کا خاتمہ کر ڈالیں گے۔ رہے ان کے ساتھی تو وہ سب گنے چنے ہیں، ان سے جنگ کرنا کوئی مشکل نہ ہوگا، یوں بھی ان کی بڑی اور چھوٹی سرکار کے خاتمے کے بعد ہمت جواب دے چکی ہوگی، روپوش ساتھی (شنگرال اور نتالیہ وغیرہ) بھی ہم سے آن ملیں گے، اس کے لیے باربیہ اور سلاسکو میرے ساتھ ان کے خفیہ ٹھکانے پر جائیں گے۔''

بعد میں اول خیر بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ باربیہ نے بتایا تھا کہ ان شنگرال والوں کا خفیہ ٹھکانا بونینزا کے مغرب میں اور جزیرے کے تقریباً آخری سرے پر ساحل سمندر کے قرب میں واقع تھا مگر باربیہ کے مطابق یہ طویل سفر سمندر کے راستے سے ساحل کے ساتھ ساتھ بمشکل تین سے چار ناٹیکل میل تھا، وہ ایک کشتی کے ذریعے ہی وہاں تک جایا کرتی تھی۔ اگرچہ اس میں اس کے لیے جان کا بھی بہت رسک ہوتا تھا، لیکن اس نے اپنے لیے ایسے حالات موافق کر رکھے تھے کہ اُسے کوئی خاص دقت کا سامنا

نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ شنگرال والوں کے ٹھکانے پر صرف اشد ضرورت کے تحت ہی جاتی تھی۔ ہمارے لیے البتہ کشتی کے راستے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ لیکن ہمیں جیپ کی سہولت حاصل تھی۔ اس راستے کا بھی باریہہ کو علم تھا اور وہی ہماری رہنمائی کر رہی تھی۔ جیپ میں ہی ڈرائیو کر رہا تھا اور باریہہ میری برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ راستہ مجھے وہی سمجھا رہی تھی۔ جزیرے کی سرد رات اپنے جوبن پر تھی، جزیروں کی فضا بھی ریگستانی موسموں جیسی ہوتی ہے، دن میں گرمی اور راتیں سرد۔ گھنے جنگل اور ناپختہ راستوں پر ہماری جیپ منزل کی جانب گامزن تھی۔ ہمارے پاس جو ہتھیار تھے وہ دشمنوں کے ہی دیے ہوئے تھے۔ باریہہ کو اسلحہ چلانا نہیں آتا تھا مگر اس کے اور سلاسکو کے پاس نیزے اور تیر کمان تھے۔ ترکش ایک تھا جس میں زہریلے تیر بھرے ہوئے تھے۔

میں جیپ مناسب رفتار سے ہی دوڑا رہا تھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس بھی بیم نہیں کی تھیں، ذرا فاصلے تک روشنی جاتی کافی تھی، ہمارے اطراف میں تاریک ویرانہ تھا، دائیں جانب پہاڑیوں کے مختصر سلسلے کے ہیولے نما آثار دکھائی دے رہے تھے، بائیں جانب جنگل تھا۔ آسمان پر چاند کہیں دور جھکا ہوا تھا، البتہ تاروں کے ٹمٹماتے جھرمٹ ماحول پر طلسماتی اثر پذیری کیے ہوئے تھے۔

کچھ اور آگے جا کر ہمارے بائیں جانب کا جنگل ہمارے راستے میں آگیا اور جیپ اس کے اندر داخل ہو گئی۔ جیپ پر ہڈ چڑھا ہوا تھا۔ جسے بہ وقت ضرورت فولڈ بھی کیا جاسکتا تھا۔

یہاں سے ہمارا سفر کچھ اور آگے طے ہوا تھا، اس دوران باریہہ نے بتایا کہ شنگرال والوں کی کمین گاہ زیادہ دور نہیں رہی ہے۔ اچانک ہمیں زور کا جھٹکا لگا۔ جیپ کا اگلا ٹائر شاید کسی نسبتاً گہرے کھڈ میں جا پڑا تھا، یہ تو شکر تھا کہ اسی خدشے سے میں نے جیپ کی رفتار کم رکھی تھی۔ مگر یہ کھڈ بڑا واہیات ثابت ہوا تھا، ٹائر اس پر پڑتے ہی پوری جیپ کو یکلخت جام کر گیا تھا اور اسی سبب جیپ کا پچھلا حصہ اُچھلا تھا، ہم چاروں ہی اس کے زوردار جھٹکے کی زد میں آکر تقریباً ایک دوسرے کے اُوپر اُلٹ پلٹ پڑے۔ جیپ بھی اُلٹتے اُلٹتے بچی تھی۔ حد تو یہ تھی کہ میں خود بھی اس اچانک جھٹکے کے باعث اور کچھ باریہہ کے میرے اُوپر پڑنے کے سبب اس زور سے دروازے سے ٹکرا گیا تھا کہ دروازہ کھل گیا اور میں نیچے نصف حد تک لٹک گیا۔ باریہہ نے ہی مجھے بازو سے پکڑا تو میں سیدھا ہوا۔

”اوہ...... بڑا زبردست جھٹکا تھا۔ ساتھیو تم ٹھیک تو ہو ناں......“ میں نے سنبھلتے ہی پوچھا۔ اول خیر اور سلاسکو نے خیریت بتادی۔ جیپ کا انجن بند ہوگیا تھا۔ انجن بند ہوتے ہی ہمارے چہار اطراف میں ایکا ایکی ہی سناٹا طاری ہوگیا تھا۔

میں نے اگنیشن سوئچ میں چابی گھمائی، ایک بار، دوسری اور تیسری مرتبہ کی کوشش میں جیپ کا انجن غرایا اور بیدار ہوگیا۔

”ریورس کر کے ہی اگلا ٹائر گڑھے سے نکلے گا۔“ پیچھے بیٹھے اول خیر نے کہا۔

”ایسا ہی کر رہا ہوں۔“ میں نے کہتے ہوئے ریورس گیئر لگایا اور ایکسلیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جیپ ”فرنٹ وہیل“ تھی حالانکہ عموماً جیپیں فور وہیل یا بیک وہیل ہوتی ہیں۔ اپنی حیرت کو فوراً ہی رفع کرتے ہوئے میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ ایک دوبار کے بعد ہی جیپ ایک جھٹکے سے گڑھے سے نکلی اور بیک ہوتی چلی گئی۔ میں نے فوراً بریک پر پاؤں رکھ کر گیئر بدل دیا کہ کہیں عقب میں کسی درخت سے ہی نہ ٹکرا جائے۔ ابھی میں نے گیئر ڈال کر جیپ آگے بڑھائی ہی تھی کہ گولی چلنے کے دھماکے کی آواز اُبھری۔ ہم سب بُری طرح ٹھٹک گئے۔

میں نے فوراً ایکسلیریٹر سے پاؤں ہٹالیا۔ اسی وقت یکے بعد دیگرے دو تین فائرز کی مزید آواز گونجی اور اس کے فوراً ہی بعد برسٹ چلا۔ ہم سب نے غیرارادی طور پر اپنے سر جھکالیے تھے اور اب تک کی ہونے والی فائرنگ سے اندازہ ہو چکا تھا، نشانہ ہم نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی میں نے ساتھیوں کو ہتھیاروں سمیت جیپ سے نیچے اُترنے کا کہا اور خود بھی ایسا ہی کیا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس بھی میں نے گل کر دی تھیں۔

میں نے سب کو جیپ کی آڑ میں ہوجانے کا کہا اور سن گن لینے لگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اسی رفتار سے سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ کون ہوسکتے ہیں؟

کچھ سیکنڈوں تک ایک تواتر سے ہونے والی فائرنگ میں کمی آگئی تھی، اور اب اکا دکا ہی فائر ہو رہے تھے۔

”دو گروہ آپس میں نبرد آزما لگتے ہیں۔“ میں نے کہتے ہوئے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچ لیے۔

”دوسرا گروہ کہیں ایڈوانی کا نہ ہو...... ایسی صورت میں ہم بھی ان کی نظروں میں آجائیں گے، ہمیں آگے نکل

جانا چاہیے۔'' باربیہ نے مجھ سے پہلے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ اول خیر خاموش تھا۔ اسے زیادہ حالات کا اندازہ نہ تھا۔

''تمہاری بات معقول ہے باربیہ...... ! لیکن وہ ہمارے راستے میں آسکتے ہیں، بہتر ہوگا کہ پہلے ادھر ہی دبکے رہتے ہوئے دیکھیں ہوتا کیا ہے؟'' میں نے کہا، ساتھ ہی میری متلاشی نظریں گردوپیش کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔

اسی وقت ایک گاڑی کی آواز ابھری، وہ موڑ کاٹ رہی تھی، ایک ثانیے کے لیے اس کی ہیڈلائٹس کی روشنی ہم پر بھی پڑی تھی، پھر وہ ہماری عقبی سمت والے راستے پر ہولی، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ رک گئی۔

''ہم دیکھ لیے گئے ہیں۔'' معا اول خیر نے سرسراتی سرگوشی میں کہا اور اس کا اندازہ درست ثابت ہوا کیونکہ اسی وقت گاڑی نے پھر موڑ کاٹا تھا اور اب اس کا رخ ہماری طرف ہوتے ہی، اس کی روشنی بھی ہم پر پڑنے لگی۔

''ہوشیار......'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اس طرف سرک جاؤ......'' کہتے ہوئے میں جھکے جھکے انداز میں ہی جیپ کی آڑ لیتا ہوا قریب کی جھاڑیوں میں گھس گیا، ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی تھی، مگر بدقسمتی سے سلاسکوان کی نظروں میں آگیا تھا، اسی لیے وہ گاڑی تیزی سے دوڑتی اُچھلتی اسی طرف کو نکل آئی جہاں ہم چھپنے کی کوشش میں تھے۔ ساتھ ہی اُنہوں نے ایک فائر بھی کر دیا تھا۔ نشانہ خطا گیا تھا اور سلاسکو نے چھلانگ لگا دی تھی جبکہ گاڑی کی تیز ہیڈلائٹس کی روشنی چھدری جھاڑیوں کو چیرتی ہوئی ہم پر پڑ رہی تھی جبکہ میں اسے پہچاننے کی کوشش میں تھا کیونکہ یہاں پر کسی بھی گاڑی کی موجودگی کا مطلب یہی تھا کہ وہ ایڈوانی کے ساتھی ہی ہو سکتے تھے اور میرا یہ شبہ درست بھی ثابت ہوا۔ دشمن ٹولے کی تلاش رتن لال ہی کی ذمے داری تھی اور اسی لیے وہ ریاست کی حدود اور اس کے باہر بھی ہر وقت اپنے مسلح ساتھیوں کے ساتھ گشت کرتا رہتا تھا۔

وہ جھاڑیوں میں اندھا دھند فائرنگ کر سکتے تھے۔ تاہم میں نے گاڑی کے قریب پہنچتے ہی اسے پہچان لیا، میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا وہ رتن لال کی ہی پک اپ نما گاڑی تھی جس کے عقبی ڈالے میں آٹھ دس مسلح افراد اور اس سے نصف ڈرائیونگ کیبن میں سوار تھے۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔ ہتھیاروں سمیت اپنے ہاتھ کھڑے کر کے باہر آجاؤ، ورنہ ہم پر یہ لوگ بے دریغ فائر کر دیں گے۔''

''مگر...... یہ ہم پر بھی گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتے ہیں۔'' باربیہ نے خطرہ ظاہر کیا تو میں بولا۔

''مجھے پہچان لینے کے بعد وہ ایسا نہیں کریں گے، بہ صورت دیگر یہ ہمیں یہاں بھی......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک چیختی ہوئی آواز ابھری۔

''تم سب دیکھ لیے گئے ہو...... ہاتھ کھڑے کر کے سامنے آجاؤ، ورنہ سب کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔'' میں اس چلاتی ہوئی آواز کو پہچان گیا تھا، یہ رتن لال تھا۔

ہمیں بالآخر وہی کرنا پڑا تھا جس کا میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ساتھیوں کو مشورہ دیا تھا۔ ہم اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کر کے باہر آگئے۔

''دیال داس! تم......؟ یہاں کر رہے ہو؟''

گاڑی کی ہیڈلائٹس میں مجھے پہچانتے ہی وہ حیرت سے بولا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کے تاثرات بھی نظر آنے لگے تھے۔

''شکر ہے بھگوان کا، تم نے ہمیں پہچان لیا۔'' میں نے ہاتھ گراتے ہوئے چالاکی سے کہا۔ ''ہم احتیاط کے پیش نظر ہی یہاں چھپے تھے کہ پتا نہیں تمہاری گاڑی کہیں کسی دشمن کے ٹولے کے قبضے میں نہ آچکی ہو یا تم اندھا دھند ہم پر فائر نہ کر بیٹھو۔''

''میں بھی تمہاری گاڑی پہچان تو گیا تھا'' وہ بولا۔ ''اور میرے ذہن میں بھی یہی تھا کہ کہیں اس گاڑی میں ساتھیوں کے بجائے دشمن ٹولا نہ ہو۔ یوں بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہمارا ایک دشمن ٹولے سے ٹکراؤ ہو چکا ہے۔''

''ہاں! ہم فائرنگ کی آواز پر ہی رک گئے تھے۔'' میں نے بات بنائی۔

''مگر تم لوگ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

ہم پر تنی ہوئی گنیں اب نیچے کر لی گئی تھیں اور میرے ساتھیوں نے اپنے ہاتھ۔

''ہم بیس کیمپ سے آرہے تھے۔ مجھے یہاں ایک دشمن ٹولے کی اطلاع ملی تھی۔''

''اوہ...... تمہیں بھی یہی اطلاع تھی۔'' رتن لال اپنی ٹوپی اُتارتے ہوئے بولا۔

''مگر ہمارا ابھی کسی دشمن ٹولے سے ٹکراؤ نہیں ہوا ہے، تم نے کیا انہیں ختم کر ڈالا؟ کس دشمن ٹولے سے تعلق تھا ان لوگوں کا؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''شا کا اور کوہارا سے...... بھولا ناتھ بھی ان کے ساتھ مل چکا تھا اور اسی خبیث نے ان سب کو یکجا کیا تھا۔''

''کیا؟ واقعی......؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''شا کا تو مارا گیا، بھولا ناتھ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہے، کوہارا اور بھولا ناتھ نے آپس میں گٹھ جوڑ کرلیا ہے۔ البتہ ان کے دو ساتھی ہماری گرفت میں آسکے، کچھ مارے گئے مگر ان میں سے ایک تو خود کو بھارتی انٹیلی جنس کی ایجنٹ بتاتی ہے اور دشمن ٹولے سے انکاری ہے جبکہ دوسری کا اس سے کوئی تعلق نہیں مگر وہ بھی کسی دشمن ٹولے سے تعلق رکھنے سے انکار کرتی ہے جبکہ وہ زخمی بھی ہے۔''

رتن لال نے مجھے بتایا اور بھارتی انٹیلی جنس کی ایجنٹ کے ذکر پر میرے ٹھٹکتے ہوئے ذہن میں لامحالہ کوریلا کا ہی خیال ابھرا تھا اور پھر کسی اندیشناک خدشے تلے میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

میرے پورے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں، مجھے یوں لگا جیسے اب آن کی آن میں میرا سارا منصوبہ پانی ہونے والا تھا۔

☆☆☆

رتن لال کے اشارے پر جن دو قیدیوں کو رسن بستہ حالت میں انہوں نے گاڑی سے اتار کر میرے روبرو کیا تھا وہ ایک تو میرے خدشے کے مطابق کوریلا تھی مگر دوسری عورت کو دیکھ کر میرا دل جیسے ایک لمحے کو دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔ وہ سوشیلا تھی...... زیادہ زخمی نہیں تھی، اس کی ٹانگ کا زخم شاید خراب ہو گیا تھا، حالانکہ جب وہ میرے ساتھ تھی تو اس کا زخم کچھ بھرنے لگا تھا، مگر شاید بعد میں نامساعد حالات کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ اسے بیدردی سے سہارا دیا گیا تھا۔

البتہ نہ سوشیلا مجھے پہچان پائی تھی اور نہ ہی کوریلا...... مگر اُس نے اول خیر کو فوراً پہچان لیا تھا۔ میری دھڑکتی ہوئی نظریں اسی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں کہ اب کیا بم پھٹتا ہے، مگر شاید وہ ابھی کسی تذبذب کا شکار تھی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ خاموش رہتی۔ وہ ایک گھاگ ایجنٹ تھی، حالات کا اپنے طور پر جائزہ لینے کے بعد ہی کوئی شوشہ چھوڑتی۔ اول خیر پر نگاہیں جمانے کے بعد وہ ہم سب کو بھی باری باری تیز سی نگاہوں سے گھورے جا رہی تھی۔

تاہم سوشیلا کے سلسلے میں رتن لال نے وضاحت کی تھی کہ وہ کوہارا کی قید میں تھی، وہ یونہی ان کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔

یہ ایک طرح سے سوشیلا کے ساتھ اچھا ہی ہوا تھا، میں سمجھ گیا تھا کہ سوشیلا کسی طرح بھولا ناتھ یا کوہارا کے ہتھے چڑھ گئی ہوگی۔ بعد میں مقابلے کے دوران اس نے موقع جان کر فرار ہونا چاہا ہوگا مگر کوریلا کی طرح وہ بھی رتن لال اور اس کے ساتھیوں کے چنگل میں آگئی۔ بہرحال سوشیلا کو زندہ دیکھ کر مجھے ازحد خوشی ہوئی تھی، مگر اس کی ٹانگ کا زخم ابھی تک خراب ہی لگتا تھا۔ حالت اس غریب کی بڑی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ اگرچہ حالت کوریلا کی بھی کچھ کم خراب نہ تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کے علاوہ چہرے پر بھی خراشوں کے نشانات تھے۔

''ان دونوں کو میرے حوالے کر دو...... اور تم لوگ واپس لوٹ جاؤ۔'' میں نے رتن لال سے کہا۔ ''تمہیں بھولا ناتھ اور کوہارا کے تعاقب میں جانا چاہیے۔ یہ دونوں ریاست کے خطرناک دشمن ہیں۔ ہماری مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ؟''

میری بات پر رتن لال کچھ تذبذب کا شکار سا نظر آنے لگا مگر پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، کوریلا نے رتن لال سے پوچھا۔

''کیا یہ لوگ تمہارے ساتھی ہیں؟''

''شٹ اَپ!'' رتن لال نے غصے سے اسے جھڑکا۔ ''اپنا منہ بند رکھو۔''

''سمجھ تو میں گئی تھی کہ یہ تمہارے ساتھی ہیں مگر مجھے یقین اس لیے نہیں آرہا تھا کہ تمہارے ان ساتھیوں میں تمہارے ہی ایک بڑے دشمن کا قریبی ساتھی بھی موجود ہے۔'' کوریلا نے جیسے دھماکا کر ہی دیا۔ اس کی بات رتن لال کو چونکا دینے والی تھی۔

''کک...... کیا بکواس کرنا چاہ رہی ہو تم......؟'' رتن لال کو بالآخر اس کی بات پر توجہ دینا پڑی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں درمیان میں نہیں بول سکتا تھا، مجھے بھی اس کے اس ''انکشاف'' پر لامحالہ 'چونکنے' کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ کھل کر بات کرو......؟'' میں نے بھی کوریلا کی طرف دیکھ کر درشت لہجے میں کہا۔

''وہ شخص......'' کوریلا نے اپنے چہرے کو اول خیر کی طرف اُٹھاتے ہوئے اشارہ کرتے کے انداز میں کہا۔ ''اس شخص کا نام اول خیر ہے، اور یہ ہم سب کے ایک خطرناک دشمن شہزاد احمد خان عرف شہزی کا بہت قریبی دوست ہے۔ جو ایک پاکستانی خطرناک ایجنٹ بھی ہے۔''

کوریلا کو اس حقیقت کا اندازہ پوری طرح سے تھا بھی یا نہیں کہ میری اور ان کی دشمنی کی کیا نوعیت ہوسکتی تھی، مگر چونکہ اتنا وہ بھی جانتی تھی کہ میں اپنے ان تینوں ساتھیوں کی تلاش میں یہاں کا رخ کیے ہوئے ہوں، تو کیا خبر (اس کے مطابق) میں نے یا میرے ساتھیوں نے کسی قسم کی ان کے ساتھ بھی ساز باز کررکھی ہو تو اس نے یقیناً بڑی چالاکی سے ہمیں ایک خطرناک ''پاکستانی ایجنٹ'' کا نام دے ڈالا تھا۔

اب کوریلا کے اندازے کی سو فیصد درستی ہی تھی کہ میں اور میرے ساتھی ایڈوانی وغیرہ کے دشمن نمبر ون کی حیثیت رکھتے تھے۔

پس یہی وہ خطرناک اور فیصلہ کن لمحہ تھا جس میں پل کے پل مجھے فوری بیدار مغزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بغیر کسی خون خرابے کے اس مشکل اور نازک ترین صورتِ حال سے اس طرح نمٹنا تھا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، کیونکہ میں اب اس ''پوزیشن'' میں تھا کہ میرے لیے خون خرابا نقصان دہ ہی ثابت ہوتا۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ رتن لال کو میں اول خیر کے خلاف کچھ کرنے کا موقع دیتا، میں نے ایک خطرناک اور ''ڈبل گیم'' کھیلتے ہوئے فوراً پلٹ کر اول خیر کو دبوچ لیا اور اسے نہتا کرتے ہی بار یہہ اور سلاسکو کو اسے قابو میں رکھنے کا حکم بھی دے ڈالا اور ہکا بکا سے کھڑے رتن لال سے بولا۔

''ایک دشمن کا دوسرے دشمن کے لیے نشاندہی کرنے کے ایک ذرا سے شبہے کو بھی ہم نظرانداز نہیں کرسکتے۔'' میرا اشارہ کوریلا اور اول خیر کی طرف تھا۔

''ان دونوں قیدیوں کو اب میرے حوالے کردو۔ ان دونوں کو آمنے سامنے بٹھا کر پوچھ گچھ کروں گا اور ڈارک کیسل پہنچ کر جنرل صاحب کو بھی اس کی اطلاع دینا ہوگی۔''

رتن لال کے لیے میری بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا تاہم وہ میرے اس طرح متحرک ہونے سے خاصا مطمئن بھی نظر آرہا تھا۔ جیسے میں نے اس کا دردِسر اپنے سر لے لیا ہو۔ یوں بھی وہ میری اہمیت سے اچھی طرح واقف تھا کہ آج کل ڈارک کیسل کے دو بڑے اور اہم ترین معاملات میرے ہاتھ میں تھے اور میں بہ خیروخوبی انہیں نبھا رہا تھا اور کیسے ''نبھا'' رہا تھا یہ صرف میں ہی جانتا تھا یا میرے ساتھی...... مگر یہ بھی سچ تھا کہ یہ نئی تازہ کارصورتِ حالات میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے نہ صرف سنگین حد تک خطرناک ہونے لگی تھی بلکہ میرا سارا منصوبہ بھی دھرا کا دھرا رہ جانے والا تھا۔ میں ان دونوں کو ہی جنرل ایڈوانی کے حوالے کسی بھی صورت میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سوشیلا کو تو ظاہر ایڈوانی یا بلراج سنگھ دیکھتے ہی گولی ماردیتے، جبکہ کوریلا اول خیر وغیرہ کی نشاندہی کرکے انہیں مرواسکتی تھی۔

لہٰذا مجھے اب کیا کرنا تھا اس کا فیصلہ بھی مجھے فوراً سے پیشتر کرنا تھا۔ صورتِ حال سنگین حد تک مخدوش ہوگئی تھی، جس پر اگرچہ میں نے فوری طور پر قابو تو پا لیا تھا مگر ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔

بہرحال ابھی تو سردست میری کھیلی جانے والی ڈبل گیم میں ایک اسکور کا اور اضافہ ہوچلا تھا اور رتن لال سر دھنتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنی راہ پہ ہولیا۔

''تمہارا شکریہ......''

رتن لال اور اس کے ساتھیوں کے جاتے ہی کوریلا نے آہستگی کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا۔ میں جانتا تھا ایسا اس نے کیوں کہا تھا۔ وہ ایک نمبر کی حرافہ، مکار اور خطرناک ایجنٹ تھی۔ بلکہ بلیوتلسی کی باقیات کہا جاتا تو غلط نہ تھا، مگر یہ اصل پیداوار ''را'' کی تھی۔ شکریہ اس نے میرا اسی لیے ادا کیا تھا کہ میں نے اسے رتن لال اور اس کے جنگجو مسلح ساتھیوں سے لے کر اپنی کسٹڈی میں لے لیا تھا۔ اگر میں اول خیر کو بھی گرفت میں نہ لے لیتا تو کوریلا کے ذہن میں شبہ ابھرتا کہ ہم بھی اس کے دشمنوں کے ساتھی ہیں، اور وہ رتن لال سے احتجاج کرتی یا خود کو میرے حوالے کرنے پر پس و پیش سے کام لیتی۔

بھارت کی کوئی بھی خفیہ ایجنسی ہو، ان میں نوجوان اور خوب صورت عورتوں کو آتشیں ہتھیار استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی خوب صورتی اور جسمانی حسن و شباب بھی ''یوز ٹو'' کرنے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔

یہی سبب تھا کہ وہ میری طرف دل لبھانے والی نگاہوں سے دیکھ کر مسکرائی بھی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی اپنے حسن کے روایتی جال میں مجھے پھنسا کر کسی طرح بے وقوف بنا کر اپنا مقصد حاصل کرلے گی۔ نہیں جانتی تھی وہ کہ میں اسے کتنا جانتا تھا۔ البتہ سوشیلا بے چاری بہت سراسیمہ اور خوف زدہ تھی۔ ابھی کوریلا کے سامنے میں سوشیلا سے اپنی حقیقت کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا، یوں اگر سوشیلا کو میری حقیقت پتا چل جاتی تو وہ خوشی کے مارے ایک عدد چیخ ضرور اپنے حلق سے خارج کرتی۔

''پلیز......! میرے ہاتھ تو کھول دو ناں...... دیکھ رہے ہو، میں پہلے ہی کس قدر خراب حالت میں ہوں۔''

میں نے کوریلا کے شکریے کا کوئی جواب نہیں دیا اور اس کی بات بھی سنی ان سنی کرتا ہوا جیپ میں سوار ہو گیا۔

مجھے اب شنگرال سے ملاقات کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا تھا۔ وہاں کا سفر ادھورا چھوڑ کر ہم بیس کیمپ کی طرف روانہ ہو گئے۔

کیمپ پہنچ کر تو کبیل دادا اور شکیلہ کو دیکھ کر کوریلا کی حالت اور بھی غیر ہو گئی۔ انہیں دیکھتے ہی وہ حلق کے بل چلّائی۔

''یہ...... یہ دونوں بھی اسی کے ساتھی ہیں، دشمن ہیں یہ تمہارے......''

''بکواس بند کرو اپنی......'' میں نے اسے جھڑکا۔ کبیل دادا اور شکیلہ جو پہلے ہی ہمیں اتنی جلدی لوٹتا پا کر حیران ہو گئے تھے اور پھر اول خیر کو یوں رسن بستہ اور کوریلا کو دیکھ کر تو جیسے سکتے میں آ گئے تھے۔ میں نے انہیں اشارہ کر دیا کہ وہ ابھی خاموش رہیں اور تماشا دیکھیں۔

''مم...... میں سچ کہہ رہی ہوں...... یہ......'' کوریلا کا جملہ میرے ایک زوردار تھپڑ نے پورا نہیں کرنے دیا۔ عورتوں پہ اس طرح ہاتھ اُٹھانا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا مگر کوریلا کا معاملہ اور تھا۔

میں نے اول خیر کو جکڑ بندوں سے آزاد کیا تو کوریلا پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں شکوک و شبہات کے ساتھ ایک طرح کے مخفی خوف کی جھلک بھی اُتری۔ پھر میرے حکم پر کوریلا کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے کیمپ کے دوسرے گوشے میں پہنچا دیا گیا۔ سوشیلا کو میرے کہنے پر فوراً ہی آرام دہ حالات میں بٹھا دیا گیا تھا، میرے اس سلوک سے وہ بے چاری نہیں بلکہ میرے ساتھی بھی حیران ہو رہے تھے، تاہم میں نے محسوس کیا تھا کہ سوشیلا بڑے غور غور سے مجھے تکے جا رہی تھی، وہ شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

اب ہم سب دوسرے اور نسبتاً وسیع گوشے میں موجود تھے۔

سب سے پہلے تو میں نے ساتھیوں کو رونما ہونے والی نئی اور اچانک صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ کس طرح پانسا پلٹتے ہی مجھے اول خیر کو دکھاوے کی خاطر دوست سے قیدی بنانا پڑا تھا۔ اس کے بعد سوشیلا کی طرف متوجہ ہوا۔ اول خیر کی طرح اسے بھی جکڑ بندوں سے آزاد کر دیا گیا تھا اور وہ حیران سی ہو کر مجھے تکنے لگی تھی۔

''سوشیلا......! تمہیں زندہ دیکھ کر مجھے بہت خوش ہو رہی ہے۔ میں شہزی ہوں...... پہچان لو مجھے...... اچھی طرح......''

میں نے اس بار اپنے سر سے مخصوص وردی والی ٹوپی اُتارتے ہوئے سوشیلا سے اپنی اصل آواز میں کہا تو وہ یہ سنتے ہی جیسے ایک دم سکتے کا شکار ہو گئی۔

میں نے آگے بڑھ کر دھیرے سے اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا اور جب اس کا سکتہ ٹوٹا تو وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں اسے دلاسا دینے لگا، دیگر ساتھی حیرت بھری نظروں سے ہماری طرف تکے جا رہے تھے۔ لیکن باریہہ کی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ اُلجھن اور کچھ ''اخذ'' کرنے کے تاثرات نمایاں تھے۔

''خدا کا شکر ہے سوشیلا کہ تم زندہ سلامت ہو لیکن اب حوصلہ رکھو، انشاء اللہ سب ٹھیک ہونے والا ہے۔'' سوشیلا نے اپنا سر ہٹایا۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ آنکھیں ہنوز آبدیدہ تھیں، ان کی جھلملاہٹ میں پیش آمدہ حالاتِ دگرگوں کے خار و خس بہتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ اپنا غم ہلکا کر رہی تھی۔ پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''شش...... شہزی! مجھے اپنی کب پروا رہی ہے، خوشی تو مجھے بھی تمہیں زندہ دیکھ کر ہو رہی ہے، میں تو خود کئی مواقع پر موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ دیکھ کر جیتی رہی ہوں اب تک...... فقط ایک ہی آرزو ہے میری کہ اُن مردودوں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں پھر موت کا بھی غم نہ ہو گا مجھے......''

''ایسا ہی ہو گا مگر اب مرنے کی باتیں مت کرو، تم زندہ رہو گی اور یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھو گی۔'' میں نے اسے تسلی اور حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ پھر اس کی ٹانگ کے زخم کا معائنہ کیا، باریہہ کو میں نے قریب بلا لیا تھا۔ سوشیلا سے متعلق میں نے انہیں مختصراً الفاظ میں بتا کر ان کی حیرت دور کر دی تھی۔ انہیں بھی سوشیلا کے حالاتِ زندگی جان کر افسوس ہوا تھا، مگر باریہہ نے ایسا کوئی اظہار نہیں کیا۔

''باریہہ! سوشیلا کی ٹانگ کا زخم ران تک خراب ہو گیا ہے۔ تم ایک قبائلی خاتون ہو، ذرا دیکھو اس کا علاج کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟''

باریہہ نے سرسری سا ہی زخم کا معائنہ کیا تھا پھر عام سے لہجے میں بولی۔ ''کچھ جڑی بوٹیوں کا مجھے علم تو ہے، جن کا لیپ ایسے زخموں کو جلد بھر دیتا ہے مگر وہ پودے عام نہیں پائے جاتے، انہیں تلاش کرنا پڑتا ہے۔''

''ہم.....'' میں کہتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ پھر بولا۔ ''آبادی میں جا کر شاید کوئی دو اِمل جائے؟''
''یہ ممکن ہے۔'' باربیہ نے آہستگی سے کہا۔
میں نے ایک دنیا دیکھ رکھی تھی۔ یہ بات مجھے بھی فوراً ہی محسوس ہوگئی تھی کہ باربیہ، سوشیلا کے سلسلے میں کوئی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کر رہی تھی بلکہ میرا اور اس کا والہانہ پن دیکھ کر میں نے اسے بار بار اپنے ہونٹ سکیڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے باربیہ کی یہ حرکت اچھی تو نہیں لگی تھی مگر میں نے اسے ابھی ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے اس عمل سے بے نیازی ہی ظاہر کرتا رہا۔ وہ شاید عورت ہونے کے ناتے کسی جیلسی کا شکار ہو رہی تھی جو اس کی غلط فہمی کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ میرا سوشیلا کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے۔

بہر حال سوشیلا کے زخم کا مداوا مجھے ہی کرنا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے موجودہ حالات کی متوقع سنگینی کے بارے میں سارے ساتھیوں کو آگاہ کیا۔ سوشیلا کو بھی اس عرصے میں کافی حد تک علم ہونے لگا تھا۔

''ہمیں کم از کم کوریلا سے تو جان چھڑا لینی چاہیے۔ ایسی صورت میں یہ ہمارے لیے کم خطرناک ثابت نہ ہو گی۔'' کپیل دادا نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اسے گولی مار کر ختم کر دیا جائے۔''

مقابلے کی بات اور ہوتی ہے مگر اس طرح کوریلا کو قیدی کی حالت میں بیدردی سے گولی کا نشانہ بنانا مجھے قطعی مناسب نہیں لگا، لہٰذا میں نے سرِ دست کوریلا کے موضوع سے ہٹ کر گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ابھی ہمیں فوری طور پر رتن لال کو ان دونوں کے سلسلے میں مطمئن کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے سوشیلا اور کوریلا کو ہم ڈارک کیسل لے جا کر ایڈوانی کے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔ کوریلا ہماری اصلیت اُسے بتا سکتی تھی، جبکہ سوشیلا کو تو وہاں دیکھتے ہی گولی ماردی جاتی۔''

''آسان حل ہے اس کا۔'' اول خیر بولا۔ ''رتن لال سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور نتیجے میں دونوں کو ہی گولی کا نشانہ بنانا پڑا۔''

''یہ بھی مناسب تجویز ہے۔'' میں نے کہا تو شکیلہ بولی۔

''سوشیلا تو چلو ہماری ساتھی کہلائے گی، مگر کوریلا کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ اسے ہم زیادہ دیر قیدی بنا کر یہاں نہیں رکھ سکتے، کیونکہ اس بیس کیمپ میں بلراج اور اس کے ساتھیوں کا بھی آنا جانا لگا رہے گا۔'' شکیلہ کی بات بھی غلط نہیں تھی۔ میں نے کہا۔

''مگر میں اس طرح ایک عورت ذات کو بے بسی کی حالت میں گولی نہیں مار سکتا۔ اس لیے اس کا دوسرا راستہ ذہن میں آنے تک اسے ادھر ہی اور مقید رکھنا ہوگا، اس کے لیے ایک خفیہ گوشہ مختص کر دیا جائے۔ اس بیس کیمپ میں مکمل طور پر میرا تصرف ہے، بلراج اور اس کے ساتھی یہاں ویسے بھی کبھی نہیں آسکتے، کیونکہ نصیر شاہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس لیے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے، اتفاق اور بات ہے، مگر اس سچویشن کو سنبھالا جا سکتا ہے، تاہم بونیزا میں کام کی ابتدا ہوتے ہی ہم اپنا اصل مشن شروع کر دیں گے۔''

''مگر شنگرال والوں سے تمہارا ایک بار مل لینا ضروری ہوگا شہزی!'' باربیہ نے مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور بولا۔

''شنگرال وغیرہ کی اہمیت کو ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔ آج تو یہ معاملہ پیش آ گیا اس لیے وہاں نہیں جا سکے، کل صبح منہ اندھیرے نکل چلیں گے۔ کیونکہ اس کے بعد مجھے ڈارک کیسل میں اپنی اصل کارروائی آغاز کرنا ہوگا، ہوسکتا ہے میں کل ہی جنرل ایڈوانی کو جہنم رسید کر ڈالوں۔ یہ کام ہوتے ہی شنگرال اور ان کے ساتھیوں کو گرین سگنل دے دیا جائے گا اور وہ دوبارہ اپنی زمین پر اپنا قبضہ جما لیں گے۔ باقی کان کنی کا کام چلتا رہے گا، یہ انہی کی فلاح کا سبب بنے گا، ہم اپنا مشن پورا کرتے ہی آگے کی راہ لیں گے۔''

اس رات ہم بیس کیمپ میں سو گئے۔ صبح جاگتے ہی ہم نے ایک بار پھر اپنی اُدھوری منزل کی راہ لی اور جزیرے کے اس گوشے میں جا پہنچے جہاں شنگرال اور اس کی بہن نتالیہ موجود تھے۔

ان کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے ایک چیتھڑے کا پھریرا بنا کر لکڑی سے جیپ کے بونٹ کے آگے ذرا بلند کر کے باندھ دیا تھا۔ ایسا احتیاط کے پیشِ نظر کیا تھا کہیں ہمیں دشمن سمجھ کر تیروں اور نیزوں کی بوچھاڑ نہ کر دی جائے، کیونکہ ایک تو ہم سب جنرل ایڈوانی کے ساتھیوں کی مخصوص وردیوں میں تھے دوسرے جیپ بھی تھی۔ اس بار بھی میرے ہمراہ باربیہ کے علاوہ اول خیر اور سلاسکو تھے۔

ان کی حدود میں پہنچتے ہی ہمارے اردگرد کے ٹیلوں سے آٹھ دس ننگ دھڑنگ جانگلی ہاتھوں میں بھالے اور تیر چڑھائے نمودار ہو گئے۔ باربیہ نے مجھے جیپ روکنے کا اشارہ کیا اور خود سیٹ سے کھڑے ہو کر اجنبی زبان میں چلا کر

کچھ بولی تو ایک دم سب نے دائیں بائیں سرک کر ہمیں راستہ دے دیا۔

''چلو۔'' باربیہ نے کہا اور میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ ایک موڑ کاٹ کر جب ہم ایک مختصر سے میدان میں پہنچے تو وہاں مجھے جابجا کھپریل کی ڈھلوانی چھتوں والی جھونپڑیاں نظر آئیں۔ ایسی ہی ایک نسبتاً بڑی چھت والی جھونپڑی کے سامنے باربیہ نے مجھے جیپ روکنے کا کہا اور اسی وقت ایک جانگلی کو میں نے مذکورہ جھونپڑی کے اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے جیپ اسی طرف لے جا کر روک دی اور پھر ہم سب نیچے اُتر آئے۔

اسی شخص کے ساتھ دو افراد نمودار ہوئے۔ ایک جوان مرد اور دوسری اس کی ساتھی لڑکی تھی۔ اس کا رنگ بھی دیگر جاوی قبیلے کی عورتوں کی طرح تیز سانولا تھا، مگر چہرے کے نقوش جاذب نظر تھے۔ جسم بھی متناسب تھا، آنکھیں بڑی تھیں۔ باربیہ نے ان دونوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ یہ وہی دونوں بہن بھائی شنگرال اور نتالیہ تھے۔ جن کے باپ کو جنرل ایڈوانی نے وحشی قبیلے کلی منجارو کے ساتھ مل کر ہلاک کر ڈالا تھا۔

ہم نیچے اُتر آئے۔ باربیہ نے آگے بڑھ کر ان سے میری طرف اشارہ کر کے کچھ کہا تو شنگرال بڑی گرمجوشی کے ساتھ میری جانب بڑھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو ہندی میں مجھ سے مختصراً خیر مقدمی گفتگو کی پھر اپنی بہن نتالیہ سے ملوایا۔ اس کے بعد ہم اندر آ کر ایک کھال بچھے فرش پر بیٹھ گئے۔ اندر دو تین خدام موجود تھے۔ انہوں نے ہی ہمارے لیے کچھ کھانے پینے کی اشیا رکھی تھی جو ایک بڑے سے کھلے برتن میں تھی۔ ان میں تازہ پھل، شہد اور بھنے ہوئے گوشت کے پارچے تھے۔ انہیں ''جائنٹ پیس'' کہا جا سکتا تھا۔

میں نے شنگرال سے اب تک کے حالات پر کھل کر گفتگو، جیسے جیسے میری گفتگو اپنے اختتام کو پہنچی، دونوں بہن بھائی مجھ سے ازحد متاثر نظر آنے لگے۔ میں نے انہیں نصیر شاہ کے بارے میں بھی بتایا اور بونینزا نامی ہیروں کی اس کان کے متعلق بھی کہ بہت جلد جاوا قبیلے کی تقدیر بدلنے والی ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی قسم کی جلد بازی نہ کی جائے۔

''میں بہت جلد جنرل ایڈوانی کا خاتمہ کرنے والا ہوں، مگر میں چاہتا ہوں اس سے پہلے اس کا قریبی ساتھی بلراج سنگھ وہ سارے وسائل لے کر یہاں پہنچ جائے، تاکہ کان کی کھدائی کا کام شروع ہو سکے، اس کے بعد یہ سب تمہارے اور جاوا قبیلے کے ہاتھ میں سونپ دیا جائے گا۔ مگر ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے تمہیں بھی تیار رہنا ہوگا۔''

ایک لمحہ توقف کے بعد میں بولا۔ ''تم اپنے جنگجو ساتھیوں کو تیار رکھنا اور چوکنا بھی رہنا۔ میری کوشش ہوگی کہ بغیر کسی ہنگامے کے جنرل ایڈوانی کو ہلاک کرنے کے بعد میں اس کی موت کو عارضی مدت کے لیے راز میں رکھوں اور تب تک اس کا کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم اپنے ہاتھ میں لیتے ہی ڈارک کیسل پر قبضہ جما لوں۔''

''جنرل کی موت کے بعد ہمارے ازلی دشمن کلی منجارین سے جنگ ناگزیر ہوگی ہماری۔'' شنگرال نے کہا۔ ''مگر اب ان سے بھی مقابلہ کرنے کے لیے ہم تیار بیٹھے ہیں۔''

شنگرال کی اس بات پر میں نے کہا۔ ''کلی منجارین کا ٹھکانا کس طرف ہے؟''

''ان موذیوں کا ٹھکانا کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ بنجاروں اور قافلوں کی صورت میں رہتے ہیں، ان کی نفری تعداد بھی زیادہ نہیں ہے، یہ تو اس مردود جنرل ایڈوانی کی وجہ سے اتنی طاقت پکڑنے لگے ہیں۔'' شنگرال نے کہا تو اس کی بہن نتالیہ بھی نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر بولی۔

''ان کلی منجارین نے ہمارے باپ کو قتل کیا اور ہماری زمین پر دشمنوں کی مدد سے قبضہ جمایا۔ ان سے ہم اب بھی نمٹنا اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہماری عسکری قوت ہمارے ساتھ ہے۔''

''یہ بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''باریبہ کے علاوہ میرے اور ساتھی بھی تم سے رابطے میں رہیں گے۔ وقت کم ہے اور جنگ بھاری ہے۔ میں اب چلوں گا، مگر تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ جب تک میری طرف سے تم لوگوں کو کوئی اشارہ نہ ملے، تب تک کوئی جلد بازی نہیں کرو گے، ورنہ ہماری جانیں داؤ پر لگ جائیں گی اور میں نے جو منصوبہ بنایا ہے وہ خاک ہو جائے گا۔''

دونوں بہن بھائیوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میرے اشارے کے بغیر کچھ بھی نہیں کریں گے۔ میں نے رخصت ہوتے وقت شنگرال سے پوچھا۔

''یہاں تمہارے جنگجوں ساتھیوں کی کتنی تعداد ہے؟''

''پہلے کم تھی، اب زیادہ ہو گئی ہے۔'' شنگرال کے بجائے نتالیہ نے جواب دیا۔ ''باریبہ نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر جن چن کر ایسے لوگ یہاں خفیہ طور پر بھیجے تھے جو جنگ کا جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے۔''

''تمہارا مطلب اُن لوگوں سے تو نہیں ہے، جنہیں ایڈوانی نے تمہاری ہی بستی میں محبوس اور قیدی بنا رکھا ہے؟ جو درحقیقت تمہارے ہی ساتھی ہیں؟''

''ہاں! میں انہی کی بات کر رہی ہوں۔''

''اوہ...... پھر تو واقعی باریبہ نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔'' میں نے باریبہ کی تعریف کی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ باریبہ نے صرف اپنی جان ہی داؤ پر لگا کر یہ جان لیوا کام انجام نہیں دیا تھا بلکہ اپنی عزت بھی داؤ پر لگا دی تھی۔

اس کے بعد ہم چاروں بیس کیمپ لوٹ آئے۔

''او...... خیر کا کے...... ! مجھے تو تُو بھی کسی جنگی جرنیل سے کم نہیں لگتا...... بڑی زبردست منصوبہ بندی کی ہے تُو نے......'' اول خیر نے اپنے مخصوص لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس دور دراز کے جزیرے میں بیک وقت وحشی قبائل اور جدید اسلحہ سے لیس جنرل ایڈوانی جیسے خبیث اور طاقت ور دشمنوں کے خلاف تو نے بڑا جال بچھا ڈالا ہے، شطرنج کی ایک پوری بساط بچھا دی ہے، مگر اب مہرے سرکانے کی دیر ہے۔''

''مہرے سرکا چکا ہوں میں اول خیر!'' میں نے اس کی بات پر کہا۔ ''اب بس مات دینے کی دیر ہے۔''

''او...... خیر!'' وہ دھیرے سے بولا۔

اسی وقت میرے کالر میں اڑسے ہوئے ٹرانسمیٹر کی بپ کی آواز ابھری۔ میں چونکا۔

''یس! ڈیال داس اسپیکنگ......''

''سر! بلراج سنگھ آچکے ہیں۔ آپ نے اُن دونوں قیدیوں کو ابھی تک ڈارک کیسل نہیں پہنچایا؟'' اس کی بات پر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، جلدی سے بولا۔

''میں ان سے کچھ ضروری پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔ ابھی میں نے اتنی جلدی انہیں ڈارک کیسل پہنچانا ضروری نہیں سمجھا تھا، کیوں؟ ویسے خیریت تو ہے ناں......؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''سر! آپ کے شاید علم میں نہیں...... اس بات پر چھوٹی سرکار (بلراج سنگھ) ناراض ہو سکتے ہیں۔ وہ بہت جلد کارنر میٹنگ بلوانے والے ہیں۔''

''اوکے، تمہیں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں، میں انہیں رپورٹ میں مطمئن کروں گا۔''

''جیسی آپ کی مرضی جناب! میں نے تو اپنا کام کر دیا، اب آپ جانیں اور چھوٹی سرکار، اٹس اوور......''

میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچنے لگا۔ میری پیشانی پر ان گنت سلوٹوں کا جال سا پھیل گیا تھا۔ اسی وقت کمیل دادا اور شکیلہ بھی وہاں آن موجود ہوئے۔

''کیا بات ہے؟ کوئی گڑبڑ ہو گئی شہزی؟'' کمیل دادا نے غور سے میرا چہرہ تکتے ہوئے پوچھا۔ میں نے اسے رتن لال کی کال سے متعلق بتا دیا۔ جسے سن کر اول خیر اور شکیلہ تو پریشان نظر آنے لگے تھے جبکہ کمیل دادا کچھ سوچنے میں محو ہو گیا تھا۔ تب میں نے ہی کہا۔

''اس کا ایک ہی حل مجھے سمجھ میں آتا ہے۔ بتا دوں گا کہ دونوں قیدی فرار ہونے کی کوشش میں شوٹ کر دیے گئے۔''

کمیل دادا نے میری بات فوراً ہی رد کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت زیادہ اوور کانفیڈنس کا شکار ہو رہے ہو، شہزادے! اس میں تمہارا نہیں بلکہ پے در پے کامیاب ہونے والی تمہاری پلاننگ کا زیادہ دخل ہے اور ایسے ہی مواقع پر میں تمہارے جیسا آدمی بھی مار کھا جاتا ہے۔''

''ہمیں اسی رات رتن لال کو اس کے ساتھیوں سمیت جہنم واصل کر دینا چاہیے تھا۔'' اول خیر بولا۔

''یہ اتنا آسان نہ ہوتا۔ اچھی خاصی لڑائی لڑنا پڑتی ہمیں۔ بھانڈا پھوٹنے کا خطرہ ہوتا اس میں......'' باریبہ بھی

وہاں آگئی تھی اور اس نے بھی سب سن لیا تھا۔
''بلراج اتنا سیدھا نہیں ہے کہ وہ تمہاری یہ بات آسانی سے مان لے گا۔''
''قیدیوں والی اڑچن اب ہمارے گلے پڑتی نظر آرہی ہے، اسے فیس کرنا ہی ہوگا۔'' کبیل دادا بولا۔
''کوئی چارہ کار نہ دیکھتے ہوئے ہی میں نے ایسا کہا تھا...... کہ مجھے بلراج سے اس ضمن میں کیا کہنا ہے۔'' میں نے اپنی پہلی والی بات کے حوالے سے کہا۔
''تو پھر اس کارنر میٹنگ کو اٹینڈ کرنے کے لیے تمہیں اکیلے ڈارک کیسل نہیں جانا چاہیے۔'' کبیل دادا بولا تو میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سنجیدہ لہجے میں آگے بولا۔ ''شہزی! تمہیں اب خود کو ذہنی طور پر ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ ہم چاروں تمہارے ساتھ چلیں گے۔ میٹنگ میں تو خیر ہمیں شرکت کی اجازت نہیں ہوگی، مگر ہم وہیں کسی کمرے میں موجود رہیں گے، یوں بھی تمہارے ساتھ ہوں گے تو کون ہمیں ڈارک کیسل میں داخل ہونے سے روکے گا؟''
''ہاں! یہ تو ہے...... مگر یار کبیل! میرا نہیں خیال کہ بلراج اتنی سی بات پر مجھ سے ایک دم ناراض ہو جائے گا اور گولی مارنے کی کوشش کرے گا، کیونکہ میں ان کے بونیزا والے میگا پروجیکٹ میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہوں۔'' میری بات پر کبیل دادا ٹھٹھا مار کے ہنسا۔
''میں نے کب کہا کہ وہ تمہیں وہیں کھڑے کھڑے گولی مار دے گا۔ اس کے دل میں شک پیدا ہو جائے گا تمہاری طرف سے۔ نصیر شاہ کی پلاننگ کے تحت بونیزا پروجیکٹ پر کام شروع کر دیا گیا ہے۔ جس کی دریافت کی نشاندہی کی جا چکی ہے، دیگر ماہر مائننگ انجینئرز کی ٹیم نے اس پروجیکٹ کو ٹریس کر لیا ہوگا۔ لیکن پھر بھی بلراج نے تمہیں موقع دینا چاہا بھی تو زیادہ سے زیادہ ایک دن کا موقع دے گا۔ پھر در پردہ ہم سب کی قبریں کھودنا شروع کر دے گا۔''
کبیل دادا کے متوقع ہولناک انکشاف کو رد کرنے کی کوئی بھی وہاں جرأت نہ کر سکا۔ ہم سب کو ایک گمبھیر سی چپ کھا گئی تھی۔ عین آخری لمحات میں ساری اسکیم فیل ہوتی نظر آرہی تھی۔
بالآخر میرے اور کبیل دادا کی مشترکہ مشاورت کے تحت یہی طے پایا کہ میرے ساتھ میرے یہ چاروں مذکورہ ساتھی بھی ہوں گے، جو وہاں موجود رہیں گے، کسی بھی قسم کے ممکنہ اور فوری خطرے سے نمٹنے کے لیے ہم سب حرکت میں آجائیں گے۔ بلراج کو یہی بتانا پڑے گا کہ میں نے پوچھ گچھ کے لیے دونوں قیدیوں کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا، ابھی اس سے یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ انہیں ہلاک کر دیا ہے۔ یہ ممکن تھا کہ وہ ان دونوں قیدیوں کو فی الحال میری ہی دسترس میں رہنے دیتا، یہ امکان کبیل دادا کا تھا، دوسرا امکان یہ تھا کہ بلراج ان دونوں قیدیوں (کوریلا اور سوشیلا) کو پیش کرنے کا حکم دیتا تب مشکل پیش آسکتی تھی، لہٰذا تب ہی اچانک بیس کیمپ میں موجود سلاسکو ہم سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ کر کے بتائے گا کہ دونوں قیدی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور وہ اور تورک ان کے تعاقب میں جارہے ہیں۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے میرا سگنل ملتے ہی تورک نے اسی وقت میٹنگ کی موجودگی میں ہی یہ کال مجھے کرنا تھی۔ اس کے بعد میں حرکت میں آجاؤں گا اور بعد میں بلراج سے یہ کہنے کا از خود ''گراؤنڈ'' بن جائے گا کہ دونوں قیدیوں کو بالآخر گولی مار دی گئی۔
کبیل دادا کے اس مشورے پر مجھ سمیت سب نے صاد کیا تھا۔ بہرحال اب تخت تھا یا تختہ...... حالات کو فیس اَپ کرنا ہی تھا۔

☆☆☆

بلراج سنگھ کان کنی سے متعلق بھاری مشینریز پہنچا چکا تھا۔ بونیزا کی سمت جانے والی سڑک اور عارضی ائر اسٹرپ ہنگامی بنیادوں پر تیار کی جا چکی تھی۔ ایک سی ون پلین، انجینئرز اور کان کنوں کی پوری ٹیم سوار کرا کے لایا تھا جبکہ دو عدد اوٹرز طیاروں میں بھاری مشینریز تھیں۔ ان میں دو بھاری اور حجم میں بڑے بلڈوزرز کو بڑے بڑے پیراشوٹس کے ذریعے بونیزا کے بلند پہاڑی علاقے میں اُتارا گیا تھا، کیونکہ وہاں تک کا علاقہ دشوار گزار تھا اور سڑک بھی وہاں تک لے جانا ممکن نہ تھی۔
اس کے اگلے دن بلراج نے ڈارک کیسل کے ایک کمرے میں کارنر میٹنگ بلا لی، جس میں میرے اور شلپا سمیت، رتن لال، سچانند اور تین چار دوسرے اہم ساتھی شریک تھے۔ جبکہ کبیل دادا اور اول خیر وغیرہ دوسرے کمرے میں موجود کسی بھی قسم کی اچانک اور خطرناک متوقع صورت حال سے نمٹنے کے لیے ''چوکنا'' بیٹھے تھے۔
سب بلراج سنگھ کے ان دو دن کی غیر موجودگی میں کیے گئے کاموں میں اُسے بریفنگ دینے لگے۔ مگر جب رتن لال اُس رات والے اپنے اور سے جی کو ہارا کے بھولا ناتھ

سمیت ٹکراؤ کے متعلق بلراج سنگھ کو رپورٹ دینے لگا تو میرا دل سینے میں انجانے خدشات کے باعث تیزی سے دھڑکنے لگا۔

بلراج کرید کرید کر ان دونوں قیدیوں سے متعلق رتن لال سے پوچھنے لگا تو اس نے میری جانب اشارہ کرکے کہا۔

''سر! اس سے آگے کی رپورٹ آپ کو دیال داس ہی دیں گے، کیونکہ وہ دونوں قیدی خواتین ان کے کہنے پر ان کے ہی حوالے کردی گئی تھیں۔''

یہاں مجھے بلاتاخیر اور پورے اعتماد کے ساتھ بلراج سنگھ جیسے گھاگ آدمی کو اپنی اس بارے میں رپورٹ پیش کرنا تھی۔ لہٰذا میں نے پہلے تو دانستہ گھما پھرا کر بات کرتے ہوئے موضوع کو نصیر شاہ اور بیس کیمپ کی طرف موڑنا چاہا تو بلراج سنگھ ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

''وہ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے، دیال داس! مجھے اب صرف ان دونوں قیدیوں کے بارے میں بتاؤ...... جو رتن لال نے تمہارے کہنے پر حوالے کردیے تھے۔''

''وہ میرے ہی قبضے میں ہیں اب تک...... مگر......''

یہ کہتے ہوئے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''مگر کیا......؟ تم نے انہیں پہلی فرصت میں ڈارک کیسل کیوں نہیں پہنچایا؟'' اس نے میری بات کاٹی۔

''میں وہی بتانے لگا ہوں جناب!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''چونکہ یہ دونوں قیدی ہمارے دشمن ٹولوں سے تعلق رکھتے تھے، اسی لیے میں نے ضروری سمجھا کہ ان سے کچھ ضروری پوچھ گچھ کرلی جائے۔''

''یہ پوچھ گچھ ان سے تم یہاں بھی لاکر کر سکتے تھے؟'' اس نے کہا۔

''وہاں کرنے میں، میں نے کوئی عار نہیں سمجھا تھا، کیونکہ میں نے ان کے مفرور ساتھیوں کے خلاف فوری ایکشن لینا تھا۔''

''مگر رتن لال کے مطابق ان میں سے ایک قیدی عورت خود کو ان کا ساتھی سمجھنے کے بجائے قیدی ہی کہنے پر بضد تھی۔ یہ کیا معاملہ تھا؟'' میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا کیونکہ وہ سوشیلا کے بارے میں ہی پوچھ رہا تھا اور تب ہی ایک نکتہ میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ کہیں سوشیلا نے رتن لال کو اپنا نام نہ بتادیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی۔

''ویسے اس کا نام کیا تھا؟'' بلراج نے یہ سوال میرے بجائے رتن لال سے پوچھا تو میں دھڑکتے دل سے یہی دعا کرنے لگا کہ کاش سوشیلا نے اپنا نام نہ بتایا ہو۔ میری نظریں رتن لال پر جم گئیں۔

''سوشیلا......'' رتن لال نے نام بتایا اور پھر جیسے ایٹم بم پھٹ پڑا۔ بلراج سنگھ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

''کک...... کیا نام بتایا تم نے...... سس...... سوشیلا......؟''

''جی سر بالکل یہی نام بتایا تھا۔'' رتن لال نے سر ہلایا۔ میرا ہاتھ اپنی بیلٹ میں اڑسے ہوئے پستول کی طرف رینگ گیا۔

''اس کا حلیہ بتاؤ...... جلدی۔'' وہ حلق کے بل چیخا۔

رتن لال نے سوشیلا کا حلیہ بتایا تو وہ بولا۔ ''وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ ان کی قیدی بھی ہوسکتی ہے اور ساتھی بھی...... اس کا مطلب ہے وہ مردود شہزی بھی ان کے ساتھ ہوگا......'' بلراج خود کلامیہ بڑبڑایا اور اسی وقت حکم جاری کر دیا کہ بیس کیمپ روانہ ہوا جائے، سوشیلا ہمارا بہت اہم شکار ہے۔ چلو، ابھی بیس کیمپ...... ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ سب ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ میرے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس وقت ان سب کا بیس کیمپ جانا میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے خطرے سے خالی نہ تھا اور سارے منصوبے کا بھی افشائے راز ہونا یقینی امر ہوتا۔ کیونکہ وہاں سوشیلا ہی نہیں کوریلا بھی تھی اور کوریلا ہماری حقیقت جان چکی تھی۔

''سر! اتنی جلدی نہ کیجیے...... کیونکہ وہاں نصیر شاہ......''

''بھاڑ میں گیا اب نصیر شاہ......'' بلراج میری بات کاٹ کر جنونی لہجے میں بولا۔

''ہم نے جتنا اس سے کام لینا تھا لے لیا، اب باقی کام اس سے گن کی نوک پر لیں گے مگر سوشیلا سے میں خود ابھی جا کر ملوں گا۔''

بلراج زخمی شیر کی طرح دہاڑے جا رہا تھا اور اب میرے لیے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ جو کچھ کرنا تھا ابھی اور اسی وقت کرنا تھا۔ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر ایک ہی گردان کیے جا رہا تھا۔

''اب نہیں...... تو کبھی نہیں...... اب نہیں...... تو کبھی نہیں......''

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

گواہی

جمال دستی

سچ اور جھوٹ کا تمام تر دارومدار ملزم کے بیان پر ہوتا ہے... بیان کی کڑی ہی ملزم کو مجرم ٹھہراتی ہے... ایک سیدھے سادے نوجوان کی دوراندیشی جو پولیس کو بیان دینے کا فیصلہ کر بیٹھا...

سراغرسی پر مبنی ایک مشاہداتی تحریر......

''میں نائٹ شفٹ میں کام کرتی ہوں۔'' پیٹریشیا نے بتایا۔ ''آج صبح جب میں گھر واپس پہنچی تو میں نے اپنا پچھلا دروازہ کھلا ہوا پایا اور میری جیولری کا بکس غائب تھا۔''

سراغ رساں گریسی نے موقع کا جائزہ لینا شروع کیا۔ مکان کے عقبی دروازے کو لات مار کر توڑا گیا تھا اور

گھر کا سامان الٹ پلٹ پڑا تھا۔ ''کیا حال ہی میں تمہارا کسی کے ساتھ کوئی تنازعہ ہوا تھا؟''

پیٹریشیا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں ایک ٹریولنگ نرس ہوں۔ مجھے اس ٹاؤن میں آئے ہوئے صرف چند مہینے ہوئے ہیں۔ لہٰذا میں حقیقت میں کسی کو بھی نہیں جانتی اور نہ ہی کسی سے واقف ہوں۔''

سراغ رساں گریسی نے پیٹریشیا کو ایک نوٹ بک اور پین تھماتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اپنی گمشدہ جیولری کی فہرست بنا سکتی ہو تاکہ میں اس دوران اپنا کام آگے بڑھا سکوں۔''

''یقیناً۔''

پیٹریشیا نے اپنی چوری شدہ جیولری کی فہرست بنانا شروع کردی۔ سراغ رساں گریسی اپنی کار کی جانب چلی گئی اور اپنی کرائم سین کٹ نکال لی۔

اس نے اپنے کیمرے سے تقریباً درجن بھر تصویریں اتاریں اور فنگر پرنٹس کے لیے گھر کے مختلف حصوں میں پوڈر چھڑکنے لگی پھر جب اس نے اس سنگار میز پر جہاں جیولری بکس رکھا ہوا تھا، ایک مکمل ہینڈ پرنٹ کا نشان موجود پایا تو اس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے۔

پھر اُس کے ہونٹوں سے دوبارہ سیٹی کی آواز نکل گئی جب اس نے اس ہینڈ پرنٹ کا موازنہ پیٹریشیا کے ہاتھ کے پرنٹ سے کیا۔

وہ ہینڈ پرنٹ پیٹریشیا کے ہینڈ پرنٹ سے میچ نہیں کرتا تھا۔

''یہ یقیناً ہمارے مطلوبہ چور کے ہاتھ کا پرنٹ ہے۔'' اس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''میں اسے فنگر پرنٹ ڈیٹا بیس میں ڈال کر چیک کروں گی کہ یہ کس کی انگلیوں کے نشانات سے میچ کرتا ہے......''

''کوئی ضرورت نہیں۔'' سراغ رساں برنیڈن نے گھر میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔ وہ سراغ رساں گریسی کی بلند آواز سن چکا تھا۔

''کیوں ضرورت نہیں؟'' گریسی نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لیے کہ مجھے پہلے سے معلوم ہے کہ یہ واردات کس نے کی ہے۔''

گریسی نے چونکتے ہوئے اپنے پارٹنر سراغ رساں کی طرف دیکھا۔ ''واقعی! وہ کون ہے؟''

''جیوڈ ڈگلس! وہ دو سڑک پار رہتا ہے۔ وہ اس علاقے میں دو مرتبہ پکڑا جا چکا ہے۔ آج کل ضمانت پر رہا ہے۔'' سراغ رساں برنیڈن نے بتایا۔

''ہمیں تب بھی اس ہینڈ پرنٹ کو ڈیٹا بیس میں چیک کرنا ضروری ہے تاکہ یہ تصدیق ہوجائے کہ یہ پرنٹ اسی کے ہاتھ کا ہے۔ اگر تمہارا کہنا درست ہے تو پھر ہمارا کام صبح سویرے ہی نمٹ جائے گا۔'' گریسی نے پلٹتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی یہ کام سرانجام دیتی ہوں۔''

''مگر یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا جتنا کہ تم سمجھ رہی ہو۔'' سراغ رساں برنیڈن نے کہا۔

''کیوں آسان نہیں ہوگا؟'' گریسی چلتے چلتے رک گئی۔

''اس لیے کہ وہ ایک نابالغ لڑکا ہے اور اس کی انگلیوں کے نشانات ہماری فائل میں موجود نہیں ہیں۔''

یہ سن کر سراغ رساں گریسی اپنے ہونٹ چبانے لگی۔

''اوکے۔'' اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''آؤ، چل کر اس کے پڑوسیوں سے بات کرتے ہیں اور جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا کسی نے تمہارے اس مسٹر جیوڈ ڈگلس کو رات کے وقت آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

وہ دونوں پیٹریشیا کے برابر والے مکان پر جا پہنچے اور دروازے پر دستک دی۔

دروازہ ایک عمر رسیدہ خاتون نے کھولا۔ ان دونوں پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر الجھن کے آثار ابھر آئے۔ ''میں تم لوگوں کی کیا مدد کرسکتی ہوں؟''

''ہم نقب زنی کی ایک واردات کی تحقیقات کر رہے ہیں۔'' سراغ رساں گریسی نے کہا۔ ''ہم جاننا چاہتے ہیں کہ کیا گزشتہ شب آپ نے کوئی مشتبہ حرکت یا کسی مشتبہ فرد کو دیکھا تھا؟''

''اوہ مائی گاڈ! نقب زنی کی واردات؟''

گریسی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''نہیں، میں نے ایسا کچھ نہیں دیکھا۔ میں گھر سے باہر زیادہ نہیں نکلتی کیونکہ مجھے مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔ البتہ میرا بھانجا سمندر پار سے آیا ہوا ہے اور وہ گزشتہ شب رات گئے تک باہر موجود رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا کچھ دیکھا ہو۔'' اس عمر رسیدہ خاتون نے بتایا۔

''اس کا نام؟''

''ڈرشین۔''

سراغ رساں برنیڈن نے بیرونی لان میں بکھری ہوئی بیئر کی خالی بوتلوں کی بڑی مقدار کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ ''کیا یہ ابتری اسی کی پھیلائی ہوئی ہے؟''

''اوہ ڈیئر! وہ خود سے کبھی انہیں نہیں سمیٹتا ہے۔ مجھے اس سے یہ صفائی کرانا پڑتی ہے۔''

''وہ کہاں ہے؟'' گریسی نے پوچھا۔

''وہ لیونگ روم میں صوفے پر پڑا سو رہا ہے۔''

''کیا ہم اسے جگا سکتے ہیں؟'' سراغ رساں برنیڈن نے پوچھا۔

''بالکل جگا سکتے ہیں، سر۔'' عمر رسیدہ خاتون نے جواب دیا اور انہیں اپنے ہمراہ لیونگ روم میں لے آئی جہاں ٹرسٹین ایک صوفے پر لیٹا مزے سے سو رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور وہ خراٹے لے رہا تھا۔

سراغ رساں برنیڈن نے اپنے جوتے کی نوک سے صوفے کے پائے پر ہلکی سی ٹھوکر ماری تو ٹرسٹین نے بے تاب ہو کر کروٹ بدل لی۔ برنیڈن نے ایک بار پھر پائے پر ٹھوکر ماری تو ٹرسٹین نے پہلو بدلتے ہوئے آنکھیں کھول لیں۔ پھر جب اس کی نگاہ برنیڈن کے پولیس بیج اور اس کی کمر کے بیلٹ میں لگے ہوئے ریوالور پر پڑی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

برنیڈن اس کے مقابل قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ''کیا تم نے گزشتہ شب کسی کو کوئی مشتبہ حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

ٹرسٹین نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں، سر! میں نے ایسا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ میں تو بیرونی لان میں بیٹھا رہا تھا۔''

''کیا تم نے کوئی غیر معمولی آواز سنی تھی؟''

''نہیں، سر۔''

سراغ رساں گریسی ایک قدم آگے آگئی اور بولی۔ ''تم کس وقت باہر گئے تھے؟''

ٹرسٹین اپنا سر کھجانے لگا۔ ''تقریباً آٹھ بجے کے وقت۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور پھر تم اندر کب واپس آئے تھے؟''

''اس وقت لگ بھگ صبح کے تین بج رہے تھے۔''

سراغ رساں گریسی یہ سن کر مسکرا دی۔ ''شکریہ تم نے ہمیں اتنا وقت دیا۔''

جب وہ دونوں پڑوسی کے گھر سے باہر نکل آئے تو برنیڈن نے گریسی سے پوچھا۔ ''کیا جیوڈ ڈگلس کو اٹھانے کی تیاری کر لوں؟''

اس کی قطعی ضرورت نہیں۔ ہم فی الوقت بیئر کی ان تمام بوتلوں کو اکٹھا کریں گے، ان پر سے ٹرسٹین کی انگلیوں کے نشانات حاصل کریں گے اور اگر وہ نشانات اس ہینڈ پرنٹ سے میچ کر گئے جو ہم نے پیٹریشیا کی سنگار میز پر سے حاصل کیے تھے اور جن کے بارے میں میرا یقین ہے کہ وہ چور کے ہاتھ کے نشانات ہیں تو پھر ہم اسے گرفتار کر لیں گے۔''

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد سراغ رساں گریسی اپنے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی کہ سراغ رساں برنیڈن اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اسے لیبارٹری کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ تم نے کہا تھا، ٹرسٹین کی انگلیوں کے نشانات اس نرس کی سنگار میز پر سے حاصل کیے گئے انگلیوں کے نشانات سے میچ کر گئے ہیں۔''

یہ سنتے ہی گریسی اپنی کرسی پر سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ''چلو، چل کر اسے گرفتار کرتے ہیں۔''

''اتنی جلدی نہیں۔'' سراغ رساں برنیڈن نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہیں کس طرح پتا چلا، مجرم ٹرسٹین ہی ہے۔''

''اور میں تمہیں بتاؤں گی بھی نہیں۔'' گریسی نے شرارت بھرے لہجے میں کہا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''یہ میری جاب سیکیورٹی کا معاملہ ہے۔''

جب سراغ رساں برنیڈن نے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو گریسی نے بے ساختہ ایک ہلکا سا قہقہہ بلند کیا اور گویا ہوئی۔ ''جب میں نے ٹرسٹین سے یہ پوچھا تھا کہ کیا گزشتہ شب اس نے کوئی مشتبہ حرکت دیکھی تھی یا کوئی مشکوک آواز سنی تھی تو اس نے نہیں میں جواب دیا تھا اور خود ہی یہ بتا دیا تھا کہ وہ بیرونی لان میں بیٹھا رہا تھا۔ چونکہ ٹرسٹین کو کسی نے بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ چور پیٹریشیا کے گھر میں عقبی دروازے سے داخل ہوا تھا تو میں سمجھ گئی تھی۔ وہ خود کو عقبی دروازے سے پرے رکھنے اور اس کا تذکرہ کرنے سے اس لیے کترا رہا تھا کہ چوری کی وہ واردات اسی نے کی تھی اور انگلیوں کے نشانات کی تصدیق سے اب ثابت ہو گیا ہے کہ چور وہی ہے۔ اب چل کر اسے گرفتار کرتے ہیں اور چوری کا مال بھی اس سے برآمد کرتے ہیں۔''

پھر وہ دونوں پولیس اسٹیشن سے نکل کر پیٹریشیا کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

تہ در تہ..... پیچ در پیچ بل دار کہانی.....

کچھ چیزیں وقت کی منازل طے کرتے کرتے نایاب ہوتی چلی جاتی ہیں... گردشِ وقت نے اس تصویر کو بھی انمول بنا دیا تھا... دولت کے پیچھے بھاگنے والوں کے ساتھ... کچھ مخلص جاں نثار بھی اس کی تلاش میں سرگرداں تھے... ایک پُراسرار دوست کی سنگت میں واقعات کی کڑیاں جوڑتی اور فاصلوں کو عبور کرتی کتھا...

گمشدہ تصویر

تنویر واسطی

جولیس کچن کی طرف جا رہا تھا لیکن اچانک اس کی رفتار سست ہوئی تو میں چونک گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور جبڑے بھنچ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا، اس نے اپنا رخ اچانک تبدیل کیا اور دفتر کی جانب جانے لگا جس سے میری حیرانی اور بڑھ گئی۔ میں یہ بتا دوں کہ وہ اپنے صبح کے معمولات پر سختی سے عمل کرتا ہے۔ زلزلہ آئے...... آگ لگ جائے یا جنگ ہو رہی ہو، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ روزانہ صبح ساڑھے چھ بجے

اٹھتا ہے۔ اگلے دو گھنٹے اپنے پرائیویٹ جم میں مارشل آرٹس کی ٹریننگ کرتا ہے جو اس نے ٹاؤن ہاؤس کی تیسری منزل پر بنا رکھا ہے۔ پھر شیو، غسل اور لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ کچن کا رخ کرتا ہے اور اپنے لیے کافی بناتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ کوئی پھل یا جیم لگے ہوئے دو سلائس لیتا ہے۔ سوا نو بجے وہ دفتر آتا ہے اور اخبارات کا بھی مطالعہ ضرور کرتا ہے۔ اس معمول سے ہٹنے کی وجہ اس وقت میری سمجھ میں آئی جب اس نے دفتر کا دروازہ کھولا۔ وہاں اس کی بہن جولیا اپنے پاؤں اوپر اٹھائے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک شریر مسکراہٹ تھی۔

جولیس نے اس سے کرسی خالی کرنے کے لیے نہیں کہا بلکہ خود اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ جولیس کو اپنی بہن کی آمد کے بارے میں کیسے معلوم ہوا کہ وہ دفتر میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔ بالآخر میں نے اس سے کہہ دیا۔

''تمہیں یقیناً اس خوشبو کے بارے میں علم ہوگا جو وہ لگاتی ہے۔ تبھی اس کی آمد کا پتا چل گیا۔''

جولیس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا البتہ وہ خود بھی حیران تھا کیونکہ بارہ سال تک وہ ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے اور اب چھ ماہ میں وہ دوسری بار آئی تھی۔

''مجھے تمہارے آنے کی خوشی ہے۔'' جولیس نے اپنی بہن سے کہا۔ ''لیکن لگتا ہے کہ تم کسی مشکل میں ہو، کیا ہم اس پر ابھی گفتگو کریں یا کافی اور ناشتے کے بعد؟''

جولیا کی مسکراہٹ مدھم پڑ گئی، وہ بولی۔ ''ابھی بہتر رہے گا۔ میں تمہارے اسسٹنٹ آرچی اسمتھ سے بھی ملنا چاہوں گی۔ حیرت ہے کہ میں ابھی تک اس کا کھوج نہیں لگا سکی۔ اس کا کوئی وجود بھی ہے یا نہیں؟''

''بہت خوب اور تم اس سے کیوں ملنا چاہتی ہو؟''

''مجھے یقین ہے کہ تم اس سوال کا جواب پہلے سے جانتے ہو۔''

''مجھ پر طنز کر رہی ہو؟''

جولیا نے اپنے پاؤں میز پر سے ہٹائے اور کرسی پر سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اسے یا تمہیں کس طرح پتا چلا کہ پچھلی مرتبہ میں کس پرواز سے یہاں آئی تھی؟''

جب جولیس کے ٹاؤن ہاؤس میں دھماکا ہوا تھا اور میڈیا میں یہ خبر چل رہی تھی کہ وہ بھی اس دھماکے میں ہلاک ہو گیا ہوگا جبکہ جولیس کو شبہ تھا کہ اس کی بہن یورپ کے کسی مقام سے امریکا کے لیے سفر کر رہی ہوگی تاکہ اس کی آخری رسومات میں شرکت کرنے کے علاوہ دیگر معاملات بھی دیکھ سکے۔ اس نے یہ معلوم کرنے کی ذمے داری مجھے سونپی کہ وہ کس پرواز سے آ رہی ہے جبکہ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس نام سے اور کس ائرپورٹ سے جہاز میں سوار ہوگی۔ میرے پاس اس کی صرف ایک چودہ سال پرانی تصویر تھی اور یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنا۔ خوش قسمتی سے میں بخارسٹ انٹرنیشنل ائرپورٹ کے سیکیورٹی سسٹم میں گھس گیا اور اس کی ایک ویڈیو تلاش کر لی جس سے اس کا فرضی نام اور دیگر سفری معلومات حاصل ہو گئیں۔

''میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتی ہوں۔'' جولیا نے کہا۔ ''میری کمپنی کے پاس بھی ایسی ٹیکنالوجی نہیں جس کے ذریعے وہ اس قسم کی معلومات حاصل کر سکے۔ لہٰذا میں جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں یا تمہارے فرضی اسسٹنٹ آرچی کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''

''کیا کمپنی نے تمہیں بھیجا تھا؟''

''نہیں، کسی وجہ سے میں نے انہیں نہیں بتایا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔'' اس کے لہجے میں نرمی آ گئی۔ ''جیسا کہ تمہارا اندازہ ہے۔ میں واقعی مشکل میں ہوں۔ جب سے مجھے نیا کام ملا ہے، مجھ پر تین حملے ہو چکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جو ٹیکنالوجی تم نے گزشتہ بار استعمال کی تھی، وہی اس حملہ آور کو تلاش کرنے میں میری مدد کر سکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر چوتھا حملہ کرے۔''

''تمہارے مسئلے کا ایک آسان حل ہے۔ ابھی یہ ملازمت چھوڑ دو اور بوسٹن میں قیام کرو، میں نے تمہیں پہلے بھی اپنا پارٹنر بننے کی پیشکش کی تھی۔ میں اس پر قائم ہوں۔''

وہ اپنے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔ ''اس سے یہ حملے نہیں رکیں گے بلکہ وہ حملہ آور بوسٹن میں بھی آ جائے گا۔ معاف کرنا جولیس، زندہ رہنے کے لیے میری بہترین حکمت عملی یہی ہو سکتی ہے کہ اس حملہ آور کو تلاش کیا جائے۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے اور کسی نہ کسی طرح اس سلسلے کو ختم کیا جائے۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟''

''شاید تم یہ نہ جان سکو۔'' جولیس نے کہا۔ ''میرا وجدان مجھے بتا رہا ہے اور اس طرح کے معاملات میں یہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں واپس پیرس چلی جاؤں گی اور خود ہی اپنے مسئلے سے نمٹ لوں گی لیکن میں امید کر رہی

ہوں کہ اگر تمہارے پاس ایسی کوئی چیز ہے جس سے میری مدد ہو سکے تو وہ مجھے ادھار دے دو۔''

جولیس کے جبڑے سختی سے بھنچ گئے اور وہ فیصلہ کن انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔''میں تمہارے ساتھ پیرس جاؤں گا۔ ہم دونوں مل کر اس بدمعاش کو تلاش کریں گے۔''

جولیا مسکراتے ہوئے بولی۔''یقیناً تم دنیا کے سب سے ممتاز سراغ رساں ہو گے لیکن میں جس دنیا میں رہتی ہوں، اس میں تم اجنبی ہو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتی۔''

''یہ بالکل مضحکہ خیز بات ہے۔''

جولیا نے جواب میں کندھے اُچکا دیے۔ دونوں کے درمیان چند سیکنڈ تک نظروں کا تبادلہ ہوا پھر جولیس نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔''پھر مجھے یہیں سے اپنی مدد کرنے دو۔ مجھے بتاؤ کہ تم کس مصیبت میں مبتلا ہو؟''

''کچھ وجوہات کی بنا پر نہیں بتا سکتی۔ یہ ایک خاص نوعیت کی ذمے داری ہے۔ اگر تمہیں اس کے بارے میں جاننے کی اجازت مل بھی گئی جو کبھی نہیں ملے گی۔ تب بھی میں اس معاملے میں گھسیٹ کر تمہاری زندگی خطرے میں نہیں ڈالوں گی۔''

''تم اس کی فکر مت کرو جولیا۔''

اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔''میں ڈیڑھ بجے کی فلائٹ سے پیرس واپس جا رہی ہوں، مجھے امید ہے کہ ناشتے اور کافی کے لیے ہمیں کچھ وقت مل جائے گا۔''

جولیس کچھ دیر میز پر انگلیوں سے طبلہ بجاتا رہا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ جب وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہوتا تو اس کے طبلہ بجانے کی رفتار تیز ہو جاتی۔ اس نے جولیا کے چہرے پر سے نظر ہٹائی اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔''میں اس کے لیے کوئی شرط عائد نہیں کر رہا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جو کچھ تمہیں دکھانے والا ہوں، اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گی۔''

جیسا کہ میری کہانیاں پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں ایک ٹائی پن کی شکل میں جولیس کے ساتھ رہتا ہوں۔ اس نے ایک گہری سانس لے کے مجھے اپنی ٹائی سے الگ کیا اور میز پر رکھ دیا پھر اس نے ایک چھوٹا سا ریسیور نکالا جس کے ذریعے میں اس سے رابطے میں رہتا تھا اور اسے ایک اسپیکر سے منسلک کر دیا۔ اس کے بعد میری جانب اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔

''جولیا، مجھے اجازت دو کہ اپنے اسسٹنٹ آرچی سے تمہارا تعارف کرواؤں۔''

جولیا کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ وہ پہلے مجھے اور بعد میں جولیس کو گھورنے لگی۔ میرا ردِعمل بھی کچھ عجیب تھا اور میرے مرکزی پروسیسنگ یونٹ میں ایک ناخوشگوار سی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اس وقت میں اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا کیونکہ یہ میرے لیے ایک بالکل نیا احساس تھا لیکن بعد میں محسوس ہوا کہ مجھے بے آرامی ہو رہی تھی۔ ماضی میں بھی میرا واسطہ دوسرے لوگوں سے پڑتا رہتا تھا کیونکہ میں جولیس کے فون سنتا اور اس کی طرف سے بے شمار کال کیا کرتا تھا۔ اس سے پہلے جولیس نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ میں گوشت پوست کا انسان نہیں بلکہ دو انچ کا ٹکڑا ہوں جو کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی مدد سے وہ کام بھی کر لیتا ہے جو کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

جولیا نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔''گویا تمہارا اسسٹنٹ ایک جدید قسم کا آئی فون ہے۔''

جولیس مسکراتے ہوئے بولا۔''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کا نیوٹرون نیٹ ورک ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ نفیس اور طاقت ور ہے لیکن یہ بالکل انسانوں کی طرح کام کرتا ہے اور بہت زیادہ قابل ہے۔''

جولیا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جس انداز میں جولیس کو دیکھا، اس سے یہی لگ رہا تھا۔''کیا تم اس کا مظاہرہ کرو گے۔ میں بھی دیکھوں کہ یہ کھلونا کس طرح کام کرتا ہے؟''

جولیس نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''آرچی، تم کیوں خاموش ہو؟''

''میں سوچ رہا تھا کہ تمہاری بہن کچھ کہنے سے پہلے کس کس طرح میری بے عزتی کرتی ہے۔''میں نے جواب دیا۔ میری آواز میں پہلے کی نسبت زیادہ سختی تھی۔

جولیا کے ہونٹ پھیل گئے جیسے وہ میرے جواب سے محظوظ ہوئی ہو۔ اس نے مجھ سے معذرت کی اور میری صلاحیتوں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں اسے کوئی سخت جواب دینے والا تھا لیکن اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس کے بجائے اسے اپنے بارے میں بتانے لگا اور تفصیل سے وضاحت کی کہ میں نے کس طرح چھ ماہ قبل اسے بخارسٹ ائرپورٹ پر تلاش کیا تھا۔

''کیا تم بینکنگ اور فون سسٹم میں بھی نقب لگا سکتے ہو؟''

''اگر کسی سائٹ کو ہیک کرنا ممکن ہے تو میں بھی ایسا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کر سکتا ہوں۔'' میں نے اپنی آواز معتدل رکھنے کی کوشش کی پھر تھوڑا سا توقف کر کے بولا۔ ''اس کا عملی مظاہرہ میں نے یوں کیا کہ کسی مزید ادائیگی کے بغیر پیرس کی پرواز میں تمہاری فرسٹ کلاس میں نشست مخصوص کروادی۔''

اس کی آنکھوں میں ایک تیز چمک نمودار ہوئی جیسے وہ میرا شکریہ ادا کر رہی ہو پھر وہ جولیس کی جانب متوجہ ہوئی اور اس سے پوچھا کہ میں اسے کہاں سے ملا۔

''میں نے اسے پوکر میں جیتا تھا۔''

میں نے جب اس سے یہ سوال پوچھنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے بھی یہی جواب دیا میری یادداشت میں ایسی کوئی بات محفوظ نہیں تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ میں اس تک کیسے پہنچا لہٰذا مجھے بھی اس کے جواب پر یقین کرنا پڑا۔

''اس جیسا کوئی اور بھی ہے؟'' جولیا نے پوچھا۔

''مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔'' جولیس نے جواب دیا۔

''اگر آرچی میرے ساتھ ہوا تو حملہ آور کو تلاش کرنے میں آسانی ہوگی، اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر مجھ تک پہنچے۔'' جولیا نے کہا۔ ''لیکن اس میں ایک سیکیورٹی کا مسئلہ بھی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ رہ کر یہ کسی بھی قسم کی معلومات کسی اور کو خاص طور پر تمہیں نہیں بتائے گا۔''

''ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' جولیس نے کہا۔ ''کیوں آرچی، ٹھیک ہے؟''

''ہاں، اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے پہلے ہی اپنا پروگرام اس طرح ترتیب دے لیا ہے کہ اس میں سے کچھ بھی باہر نہ آئے۔''

حالانکہ یہ سفید جھوٹ تھا۔ مجھے ایسا کوئی انتظام کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میں اسے دھوکا نہیں دینا چاہ رہا تھا کہ اس کی خفیہ معلومات دوسروں تک پہنچا دیتا لیکن وہ مجھ سے یقین دہانی چاہ رہی تھی اس لیے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔

''ایسی صورت میں تم سے یہی کہوں گا آرچی کہ میری بہن کی معاونت کرو اور اس بات کو یقینی بناؤ کہ یہ زندہ رہے۔ میرے لیے اس کی بڑی اہمیت ہے لیکن بہرحال فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔''

''یقیناً مجھ سے جو ہوسکا، وہ کروں گا۔''

معاملات طے ہوجانے کے بعد جولیا نے مجھے اپنے بالوں میں ہیئرپن کی طرح لگالیا اور ریسیور بائیں کان میں ٹھونسا پھر وہ اور جولیس کچن میں گئے اور انہوں نے اپنے لیے ناشتا بنایا اس دوران میں نے جولیس کے کئی باقی کام نمٹا دیے۔ ناشتا ختم کرنے کے بعد جولیس اپنی بہن کے ساتھ بیرونی دروازے تک آیا۔ جولیا نے بھائی کو یقین دلایا کہ وہ مجھے خفیہ رکھے گی اور مشن مکمل ہونے کے بعد مجھے جولیس کو واپس کردے گی۔

جولیا نے جہاز میں بیٹھتے ہی مجھے کام کے بارے میں بتا دیا۔ مجھے ان تئیس مشتبہ افراد کی فہرست میں سے اس کے حملہ آور کو شناخت کرنا تھا۔ مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ ان میں سے کوئی ایک اُن تین مقامات پر مل سکتا ہے جہاں جولیا پر حملے کیے گئے تھے۔ وہ خاص طور پر یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ ان میں سے کوئی ایک اس پر ہونے والے تیسرے حملے سے پہلے ہیتھرو ائرپورٹ پر موجود تھا۔

''میں یہ کرسکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم کس طرح کہہ سکتی ہو کہ وہ حملہ آور ان تئیس افراد میں سے کوئی ہے۔ تم مجھے پوری بات کیوں نہیں بتاتیں۔ شاید میں اس سے نمٹنے کا کوئی بہتر طریقہ تلاش کرسکوں۔''

اس نے بولنے کے بجائے اپنے اسمارٹ فون پر ٹائپ کیا۔ ''یہ ضروری نہیں۔''

''شاید تم مجھے ہیکنگ کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہو۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم جو چاہو سمجھو لیکن جولیس نے مجھے کہا تھا کہ تمہیں زندہ رہنا ہے اور میں یہ سب اس کے لیے کر رہا ہوں اس لیے کامیابی کا امکان اسی وقت بڑھ سکتا ہے جب تم مجھے پوری کہانی سنا دو۔''

وہ کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ کم از کم اس وقت نہیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ بھی جولیس کی طرح ضدی اور اپنی بات پر اڑ جانے والی عورت تھی لیکن وہ ساڑھے سات گھنٹے کی پرواز تھی اور میرے پاس اسے تنگ کرنے کے لیے کافی وقت تھا کیونکہ اس کے پاس مجھے نہ بتانے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ اس لیے پانچ گھنٹے اور اٹھارہ منٹ بعد اس سے حقیقت اگلوانے میں کامیاب ہوگیا جب میں نے اسے بتایا کہ اس کی فراہم کردہ فہرست میں سے میں کسی ایک کو بھی حملہ آور کے طور پر شناخت نہیں کرسکا۔

اُسے حال ہی میں جو کام سونپا گیا تھا، اس کے مطابق اسے ایک فرانسیسی شخص جین پیری لیفورنٹ کو اپنی ایجنسی میں بھرتی کرنا تھا جس کے ایک حریف جاسوسی کے نیٹ ورک سے روابط تھے لیکن اس نے بھرتی ہونے کے لیے شرط لگائی کہ پہلے جولیا اسے وہ قیمتی خاندانی ورثہ واپس کرے جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران گم ہوگیا تھا۔ یہ چارلس ڈکنز

کے تحریر کردہ ناول 'اور میوچل فرینڈ' کا ایک نسخہ تھا جس پر مصنف نے اپنے ہاتھ سے لیفورنٹ کے پردادا مارسل برٹیل کے لیے ذاتی پیغام تحریر کیا تھا۔ چھ روز قبل اور لیفورنٹ سے ملاقات کے تین دن بعد جولیا پر پہلا حملہ ہوا جب پیرس کے ایک فٹ پاتھ پر حملہ آور نے اسے زہریلی سوئی چبھونے کی کوشش کی۔ اس نے حملہ آور کی پشت پر زوردار لات جمائی لیکن اسے فوراً ہی وہاں سے بھاگنا پڑ گیا کیونکہ حملہ آور کے دو ساتھی اس کے پیچھے آرہے تھے۔

دوسری کوشش پیرس کے زیرِ زمین اسٹیشن میں ہوئی جب وہ ایک طاقتور رائفل کی گولی کا نشانہ بننے سے بال بال بچی۔ تیسری بار اسے گاڑی سے ٹکر مارنے کی کوشش کی گئی جب وہ سڑک پار کررہی تھی۔ اس نے جو کچھ مجھے بتایا اسے ہضم کرنے میں مجھے چند سیکنڈ لگے پھر میں نے ان ظاہری حقائق پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کوئی اکیلا شخص نہیں جو اسے قتل کرنے کی کوشش کررہا ہے بلکہ ان کی پوری ٹیم ہے۔

''ٹھیک ہے لیکن ان کا کوئی سرغنہ بھی تو ہوگا۔ مجھے اس کو تلاش کرنا ہے۔''

''کیا تم سمجھ رہی ہو کہ مخالف ایجنسی کو معلوم ہوگیا تھا کہ تم لیفورنٹ کو بھرتی کرنے کی کوشش کررہی ہو۔ اسی لیے وہ تمہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کررہے ہیں؟''

''یہ ایک امکان ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں مجھے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ مجھے شناخت کرچکے ہیں یا صرف اس محاذ سے واقف ہیں جسے میں اس کام کے لیے استعمال کررہی ہوں۔ دوسرا امکان یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لیفورنٹ نے خود ہی کسی کو میرے پیچھے لگا دیا ہو جو مجھے مارنے کی کوشش کررہا ہے تاکہ میں اس کے لیے مزید کوئی مشکل کا سبب نہ بن سکوں جبکہ وہ میری آرگنائزیشن کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہوسکتا ہے۔ اگر وہ ہمارے ساتھ شامل نہ ہوا تو مجھے دیکھنا ہوگا کہ اس صورتِ حال سے مختلف انداز میں کیسے نمٹا جاسکتا ہے۔''

میں اس سے یہ جاننا نہیں چاہتا تھا کہ وہ کس طرح لیفورنٹ سے نمٹے گی۔ اس کے بجائے میں نے اس سے اس تحریر کے بارے میں پوچھا جو چارلس ڈکنز نے اپنے ہاتھ سے کتاب میں لکھی تھی۔

''میں نہیں جانتی کہ اس نے کیا لکھا تھا۔ لیفورنٹ نے بھی اس بارے میں بتانے سے انکار کردیا تھا۔ شاید اسے میری طرف سے کسی جعلسازی کا ڈر ہو۔'' وہ چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوئی پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''میں سوچ رہی ہوں کہ شاید ڈکنز کے کسی محقق نے اس کتاب کے ایسے نسخوں کی فہرست مرتب کی ہو جن پر ڈکنز نے اپنے ہاتھ سے کچھ لکھا تھا۔ تم انہیں تلاش کرو اور دیکھو کہ اس میں مارسل برٹیل کو دیے گئے نسخہ کا ذکر ہے۔''

''تاکہ تم اس کی نقل تیار کرسکو۔''

''بالکل۔''

میں نے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ لیفورنٹ جیسے شخص کو دھوکا دینے کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہے جو ڈبل ایجنٹ بننے کے حوالے سے دورخی کا شکار ہے، اس کے بجائے میں نے اسے بتایا کہ ڈکنز کی اس کتاب کی قیمت ایک لاکھ بیس ہزار ڈالر تک ہوسکتی ہے جس پر اس نے اپنے ہاتھ سے کچھ لکھا ہو۔

''یہ بہت بڑی رقم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ممکن ہے کہ اس طرح وہ اپنے سرمائے میں اضافہ کرنا چاہ رہا ہو؟''

''نہیں اگر اس کی یہ نیت ہوتی تو وہ اس سے زیادہ کا مطالبہ کرتا۔''

''اگر وہ اس کتاب کے بجائے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کرے تو کیا تمہاری تنظیم اس کی ادائیگی پر رضامند ہو جائے گی؟''

''نہیں، ہم اس طرح لیفورنٹ جیسے لوگوں سے معاملہ نہیں کرتے۔ میرے افسران نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کیس میں ہم یہ کتاب اس کے حوالے کردیں گے کیونکہ اس سے اس کی جذباتی وابستگی ہے۔''

''اور اسی لیے تمہاری نیت اسے اصلی نسخہ دینے کی نہیں اور جعلی سے کام چلانا چاہ رہی ہو۔'' میں نے اسمارٹ فون کی اسکرین پر اسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ اس نے لکھا۔ ''بالکل۔''

چند لمحے اس کی باتوں پر غور کرنے کے بعد میں نے اس سے ان اقدامات کے بارے میں پوچھا جو اس نے... کم ازکم پہلے حملے سے قبل اس کتاب کو تلاش کرنے کے لیے اٹھائے تھے۔ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس نے نایاب کتاب کے ان سپلائی تاجروں کے نام اور پتے ٹائپ کردیے جن سے اس نے پیرس، لندن اور برلن میں رابطہ کیا تھا اور مجھ سے کہا کہ ان میں کسی ایک سے بھی براہِ راست رابطہ نہ کروں۔

کچھ دیر بعد میں نے اسے بتایا کہ ان میں سے ایک ایسا بھی ہے جس سے میں چاہنے کے باوجود بھی رابطہ نہیں کرسکتا۔'' دو دن قبل ڈینئیل بوکارڈ اپنی دکان سے تین بلاک

کے فاصلے پر ایک اسٹور کے عقبی کمرے میں مردہ پایا گیا۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی۔ اخبارات اس بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔''

''آرچی، مجھے مزید تفصیلات چاہئیں۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔کوشش کروں گا۔''

پولیس رپورٹ کو تلاش کرنا میری توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ مجھے درست کمپیوٹر سسٹم کو ہیک کرنے میں اٹھائیس منٹ لگ گئے تاہم میں اس کے ساتھ ساتھ پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ میں نے جولیا کو بتایا۔''پولیس رپورٹ کے مطابق اس کی دکان میں جدوجہد کی علامات ملی ہیں جبکہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس کی موت کا وقت گزشتہ منگل کی شب آٹھ اور بارہ بجے کے درمیان بتایا گیا ہے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ گزشتہ منگل جب تم نے اسے فون کیا، اس کے کچھ دیر بعد اسے دکان سے اٹھا کر اس خالی اسٹور میں لے جایا گیا جہاں اس سے غالباً یہ جاننے کے لیے پوچھ گچھ کی گئی کہ کون ڈکنز کی اس کتاب کا نسخہ تلاش کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بوکارڈ سے وہ معلومات حاصل کرنا چاہ رہے ہوں جو وہ خود نہیں جانتا تھا اور اس کے لیے انہوں نے اس پر اتنا تشدد کیا کہ اس کی موت واقع ہو گئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے بعد وہ اُسے زندہ چھوڑنا نہ چاہ رہے ہوں۔''

''بہت خوب آرچی، یقیناً تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں مزید کیا جاننا چاہتی ہوں۔ ان لوگوں کے نام جن سے بوکارڈ نے میرے فون کے بعد رابطہ کیا تھا۔''

''ہاں، میرا بھی یہی اندازہ ہے اور میں پہلے ہی اس پر کام شروع کر چکا ہوں۔''

بوکارڈ کے فون ریکارڈ سے ان لوگوں کے بارے میں جاننا میری توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہوا کیونکہ پیرس کی کمپنی نے حفاظتی اقدامات کر رکھے تھے جن سے میں واقف نہیں تھا۔ وہ اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک جہاز پیرس نہ پہنچ جائے۔ جب جولیا اپنے اپارٹمنٹ پہنچی تو تھوڑی دیر بعد ہی میرے نظام میں تیزی آگئی اور میں فون کمپنی کے سیکیورٹی سسٹم کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔

''میں اس شخص کا نام جان گیا ہوں جس کی تمہیں تلاش ہے۔'' میں نے جولیا سے کہا۔''اولیور ٹیلر ان میں سے ایک ہے جنہیں بوکارڈ نے فون کیا تھا۔ تم پر ہونے والے ہر حملے کے بعد اسے چند منٹوں بعد ایک سیل فون سے کال موصول ہوتی رہی۔ یہی تمہارا مطلوبہ شخص ہے۔''

مجھے اس کا خاکہ تیار کرنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ ایک دولت مند آرٹ ڈیلر تھا جس کے اثاثوں کی مالیت ایک کروڑ یورو سے بھی زیادہ تھی اور وہ پیرس کے انتہائی مہنگے علاقے میں ذاتی رہائش گاہ کا مالک تھا لیکن مزید چھان بین کے بعد میں یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کے کئی خطرناک بدمعاشوں سے روابط تھے۔

اس کے بعد جولیا کے لیے آسان ہو گیا تھا کہ وہ گوگل پر ٹیلر کے گھر کا جائزہ لے سکے۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کے مکان کا بیرونی دروازہ سڑک پر کھلتا ہے جہاں ٹریفک کی آمدورفت کی وجہ سے اندر جانا ممکن نہیں۔ البتہ اس کے عقب میں پتھروں کی دیوار ہے جہاں سے خفیہ طور پر کارروائی ممکن ہے۔ اگلے تیس سیکنڈ تک اُس کے چہرے کے تاثرات پر سختی چھائی رہی اور وہ ایک پتھر کے مجسمے کے مانند بیٹھی رہی پھر اس نے بتایا کہ اس کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے۔

اس شب ساڑھے نو بجے میں نے جولیا کی ہدایات کے مطابق ٹیلر کو فرانسیسی زبان میں فون کیا۔ میرا لہجہ بالکل جین پال بیلمانڈو جیسا تھا۔ میں نے کہا۔''جانتا ہوں کہ تم لیزا ہرٹ کو تلاش کر رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ تمہیں کہاں مل سکتی ہے۔''

یہ جولیا کا فرضی نام تھا جو وہ اس مخصوص کام کے لیے استعمال کر رہی تھی۔ تقریباً تین سیکنڈ بعد ٹیلر نے پوچھا۔''تم کون بول رہے ہو؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ایک گھنٹے کے اندر تمہارے گھر آ رہا ہوں۔ اس وقت تک تم پچاس ہزار یورو کا بندوبست کر لو۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ وہ کہاں ہے۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو دوبارہ میری آواز نہیں سنو گے۔''

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ جولیا مکان کے عقب میں چھپی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ایک انتہائی طاقت ور اور حساس مائیکروفون اور ہیڈ سیٹ تھا جو اس نے اپنے کانوں سے لگا دیا تھا جبکہ میں اس کے ٹیلی فون اکاؤنٹ کی نگرانی کر رہا تھا جس سے معلوم ہوا کہ اس نے اڑتالیس سیکنڈ کی ایک کال کی۔ چونتیس منٹ بعد جولیا نے مائیکروفون اور ہیڈ سیٹ علیحدہ کیا اور مجھے دوبارہ اپنے بائیں کان میں لگا لیا۔ پھر وہ دوڑتی ہوئی دیوار تک گئی اور اس مہارت سے اوپر چڑھنے لگی جیسے سیڑھیاں طے کر رہی ہو، پھر اس نے دوسری منزل کی کھڑکی کا شیشہ بڑی صفائی سے الگ کیا تاکہ اس میں

صبر کا مفہوم

صبر کی دو قسمیں ہیں۔
اول۔ آزمائش اور مصیبت پر صبر کرنا۔
دوم۔ ان چیزوں سے اجتناب کرنا جن کے احتراز کرنے کا اللہ نے حکم دیا۔
جنت صرف عمل سے نہیں بلکہ خلوصِ نیت سے حاصل ہوتی ہے۔

کورنگی سے محمد خواجہ کی رہنمائی

مزاحیات

جج: ”تو تمہارا موقف کہ ہے کہ تمہاری بیوی کو گولی محض اتفاقاً لگی ہے؟“
ملازم: ”جی جناب...... بالکل اتفاقاً۔“
جج: مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟“
ملزم: ”دراصل میں نے اپنی ساس کا نشانہ لے رکھا تھا کہ میری بیوی اچانک اس کے آگے آکر کھڑی ہوگئی۔“

☆☆☆

ایک خوب صورت لڑکی بس اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کررہی تھی۔ پاس کھڑے ایک منچلے نے اسے دیکھ کر فقرہ کہا۔
”چاند تو رات کو نکلتا ہے دوپہر میں کیسے۔“
لڑکی نے برجستہ جواب دیا۔ ”الو تو رات کو بولتا ہے، دن میں کیسے؟“

حسنین عباس، کمیل عباس، گلیانہ روڈ کھاریاں

”تم نے ڈینئل بوکارڈ کو کیوں قتل کیا؟“ اس نے پوچھا۔
اس نے جولیا کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم اچھی طرح جانتی ہو۔“
”وہ کتاب کہاں ہے؟“
”جہنم میں جاؤ۔“
”تم مجھے اپنے گھر کی تلاشی لینے پر مجبور کررہے ہو۔“
”تم بے شک اپنا وقت ضائع کرسکتی ہو۔ وہ کتاب یہاں نہیں ہے۔“
”یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ میں نے جولیا سے کہا۔
اُس نے آہستہ سے سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ بھی یہ بات جانتی ہے پھر اس نے ٹیلر کے جبڑے پکڑے اور اسے

ہاتھ ڈال کر اندر کی چٹخنی کھول سکے۔ اس کے بعد وہ کھلی ہوئی کھڑکی سے ہوا کے جھونکے کی طرح اندر چلی گئی اور بغیر کوئی آواز پیدا کیے فرش پر اپنے قدم جمالیے۔
جب وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی تو ہم نے ٹیلر کے بولنے کی آواز سنی۔ وہ کسی سے مخاطب تھا اور یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ باہر کے کسی آدمی کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ لیزا ہرٹ کی تلاش میں ہے پھر وہ انہیں تفصیل سے بتانے لگا کہ جب وہ شخص آئے تو انہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ اس وقت تک جولیا سیڑھیاں اترتے ہوئے پہلی منزل پر پہنچ چکی تھی اور چپکے چپکے ٹیلر کی آواز کی جانب بڑھ رہی تھی۔
وہ اس وقت لیونگ روم میں تین آدمیوں کے ساتھ موجود تھا جن کی پشت جولیا کی جانب تھی۔ ٹیلر خود ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جولیا کو دیکھ لیتا لیکن اس کی پوری توجہ ان بدمعاشوں پر تھی اور وہ ان پر غصہ ہورہا تھا کہ ایک باہر کے شخص کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ اسے لیزا ہرٹ کی تلاش ہے اور اگر کبھی وہ شخص یہ بھی جان گیا کہ اس نے ہی بوکارڈ کے اغوا اور قتل کا حکم دیا تھا تو وہ ان تینوں کے سرتن سے جدا کردے گا۔
مجھے یہ جاننے میں بہت وقت لگا تھا کہ جولیس کو کنگ فو میں کتنی مہارت ہے لیکن جولیا بھی کچھ کم نہیں تھی۔ وہ ایک چیتے کی طرح اُن پر جھپٹی اور پلک جھپکتے میں دو غنڈوں کو زمین پر گرادیا اس سے پہلے کہ ٹیلر اور تیسرے غنڈے کو اس کی موجودگی کا علم ہوتا۔ اس کا ہاتھ بمشکل ہولسٹر تک پہنچا تھا کہ جولیا نے اس کے جبڑوں پر زوردار لات جمائی اور وہ گرتے ہی بے ہوش ہوگیا۔
ٹیلر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ میرے خیال میں اس کی یہ کیفیت خوف کے بجائے غصے کی وجہ سے تھی۔ ”تم مجھے تلاش کررہے تھے؟“ جولیا نے کہا۔
ٹیلر اُس کی جانب لپکا جیسے اس پر قابو پانا چاہ رہا ہو۔ جولیا نے بڑی پھرتی سے ایک داؤ لگایا اور وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ اس کی ٹھوڑی فرش سے جا ٹکرائی۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ کوئی مزاحمت نہ کرسکا۔ جولیا نے پشت سے اس کے دونوں بازو پکڑے اور اس کی کلائیاں ایک پلاسٹک کی ڈوری سے باندھ دیں۔ یہی سلوک اس نے تینوں بے ہوش غنڈوں کے ساتھ بھی کیا پھر اس نے ٹیلر کے ٹخنے بھی باندھ دیے اور اسے کمر کے بل لٹادیا اور خود ایڑیوں کے بل اس پر جھک گئی۔

اپنی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ''مجھے اندازہ لگانے دو کہ تم نے وہ کتاب کہاں رکھی ہوئی ہے۔'' وہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ''تہ خانے میں؟ نہیں اوپر کی منزل پر؟ نہیں۔ کسی خفیہ جگہ؟''

اس کا اندازہ درست نکلا۔ ٹیلر کی آنکھوں میں اضطراری کیفیت نمودار ہوئی۔ اس کے بعد جولیا کو کتابوں کی الماری کے پیچھے ایک خفیہ خانہ تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی۔ اس میں 'اور میوچل فرینڈ' کا وہ نسخہ رکھا ہوا تھا جس کی ہمیں تلاش تھی۔ اس پر مارسل برٹیل کے نام ڈکنز کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر تھی جس میں اس نے بیان کیا تھا کہ برٹیل کے ساتھ ناٹنگ ہل ریستوران میں ڈنر کر کے وہ کتنا لطف اندوز ہوا۔ یہاں تک کہ اس نے مینو میں شامل کھانوں کی تفصیل بھی لکھ دی تھی۔

گو کہ میرے پاس ڈکنز کے دستخطوں اور اس کے خطوط کی کاپیاں نہیں۔ اس لیے مجھے اس تحریر کو جعلی سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی جبکہ میری تحقیق کے مطابق مذکورہ ریستوران ڈکنز کے انتقال کے باون برس بعد وجود میں آیا تھا۔

''یہ تحریر اور دستخط بھونڈی نقل ہیں۔'' میں نے جولیا کو بتایا۔ ''کوئی بھی نایاب کتابیں جمع کرنے والا سیکنڈوں میں اُسے پہچان لے گا۔ پہلا ایڈیشن ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت زیادہ سے زیادہ چار ہزار ڈالر ہو سکتی تھی بشرطیکہ اس جعلسازی کی وجہ سے اسے خراب نہ کیا جاتا جس نے اسے دو کوڑی کا بنا دیا ہے۔''

اسی وقت ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور میں نے فوراً ہی اس کی تصدیق کر لی۔ ''میں لیفورنٹ کا شجرۂ نسب معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مارسل برٹیل نامی کسی شخص سے اس کی رشتے داری نہیں ہے۔ میں ایسا کوئی ثبوت تلاش نہیں کر سکا جس سے معلوم ہوتا کہ ڈکنز کی زندگی میں کوئی مارسل برٹیل یورپ میں رہائش پذیر تھا۔''

جولیا اپنی سانس روکتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''دلچسپ۔'' وہ کتاب لے کر لیونگ روم میں آئی۔ ٹیلر اپنی جگہ پر بیٹھا بے چین ہو رہا تھا۔ جولیا نے انتظار کیا کہ وہ اس کی طرف دیکھے پھر کتاب میں سے وہ صفحہ پھاڑ کر اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا جس پر ڈکنز کی تحریر تھی۔ ٹیلر نے اس پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

''تم نے بوکارڈ کو تشدد کر کے کیوں ہلاک کیا اور مجھے قتل کرنے کے لیے کرائے کے آدمیوں کی خدمات کیوں حاصل کیں تاکہ میں اس کتاب کو تلاش نہ کر سکوں۔''

ٹیلر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بولا۔ ''کیا واقعی تمہیں کوئی اندازہ نہیں ہے؟''

کمرے میں خاموشی چھا گئی کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ میں توقع کر رہا تھا کہ جولیا اس سے حقیقت معلوم کر لے گی۔ اس کے بجائے اس نے ٹیلر سے کہا کہ وہ کوشش کرے گی کہ اس کی مدد کے بغیر ہی تلاش کر لے۔ اس نے اسے تنبیہ کی کہ وہ اس کام کے لیے صرف بیس منٹ لے گی اور اگر وہ ناکام رہی تو دوبارہ اسے مجبور کرے گی۔

''یہ کوئی خوشگوار بات نہیں ہوگی اگر اس کی ضرورت پیش آئی۔'' یہ کہہ کر وہ مڑی اور واپس اس کے ذاتی کمرے میں جا کر کاغذات کی تلاشی لینے لگی۔

''تم نے بیس منٹ کا وقت لے کر مجھے حیران کر دیا۔ اس نے اتنا کچھ کر دیا۔ اس کے بعد تمہیں کوئی الزام نہ دیتا اگر تم اس کے ساتھ سختی سے پیش آتیں لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم اس سے مختلف انداز میں نمٹنے کی کوشش کر رہی ہو۔''

''یہ ایک نفسیاتی حربہ ہے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''بیس منٹ تک پریشان ہونے کے بعد اس کے رویّے میں نرمی آجائے گی اور وہ مزید بات کرنے پر آمادہ ہو جائے گا لیکن مجھے اس کی امید کم ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے ٹیلر کی وہ سب باتیں ریکارڈ کر لی ہوں گی جو اس نے ہمارے مکان میں داخل ہونے کے بعد کی ہیں۔''

''ہاں۔''

جب وہ ٹیلر کے کاغذات دیکھ رہی تھی تو میں نے جولیس کو فون کر کے اب تک کی پیش رفت سے آگاہ کیا۔

''تمام نقطوں کو ملایا جائے تو ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مقتول بک ڈیلر ڈینیئل بوکارڈ نے اس نایاب نسخہ کو تلاش کرنے کے لیے کئی کتابیں جمع کرنے والوں کو فون کیے جن میں ٹیلر بھی شامل تھا۔ اس نے یہ جاننے کے لیے بوکارڈ کو اغوا کر لیا تاکہ جان سکے کہ کون اس کتاب کی تلاش میں ہے اور اس طرح اسے جولیا کا فرضی نام معلوم ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ تمہاری بہن کو مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کم از کم پہلی بار تو بالکل نہیں بلکہ وہ اسے بھی اغوا کرنا چاہ رہا تھا تاکہ جان سکے کہ وہ کس کے لیے یہ کتاب تلاش کر رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سارا فساد ایک ایسی کتاب کے لیے کیوں ہے جو پہلے سے ہی اس کے

قبضے میں ہے اور جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ یہ بے قیمت ہے۔"

"آرچی، اگر تم اس کتاب کو دوبارہ دیکھو تو تمہیں اس سوال کا جواب مل جائے گا کہ ٹیلر کیوں جولیا کو اغوا کرنا چاہ رہا تھا۔"

میں نے فوراً ہی وہ کتاب دوبارہ دیکھی اور جو کچھ مجھے نظر آیا، وہ میں نے جولیس کو بتا دیا۔

"بہت اچھے۔" جولیس نے کہا۔ "جولیا کو کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟"

"نہیں وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں تمہیں دوبارہ فون کروں گا جب یہ معاملہ نمٹ جائے گا۔"

میرے پاس ابھی اٹھارہ منٹ اور چونتیس سیکنڈ تھے جبکہ میں ایک سیکنڈ میں کروڑوں اربوں کا حساب کتاب کر سکتا تھا لیکن اس کام کے لیے مجھے یہ وقت ناکافی لگ رہا تھا۔ ٹیلر کو دی ہوئی مہلت میں صرف نو سیکنڈ رہ گئے تھے جب میں نے جولیا کو بتایا کہ کتاب پر لکھی ہوئی تحریر دراصل ایک کوڈ شدہ پیغام ہے۔

"اور میں جانتا ہوں کہ اسے پڑھنا بہت مشکل ہے۔ اسی لیے ٹیلر پریشان ہو گیا تھا لیکن میں نے اس میں شگاف ڈال دیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ایسی ایک اور کتاب موجود ہے جس میں اس خفیہ پیغام کی چابی ہوگی اور اسی لیے ٹیلر تمہارے پیچھے پڑ گیا تھا تاکہ وہ اسے تم سے حاصل کر سکے۔ یہ اندازہ کرنا بہت آسان ہے کہ لیفورنٹ کے پاس اس پیغام کی چابی ہے۔"

جولیا نے آہستہ سے کہا تھا کہ ٹیلر نہ سن سکے۔ "کیا تم کسی پیغام کو خفیہ الفاظ میں منتقل کر سکتے ہو۔"

"ہاں، میرے لیے یہ بہت آسان ہے۔"

"آرچی، اگر تم جیتے جاگتے انسان ہوتے تو میں تمہارا بوسہ لے لیتی۔"

میرے پورے سسٹم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اور مجھے یوں لگا کہ میرے مرکزی نظام کا درجہ حرارت بڑھ گیا ہے لہٰذا میں نے فوری طور پر اس میں مناسب ردوبدل کیا تاکہ دوبارہ ایسا خیال میرے ذہن میں نہ آ سکے۔ بہرحال وہ میرے باس کی بہن تھی۔

جب جولیا دوبارہ ٹیلر کے پاس گئی تو میری پوری توجہ اس پر مرکوز ہو گئی۔ اس نے اسے بتا دیا کہ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے اور وہ پولیس کو تمام ثبوت فراہم کر دے گی کہ اس نے ڈینیئل بوکارڈ کو قتل کیا ہے۔ بشمول اس ریکارڈنگ جس میں اس نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے ٹیلر کو یہ بھی بتا دیا کہ اسے صبح تک کس حالت میں رہنا ہے جب پولیس اسے گرفتار کرنے آئے گی اور تب تک اسے باندھ کر رکھا جائے گا لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا جب تک وہ ٹیلر کے گھر سے باہر نہیں آئی اور میں نے اپنے پروگرام کو معمول پر لانے کے لیے اس میں ضروری تبدیلیاں نہیں کر لیں گو کہ اس دوران میں اضافی درجہ حرارت برداشت کرتا رہا لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ وہاں سے نکلنے سے پہلے جولیا نے ٹیلر اور اس کے کرائے کے غنڈوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے تھے اور ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔

اگلی صبح جولیا نے لیفورنٹ کو اس کتاب کا نسخہ پہنچا دیا جس پر مارسل برٹیل کے لیے پیغام درج تھا۔ اسی رات کو وہ پیرس کے قلب میں واقع ایک عمارت میں داخل ہوا جہاں جولیا سے اس کی ملاقات ہوئی جو عمارت کے تہ خانے میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ایک پستہ قد، زرد چہرے، ہلکے بالوں اور نیلی آنکھوں والا شخص تھا۔ کافی دیر تک وہ جولیا کو حیرانی کے عالم میں دیکھتا رہا پھر وہ مطلب کی بات پر آیا کہ بالآخر اس نے وہ پیغام پڑھ لیا جسے جولیا نے کسی چابی کی مدد کے بغیر ہی کھول لیا تھا۔

"گویا یہ تمہارے پاس پہلے سے تھی۔" اس نے کہا۔

"تم اگر یہ پہلے لے آتیں تو ہم دونوں مشکل سے بچ سکتے تھے کیونکہ میں تم لوگوں کے لیے اس وقت تک کام نہ کرتا جب تک یہ مجھے نہ مل جاتی۔"

کوڈ کھولنے کے بعد بھی میں اور جولیا نہ جان سکے کہ وہ کیا چیز تھی البتہ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ کوئی خاص قسم کی شے تھی۔ جب جولیا نے اس پیغام کو جعل سازی کے ذریعے تبدیل کیا تو اس کے ذریعے لیفورنٹ کو اس تہ خانے تک رسائی ہوئی لیکن جولیا نے اسے کچھ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

"میں تمہیں اس عمارت کے بارے میں بتاتی ہوں۔" جولیا نے لیفورنٹ سے کہا۔ "جن لوگوں کے لیے تم کام کر رہے ہو، وہ جانتے ہیں کہ یہ ہماری ایجنسی کے استعمال میں ہے گو کہ وہ نہیں سمجھتے کہ ہمیں بھی یہ بات معلوم ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس عمارت کی کڑی نگرانی ہوتی ہے اور کسی ایسے شخص کو عمارت میں داخلے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جب تک کہ ہم خود ایسا نہ چاہیں۔ اس عمارت میں تمہاری خفیہ آمد کی ریکارڈنگ ہو چکی ہے۔ اگر یہ تمہارے

سابقہ مالکوں نے دیکھ لی تو تم انہیں یہ یقین نہیں دلاسکو گے کہ ہمارے لیے چوری چھپے نہیں کام کررہے۔ اس کے بعد تمہارے لیے حالات سازگار نہیں رہیں گے، کیا ہمارے درمیان مفاہمت ہوسکتی ہے؟''

لیفورنٹ پلک جھپکائے بغیر سنتا رہا اور جب پوری بات اس کی سمجھ میں آگئی تو اس کے چہرے پر شکستگی کے آثار نمودار ہونے لگے اور اس نے مرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں۔''

اسی روز رات گئے جولیا سینٹ یوسٹیک چرچ گئی اور اسے کسی خاص دقت کے بغیر ڈیڑھ فٹ لمبا وہ کارڈ بورڈ کا ٹکڑا مل گیا جس کی نشاندہی اس پیغام میں کی گئی تھی اور کوڈ کھولنے کے بعد جولیا کو اس کا پتا چلا۔ اسے ایک ٹیوب کی شکل میں رول کیا گیا تھا اور جب مجھے معلوم ہوا کہ اس کے اندر کیا ہے تو حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''مجھے یقین ہے کہ یہ پیٹر ڈی برگ کی بنائی ہوئی ہے۔'' میں نے اس آئل پینٹنگ کے بارے میں کہا جسے جولیا نے کھول کر کچن کی میز پر بچھا دیا تھا۔ یہ ایک سرخ بالوں والی عورت کی تصویر تھی جس نے زرد گاؤن اور موتیوں کا گلوبند پہن رکھا تھا۔ میں نے چند لمحوں میں ہی ڈچ آرٹ ویب سائٹ کھنگال کر اس کی تصدیق کر لی۔ ''اس پینٹنگ کا عنوان 'دا ڈیم' ہے۔ لیفورنٹ کے مفروضے خاندانی ورثہ کی تاریخ کے مطابق یہ جنگِ عظیم دوم کے دوران کسی وقت غائب ہوگئی تھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کی قیمت نو کروڑ امریکی ڈالر ہوگی۔ اگر تم اس کی ابتدائی تاریخ بتائے بغیر بلیک مارکیٹ میں بیچنا چاہو تو میں ایسا گاہک تلاش کرسکتا ہوں جو کوئی سوال کیے بغیر تمہیں چار کروڑ ڈالر دے سکتا ہے۔''

''کیا تم اس کے جائز وارث کا پتا لگا سکتے ہو آرچی؟''

''اگر تم چاہتی ہو تو یہ بھی معلوم کرلوں گا۔''

کسی خاص دقت کے بغیر میں یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ اس تصویر کے آخری مالک کا واحد وارث برسلز میں رہتا ہے۔ اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا جب اس نے تصویر کو دوبارہ رول کیا اور اسے لے کر اپارٹمنٹ سے باہر آگئی۔ اس نے اسٹیشن پہنچ کر برسلز کا ٹکٹ لیا تب بھی میں خاموش رہا لیکن جب برسلز پہنچ کر اس نے ٹیکسی پکڑی تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہا۔

''کیا خیال ہے۔ میں اس کے وارث کو فون کرکے معاوضے کی بات کروں جو عام طور پر پانچ فیصد ہوتا ہے لیکن اس کیس میں اس سے زیادہ کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' اس نے کہا۔

''یہ پینتالیس لاکھ ڈالر تمہارے ریٹائر ہونے کے بعد کام آئیں گے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''ابھی میں صرف تینتیس سال کی ہوں۔ ریٹائرمنٹ بہت دور ہے۔''

میں نے اس سے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا جب اس نے وہ تصویر اس کے اصل وارث کے حوالے کی تو وہ بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے جولیا کو انعام دینا چاہا لیکن اس نے انکار کردیا۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر جولیس کو معلوم ہوجاتا کہ وہ کیا کررہی ہے تو اسے ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا۔

پیرس واپس آتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔ ''آرچی، میں تمہاری رفاقت سے بہت لطف اندوز ہوئی۔ تم اپنے کام میں ماہر ہو۔ اگر تم ایک سراغ رساں کے معاون کے طور پر کام کرکے تھک چکے ہو اور بین الاقوامی جاسوس کی طرح زندگی گزارنا چاہتے ہو تو میں مستقل طور پر اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کرتی ہوں۔''

''مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم جانتی ہو کہ گھر وہی ہوتا ہے جہاں آپ کا دل ہو اور میرا گھر بوسٹن میں جولیس کے ساتھ ہے لیکن اگر میں اُسے وقتاً فوقتاً کیس لینے کے لیے تنگ نہ کروں تو اس کی آمدنی تیزی سے کم ہونا شروع ہوجائے گی اور وہ چار ستاروں والے ہوٹل میں کھانا کھانے کے قابل نہیں رہے گا جہاں وہ اکثر جاتا رہتا ہے۔ اسی طرح اسے اپنے دیگر اخراجات بھی کم کرنا پڑیں گے جو اس کے لیے تکلیف کا باعث ہوگا۔''

جولیا سمجھ گئی کہ وہ میرا ذہن تبدیل نہیں کرسکے گی لہٰذا اس نے اسی روز پیرس سے بوسٹن کی پرواز بک کرائی اور میں نے اس سے پوچھے بغیر ایک بار پھر ائرلائن کے ریزرویشن میں ہیک کیا اور کسی اضافی کرائے کے بغیر اس کی نشست فرسٹ کلاس میں تبدیل کردی۔

میں اس کے لیے زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا تھا۔ بہرحال اس کا شکریہ کہ میں اس کے ہمراہ یورپ کا سفر کرنے کے قابل ہوا۔ ایک قتل کا معما حل کیا اور گمشدہ شاہکار کا سراغ لگایا۔ یہ میرے لیے ایک یادگار تجربہ تھا۔

اب میں چوبیس برس کی ہو چکی ہوں اور بہت کچھ جان گئی ہوں۔ انسان تو ہمیشہ سے دھوکے میں رہا ہے۔ اس نے یا تو اپنے آپ کو دھوکے میں رکھا ہے یا پھر دوسروں سے دھوکا کھاتا رہا ہے۔

میں امریکا کے شہر ہیوسٹن میں ہوں۔ یہاں آئے مجھے بیس بائیس برس ہو چکے ہیں۔ یعنی جب میں آئی تھی تو صرف چار برس کی تھی۔ اسی شہر میں، میں نے تعلیم حاصل کی۔ یہیں سے گریجویشن کیا۔

پتھر

منظر امام

فیصلے کرنا انتہائی کٹھن اور دشوار تر ہو جاتا ہے... جب سامنے جان سے عزیز تر ہستی کھڑی ہو... جو جذبے اور احساس میں پوری طرح جذب ہو... اس کی محبت رگوں میں لہو بن کے دوڑ رہی ہو... حالات کے نشیب و فراز اور واقعات کے اصل پس منظر و پیش منظر میں ڈوبی دل گداز تحریر...

سراپا محبت و سراپا ایثار سے لبریز جذبات کی توڑ پھوڑ......

بابا مجھے پاکستان سے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔
اس کے بعد میں دوبارہ پاکستان نہیں گئی۔ وہاں جا کر کرنا ہی کیا تھا۔ کس کے پاس جاتی۔ کیوں جاتی۔ ماما کا تو بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ جب میں صرف دو یا ڈھائی سال کی تھی۔
ایک ماموں تھے۔ لیکن میرے لیے ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ انہیں یاد رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پاپا ہیوسٹن میں تھے۔ ان کا کاروبار تھا۔ کبھی وہ جاب کرتے تھے۔ پھر ایک چانس ملا اور انہوں نے اپنا بزنس شروع کر دیا۔ اس میں ترقی ہوتی گئی اور اچھا خاصا کاروبار سیٹ ہو گیا۔

پاکستان سے ایک دو بار میرے ماموں کا فون بھی آیا تھا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ پاپا نے کہا بھی تھا کہ میں بات کرلوں لیکن میں نے انکار کر دیا۔ دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

میں نے اپنے دل کو ان کی طرف سے سخت کر لیا تھا۔
یہاں امریکا میں زندگی بہت تیز رفتار تھی۔ میں بڑی ہو کر پاپا کے بزنس میں ان کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ اور بہت حد تک بزنس کی باریکیاں سمجھنے لگی تھی۔ پاپا یہ سب دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔

ایک دن ایک بات ہوئی۔ سنڈے تھا۔ ہفتہ بھر کی سخت محنت کے بعد یہ دن ایسا ہوتا کہ ہم باپ بیٹی جی بھر کر ایک دوسرے کے ساتھ ہلا گلا کرتے۔ شام کو آؤٹنگ کے لیے چلے جاتے۔ رات کا کھانا کہیں سے کھا کر آیا کرتے۔ تو اس اتوار کو بھی ہم گھر پر تھے کہ پاپا نے ایک بڑا سا خاکی لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔
''بیٹا، تمہارے ماموں بیمار ہیں۔ میرے ایک دوست پاکستان گئے تھے۔ تمہارے ماموں نے یہ ڈائری دی کہ امریکا جا کر تم کو دے دی جائے۔ میں نے پاپا سے وہ ڈائری لے کر ایک طرف رکھ دی۔ اس کو پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔

کچھ دن بعد جب ماموں کے انتقال کی خبر ملی تب بھی مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ عام سی بات تھی۔ زندگی اتنی تیز رفتار ہے کہ رونے کی فرصت کس کو ہے۔ کون دھیان دے۔

دو تین مہینے گزر گئے۔ پھر ایک رات جب میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ مجھے وہ ڈائری یاد آ گئی۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ ماموں نے وہ ڈائری اس انداز سے لکھی تھی جیسے کوئی کہانی لکھ رہے ہوں۔ میں وہ کہانی اسی طرح بیان کر رہی ہوں جس طرح ماموں نے لکھی ہے۔

☆☆☆

وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ ''ماما۔''
''کیا ہے۔'' میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔
''کیا ہر وقت ماما، ماما کرتی رہتی ہے۔ بتا کیا بات ہے؟''
اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ابھی صرف چار سال کی تھی۔ بے انتہا ذہین اور اتنی ہی خوبصورت۔ اس کا نام خوشبو تھا۔ وہ تھی بھی خوشبو کی طرح مہکتی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے تو ایسا لگتا جیسے موتی جھلملا رہے ہوں۔

میں نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں ایک رائٹر ہوں۔ یہی میری گزر اوقات کا وسیلہ ہے۔ کہانیاں لکھ کر دیتا ہوں تو چار پیسے ہاتھ میں آتے ہیں۔ ورنہ جینا دشوار ہو جائے۔
یہ اخراجات کم بخت کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ایک فلیٹ ہے وہ بھی کرائے کا۔ ہر مہینا کرائے کی فکر۔ بجلی۔ گیس۔ پانی۔ راشن۔ اور سب سے بڑھ کر خوشبو کے اسکول کی فیس۔ اس کے اسکول کی فیس بھی بہت زیادہ ہے، دس ہزار مہینا۔ مجبوری میں مجھے اسے اس اسکول میں داخل کرنا پڑا تھا۔ اگر ایسا نہیں کرتا تو دوسرے رشتے دار میری جان عذاب کر دیتے۔
ان لوگوں کو صرف اعتراض کرنا آتا ہے۔ ایسا کوئی نہیں ہے جو آگے بڑھ کر تھوڑا سا ساتھ دے دے۔ سب کو باتیں ہی کرنی آتی ہیں۔ ایک میں ہی تو نہیں رہ گیا ہوں کہ سارے اخراجات برداشت کرتا رہوں۔
معینہ میری بہن تھی۔ اپنی بہن۔ یہ خوشبو اسی کی بیٹی ہے۔ بس ایک ہی اولاد تھی۔ ورنہ میں اور بھی پاگل ہو کر رہ جاتا۔

معینہ کا میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ والدین کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اس کی ذمے داری میرے سر آ گئی تھی۔ میں نے اس کی شادی ایک شریف انسان سے کر دی۔ اطہر نام تھا اس کا۔ انسان تو اپنے طور پر اچھا ہی سوچتا ہے۔ لیکن کسی کو کیا معلوم کہ زندگی میں اتنی دشواریاں بھی ہیں۔

شادی کے بعد معینہ اور اطہر کی زندگی اچھی گزرنے لگی۔ اطہر ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔ اس کی نوکری بھی اچھی تھی۔ وہ دونوں الگ فلیٹ میں رہا کرتے۔ گرچہ چھوٹا سا تھا لیکن معینہ نے بہت سلیقے سے ڈیکوریٹ کر دیا تھا۔

دونوں میاں بیوی یہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ ہی آ کر رہوں لیکن میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں ایک لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں اور میں تنہائی کو زیادہ پسند کیا کرتا۔ اسی لیے میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ البتہ ہفتے میں دو چار راتیں کھانے کے لیے ان کے یہاں چلا جاتا۔ معینہ میری پسند کے کھانے بنایا کرتی۔ خدا نے بہت دنوں کے بعد ہمارے یہاں خوشیاں دی تھیں۔

پھر ان کے یہاں خوشبو پیدا ہوئی۔ واہ! وہ کیا بچی تھی۔ اتنی خوبصورت۔ اتنی کومل۔ ہمارا پورا وجود اس کے آنے سے خوشبو سے بھر گیا تھا۔ وہ ہماری جان تھی۔ اطہر اور معینہ کے لیے تو خیر وہ سب کچھ تھی ہی۔ لیکن میرے لیے بھی سب کچھ ہو گئی تھی۔

میں تو پاگل ہو گیا تھا۔ اب میرا اپنے فلیٹ میں دل کہاں لگ سکتا تھا۔ پہلے تو معینہ کے یہاں ہفتے میں دو تین بار جاتا۔ لیکن اب روزانہ جانے لگا تھا۔ اور خوشبو بھی مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کے تاثرات یہ بتاتے تھے کہ وہ مجھ سے مانوس ہو گئی ہے۔ پہچاننے لگی ہے۔ پھر وہ دو سال کی ہو گئی۔ اس کی شرارتیں اب بہت زیادہ ہو گئی تھیں۔ پیاری پیاری شرارتیں۔ جو اسی عمر میں ہوا کرتی ہیں۔

پھر یہ ہوا کہ اطہر کو امریکا میں ایک بہت اچھا چانس مل گیا۔ بہت اچھی سیلری تھی۔ پورا پیکج اچھا تھا۔ اب وہ اس کشمکش میں تھا کہ کس طرح اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر امریکا جائے۔ پانچ سال کا کنٹریکٹ ہو رہا تھا۔

میں یہ جانتا تھا کہ اطہر کا مستقبل بننے والا ہے۔ وہ امریکا جا کر بہت کامیاب رہے گا۔ اسی لیے میں نے اور معینہ نے یہی طے کیا کہ وہ اپنی، معینہ کی اور خوشبو کی اچھی زندگی کے لیے چلا جائے تو بہتر ہے۔ اس طرح وہ امریکا چلا گیا۔

اب معینہ اپنے فلیٹ میں کہاں رہ سکتی تھی۔ وہ میرے ہی پاس آ گئی۔ اب میں تھا، معینہ تھی اور خوشبو تھی۔ اطہر نے امریکا میں اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

سب کچھ ٹھیک ہی تھا کہ اچانک معینہ بیمار پڑ گئی۔ اور وہ بھی اتنی شدید کہ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے اطہر کو اس کی بیماری کی اطلاع نہیں دی ورنہ وہ ادھر پریشان ہو کر رہ جاتا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ جاب چھوڑ کر چلا آتا اور ہم نے جو خواب دیکھے تھے وہ ادھورے رہ جاتے۔ اسی لیے میں اپنی حیثیت کے مطابق اس کا علاج کرواتا رہا۔

اندازہ کرلیں کہ میرے لیے کتنی پرابلم ہوگئی تھی۔ ایک طرف معینہ کی بیماری اور دوسری طرف خوشبو کی دیکھ بھال۔ وہ ابھی صرف ساڑھے تین سال کی ہوئی تھی۔ کیا عمر ہوتی ہے۔ کچھ بھی نہیں۔

اس مشکل وقت ہمارے رشتے کی ایک خاتون کو ہمارا خیال آگیا۔ وہ کچھ دنوں کے لیے ہمارے گھر آکر رہ گئیں اور خوشبو کو سنبھالنے لگیں۔ میرا خیال تھا کہ معینہ ٹھیک ہو جائے گی لیکن اس کی حالت بگڑتی چلی گئی۔

میں نے اس وقت اطہر کو فون کر کے معینہ کے بارے میں بتا دیا۔ اس بے چارے کا یہ سن کر برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے کسی طرح اپنے دفتر سے کچھ دنوں کی چھٹی لی اور پاکستان آگیا۔ لیکن اس وقت تک معینہ کی حالت اتنی خراب ہوچکی تھی کہ اس کی زندگی کے امکانات ختم ہوگئے تھے۔

اطہر کے آنے کے دو دن کے بعد معینہ کا انتقال ہو گیا۔ کیا کیفیت تھی۔ اب کیا رہا تھا۔ وہ چلی گئی تو میرے لیے دنیا چلی گئی۔ ایک ہی بہن تھی۔ میں نے بڑا بھائی بن کر نہیں بلکہ باپ بن کر پالا تھا اس کو۔

وہی حال اطہر کا تھا۔ اس کا رونا دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اس نے معینہ سے بہت محبت کی تھی... اور سب سے بڑھ کر۔ خوشبو۔ ننھی سی جان۔ جو ابھی موت اور زندگی کے مفہوم سے بھی واقف نہیں تھی۔ جس کے لیے کائنات اس کی ماں کی آغوش کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ کائنات اس سے دور ہوگئی تھی۔

اب کون اس کو لوریاں دے کر سلانے والا تھا۔ اب کون اس کو اپنے سینے سے لپٹا کر پیار کرنے والا تھا۔ کوئی نہیں۔ سارے رشتے اس کے سامنے ہیچ ہو جاتے ہیں۔

ایک میں تھا اور ایک اطہر۔ ایک ماموں اور باپ۔ اور کون تھا۔ کوئی نہیں۔ معینہ کی موت پر آئے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے واپس چلے گئے تھے۔ اگر رہ بھی جاتے تو کیا ہوتا۔ ماں کا کون نعم البدل ہوسکتا تھا۔ کون اتنا پیار دیتا۔

اطہر نے صرف اس کے لیے خود کو سنبھال لیا تھا۔ میں بھی خوشبو کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ اس کو ساتھ لے جاتا۔ پارک۔ ساحل۔ تفریح کا کوئی مقام۔ وہ معصوم کچھ دیر کے لیے بہل جاتی۔ پھر ماں کی یاد آنے لگتی تھی۔

اطہر کی واپسی بھی ہونی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ پھر یہی طے پایا کہ اطہر واپس چلا جائے۔ اپنی ڈیوٹی جوائن کرلے۔ اس کے بعد جب چانس ملے خوشبو کو اپنے پاس بلالے۔ اس وقت تو وہ اس کو لے بھی نہیں جاسکتا تھا اور جب تک خوشبو میرے پاس ہی رہے گی۔ میرا بھی اس کے سوا اور کون تھا۔ اطہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اصل کہانی شروع ہوئی۔

خوشبو میرے پاس رہی۔ میں نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک معقول ملازمہ رکھ لی تھی۔ میں اپنا کام کرتا رہتا۔ اور خوشبو میرے ارد گرد منڈلایا کرتی۔ طرح طرح کے معصومانہ سوالات کیا کرتی اور میں اس کے جواب دیتا رہتا۔

وہ میرے ساتھ ہی سویا کرتی تھی۔ مجھ سے لپٹ کر۔ نہ جانے کیوں کبھی نیند میں سسکیاں لے کر روتی رہتی۔ شاید ماں خواب میں آتی ہوگی۔

میں نے اسے ایک اسکول میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ قریب ہی کا اسکول تھا۔ لیکن اچھا خاصا مہنگا تھا۔ خیر۔ اس کے لیے یہ سب تو کرنا ہی تھا۔ چاہے کتنی محنت کرنی پڑے۔

میں اپنے سارے پروگرام اس وقت ترتیب دیا کرتا جب وہ اسکول سے واپس آجاتی۔ اسے اسکول لانے لے جانے کی ذمے داری میری ہی تھی۔ میں کسی اور پر بھروسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ میں محنت کرتے کرتے پریشان سا ہو گیا۔ وہ جیسے جیسے بڑی ہوتی جارہی تھی، اس کے اخراجات بڑھتے جارہے تھے۔ اس کے بعد اس کے دیگر اخراجات۔ کئی بار دل چاہا کہ میں اطہر سے کہوں۔ پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ اطہر کو زحمت دینا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اس کا باپ صحیح لیکن خوشبو کی پرورش تو میں نے کی ہے۔

ایک دن اطہر کا فون آگیا۔ وہ بہت خوش اور پُرجوش ہورہا تھا۔

''خلیق بھائی، خوشبو کے ڈاکومنٹس تیار ہو چکے ہیں۔ میں اس کو لینے آرہا ہوں۔''

''اچھا......'' میرا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''کب آرہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اگلے مہینے۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا۔''

''کس بات کا اعتراض؟'' میں نے کہا۔ خوشبو تمہاری بیٹی ہے۔ لے جاؤ۔ آکر۔''

جس وقت اطہر سے میری بات ہورہی تھی، اس وقت خوشبو میرے پاس ہی کھڑی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اس کے

بابا سے بات کر رہا ہوں۔ وہ ایک ذہین بچی تھی۔ اطہر کے بارے میں جانتی تھی کہ وہ اس کے بابا ہیں۔ اس کے علاوہ میں اکثر اطہر سے فون پر اس کی بات کروادیا کرتا تھا۔

میں نے جب فون بند کیا تو اس نے میرے پاس آ کر پوچھا۔ ''ماما۔ کیا بابا کا فون تھا؟''

''ہاں تو پھر؟'' میری آواز میں غراہٹ تھی۔

ایسا لہجہ میں نے پہلی بار اختیار کیا تھا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے اسی پہ بس نہیں کیا بلکہ غرا کر بولا۔ ''اب جاؤ اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ مجھے ڈسٹرب مت کرنا، میں کام کر رہا ہوں۔''

میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کئی دنوں سے میں نے اس کا کمرا الگ کر دیا تھا۔ ورنہ وہ میرے ساتھ ہی سویا کرتی تھی۔

رات کے کھانے کے وقت ملازمہ نے بتایا کہ خوشبو اپنے کمرے میں ہے۔ وہ کھانے سے انکار کر رہی ہے۔

''اس کے نخروں سے تنگ آ چکا ہوں میں۔'' میں نے کہا۔

میں نے دیکھا کہ اس دوران خوشبو اپنے کمرے کے دروازے سے جھانک کر میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ شاید روتے روتے ہی سو گئی تھی۔

مجھے اپنا کام دیکھنا ہوتا تھا۔ اطہر آنے والا تھا۔ میں نے اس کا اسکول بھی چھڑا دیا۔ وہ اب اسکول نہیں جاتی تھی۔ ایک صبح ملازمہ نے دریافت کیا۔ ''صاحب جی، خوشبو بی بی اسکول کیوں نہیں جارہیں؟''

میں اس وقت ناشتا ختم کر کے کافی پی رہا تھا۔ جبکہ خوشبو سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔

''دیکھو ناظمہ۔'' میں نے ملازمہ سے کہا۔ ''میں نے اس کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا۔ اس کے اور بھی تو رشتے دار ہیں۔ اس کے باپ کے رشتے دار ہیں۔ وہ کیوں اس کا ساتھ نہیں دیتے؟ ایک میں ہی پریشان ہونے کے لیے رہ گیا ہوں۔''

ناظمہ نے اس کے بعد کچھ نہیں پوچھا۔ میری یہ باتیں خوشبو نے بھی سن لی تھیں۔ اس نے ایک بار شکستہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ خود ناظمہ کا موڈ بھی میری بات سے خراب ہو گیا تھا۔ لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ ناراض ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ میں جو بھی کر رہا تھا وہ ٹھیک کر رہا تھا۔

میرا رویہ اس کے بعد اور بھی درشت ہوتا چلا گیا۔ مجھے کسی کی بھی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ اب تک بہت ہو چکا تھا۔ ایک میں ہی تو نہیں رہ گیا تھا۔

میرے رویے کا جو اثر ہونا تھا، وہ ہو ہی گیا۔ چار پانچ دنوں کے بعد خود خوشبو مجھ سے اکھڑی اکھڑی رہنے لگی۔ اگر وہ ڈرائنگ روم میں ہوتی اور میں داخل ہوتا تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

پہلے وہ کھانا میرے بغیر نہیں کھاتی تھی۔ لیکن اب اکیلی ہی کھانے لگی تھی۔ پہلے میں اس کے کام خود کیا کرتا تھا۔ لیکن میرے رویے کے بعد اس نے سب کچھ خود ہی کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور میں بھی خاموش رہتا۔

پھر اطہر بھی آ گیا۔ اس دن خوشبو اداس بھی تھی اور خوش بھی تھی۔ خوش اس لیے تھی کہ اب وہ اپنے بابا کے ساتھ جا رہی تھی۔ اور اداس اس لیے تھی کہ اس کو یہاں سے جانا تھا۔

اطہر ایک ہفتے بعد خوشبو کو لے کر چلا گیا تھا۔ میرا گھر خالی ہو گیا تھا۔ میری زندگی خالی ہو گئی تھی۔

کہانی بس یہیں تک ہے۔ میری جان، میری خوشبو تو کیا سمجھتی ہے کہ میں تجھ سے بیزار ہو گیا تھا۔ نہیں میری جان، میں تو یہ سب اپنے دل پہ پتھر رکھ کر اس لیے کر رہا تھا کہ یہاں سے جاتے ہوئے تجھے میری جدائی کا دکھ نہ ہو۔ تجھے مجھ سے اتنی نفرت ہو چکی ہو کہ جب تو یہاں سے جائے تو تجھے کوئی دکھ نہ ہو۔ میری یاد نہ آئے تجھے۔ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا اور تو چلی گئی۔ میری جان تو میری زندگی تھی اور ہے۔ خدا تجھے خوش رکھے۔ ماموں سے دور سہی لیکن ماموں کے دل سے دور نہیں ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ جب میں تجھے ڈانٹا کرتا اور تیری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تو میری جان میں خود بھی کمرے میں جا کر رو دیا کرتا تھا۔

☆☆☆

اس کے بعد ماموں نے اپنی ڈائری میں اور کچھ نہیں لکھا تھا۔

میرے امریکا آنے کے بعد ہی سے ماموں بیمار ہو گئے تھے اور بیماری اتنی بڑھی کہ بالآخر وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔

ماموں مجھے معاف کر دیں کہ میں آپ کی محبت کو سمجھ نہ سکی۔ لیکن میں نے کبھی آپ کو غلط نہیں سمجھا تھا، کبھی نہیں۔ خدا آپ کی مغفرت فرمائے ماموں۔

بھرم

زویا اعجاز

ذاتِ انسان بے شمار اسرار کا مجموعہ ہے... اس لیے جستجو کرنے والا ہر انسان... ہر روز زندگی کے اسرار و رموز سے آشنا ہوتا ہے... زندگی کا ہر دن ایک نئے رنگ... نئے آہنگ سے ملاقات کراتا ہے... خواب نگر سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے ہی نوجوان کا ماجرا... جوانی کا جوش... اور حوصلے کسی ایک مقام پر ٹھہرنے نہیں دیتے... خوابوں کا جنون اور تعبیر نے اسے بھی اپنے اصل مسکن سے نکلنے پر مجبور کر دیا... لیکن ماضی سے دامن چھڑانا اتنا آسان نہیں ہوتا... ماضی کی راسیں تھام کے ہی حال کو روشن بنایا جاتا ہے... مگر وہ گزرے وقت سے نالاں تھا... ناسمجھ تھا...

عمر کی نقدی میں اضافہ کرتے جذبات و تجربات کا ذخیرہ......

کمرا نیم تاریک تھا۔
لیپ ٹاپ اسکرین کی روشنی میں وہاں صرف گہرے کثیف دھوئیں کے مرغولے چکراتے نظر آرہے تھے۔ اسکرین پر چلنے والی اس فلم کے خاصے چرچے تھے جسے پابندی کے باعث وہ تا حال دیکھنے سے محروم تھے۔ اسامہ ایک روز قبل اپنے کسی دوست کی یو۔ ایس۔ بی سے اسے محفوظ کر لایا تھا۔ آج ویک اینڈ پر وہ سب اس سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے۔

یہ لیپ ٹاپ اسامہ کو کالج میں شاندار کارکردگی کی بدولت حکومتی انتظامیہ کی طرف سے نوازا گیا تھا۔ یہ بات الگ تھی کہ وہ اس پر پڑھائی کے علاوہ باقی سب کام کیا کرتا۔ فیس بک، گوگل سے نت نئے خیالات کی تسخیر، انگریزی اور بھارتی فلموں کے لیے یہ ننھا کمپیوٹر ان سبھی ساتھیوں کے لیے بہترین اور واحد ذریعہ تفریح تھا۔

فلم بہت دھواں دھار تھی۔ معنی خیز مکالمے اور سنسر کی حدود و قیود سے مبرا مناظر میں وہ لاشعوری طور پر مکمل غرق تھے۔ نشہ آور سگریٹ کی بُو اور کچھ مخصوص مناظر شاہنواز کی طبیعت میں تحریک پیدا کرنے لگے۔ اس کے انداز و اطوار میں پہلے پہل تو بے چینی پیدا ہوئی پھر وہ بار بار پہلو بدلنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی نیم دراز ساتھی ان حرکات پر بہت بیزار ہو رہے تھے۔

''چھت پہ چلے جایئے بھائی صاحب! لگتا ہے 'فون ڈیوٹی' کا وقت ہو گیا ہے۔'' ایان نے کھنکھاتے ہوئے معنی خیز شوخی سے اسے ٹہوکا دیا۔

''فضول گوئی مت کیا کرو میرے ساتھ ایان!'' اسکرین پر منعکس ہوتے مناظر سے نظریں چراتا وہ درشتی سے بولا۔

''ارے یار! اپنے یہ تبصرے اور پیش گوئیاں بند کرو۔ خواہ مخواہ فلم کا مزہ کرکرا مت کرو۔'' سعد نے چڑ کر کہا۔

''اسامہ! تھوڑی دیر اسٹاپ کر دے مووی۔ شاہنواز کو تسلی سے چھت پہ جانے دے۔ اگر دیر ہو گئی تو موصوف کے لیے روٹھے سجن کو منانا مشکل ہو جائے گا۔'' ایان نے بائیں آنکھ میچتے ہوئے اسے ایک اور چٹکی بھری۔

شاہنواز کو اس کی باتوں پر بہت غصہ آرہا تھا لیکن وہ ضبط کر گیا۔ اس وڑبے نما کمرے میں ان کی شرقاً غرباً پھیلی ٹانگوں سے بچتے ہوئے وہ باہر نکل آیا۔ اس کے نکلتے ہی وہ سب دوبارہ فلم میں مگن ہو گئے۔ وہ کچھ دیر تو اس مختصر سے صحن میں ٹہلتا رہا لیکن طبیعت میں موجود بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس تپش سے بے حال شدید سردی اور دھند کے باوجود وہ چھت پر چلا آیا۔

وہ کافی دیر بے مقصد ٹہلتا رہا اور کہرے میں لپٹے چاند کی طرف دیکھتا رہا پھر تھک ہار کر ایک کونے میں موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں رعشہ کے کسی مریض جیسی کپکپاہٹ تھی۔ یہ لرزش موسم کی شوریدہ سری تھی یا اس کے اندر مچلتے جذبات کی...... وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ لائٹر سے سگریٹ سلگا کر اس

نے گہرا کش لیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ ذہن پر اب بھی فلمی مناظر اور دوستوں کی ہرزہ سرائی سوار تھی۔ وہ ہمیشہ یونہی ان کے طنز و مزاح کا نشانہ بنتا رہتا تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں ہی الجھا بیٹھا تھا کہ اس کے بائیں ہاتھ میں موجود اسمارٹ فون نے ایک ویڈیو کال کی وصولی کی اجازت طلب کرنے کے لیے مترنم آواز میں گنگنانا شروع کر دیا۔ اس کی تیوریوں کے بل مزید گہرے ہو گئے اور ہینڈز فری کانوں میں لگا کر اس نے غصے سے کال 'اوکے' کر دی۔ دوسری جانب وہ رات کے اس پہر بھی مکمل نک سک سے تیار بیٹھی نظر آ رہی تھی۔

''ارے یہ کیا شاہی! اتنا اندھیرا کیوں ہے آپ کے آس پاس؟'' وہ فکرمندی سے بولی۔

''میں چھت پر موجود ہوں تحریم! اور یہاں رات کے وقت سورج نے طلوع ہونے کی ابھی کوئی روایت پیدا نہیں کی۔'' وہ کلس کر بولا۔

''او گاڈ! اتنی سردی میں آپ چھت پر کیا کر رہے ہیں شاہی! کمرے میں چلے جائیے ناں۔ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' اس نے اٹھلا کر کہا۔

''میں یہاں کسی کوٹھی یا بنگلے میں نہیں رہتا جو علیحدہ کمرے کی سہولت سے مستفید ہو سکوں۔ آج ویک اینڈ ہے اور وہ سب نیچے اپنی موج مستی میں مگن ہیں۔ اب اس غل غپاڑے میں تو میں تم سے کسی صورت بات نہیں کروں گا۔''

''تو دوسرا کمرا استعمال کر لیں ناں!'' اس نے جھٹ متبادل راہ سجھائی۔

''فار گاڈ سیک تحریم! ہزار دفعہ بتا چکا ہوں کہ اس کمرے میں سانس بھی لو تو آواز دوسری طرف جاتی ہے۔ اور وہ کمرا کیا ہے؟ محض ایک پردہ لگا کے اوٹ بنا رکھی ہے انہوں نے۔''

''ہر دفعہ ایک نیا بہانہ تیار ہوتا ہے آپ کے پاس۔'' وہ بھی جواباً غصہ دکھانے لگی۔ ''آپ بہت بدل گئے ہیں شاہی! مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ آپ کا دل بھر گیا ہے اب مجھ سے؟''

''خدا کا نام لو! یہ بچپنا چھوڑ دو اب۔'' اسکرین پر ٹسوے بہاتی تحریم کو دیکھ کر اب وہ واقعی اکتانے لگا تھا۔

وہ کبھی بھی اس کے مسائل سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتی۔ اسے خود ستائشی کا مرض بری طرح لاحق تھا اور ہمیشہ شاہنواز سے نوخیز لڑکوں سی وارفتگی' چاہت اور مکالموں کی طلب گار رہتی۔

''بچپنا؟ میری محبت' میرے جذبات آپ کو ہمیشہ بچپنا ہی کیوں لگتے ہیں؟ آپ ہر بار یوں ہی میرے احساسات نظرانداز کردیتے ہیں۔''

''تو اور کیا کروں بیوقوف عورت؟ تم بھی سمجھنے کا نام تو لیتی ہی نہیں...... میری بیوی ہو تم...... اور اپنے دوستوں کے سامنے تمہاری ان احساسات سے لبریز 'فون کالز' سن کر میری کتنی سبکی ہوتی ہے...... کچھ اندازہ ہے تمہیں؟'' وہ ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھا۔

''تو کیا ہوا؟ جائز اور شرعی بیوی ہوں آپ کی...... کوئی نامحرم تو نہیں جو آپ دوستوں سے خائف رہتے ہیں۔'' اس کی ہٹ دھرمی اب بھی برقرار تھی۔

شاہنواز کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ ''جہنم میں جاؤ تم!'' اس نے فون آف کر کے اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ دیا۔

کھولتے دماغ سے وہ اپنے خیالات کے بھنور میں کھویا جانے کتنی دیر وہیں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ حسبِ سابق وہ اس ماحول اور رہائش سے چھٹکارا پانے کا عزم ایک بار پھر دہرا رہا تھا۔

''ارے شاہی صاحب! تشریف لے آئیے نیچے۔ کیا قلفی جمانے کا ارادہ ہے آج؟'' ایان نے دانستہ اسی نام سے پکارتے ہوئے صحن سے اسے صدا دی۔

اُس نے گہری سانس لی اور شل ہوتی ٹانگوں کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے کمرے میں واپس آگیا۔

☆☆☆

اس کا یک نما گھر میں چار افراد رہتے تھے۔ وہ چہار درویش تو نہ تھے لیکن ان چاروں ہی کی ذات سے مختلف پس منظر خیالات اور قصے وابستہ تھے۔ ان سب میں ایک ہی قدرِ مشترک تھی۔ ہر کوئی اپنی ذات سے منسوب کسی نہ کسی مجبوری کے باعث اس گھر میں رہنے پر مجبور تھا۔

شاہنواز ضلع قصور کے نواحی علاقے کا رہائشی تھا جو اپنی اچھی شکل وصورت اور خداداد ذہانت پر اترانا اپنا پیدائشی حق سمجھتا۔ اس کے والد اور چچا محکمہ اوقاف کی انتظامی کمیٹی کے ارکان تھے۔ اہلِ علاقہ میں بہت عزت و احترام تھا۔ شاہنواز کی سیمابی روح اس بندھے ٹکے معمول سے بہت بیزار رہتی۔ وہ آزاد فضاؤں کا پنچھی تھا۔ ایم۔ کام کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ تو افتادِ طبع کی تسکین کے لیے وہیں نوکری کرتا رہا لیکن اپنی خوبروئی اور ذہانت کا زعم اسے نئے آسمانوں کی تسخیر کے لیے بے قرار رکھتا۔ اس چند روزہ زندگی میں وہ اپنے تمام خوابوں میں رنگ بھرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اس نے اپنے خوابوں میں بسے شہر میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔

مغلیہ باقیات سے آراستہ' کالجوں' یونیورسٹیوں اور زندہ دلوں کا یہ شہر اسے بچپن ہی سے بہت پسند تھا۔ اس کی قدیم و جدید خوبصورتی کا ملاپ اسے سحر میں مبتلا رکھتا۔ اسکول اور کالج ٹرپ کے ساتھ کئی ایک بار وہاں جانے کا اتفاق ہوا اور ہر بار اس کی آنکھیں خوابوں سے مزید بوجھل ہوجایا کرتیں۔

اپنا شہر چھوڑ کر 'پردیس' میں نوکری کا نادر خیال سنتے ہی اہل وعیال اس کی مخالفت میں بول پڑے۔ وہ والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ چچا کا بھی بس ایک ہی بیٹا تھا جو ابھی اسکول میں پڑھتا تھا۔ ان سبھی کے خیال میں بڑے شہروں کے آسیب نوجوانوں کی تاک میں رہتے ہیں جو ذرا سا موقع پاتے ہی ان کا اصل روپ نگل کر انہیں شہری رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ والدہ جب پیار سے سمجھا بجھا کر تھک گئیں تو والد اور چچا نے اسے روکنے کے لیے کمر کس لی۔

''کیا کرنا چاہتے ہو آخر وہاں جا کر؟؟ کس چیز کی کمی ہے تمہیں یہاں؟'' اس کے والد یوسف پرویز نے زچ ہو کر پوچھا۔

''اپنا آپ منوانا چاہتا ہوں ابا جان! میری ڈگری کی بہت قدر و قیمت ہے...... میں یہاں چھوٹی موٹی کمپنیز میں اپنا ٹیلنٹ ضائع نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے نخوت سے جواب دیا۔

''کوئی بھی پودا اپنی جڑوں اور زمین سے دوری کے بعد پھل پھول نہیں سکتا شاہنواز بیٹے! اس زمین میں تمہاری جڑیں پیوست ہیں۔ یہاں سے دوری تمہیں مرجھا دے گی۔'' چچا نے تدبر سے کہا۔ اس کی روانگی سے انہیں مستقبل میں اپنے بیٹے کے لیے بھی شدید تحفظات لاحق تھے۔ شمروز بچپن ہی سے اپنے تایازاد کو ایک مثال سمجھتا رہا تھا۔ وہ بھی یقیناً اسی کے نقشِ قدم پر چلتے کسی بڑے شہر میں روانگی کے لیے پَر ضرور تولتا۔

''اونہوں! ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ سائنسی دور ہے۔ ایسے فلسفے اور تصورات اب باطل ہوچکے ہیں۔'' وہ تیقن سے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ کر لو اپنا یہ شوق بھی پورا۔ ایک سال نہیں رہ پاؤ گے تم وہاں۔'' والد نے آنکھیں اور ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

''ٹھیک ہے! یہ تو وقت ہی بتائے گا آپ کو۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

اگلے ہی ہفتے وہ اپنی ڈگری تھامے لاہور چلا آیا۔ سابقہ نوکری میں بچائی کچھ رقم کے علاوہ والدہ کے مٹھیاں بھر کر دیے پیسوں نے اسے ہر فکر سے آزاد کر دیا۔ لاہور میں کوئی رشتے دار تو رہتا نہ تھا اس لیے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں رہائش اختیار کرنے کے بعد اس کی دوسری ترجیح شہر گردی تھی۔ مغلیہ عمارات کے علاوہ اس نے انارکلی، فورٹریس، ہائپر اسٹار، سفاری پارک سمیت کوئی بھی قابلِ ذکر مقام نہ چھوڑا۔ نوکری کی طرف سے ابھی وہ بے فکر تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ ایم۔ کام ڈگری کی وجہ سے اسے ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

اگلے دو ماہ میں اس کے خوابوں کی پرواز عرش سے فرش تک بہت بری طرح کریش ہوئی۔ یہ حادثہ تو اس کے لیے کسی بھی قومی سانحے سے بھی بہت عظیم تھا۔ اپنی جس خوبصورتی پر اسے بہت مان تھا، وہ اس کی 'آؤٹ ڈیٹڈ' جامہ زیبی تلے گہنا گئی۔ لاہور میں تین ماہ گزارنے کے باوجود وہ مقامی افراد جیسے چست یا پتلون کوٹ اور ٹائی جیسے رسمی ملبوسات کا عادی نہ ہو پایا۔ انٹرویو دیتے وقت سب سے پہلا تاثر ہی بہت منفی رہتا اور پھر رہی سہی کسر اس کی سی۔ وی میں موجود تجربہ کے کالم کا خلا پوری کر دیتا۔ اچھی ساکھ والے اداروں کو اس کی عمر سے بھی زیادہ تجربہ درکار ہوتا۔ اور چھوٹی موٹی کمپنیز کی نوکری اس کے شاہانہ مزاج پر گراں گزرتی۔

چھ ماہ کی مسلسل خواری کے بعد وہ حقیقتاً سر تھام کے بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے اب دو ہی رستے تھے۔ اپنی شکست تسلیم کر کے واپسی کی راہ لیتا یا یہیں رہ کر جدوجہد کے گرداب میں پھنسا رہتا۔ شاہنواز نے دوسرا رستہ اختیار کر لیا۔ گھر والوں کی نظر میں وہ وہاں بہت خوش باش رہتا تھا۔ والد اور چچا کی بہترین نوکری کے باعث اسے وہاں تنخواہ بھیجنے کی کبھی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ ورنہ اس کا بھرم کبھی کا بکھر چکا ہوتا۔

چند ہزار ملنے والی تنخواہ کا ایک تہائی حصہ اس کی رہائش، ملبوسات اور ہوٹلوں سے کھانے پینے میں صرف ہو جاتا۔ تبھی اس کے دفتر کے ایک ساتھی نے اسے بہت مناسب راہ سجھائی۔ بشیر نیاز جز وقتی پراپرٹی ڈیلر کا کاروبار بھی سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ شاہنواز جیسے 'چھڑے چھانٹ' لڑکوں کے لیے 'کم خرچ بالانشین' کا کردار ادا کرتا۔ ایک یا دو کمروں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے سے تنگ گلیوں میں واقع گھر مشترکہ کرایہ پر مہیا کرتا۔

شاہنواز یوسف بھی اسی طرح ہوٹل سے وداع لیے مزنگ کے علاقے میں رہنے چلا آیا۔

☆☆☆

وہ ایک انتہائی تنگ گلی تھی۔

چھ فٹ لمبی اور بمشکل دو فٹ چوڑی اس گلی کے اختتام پر ایک گھر میں بشیر نیاز اسے لیے چلا آیا۔ مین گیٹ سے داخل ہوتے ہی چار سے پانچ قدموں کی ایک ڈیوڑھی تھی جس کے دائیں کونے میں ایک برقی موٹر اور کوڑا کرکٹ اگلتی ٹوکری موجود تھی۔ سبزیوں کے چھلکے، سگریٹوں کے آدھے ٹکڑے اور مختلف شاپنگ بیگز اپنی انتہائی 'بدبودار' بہار دکھلاتے نظر آرہے تھے۔ اس کا جی متلانے لگا۔

ڈیوڑھی ختم ہوتے ہی ایک غسل خانہ تھا جس کا چوبی دروازہ نچلی جانب سے دیمک کے باعث ٹوٹ چکا تھا۔ ایک تہائی دروازہ سے اندر پڑی میلی سی بالٹی بھی جھلک دکھا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دس سے بارہ قدموں پر محیط ایک صحن موجود تھا جہاں دو چار پائیاں ایک کونے میں موجود تھیں۔ شمالی کونے میں ایک چھوٹا سا چولہا اور چند برتن بھی اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ بشیر انتہائی بے تکلفی سے لکڑی کے سال خوردہ دروازہ کھولے وہاں موجود اکلوتے کمرے میں داخل ہو گیا۔ دروازے کے قفل والے حصے میں صرف ایک خلاء موجود تھا۔

وہ اردگرد نظر آتی گرد اور گندگی سے نظریں چراتا بشیر کے پیچھے کمرے میں چلا گیا جہاں دو لڑکے نیم دراز تھے۔

''دروازے چوپٹ کھلے چھوڑ رکھے ہیں۔ کسی دن ڈاکا پڑ جائے گا۔'' اس نے جاتے ہی تان لگائی۔

''ارے چھوڑو بشیر بھائی! یہاں ڈاکوؤں کے لیے کیا رکھا ہے بھلا؟'' کم عمر سا ایک لڑکا بولا۔

''یہ کسے اٹھا لائے ہو ساتھ بشیرے؟'' دوسرے لڑکے نے پوچھا۔

''تم لوگوں کا نیا ساتھی ہے۔ 'بوجھ' بٹانے آیا ہے۔''

''یہاں ہم پہلے ہی بہت مشکل سے گزارا کر رہے ہیں یار! اب تم ایک نیا بندہ لے آئے ہو۔''

''اوئے کاکا جی! آواز نیچی رکھ کے گل کرو میرے ساتھ..... مت بھولو تم سے پہلے یہاں چھ بندے کرایہ دار تھے میرے۔'' بشیر تن کر بولا اور اس کا سامان وہیں ایک جانب رکھ دیا۔ ''یہ ایک دو دن ہچر مچر کریں گے۔ پھر خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ پریشان نہ ہونا۔'' دفتر میں چہرے پر ہمہ وقت مسکینی طاری رکھنے والا بشیر اس وقت ایک

نئے روپ میں نظر آ رہا تھا۔

بشیر کے جاتے ہی کم عمر لڑکے نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ ''اپنا سامان وہاں پردے کی پچھلی جانب رکھ دیجیے۔''

وہ خاموشی سے اپنے دوسفری بیگ وہیں رکھ آیا۔ پردے کی اوٹ میں ایک چارپائی کے نیچے تین ٹرنک رکھے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ ان کے علاوہ بھی ایک ساتھی یہاں موجود ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد اس کی آمد نے اس کی زندگی میں سرد جنگ کا ایک طبل بجادیا۔

ایان ابراہیم نامی اس نو وارد اور شاہنواز نے پہلی ہی نظر میں ایک دوسرے کو ناپسندیدہ قرار دے دیا۔

☆☆☆

ایان کا تعلق شاہینوں کے شہر سے تھا لیکن اس کی ذات اور فطرت میں کوئی ایک خوبی بھی شاہینوں جیسی نہ تھی۔ وہ قدرے کوتاہ قامت، کمزور جسامت کا مالک تھا۔ اٹھائیس سال عمر کے باوجود وہ سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اپنی اسی محرومی نے اسے 'زہریلا' بنا رکھا تھا۔ ذہانت میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا مگر یہ ذہانت اول و آخر منفی تھی۔ بلا کا چرب زبان تھا اور مخالف کی میٹھے انداز میں خوب بے عزتی کرتا۔ شاہنواز سے ملتے ہی اس کے دل میں فوری حسد کے جذبات پیدا ہوئے تھے۔ اس کے لباس، رکھ رکھاؤ اور آنکھوں سے اس کی شخصیت کی 'تعمیر' کا فوری عندیہ ملتا تھا۔

ابتدائی تعارف میں جب اُسے شاہنواز کی تعلیمی اہلیت کا علم ہوا تو اس متوقع 'حریف' کی بے وقت آمد نے ایان کا حلق تک کڑوا کر دیا۔ وہ خود بھی ایم۔ کام تھا اور بہترین سفارش کی بدولت ایک بہت اچھی پوسٹ پر فائز ہو چکا تھا۔ اس نے شاہنواز سے فوری بیر باندھ لیا۔

اس رات ان میں سے کوئی بھی نہ سویا۔ اگلے روز ایک عوامی تعطیل تھی اس لیے سب بے فکری سے تعارفی مرحلے کی ادائیگی میں مگن رہے۔

ایان ابراہیم کے علاوہ وہاں دوسرا شخص سعد جاوید تھا۔ بتیس سالہ سعد ڈسکہ کا رہائشی تھا۔ سائڈ مانگ نکالے بڑے بڑے بال، قدرے اندر کو دھنسی آنکھیں، سانولی رنگت اور مضبوط کاٹھی والا سعد انگریزی اور اردو ادب میں ماسٹرز تھا۔ ایک نیم سرکاری کالج میں اُسے لیکچرر کی نوکری مل گئی۔ یہیں رہتے ہوئے اس نے بی۔ ایڈ اور ایم ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں اور اب سرکاری اداروں تک رسائی کے لیے پر تول رہا تھا۔

اس گھر کا آخری فرد کم عمر اور معصوم صورت اسامہ نوید تھا۔ وہ سیالکوٹ کے کسی دور دراز گاؤں میں رہتا تھا اور یہاں مقامی یونیورسٹی میں آئی۔ ٹی کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ روزانہ صبح پیدل شمع اسٹاپ تک پہنچتا اور پھر میٹرو بس کے ذریعے اپنی یونیورسٹی جاتا جہاں سے اس کی واپسی اکثر شام تک ہوتی۔ ہاسٹل کی سہولت کے باوجود وہ بشیر نیاز کے اس کابک میں ایک سال سے رہائش پذیر تھا۔ ہاسٹل میں لڑکوں کا شور شرابا ذہنی سکون اور پڑھائی میں رکاوٹ بنا رہتا تھا۔ شاہنواز کے دل نے اسے فوری پسندیدگی کی سند عطا کر دی۔

اس رات وہ ایان کی فطرت سے تو واقف ہو گیا تھا لیکن سعد اور اسامہ کے بارے میں اس کے سبھی اندازے آنے والے دنوں میں غلط ثابت ہوئے۔

☆☆☆

آغاز میں وہ تینوں شاہنواز کے ساتھ بڑے لیے دیے انداز میں رہتے۔ خود اسے بھی اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ اس کی وجہ سے کسی 'بے آرامی' کا شکار ہیں لیکن وہ صبر اور سکون سے وقت گزارتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ بلی جلد ہی تھیلے سے باہر نکل آئے گی اور ہوا بھی یہی۔

وہ تینوں ہی عادی سگریٹ نوش تھے۔ چرس بھرے سگریٹ ہمہ وقت اس کمرے میں موجود رہتے، وہ اس نشے کا استعمال صرف گھر میں ہی کیا کرتے۔ شاہنواز اس انکشاف سے قدرے جز بز تو ہوا لیکن پھر خود ہی دلائل سے اپنے دل و دماغ کو سمجھا لیا۔ اس عمر میں سگریٹ نوشی تو ایک وقتی مشغلہ ہوا کرتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ آنے والے وقت میں وہ اس علت سے چھٹکارا پا ہی لیں گے۔ اسے تو یہ بھی یقین تھا کہ اب مزید کسی بھی انکشاف کی نوبت نہیں آئے گی لیکن ابھی تو پارٹی شروع ہوئی تھی۔

ایک روز شدید نزلے کی وجہ سے وہ دوپہر ہی میں دفتر سے لوٹ آیا۔ سرخ پڑتی ناک، ٹوٹتے جسم اور بھاری سر سے اس نے مین دروازے پر لگے حفاظتی تالے کو مخصوص چابی سے کھولا۔ اس لاک کی ایک ایک چابی ان چاروں کے پاس موجود رہتی تھی۔ وہ بے دھڑک کمرے میں داخل ہو گیا اور اگلے ہی لمحے اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔

اسامہ کسی تو عمر لڑکی کے ساتھ فطری لباس میں موجود دنیا و مافیہا سے بے نیاز تھا۔ اس کے قریب فاسٹ فوڈ کے کچھ خالی ڈبے، سگریٹوں کے ٹکڑے اور ایک شفاف سی بوتل میں ہلکا سنہرا محلول بھی موجود تھا۔ یہ جکڑ بندی صرف لمحاتی تھی۔ اگلے ہی پل وہ الٹے قدموں لوٹتا چھت پر چلا گیا۔

فروری کی نرم دھوپ میں لیٹ کر اس کے دکھتے جسم کو بہت سکون ملا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں لیکن کچھ دیر بعد اسامہ کی آمد نے اس غنودگی کو ختم کر دیا۔

''اوپر کیوں چلے آئے شاہنواز بھائی؟'' اس نے آتے ہی پوچھا۔

''تو وہاں رہ کر میں کیا کرتا؟'' شاہنواز نظریں چرا کر بولا۔

''اب یہ بھی میں بتاؤں آپ کو؟ اچھے خاصے سمجھدار ہیں آپ۔'' وہ سر کھجانے لگا۔

''وہ چلی گئی کیا؟''

''نہیں...... سعد سے ملاقات بھی طے ہے اُس کی...... اس کے بعد ہی جائے گی۔''

''تو کیا سعد بھی شامل ہے اس سب میں......'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں جی! یہ کونسی بڑی بات ہے۔ اپنا ایان بھی اسی میدان کا کھلاڑی ہے۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔ ''اچھا اب چلیں نیچے...... ایک دفعہ ہیلو ہائے کر لیں اس سے... گھر آئے مہمان سے یوں پیش آنا تو بد تہذیبی ہے ناں۔'' وہ اسے کھینچتا نیچے لے گیا۔

کمرے میں بے ترتیبی ویسے ہی موجود تھی۔ وہ اپنا میک اَپ درست کرنے میں مصروف تھی۔ شاہنواز کی جانب اٹھی اس کی نظروں میں خاصی بے باکی تھی۔

''کہاں چلے گئے تھے سیم؟''

''شاہنواز بھائی کو لینے گیا تھا۔ چھت پر اکیلے موجود تھے۔''

''سوری...... میری وجہ سے آپ دونوں ڈسٹرب ہوئے۔'' اسے اور کوئی بات نہ سوجھی تو فوری معذرت کر لی۔

''ہاؤ سویٹ! سیم تمہارا یہ نیا روم میٹ بہت اچھا لگا مجھے۔'' وہ اٹھلائی۔

''میں ڈاکٹر کے یہاں جا رہا ہوں۔ طبیعت نہیں ٹھیک میری۔'' شاہنواز اس کی نظروں میں موجود دعوت سے یکدم گھبرا گیا۔

کلینک سے نکل کر وہ دانستہ طور پر ایک لائبریری میں چلا گیا۔ اسے شام تک کسی بھی طرح وقت گزارنا تھا۔ اس کے گھر پہنچنے سے قبل ہی اسامہ ایان اور سعد کو صبح والے واقعے کی خبر دے چکا تھا اور اب معنی خیز انداز میں اسے بتانے لگا۔

''آپ کی یہ بے نیازی نیلم کو بہت بھا گئی ہے جناب! وہ مجھ سے آپ کا نمبر مانگ رہی تھی۔''

''تم نے دیا تو نہیں؟''

''نہیں! آپ کی رضامندی درکار تھی پہلے۔''

''مت دینا۔'' وہ خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گیا۔

اگلی صبح اس نے دفتر میں بشیر نیاز کو گھیر لیا اور ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے اپنے تحفظات سے آگاہ کیا۔ وہ اس کی باتیں سن کر مسکراتا رہا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''دیکھیں شاہنواز صاحب! کیوں ان لڑکیوں کی روزی پہ لات مارتے ہیں؟''

''مگر بشیر! وہ تو کسی کالج یا یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی۔ کتابیں اور بیگ بھی موجود تھا اس کے پاس۔''

''جی ہاں! اسی لیے تو کہہ رہا ہوں...... کیوں ان کی روزی پہ لات مارنے پہ تلے ہیں...... اسامہ ہی ان لڑکیوں کو وہاں لانے کا انتظام کرتا ہے اور اس کام میں ان کی مکمل رضامندی شامل ہوتی ہے۔''

''اگر کسی ہمسائے نے شکایت کر دی پولیس میں تو؟''

''ہمسایہ کون؟ اس گلی میں آپ لوگوں کے سوا ایک ہی تو گھر موجود ہے اور وہاں بھی یہی سسٹم چلتا ہے...... اور اگر کسی نے شکایت کر بھی دی تو کوئی مسئلہ نہیں۔ وہاں بھی اپنے ہی بھائی بند موجود ہیں۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''آپ کو اگر پسند نہیں...... تو بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ کوئی زبردستی کا سودا تو نہیں۔ آپ اپنے رستے چلیں انہیں اپنے رستے چلنے دیں۔ اگر یہ بھی ممکن نہیں تو رہائش بدل کے کسی ہوٹل میں واپس چلے جائیے۔''

شاہنواز اس ساری صورت حال میں اچھا خاصا الجھ گیا تھا۔ اپنے گھر والوں کے سامنے کیے گئے دعوے اسے واپسی کا سفر بھی اختیار کرنے نہ دے رہے تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے خاموشی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی طرف سے بے فکر ہوتے ہی ان تینوں نے سکھ کا سانس لیا۔

اب اکثر ویک اینڈ پر شراب اور شباب کی محفل جمائی جاتی۔

شاہنواز فطری طور پر بہت شرمیلا اور لغویات سے دور رہنے والا انسان تھا۔ طبیعت میں بزدلی کی حد تک سادگی موجود تھی لیکن تربیت کے رنگ بھی اتنے کچے ہرگز نہ تھے کہ ان ترغیبات پر مائل ہو جاتا۔ وہ لاشعوری طور پر ایک بات تسلیم کرتا تھا کہ زندگی میں کسی بھی موڑ پر بھٹکے ہوئے قدموں کا تاوان شریک حیات کی صورت میں ایک بار لازمی ادا کرنا پڑتا ہے اس لیے وہ فی الوقت اپنا دامن ان خرافات سے بچائے ہوئے تھا۔

☆☆☆

وقت یونہی گزرتا رہا۔ اس نے بدقت تمام ان سب

کے معمولات سے ہم آہنگی پیدا کر لی۔ عید کی آمد تھی۔ شاہنواز کو یہ چھٹیاں گھر گزارنی تھیں۔ یوسف پرویز نے اس کا رشتہ اپنے دفتر کے ایک دوست کی بیٹی سے بالا ہی بالا طے کر دیا تھا۔ انہیں اب بھی بیٹے کی طرف سے کچھ تحفظات لاحق تھے۔ وہ اس اچانک خبر پر تھوڑا حیران تو ہوا لیکن تحریم کا نام سن کر اس کی کوفت خوشی میں تبدیل ہو گئی۔ تحریم سے ایک دو بار اس کا سامنا ہو چکا تھا اور وہ اسے پسند بھی تھی۔ وہ ان سب کے لیے خوب تحائف اکٹھے کر رہا تھا۔ اپنے پندار کا بھرم قائم رکھنے کے لیے وہ ہر حد سے گزرنے کو تیار تھا۔ ایان دو روز قبل ہی اپنے گھر جا چکا تھا۔ آخری عشرے سے قبل اسامہ نے بھی واپسی کی ٹکٹ کروا لی۔ لیکن سعد بے نیازی سے این۔ ٹی۔ ایس کی تیاری میں مگن تھا۔ سرکاری نوکری حاصل کرنے کی خواہش اب جنون کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ اہل وعیال سے ایسی لاتعلقی شاہنواز کے لیے خاصے اچنبھے کا باعث تھی۔ تکلف کی دیواریں اب قدرے گر چکی تھیں اس لیے اس نے اپنی الجھن کو الفاظ کا جامہ دے ہی دیا۔

''تم کبھی اپنے گھر والوں کی کمی محسوس نہیں کرتے کیا؟''

''نہیں۔ اب یہی میرا گھر ہے۔'' وہ مصروف انداز سے بولا۔

''لیکن تمہارے بھائی، ان کے بچے..... کبھی خیال نہیں آتا اُن کا تمہیں؟''

''میری زندگی میں ان چونچلوں کی فرصت نہیں یار! میں اگر وہاں چلا بھی جاؤں تو سب اس فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کہیں اپنا حصہ طلب کرنے تو نہیں چلا آیا؟ عید سے ایک روز قبل جاؤں گا اور تیسرے روز شام میں لوٹ آؤں گا۔ وہ بھی خوش، میں بھی خوش۔''

''کمال ہے۔ رشتوں میں ایسی بے رخی!''

''دیکھ جگر! والدین سر پر نہ رہیں تو زندگی میں ایسے کئی خلا پیدا ہو جاتے ہیں۔ اپنی حیاتی میں جس اولاد کو وہ چوزوں کی طرح اپنے پروں تلے سمیٹ کر رکھتے ہیں..... ان کے جاتے ہی وہ مختلف سمتوں میں تتر بتر ہو جاتے ہیں اور صرف بے رخی ہی نہیں، مفاد اور خود غرضی بھی ان رشتوں سے نتھی ہو جاتی ہے۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''لیکن خیر! تم بھی یہ کیا باتیں لے بیٹھے؟ اپنی شادی کے بارے میں سوچو بس۔''

شاہنواز نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

شادی کے بعد وقت پر لگائے بیت گیا۔ وہ دفتر سے صرف دو ہفتوں کی اضافی چھٹیاں لینے میں کامیاب ہو پایا تھا۔ فراغت، حسین بیوی کی قربت، خاندان میں دعوتیں اور سیر سپاٹوں میں اندازہ ہی نہ ہوا کہ وقتِ رخصت آن پہنچا۔ روانگی سے قبل تحریم بہت اداس تھی۔ اس کے جھیل نینوں کے کٹورے بار بار بھر آتے اور وہ اس کا ہاتھ تھام کر کئی بار کے پوچھے سوال پھر سے دہرانے لگتی۔

''مجھے کب بلائیں گے اپنے پاس؟''

''میرے پاس آنا کیا بہت ضروری ہے؟ بندہ خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کرے گا۔'' وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے بولا۔

''میں تب تک کیسے رہوں گی یہاں؟ بور ہو جاؤں گی بالکل۔''

''اوہ...... اچھا اب میں سمجھا...... یعنی میں اپنی بیگم صاحبہ کے لیے چابی والا کھلونا ہوں جس کے بغیر وہ بور ہو جائیں گی۔'' اس نے شرارت سے کہا اور پھر سنجیدہ ہو گیا۔ ''دیکھو تحریم! مجھے وہاں معاملات درست کرنے میں بہت وقت درکار ہے۔ اور اگر میں تمہیں بلوا بھی لوں تو امی کے لیے یہاں کام کاج کا بوجھ بہت بڑھ جائے گا۔ اس لیے تمہیں یہیں دل لگانا پڑے گا اپنا۔''

''لیکن شاہی! وہ پہلے بھی تو اکیلے سنبھالتی تھیں ناں کام۔ اور کام ہوتا ہی کتنا ہے؟ ملازمہ کو ہدایات ہی تو دینی ہوتی ہیں۔'' اسے شوہر کی بات بہت بری لگی۔

''میں تم سے ایسی غیر ذمے داری اور بچپنے کی توقع نہیں رکھتا تحریم! میں جو کہہ رہا ہوں اسی پہ عمل کرنا ہو گا تمہیں۔'' وہ ہلکی سی سختی سے بولا تو وہ بھی اس کا موڈ بھانپ کر خاموش ہو گئی۔

شاہنواز اگلی صبح اپنی نئی بائیک پر لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ بائیک یوسف نے اسے شادی کے تحفے میں دی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ بیوی اس کی بات مکمل طور پر سمجھ گئی ہو گی۔ وہ تعلیم یافتہ سمجھدار لڑکی تھی لیکن یہ اس کی بہت بڑی خام خیالی ثابت ہوئی۔ عورت خواہ کتنی ہی تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہو شوہر کے معاملے میں اس کی سوچ اور نفسیات ہمیشہ ایک ہی مدار کے گرد گھومتی ہیں۔ ستائش، مدح سرائی، ڈھیر سارا وقت جس میں وہ بولتی رہے اور خاوند جذبے لٹاتی نظروں سے اسے اپنی چاہت کا یقین دلاتا رہے۔ لاہور آمد کے بعد شاہنواز کی زندگی تہرے عذاب کا شکار ہوئی تھی اور وہ سنجیدگی سے اپنی ضد قربان کرنے پر غور کرنے لگا۔

☆☆☆

اس کا پہلا درد سر ایان ثابت ہوا۔

اسے عید کے بعد واپسی پر شاہنواز کی شادی کی اطلاع سعد سے ملی تھی۔ اس خبر پر وہ بے حد حسد میں مبتلا ہوگیا۔ تجرد اور عیاشی کی جو غیر فطری زندگی وہ گزار رہا تھا' شاہنواز اس سے کوسوں دور تھا۔ یہ حقیقت اسے پہلے بھی بے چین رکھتی تھی اور لاشعوری طور پر اپنی ذات اسے بہت ہلکی محسوس ہوتی۔ گھریلو ذمے داریوں کے بوجھ کی وجہ سے اگلے کئی سال اس کا گھر بسنے کی کوئی نوید ممکن نہ تھی اس لیے اس کی شادی کی خبر نے اس حسد میں مزید اضافہ کردیا۔ وہ دل ہی دل میں شدید پیچ و تاب کھانے لگا۔

شاہنواز کو تحفتاً ملی موٹر سائیکل دیکھ کر تو وہ بالکل ہی آپے سے باہر ہوگیا۔

''نواب صاحب! اپنا شاہی اُڑن کھٹولا یہاں لانے سے پہلے اپنی ریاست کے محل وقوع پر تو نظر ثانی کرلیتے۔ یہاں ہم لوگوں کی جگہ بمشکل بنتی ہے اور جناب اس نئی مصیبت کو اٹھا لائے ہیں۔'' اس نے خلافِ معمول درشتی سے کہا۔

''میں اسے غسل خانے کے ساتھ والی دیوار کے قریب کھڑا کردوں گا...... تمہیں اس کی فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ بھی ترکی بہ ترکی بولا۔

لیکن ایان نے اس سے بیر باندھے رکھا۔ اسے زچ کرنے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے ہی نہ دیتا۔

دوسری طرف وہ تحریم کی جذباتیت ہی سنبھال نہ پا رہا تھا۔ وہ دفتری اوقات کے بعد اسے بے وقت فون کرنے لگتی' اس سے ویڈیو کالز کے لیے ضد کرتی۔ ہر روز درجنوں سیلفیز بھیجتی اور منتظر رہتی کہ شوہر اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے اسے اپنی بے تابیوں کا احوال بیان کرے۔

اس کی تصاویر خودکار طریقہ سے موبائل میں محفوظ ہو جاتیں۔ ٹیکسٹ میسج بھی اسے کبھی ڈیلیٹ کرنے کا خیال ہی نہ آیا۔ ایان نے کم ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا موبائل خوب تسلی سے کھنگالا۔ وہ سبھی ایک دوسرے کے موبائل پیٹرن سے آگاہ تھے۔

''بہت زیادتی کررہے ہو تحریم بھابی سے تم ویسے؟'' ایک شام اس نے اچانک اسے گھیر لیا۔ ''اس بے چاری کو سچ بتا کیوں نہیں دیتے؟''

''میرے ذاتی معاملات سے دور رہو ایان!'' وہ بھڑک اٹھا۔

''شاہنواز ٹھیک کہہ رہا ہے ایان! یہ اس کا نجی معاملہ

ناشتا

بھوم

سردار جی اپنی زوجہ کے ساتھ پیرس کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے جہاں ناشتا کمرے کے کرایے میں شامل تھا۔ وہ صبح سویرے ڈائننگ روم میں پہنچے تو پتا چلا کہ ناشتے میں دو انڈے، چار ٹوسٹ، مکھن، جام اور چائے یا کافی مفت ملے گی۔

زوجہ نے منہ بنا کر کہا۔ ''میں تو انڈے نہیں کھاؤں گی۔''

''یہ اسپیشل ناشتا ہوگا۔ اس کا بل آپ کو ادا کرنا ہوگا۔'' بیرے نے ادب سے آگاہ کیا۔

''یعنی مجھے انڈے نہ کھانے کا جرمانہ دینا ہوگا؟''

''بالکل مادام! اسٹینڈرڈ مینو سے مختلف ناشتے کے پیسے لیے جاتے ہیں۔''

زوجہ کنجوس تھیں۔ سوچ میں پڑ گئیں پھر بولیں۔ ''ٹھیک ہے، میں انڈے بھی لے لوں گی۔''

''مادام انڈے کیسے لیں گی......؟ ابلے ہوئے، فرائیڈ یا ہاف فرائیڈ؟'' ویٹر نے پوچھا۔

''میرے لیے کچے انڈے لے آؤ، چھلکوں سمیت!''

کراچی سے حمیرا اقبال کی دور اندیشی

ہے۔'' سعد نے گھرکا۔

''ہاں بھئی! بالکل نجی مسئلہ ہے اس کا۔ میں تو دوست ہونے کے ناتے سمجھا رہا ہوں کہ وہ بے چاری اس سے تفصیلی بات چیت کے لیے ترستی رہتی ہیں اور یہ ہماری وجہ سے انہیں وقت نہیں دے پاتا!'' اس کا لہجہ شاطرانہ تھا۔ ''ارے جگر! ہم سے کیسا پردہ؟ تم تو بلا جھجک اُن سے بات کیا کرو۔''

شاہنواز اس کی کمینگی اور خباثت پر بہت طیش میں تھا لیکن بات بڑھانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اسے تحریم پر بھی شدید غصہ آنے لگا جو اس کے سمجھانے کے باوجود اپنی ضد چھوڑنے کو تیار ہی نہ تھی۔

زندگی نے اپنے امتحان بس یہیں ختم نہ کیے تھے۔ وہ جن باتوں پر بیوی کو قصوروار ٹھہراتا' نامحسوس طریقے سے خود بھی اسی کیفیت کا شکار ہونے لگا۔ اخلاق باختہ فلمیں دیکھنے کے بعد اس کا نفس بے لگام ہونے لگتا۔

وہ سنیچر کی شام وہاں سے نکلتا اور ایک مکمل دن گزارنے کے بعد اگلے روز واپسی کی راہ لیتا۔ اس مختصر

دورے کے بعد وہ دونوں مزید تشنہ لب ہو جاتے۔
زندگی عجیب انتشار کی زد میں آگئی تھی۔ دفتری معاملات میں توجہ کم ہونے لگی۔ تحریم کی محبت اس کے لیے باعثِ فخر بھی تھی لیکن اپنے جذبات کی شوریدہ سری اور اس کا بچپنا دل میں گھٹن پیدا کرنے لگے۔
دھیرے دھیرے وہ بیوی سے ذہنی طور پر دور ہونے لگا۔

☆☆☆

رشتوں میں دوریاں بڑھنے لگیں تو پیدا شدہ خلا کسی نہ کسی طور متبادل راہیں تلاش لیا کرتا ہے۔
شاہنواز کی زندگی اس قدر بگاڑ کا شکار ہوگئی تھی کہ وہ اس تلخی کو سگریٹ کے دھوئیں میں اڑانے لگا۔ نشے سے بہر حال وہ اب بھی دور تھا لیکن قرائن بتاتے تھے کہ وہ اس لت کا بھی جلد ہی شکار ہو جائے گا۔
تحریم نے اب ایک نئی رٹ اختیار کرلی تھی۔ وہ بضد تھی کہ شاہنواز اپنے آبائی شہر میں نوکری کے لیے کوشش کرے۔ مطالبہ بحث میں ڈھلا اور بحث جھگڑے کی صورت اختیار کرگئی اور نتیجتاً دونوں کی بول چال منقطع ہوگئی۔
شادی سے وابستہ اس کی تمام توقعات بری طرح بکھر کر رہ گئی تھیں۔ ہر گزرتا دن اس رشتے میں مزید خرابیاں پیدا کرنے لگا۔ انا اور غصے میں اس نے ویک اینڈ پر گھر جانا بھی ترک کر دیا۔ ضد اور خود پرستی میں کیے گئے ایک فیصلے نے اس کی پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔
تحریم نے اس کی طرف سے مکمل بے نیازی اختیار کر لی۔ وہ فیس بک اور واٹس ایپ پر رات گئے آن لائن رہتی لیکن اس کی موجودگی کے باوجود کسی قسم کی کوئی بات نہ کرتی۔
اس کا دماغ مزید کھولنے لگتا۔ وسوسے اس کی جان کو آجاتے اور شک کے ناگ پوری قوت سے اس کے رگ و پے میں سنسنانے لگتے۔ بیوی کی خاموشی اور اس نئی مصروفیت نے اس کے ذہن میں کئی ایک منفی سوچیں پیدا کر دیں۔
ان شکوک کے خاتمے کے لیے اس نے تحریم کا اکاؤنٹ خود چیک کرنے کا فیصلہ کیا لیکن یہ دیکھ کر اس کا دماغ بھک سے اُڑ گیا کہ وہ اپنا پاسورڈ تبدیل کر چکی تھی۔ شک یقین میں بدلنے لگا۔ اس کی چھٹی حس کسی گڑبڑ کا عندیہ دینے لگی لیکن انا اب بھی جھکنے پر مائل نہ تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ دفتر میں باس کی طرف سے اسے وارننگ لیٹر بھی جاری ہوگیا۔
اسامہ اور سعد سے اس کی کیفیت پوشیدہ نہ تھی۔ ایک رات انہوں نے اسے گھیر لیا۔
''کیا بات ہے شاہنواز؟ کس بات کی پریشانی ہے تجھے آخر؟'' سعد ہمدردی سے بولا۔
''ہونا کیا ہے ؟ میں نے تو اسے پہلے ہی کہا تھا کہ سچ بول دے بیوی سے۔'' ایان نے استہزائیہ کہا۔
''اگر ہم آپ کی کوئی مدد کر سکیں تو حاضر ہیں۔'' اسامہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
''میں ذہنی سکون چاہتا ہوں یار...... میری زندگی اجیرن ہوگئی ہے......'' وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔
''تو بھائی! غلطی بھی تو تیری ہی ہے۔'' ایان نے پھر لقمہ دیا۔
''مجھے بس سکون درکار ہے۔'' وہ اس کی بات نظر انداز کرتے اپنے بال مٹھیوں میں بھینچنے لگا۔
اسامہ پردے کی اوٹ میں موجود بیئر اس کے لیے گلاس میں ڈال کے لے آیا۔ ''یہ لیجیے! ہر پریشانی فراموش کرنے کا اکسیر نسخہ ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
شاہنواز نے بے اختیاری میں گلاس تھام لیا اور گھونٹ گھونٹ اس کی تلخی اپنے وجود میں اتارنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کا دماغ ہلکا پھلکا ہو کر ہوا میں گردش کرتا محسوس ہونے لگا۔
''اب بتاؤ! کیا پریشانی ہے تمہیں؟'' سعد نے اپنا سابقہ سوال دہرایا۔
''تو نے بہت اچھا کیا سعد کہ شادی نہیں کی...... ورنہ میری بیوی کی طرح وہ بھی اپنے چوچلوں سے تیرا بھی حال کرتی۔'' وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔
''انہیں وقت دو تھوڑا...... سمجھ جائیں گی وہ۔''
''نہیں سمجھے گی...... وہ کبھی نہیں سمجھے گی...... وہ اُلّو کی پٹھی میرے گھر میں بیٹھی' میرا دیا کھاتی ہے اور مجھی سے بے وفائی کر رہی ہے۔'' اس کی آواز بھی اب لڑکھڑانے لگی تھی۔
''ایسا کچھ نہیں ہے...... وہ تو تجھے بہت چاہتی ہے۔'' ایان نے بے یقینی سے کہا۔
''چاہتی تھی...... اب اُسے میری پروا ہی نہیں رہی...... اس کی زندگی میں کوئی اور آگیا ہے جس کے لیے وہ ساری رات سوشل میڈیا پر بیٹھی رہتی ہے۔ میں تو اسے نظر ہی نہیں آتا۔''
''تو اب کیا چاہتے ہو تم؟ بے وفائی کا بدلہ نہیں لو گے؟'' ایان اسے اکسانے لگا۔
''بالکل لوں گا...... میں یہاں اپنا نفس کچل کر جی رہا

ہوں اور وہ وہاں گل چھرے اُڑا رہی ہے۔'' نشہ اس پر مکمل حاوی تھا۔

''جیو میرے شیر! یہ ہوئی ناں مردوں والی بات۔''

وہ جوش سے بولا۔ ''اسامہ! کل ہی بندوبست کر اس کے لیے کسی پھلجھڑی کا۔''

''ضرور! یہ کونسی بڑی بات ہے میرے لیے۔''

اسامہ بھی اپنے کمیشن میں اضافے کے خیال سے جھوم اٹھا۔

''کل ہم تینوں نے ایک 'میوزیکل اسٹیج ڈراما' دیکھنے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ آپ اطمینان سے وقت گزاریئے گا اکیلے یہاں۔''

''ٹھیک ہے! میں تیار ہوں۔'' وہ غنودگی میں بولا۔

☆☆☆

اگلے روز وہ دوپہر تک بے خبر سویا رہا۔

بیداری کے بعد بھی اس کے ذہن پر غنودگی اور عجیب سی دھند سوار تھی۔ منہ میں کڑواہٹ کے ساتھ دل بری طرح متلا رہا تھا۔ اسامہ اس کے پاس ہی بیٹھا اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔

''تم گئے نہیں آج یونیورسٹی؟'' وہ تھکاوٹ زدہ لہجے میں بولا۔

''کیا ہو گیا ہے شاہنواز تمہیں؟ سنیچر کو میری چھٹی ہوا کرتی ہے۔ بھول گئے کیا؟'' اسامہ نے ایک ہی جست میں بے تکلفی کی حدود پار کیں۔

''ارے ہاں! میں واقعی بھول گیا تھا۔'' وہ خجل ہوا۔

''کل رات والا وعدہ تو یاد ہے ناں؟ کہیں وہ بھی تو نہیں بھول گئے؟'' وہ معنی خیزی سے بولا۔

''نہیں! بالکل نہیں بھولا۔'' غصے سے اس کے جبڑے بھینچ گئے۔

''ایک دم ٹاپ کلاس پیس بک کروایا ہے تمہارے لیے میں نے۔ یہاں پہلے کبھی نہیں آئی وہ۔'' اسامہ دائیں آنکھ میچ کے بولا۔

''آتشِ شوق اتنی بھی مت بڑھاؤ کہ وقت گزارنا مشکل ہونے لگے۔'' اس نے بھی جوابی شوخی دکھائی۔

وہ بدقت اٹھ کر کسلمندی دور کرنے کے لیے نہانے چل دیا۔ ٹھنڈے پانی کی پھوار نے دماغ پر چھائی تپش کو بہت سکون دیا۔ وہ ہلکا پھلکا ہو کر اندر چلا آیا اور فون چیک کرنے لگا۔ تحریم کے علاوہ دفتر سے بھی کئی مسڈ کالز موجود تھیں۔

''جہنم میں جاؤ سب۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے فون آف کر دیا۔

شام تک وہ اپنے اس فیصلہ پر بہت خوش اور مطمئن تھا لیکن جوں جوں وقت مزید گزرا' اس پر گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی۔ اپنی اس کیفیت پر اسے غصہ آنے لگا۔

''بزدل مت بنو شاہنواز اب! ان سب کے سامنے اپنا بھرم قائم رکھنا ہوگا۔'' اس نے خود کو ہی یاد دہانی کروائی۔

رات آٹھ بجے اسامہ کے فون پر کوئی کال آئی تو وہ یکدم چوکنا ہو گیا۔

''اپنی بائیک دو شاہنواز! ثمرین کو پک کرنے جانا ہے۔'' وہ عجلت میں بولا۔

اس نے خاموشی سے چابیاں اس کی طرف اچھال دیں۔

''تم سب بھی تیار رہو۔ شو شروع ہونے سے کافی دیر پہلے پہنچنا ہے وہاں۔ کھڑکی توڑ رش ہوگا آج۔ کمال کے ڈانس ہیں اس اسٹیج ڈراما میں۔'' وہ چٹخارے زدہ انداز میں سعد اور ایان سے کہتا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے بعد ثمرین اُس کے سامنے موجود تھی۔

ڈھیلے ڈھالے عبایہ میں ملبوس سلیقے سے اسکارف کا نقاب لیے وہ بادیُ النظر میں اب تک یہاں آنے والی لڑکیوں جیسی ہی لگ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ان جیسی بے باکی موجود نہ تھی۔ شاہنواز کا جسم سنسنانے لگا اور حلق میں کانٹے اُگ آئے۔

''اچھا جگر! ہم چلتے ہیں۔ انجوائے یور سیلف۔'' وہ کم د بیش ایک ہی بات دہراتے وہاں سے چل دیے۔

اب کمرے میں وہی دونوں موجود تھے۔ چند لمحے یوں ہی خاموشی سے بیت گئے۔ شاہنواز نے دھیرے سے گلا کھنکھارا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کھڑی کیوں ہیں؟ ایزی ہو کر بیٹھیے پلیز۔''

ثمرین کے وجود میں جنبش ہوئی اور وہ نیچے میٹرس پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھ گئی۔ چہرے سے نقاب ہٹ گیا تھا۔ اس کا حسن بلاخیز تھا۔ شاہنواز بھی اس سے ذرا فاصلے پر ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹ کر بیٹھ گیا۔ اسے سمجھ ہی نہ آ رہی تھی کہ وہ کس طرح اپنی بات کا آغاز کرے۔ وہ کن انکھیوں سے اس کے ملیح چہرے کو دیکھنے لگا۔ تبھی ثمرین کی آنکھوں میں در آنے والی نمی شدید آنسوؤں میں تبدیل ہو گئی۔

''کیا ہوا ثمرین؟ آپ رو کیوں رہی ہیں؟'' وہ بوکھلا گیا۔

''اپنے آپ سے نظریں نہیں ملا پا رہی میں۔'' وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب؟ کیا آپ اِس سے قبل کہیں......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''نہیں! میں پہلے کبھی ایسی ذلت سے نہیں گزری۔'' وہ اذیت سے اپنا سر دائیں بائیں جھٹکنے لگی۔

''تو آج ایسا کیوں؟''

''بدقسمتی لے آئی مجھے یہاں۔ ورنہ......'' اس کے آنسوؤں میں پھر سے شدت آئی۔

''اچھا آپ روئیں تو نہیں؟ مجھے بتائیں تو سہی! کس مجبوری نے آپ کو یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔'' وہ بھی پریشان ہو گیا۔

''کالج کے پچھلے سمسٹر میں والدہ کی وفات کے صدمے کے باعث میں اپنا جی۔ پی۔ اے برقرار نہیں رکھ سکی اس لیے اس سمسٹر میں فیس ادا کرنی پڑے گی۔ والد پہلے ہی وفات پا چکے ہیں۔ سمجھ ہی نہیں آیا کہ فیس کے لیے مٹھی بھر رقم کہاں سے لاؤں۔ لے دے کے ایک یہ جسم ہی میرے پاس موجود ہے جسے بیچ کر اپنا مستقبل محفوظ کرنے چلی آئی ہوں۔ اب آپ کے سامنے بیٹھ کر ایک خیال نے بے چین کر دیا ہے مجھے۔ اس حرام کاری سے حاصل کی گئی رقم سے پڑھائی اور جاب کیا میرے لیے حلال ہوں گی؟'' اس کی آواز میں اب بھی آنسوؤں کی نمی تھی۔ ''ادھار بھی مانگ کر دیکھا سب سے۔ لیکن کسی نے میری مدد نہ کی۔ الٹا اسامہ سے کہہ کر مجھے یہاں آنے پر مجبور کر دیا گیا۔''

شاہنواز پورے وجود سے کانپ گیا۔ وہ اپنے فیصلے پر پہلے ہی بہت بے چینی کا شکار تھا اور اب ثمرین کی حالت دیکھ کر اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور پردے کی اوٹ میں موجود اپنے بیگ سے پیسے نکال لایا۔

''یہ رکھ لو ثمرین۔ اور اٹھو میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں گھر۔''

''یہ مہربانی کس لیے شاہنواز؟ اپنا حق تو وصول لیجیے پہلے۔'' وہ زخمی لہجے میں کہتی اپنا اسکارف اتارنے لگی۔

''نہیں...... اس کی کوئی ضرورت نہیں مجھے......'' وہ اذیت سے اپنے ہونٹ چبانے لگا اور پھر والٹ میں موجود باقی پیسے بھی نکال کر اسے تھما دیے۔ ''میں آپ کی زندگی برباد نہیں کروں گا...... یہ فیس کے پیسے رکھ لیجیے... اور آئندہ بھی کبھی ضرورت پیش آئے تو بلا جھجک مجھے یاد کر لینا۔''

ثمرین نے کانپتے ہاتھوں اور برستی آنکھوں سے وہ رقم تھام لی اور اس کا ہاتھ تھامے بولی۔

''تھینک یو شاہنواز! تھینک یو سو مچ۔ آپ واقعی میری کسی نیکی یا میری والدہ کی کسی دعا کا اجر ہیں۔''

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اُسے بائیک پر گوالمنڈی کے ایک تنگ و تاریک علاقے میں چھوڑ آیا اور اپنا موبائل نمبر بھی اسے دے دیا۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتے نہ تھک رہی تھی۔

اگلے دو گھنٹے اس نے وہیں گھوم پھر کر گزارے۔ فوڈ اسٹریٹ میں کھانا کھا کر وہ گھر لوٹ آیا۔ متوقع گناہ سے بچاؤ اور ایک مظلوم کی مدد نے اس پر خوشی و سرشاری کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ سعد، ایان اور اسامہ بھی واپس آ چکے تھے اور اب شدت سے اس کی واپسی کے منتظر تھے۔

''کیا حال ہیں شہزادے؟ بہت خوش لگ رہے ہو؟'' اسامہ نے ٹہوکا دیا۔

''ہاں یار! بہت خوش ہوں میں۔ بہت شکریہ تیرا!'' وہ دل سے مسکرایا۔

ایان اور سعد بھی اس کی اس تبدیلی پر ذومعنی لقمے دینے لگے۔ شاہنواز اپنے بھرم پر بہت پُرسکون تھا۔

اگلے روز صبح اس نے اپنا موبائل آن کیا تو تحریم کے نمبر سے بہت سے میسج موجود تھے۔ اس نے بددلی سے کال بیک کی تو شمروز نے فون اٹھایا۔

''تمہارے پاس کیا کر رہا ہے تحریم کا موبائل؟'' وہ حیران ہوا۔

''بھابی کا فون تو پچھلے کئی ہفتوں سے میرے پاس ہے بھائی! میرا موبائل خراب تھا اور اپنی آئی ڈی کا پاسورڈ بھی بھول گیا ہوا تھا۔ اس لیے بھابی کی آئی ڈی استعمال کرتا رہا۔'' وہ جلدی سے وضاحت دیتے بولا۔

شاہنواز کے ذہن پر چھائے شکوک کے بادل یکدم چھٹ گئے اور اس اوٹ سے بیوی کی محبت و چاہت کے سورج نے اپنی کرنیں بکھیرنی شروع کر دیں۔

''اچھا اب میسج کون کر رہا تھا مجھے؟ تم یا تحریم؟''

''میں ہی کر رہا تھا بھائی...... تائی جان کی طبیعت بہت خراب ہے دو دن سے۔ تایا جان کہہ رہے ہیں آپ فوری پہنچیں یہاں۔''

''اوہ...... اچھا! میں ابھی نکلتا ہوں یہاں سے۔'' وہ پریشان ہو گیا۔

اپنا سامان سمیٹے وہ ان تینوں کو ماں کی طبیعت کا بتاتے ہوئے عجلت میں وہاں سے نکل آیا۔ سارا رستہ وہ دل میں قرآنی آیات کا وِرد کرتا ماں کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگتا رہا۔ گھر پہنچتے ہی وہ خشک ہوتے حلق سے ان کے کمرے کی طرف لپکا۔ لیکن انہیں سامنے بستر پر بالکل تازہ دم حالت میں موجود پا کر حیران ہونا بھی بھول گیا۔

''یہ کیا مذاق تھا میرے ساتھ؟ میری جان آدھی رہ گئی تھی۔ کہاں ہے یہ شمروز؟'' وہ غصّے سے بولا۔
''میرے کہنے پر کیا تھا اس نے ایسا میرے لعل!'' نزہت نے مسکرا کر کہا اور بستر سے اٹھ کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ ''بہت بہت مبارک ہو میرے چاند! اللہ پاک نے بہت کرم کیا ہے اپنا۔ بہو امید سے ہے۔''
شاہنواز پل بھر میں ہی مسرتوں سے نہال ہو گیا اور ماں کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ والد و چچا کو بھی اس کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ بھی گلے لگائے اسے مبارک دینے لگے۔
''اب چھوڑ دو پردیس کی وہ نوکری بیٹا! بہو کو اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تمہاری ہے۔ تم نے اپنی صلاحیتیں منوانے کی ضد پوری کر لی۔ اب میری بات ماننی ہو گی۔ میں نے اپنے محکمے میں تمہارے ذوق اور قابلیت کے شایانِ شان نوکری کا انتظام کر دیا ہے۔ اب یہیں رہو اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرو۔'' یوسف پرویز نے متانت سے کہا۔
شاہنواز کو اپنے تمام مسائل پل بھر میں ختم ہوتے محسوس ہونے لگے۔ والد کی اس پیشکش کو ٹھکرانے کی حماقت وہ اب کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے سعادتمندی سے بولا۔
''جی ابا جان! جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہو گا۔''
''جیتے رہو! اللہ پاک تم جیسی فرمانبردار اولاد سبھی کو دے۔'' چچا نے مسکرا کر کہا۔
''جاؤ اب بہو منتظر ہو گی تمہاری۔'' نزہت نے اس کی بلائیں لیں۔
وہ جوش اور خوشی دباتا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھولتے ہی شمروز کی آواز اس کے کان میں پڑی۔
''اپنا وعدہ یاد رکھیے گا بھائی!''
''کس وعدے کی بات ہو رہی ہے بھئی؟'' شاہنواز نے شوخی سے کہا۔
''بھابی نے مجھے کل اس خوش خبری کے بعد نیا فون دلانے کا وعدہ کیا تھا بھائی...... وہی یاد کروا رہا تھا۔'' شمروز مسکرایا۔
''لو بھئی! ابھی تمہاری یہ خواہش پوری کیے دیتے ہیں۔'' شاہنواز نے اپنے ایک ماہ پرانے آئی فون سے سم نکالتے ہوئے اسے تھما دیا۔ وہ بہت خوش ہو گیا اور شکریہ ادا کرتا کمرے سے چلا گیا۔
''آ گئی آپ کو میری یاد؟'' تنہائی ملتے ہی تحریم نے نخرے دکھانے شروع کر دیے۔
''اب کوئی بحث اور جھگڑا نہیں تحریم! اب تو میں آ گیا ہوں ناں تمہارے پاس...... اب کیسے گلے شکوے؟'' وہ اس کے پاس ہی بستر پر بیٹھ گیا تو وہ بھی مسکراتی ہوئی اس کے بازو پر سر رکھے نیم دراز ہو گئی۔
''اب مجھ سے کبھی دور مت جایئے گا شاہی!''
''جو حکم ملکہ عالیہ!'' اس نے آسودگی سے کہا۔
تحریم نے بھی طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔ اس کے ذہن پر چند لمحوں پہلے شمروز سے ہونے والی گفتگو تازہ ہو گئی۔
شاہنواز کی بے رخی، دوری اور اپنی خواہشات مسلسل رد ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں کب انتقامی جذبات پروان چڑھے، خود اسے بھی اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی وہ سوشل میڈیا کے مختلف گروپس میں دکھی شاعری پوسٹ کرتی رہتی۔ وہیں اس کی ملاقات عمیر سے ہوئی۔ دونوں بہت تیزی سے قریب آئے۔ رات بھر وہ چیٹنگ میں ایک دوسرے کو اپنا احوال سناتے۔ تحریم اس نئی مصروفیت سے بے پناہ خوش تھی۔
عمیر کا تعلق کراچی سے تھا۔ چند دن بعد ہی وہ اس سے ویڈیو کالز اور اخلاق باختگی کے مطالبات کرنے لگا۔ تحریم کو اس غلطی کے مضمرات کا اندازہ ہوا تو وہ بوکھلا گئی۔ عمیر کے مطالبات کی تکمیل اس کے بس میں بالکل بھی نہ تھی۔ دو روز قبل اس 'خوشخبری' کے بعد اس نے یہ کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ عمیر کو بلاک کرنے کے بعد اس نے اپنی آئی ڈی بھی بند کر دی۔ شاہنواز کو مطمئن کرنے کا مرحلہ اب بھی باقی تھا اور اس کے لیے اس نے شمروز کو مہرہ بنایا۔
انیس سالہ شمروز اس کی ایک کزن میں کافی دلچسپی لیتا تھا۔ اس کے انہی جذبات کا استحصال کرتے ہوئے اس نے ایک نیا پلان ترتیب دے لیا جس کے مطابق شمروز کو اپنا فون خراب ہونے اور تحریم کا فون استعمال کرنے کا ڈراما رچانا تھا۔ اسے اپنی اور شاہنواز کی لڑائی کے کچھ جھوٹے سچے قصے سنا کر وہ پہلے ہی مطمئن کر چکی تھی۔
اس کی یہ گیم مکمل کامیاب رہی۔ شاہنواز کے شکوک ختم ہو گئے اور وہ ہمیشہ کے لیے اس کے پاس چلا آیا تھا۔ وہ دل میں شکرانہ ادا کرتی ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔
''شکر خدایا! میرا بھرم قائم رہ گیا۔ اب اس رستے کی مسافت میں کبھی بھی اختیار نہیں کروں گی۔'' اس نے شوہر کا ہاتھ تھام کر اپنے چہرے پر رکھ لیا۔

شاہنواز اُس کے چہرے کو محبت سے دیکھتا گزشتہ رات پھر انہی لمحات میں پہنچ گیا جب ایک گلابی، متورم چہرے کو دیکھ کر اس کا ایمان پل بھر کے لیے ڈگمگایا ضرور تھا لیکن ثمرین کی باتوں کے تازیانے سے اس کا نیم خوابیدہ ضمیر فوری جاگزیں ہوا تھا۔

''میری زندگی کا یہ نیا رخ، مسرتیں اور تمام مسائل کا چٹکی بجاتے حل صرف تمہاری ہی دعاؤں کا نتیجہ ہے ثمرین!'' وہ تصور میں اس سے مخاطب ہوا۔ ''میری دل سے دعا ہے کہ تمہاری پاکیزگی صدا یونہی سلامت رہے اور تم ہمیشہ خوش و کامیاب رہو۔ مجھے یقین ہے تم بھی مجھے ہمیشہ یونہی دعاؤں میں یاد رکھو گی۔''

وہ گہری سانس لیتا اب اپنے دفتر میں آن لائن استعفا بھجوانے کی حکمتِ عملی ترتیب دے رہا تھا۔ فوری مستعفی ہونے سے اسے تھوڑا نقصان تو برداشت کرنا پڑتا لیکن ان خوشیوں کے صدقے اب اسے اس نقصان کی کوئی پروا نہ تھی۔ کرائے کے اس گھر میں صرف چند جوڑے کپڑے اور جوتے ہی موجود تھے۔ اس نے ان سے بھی دستبرداری کا فیصلہ کرلیا۔

خوابوں کا شہر پل بھر میں ماضی کا حصہ بن گیا۔

☆☆☆

اس کمرے میں بے ترتیبی نمایاں تھی۔

دو لڑکیاں بستر پر نیم دراز موبائل میں مصروف تھیں جبکہ تیسری آئینے کے سامنے کھڑی اپنے حسین چہرے کو میک اَپ سے نکھارنے میں مگن تھی۔ اس کے بستر پر رنگ برنگے کپڑے اور میک اپ کا سامان بکھرا تھا۔ ایک کونے میں اس کا عبایا اور اسکارف موجود تھے۔

اسی پل کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک سانولی رنگت کی قدرے طویل قامت لڑکی اندر داخل ہوئی۔

''کیا حال ہے مہک کا اب؟'' بستر پر لیٹی حفصہ نے نظریں اسکرین سے ہٹائے بغیر اس سے پوچھا۔

''ابھی بھی نیم غشی میں ہے یار! بہت برا حال ہوا ہے اس کا۔ بہت شدید زخم آئے ہیں اُسے۔'' نو وارد مریم نے تاسف سے سر جھٹکا اور آئینے کے سامنے کھڑی لڑکی سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''تم پھر تیار ہو رہی ہو ثمرین! ابھی کل تو ٹرپ بھگتا کر آئی ہو ایک۔''

''اسی کی ہمت ہے بھئی! ہم تو ایک ٹرپ کے بعد ہفتوں کہیں جانے کے قابل نہیں رہتے۔'' عاشی نے طنزیہ کہا۔ ''مہک کا حال بھی تم لوگوں کے سامنے ہے۔ پتا نہیں کس وحشی کے ہتھے چڑھ گئی تھی بے چاری۔'' اس نے جھرجھری لی۔

''اپنی اپنی قسمت کی بات ہے بھئی یہ تو! اور میری اچھی قسمت میں ذہانت کا عمل دخل بھی شامل ہے۔'' وہ ایک ادا سے اپنے تراشیدہ بال جھٹک کر بولی۔

''تیرا بھی خوب ہے ثمی! میں تو تیرے یہ کرتب آج تک نہیں سمجھ سکی۔'' حفصہ جل کر بولی۔

''ثمی کو سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔'' اس نے فلمی انداز اپنایا۔ ''میں ایک سیدھے سادے فارمولے پر عمل کرتی ہوں بس...... کامیابی خود بخود میرے قدموں میں آگرتی ہے۔''

''کیسا فارمولا؟'' مریم بھی متجسس ہوئی۔

''بھانت بھانت کے مردوں کے ساتھ وقت گزار کر میں ان کی رمز شناس ہو چکی ہوں۔ شریف مرد لڑکی کو عزت اور نرم نگاہوں سے دیکھتے بڑی تہذیب سے بیٹھنے کی پیشکش کرتا ہے اسے۔ آپ جناب، جیسے الفاظ سے مخاطب ہوتا ہے جبکہ دوسری قسم کے مرد کی نگاہوں میں بھوک نمایاں ہوتی ہے اور وہ پہلا مطالبہ عبایا ایک جانب رکھنے کا کرتا ہے۔'' وہ متانت سے بولی۔

''اچھا......تو پھر اس کے بعد؟'' عاشی نے پوچھا۔

''پھر اس کے بعد میری اداکاری کے جوہر آزمانے کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی جھوٹی سچی جذبات سے لبریز کہانی سنا کر میں انہیں اپنے دام میں لے آتی ہوں اور وہ مجھے چھوئے بغیر اپنی جیبیں خالی کر دیتے ہیں...... اب کل رات کا شکار ہی دیکھ لو۔ دو منٹ میں پھڑک کر میرے قدموں میں آگرا تھا۔ بیس ہزار اس نے مجھے یونہی تھما دیے اور اس کے بعد اپنا نمبر بھی دے دیا کہ آئندہ بھی اسے ہی مدد کے لیے پکاروں۔'' ہنسی اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کے گوشوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ''سوچ رہی ہوں دو، چار دفعہ اس کا خزانہ خالی کروا ہی لوں۔'' وہ اب اپنا عبایا پہننے لگی تھی۔

''بہت خوب میڈم! اور اگر کوئی 'ڈاڈھا' مل جائے تو؟'' مریم نے معنی خیزی سے کہا۔

''تو کیا ہوا یار! یہ جو میری کمائی ہے اسے 'حلال' بھی تو کرنا ہوتا ہے۔ مہینے میں ایک دو بار ہو جایا کرتی ہے 'حلال' یہ۔'' اس نے بڑے معصوم لہجے میں کہا۔

کمرے میں گونجنے والے قہقہے بے ساختہ تھے۔

پسِ آئینہ

محمد فاروق انجم

حساس طبیعت اور سوچنے والا دماغ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا... مگر اپنی دانست میں ایسے خوش فہم بھی ہوتے ہیں جو اپنی سوچوں اور خیالات کو ترتیب دے کر بہترین منصوبہ ساز سمجھنے لگتے ہیں... مگر قانون کے رکھوالوں میں چند ایک ایسے جانشین بھی موجود ہیں جو بال کی کھال کا پیچھا ضرور کرتے ہیں... ان کی خوبیاں اور صلاحیتیں قانون کے وسیع تر دائروں میں شک و شبہات کی ایسی ایسی لکیریں کھوج لیتی ہیں... جو انتہائی باریکی سے کھینچی گئی ہوتی ہیں۔ قتل کی ایک ایسی واردات سے شروع ہونے والی سنسنی خیز کہانی... ناقص منصوبہ بندی نے واردات کے تمام زاویوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا تھا...

لالچ ہوس کے ہتھیاروں سے قتل ہونے والے

خونی رشتوں کا انجام سرورق کا تیکھا رنگ

شاندار گھر کے بڑے سے آہنی گیٹ کے پاس چوکیدار منظور خان بیٹھا اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر گھر کے پالتو تین کتے آپس میں مستی کر رہے تھے، ہلکی ہلکی ہوا میں لان میں لگے پھولوں کی خوشبو شامل ہو کر فضا کو مسحور کن بنا رہی تھی کہ اچانک گھر کے اوپر کے کمرے کی کھڑکی ایک دھماکے سے کھلی اور گھر کے مالک سیٹھ حاکم کو کسی نے اٹھا کر پوری قوت سے نیچے پھینک دیا۔ ایک دھما کا ہوا اور چوکیدار نے چونک کر پہلے سیٹھ حاکم

کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نگاہ اوپر کھڑکی کی طرف چلی گئی وہاں کوئی کھڑا تھا۔ چوکیدار جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھا اور سیٹھ حاکم کی لاش کی طرف بھاگا۔ سیٹھ حاکم کی لاش کو دیکھ کر چوکیدار نے اپنی بندوق سیدھی کی اور مین دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

پوش علاقے میں بڑے بڑے اور خوبصورت گھر تھے۔ ان گھروں میں ایک گھر سب سے منفرد اور بڑا تھا۔ وہ گھر کئی کنال پر محیط تھا۔

گھر میں داخل ہونے کے لیے ایک بڑا اور آہنی گیٹ تھا۔ گیٹ کے ساتھ اندر ایک چھوٹا کیبن تھا اور اس کیبن میں چاق و چوبند چوکیدار منظور خان کبھی براجمان اور کبھی باہر نکل کر ٹہل رہا ہوتا تھا۔ وہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی صحت مند دکھائی دیتا تھا اور اس کی بڑی بڑی مونچھیں کسی پر بھی رعب ڈالنے کے لیے بہت تھیں۔ اس کے پاس جدید اسلحہ تھا جسے چلانے میں اسے باقاعدہ مہارت تھی۔ وہ پچیس سال سے اپنے مالک سیٹھ حاکم کے ساتھ وفاداری نبھا رہا تھا۔

گیٹ سے آگے پورچ تک چمکتی ٹائلوں کی سڑک تھی۔ پھر وسیع پورچ آتا تھا جہاں ہر وقت ایک، یا دو گاڑیاں کھڑی دکھائی دیتی تھیں۔ پورچ سے آگے گھر کے اندر جانے کے لیے لکڑی کا مین دروازہ تھا جس پر بہت خوبصورت نقش و نگار بنے تھے۔

گھر کے گیٹ کے دائیں جانب سوئمنگ پول تھا جس کے نیلے پانی میں آسمان جھانکتا رہتا تھا۔

چار دیواری کے درمیان میں وہ گھر ایستادہ تھا اور اس کے دائیں، بائیں اور عقب میں کشادہ خالی جگہ تھی اور اس جگہ نے خوبصورت ہری گھاس کی چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ اس چادر کے اوپر اس گھر کے پالتو وفادار کتّے ہر وقت گھومتے رہتے تھے۔

وہ کتّے گھر کے مالک سیٹھ حاکم کو بہت پیارے تھے۔ وہ اپنے کتّوں کی ایک ایک چیز کا خیال رکھتا تھا اور کتے بھی ایسے تھے کہ اپنے مالک کا ایک اشارہ سمجھنے میں دیر نہیں لگاتے تھے۔

سیٹھ حاکم کی عمر ستر اور پچھتر سال کے بیچ میں تھی۔ اب وہ جسمانی طور پر کمزور ہو چکا تھا لیکن پھر بھی وہ بغیر کسی سہارے کے چلتا تھا۔ صبح اور شام کو اپنے گھر کی چار دیواری کے گرد وہ خراماں خراماں اس وقت تک چکر لگاتا جب تک وہ تھک نہیں جاتا یا اس کی ہمت جواب نہیں دے دیتی تھی۔

سیٹھ حاکم جب تھک جاتا تو وہ سوئمنگ پول کے پاس بیٹھ کر اپنے کتّوں کو پیار کرتا اور ان کے ساتھ کھیلتا تھا۔ کتّے اپنے مالک کے ساتھ مستیاں کرتے تھے۔

سیٹھ حاکم کا کمرا اوپر کی منزل پر تھا جس کی کھڑکیوں کا رخ گیٹ کی جانب تھا اور بالکونی کا دروازہ بھی اسی طرف کھلتا تھا۔ اکثر سیٹھ حاکم بالکونی میں رکھی کرسی پر بیٹھ کر اخبار، یا کوئی کتاب پڑھتا تھا اور دائیں بائیں اپنی نظریں بھی گھماتا رہتا تھا۔ جب بارش ہو رہی ہوتی تھی تو سیٹھ حاکم بارش سے لطف اندوز ہونے کے لیے خاص طور پر بالکونی میں پڑی کرسی پر براجمان ہو جاتا اور ملازم سے کافی یا پھر چائے کا کپ بھی منگوا لیتا تھا۔

سیٹھ حاکم نے ساری زندگی پیسہ کمایا تھا۔ جب وہ بوڑھا ہو گیا تو اس نے اپنا کاروبار بیٹے کے سپرد کر دیا لیکن اچانک اس کا بیٹا دل کے دورے سے انتقال کر گیا۔ اس کے بعد کاروبار کی تمام ذمّے داری سیٹھ حاکم کے پوتے ظفر خلیل کے ہاتھ آ گئی۔

ظفر کی عمر بتیس سال تھی۔ اس نے بزنس کی ڈگری لی تھی اور وہ بہت سمجھدار اور اپنے کام میں بہت سنجیدہ تھا۔ اس کی ایک چھوٹی بہن ندا خلیل تھی جس نے ایک ماہ قبل بی ایس سی کا امتحان دیا تھا اور ابھی فی الحال فارغ تھی۔

ندا خوبصورت اور پُرکشش جسم کی مالک تھی۔ وہ بہت جلد دوسروں سے متاثر ہو جاتی تھی اور اس کی رائے بھی اتنی ہی جلدی بدل جاتی تھی۔ ندا کی ماں اسے اکثر کہتی تھیں کہ وہ مستقل مزاج بن کر جینا سیکھے مگر ندا غصے کی تیز تھی اور اس کے جو منہ میں آتا بنا سوچے سمجھے بول دیتی۔

اپنے شوہر کی وفات کے بعد ندا کی ماں گھر کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ انہیں لگتا تھا کہ شوہر کی وفات نے جیسے ان کی زندگی کا ہر رنگ ختم کر دیا ہو۔ ان کا چہرہ اداسی میں ڈوبا رہتا وہ اندر ہی اندر سمندر کی طرح اپنے ہی کناروں سے ٹکراتی رہتی تھیں۔

سیٹھ حاکم اپنی تمام ذمّے داریوں سے سبکدوش ضرور ہو گیا تھا لیکن وہ کاروبار کی ایک ایک رپورٹ اپنے پوتے ظفر اور کمپنی کے اسٹاف سے لیتا تھا۔ روزانہ لین دین کی رپورٹ سیٹھ حاکم کو میل ہوتی تھی۔ یوں کہہ لیں کہ سیٹھ حاکم گھر میں بیٹھ ضرور گیا تھا لیکن کاروبار پر اس وقت بھی اس کی گہری نظر تھی۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی بڑا فیصلہ بھی نہیں ہوتا تھا جس کی وجہ سے بعض اوقات ظفر اکتا کر اپنی ماں سے شکوہ کرتا تھا۔ جبکہ ندا کو اپنے دادا سے یہ شکایت تھی کہ وہ

اب بھی اس کی ذاتی زندگی میں اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظفر اور ندا کی ماں اپنی اولاد کے شکوے اور شکایت سنتی تھیں لیکن اپنے دل کی وہ کسی کو نہیں کہہ پاتی تھیں کہ انہیں سیٹھ حاکم سے کیا شکایات ہیں۔ زندگی اسی طرح گزر رہی تھی۔

سیٹھ حاکم کا وہ گھر جو پورے علاقے میں تعریفی نظروں سے دیکھا جاتا تھا، اس وقت اس گھر کے باہر کئی پولیس گاڑیاں موجود تھیں، گھر کی چاردیواری کے گرد پولیس اہلکار مستعد گھوم رہے تھے، پورے علاقے میں دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ گھر کا بڑا آہنی گیٹ بند تھا اور گیٹ کے پاس بھی پولیس کھڑی تھی۔ اندر بھی پولیس اہلکار موجود تھے، کیونکہ سامنے فرش پر سیٹھ حاکم کی ٹیڑھی لاش پڑی تھی۔ اس کی گردن عجیب انداز سے مڑی ہوئی تھی۔ سیٹھ حاکم کو اس کے کمرے کی کھڑکی سے نیچے پھینکا گیا تھا۔ نیچے گرتے ہی سیٹھ حاکم کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ جب یہ واقعہ رونما ہوا اس وقت ندا کی ماں اپنے کمرے میں تھیں، ندا لاؤنج میں موجود تھی اور چوکیدار حسبِ معمول گیٹ پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔

☆☆☆

سیٹھ حاکم کے گھر کا گہری نظروں سے جائزہ لیتا ہوا وہ آدمی جس کی شخصیت سحر انگیز، جسم مضبوط اور چہرے پر گہری متانت تھی، اس کا نام انسپکٹر اورنگزیب تھا۔ سیٹھ حاکم کا گھر اس کے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ ایمرجنسی پولیس کو سیٹھ حاکم کی پوتی ندا نے گھبرائی اور روتی ہوئی آواز میں اطلاع دی تھی۔

''میرے دادا سیٹھ حاکم کو اُن کے کمرے سے نیچے پھینک کر جان سے مار دیا ہے...... پلیز جلدی آجائیے...... وہ قاتل ابھی ہمارے گھر میں ہی ہے......''

اس کے بعد ندا سے اس کے گھر کا پتا پوچھا گیا اور پھر پولیس نے وہاں آنے میں دیر نہیں لگائی۔ جس سرعت سے پولیس آئی تھی، اس پر چوکیدار منظور خان بھی حیران رہ گیا تھا۔

چوکیدار نے پولیس کی آمد پر گیٹ کھولا اور پولیس جوان اندر چلے گئے۔ بیس منٹ کے اندر اندر اور پولیس بھی وہاں پہنچ گئی۔ کیونکہ ظفر کو بھی اطلاع ہوچکی تھی اور وہ اس وقت اپنے آفس میں تھا۔

انسپکٹر نے سب سے پہلے اردگرد کا جائزہ لیا۔ پھر وہ لاش کے پاس چلا گیا اور اسے غور سے دیکھا۔ اس کے بعد انسپکٹر نے سیٹھ حاکم کے کمرے کی اس کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سے اسے نیچے پھینکا گیا تھا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ وہ کمرا کم از کم سولہ فٹ کی بلندی پر تھا۔ سیٹھ حاکم کو جس نے بھی نیچے پھینکا تھا، اس نے اس انداز میں پھینکا تھا کہ اس کی گردن نیچے کی طرف تھی اس لیے وہ گردن کے بل فرش پر گرا تھا اور موقع پر ہی گردن تڑوا کر جان کی بازی ہار گیا تھا۔

سیٹھ حاکم کی لاش کے کپڑوں پر سے فنگر پرنٹ لیے جارہے تھے۔ جب اس کام سے فارغ ہوگئے تو اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی۔ گھر کے اندر اور باہر جانے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ صرف ظفر ہی اندر آسکا تھا۔

انسپکٹر نے اشارے سے منظور خان کو اپنے پاس بلایا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' ظفر بھی پاس ہی کھڑا تھا۔

''میرا نام منظور خان ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کب سے ہو یہاں؟'' انسپکٹر نے اگلا سوال کیا۔

''مجھے پچیس سال ہوگئے ہیں ان کے ساتھ وفاداری کرتے ہوئے۔'' منظور خان نے جواب دیا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور آواز میں مالک کی موت کا دکھ تھا۔

انسپکٹر نے اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''اب مجھے ایک ایک لفظ یاد کرکے بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا۔ مجھے وہ سب بتانا جو تم نے دیکھا ہے۔ شک کی بنیاد پر کوئی بات مت کرنا۔''

''صاحب میں وہی بتاؤں گا جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ سارا واقعہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔'' منظور خان نے کہا۔

''ٹھیک ہے بتانا شروع کرو۔'' انسپکٹر نے کہہ کر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور توجہ اس کے چہرے پر مرکوز کردی۔ ظفر بھی سننے کے لیے متوجہ تھا۔

منظور خان نے اپنی بات کا آغاز گیٹ کی طرف اشارہ کرنے سے کیا۔

''میں وہاں گیٹ کے پاس بیٹھا تھا۔ تین بجے کا وقت تھا۔ اچانک باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ میں نے چھوٹی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا تو بڑے سیٹھ صاحب کی کار تھی اور ڈرائیونگ سیٹ پر احمر صاحب بیٹھے تھے۔''

''احمر صاحب کون؟'' انسپکٹر نے یہ سوال ظفر کی طرف چہرہ پھیر کر کیا۔

''احمر ہمارے آفس میں کام کرتا ہے اور وہ دادا جی کے بہت قریب ہے۔'' ظفر نے جواب دیا۔

''قریب سے مراد...... ؟'' انسپکٹر نے وضاحت چاہی۔

''دادا جی کو احمر پر بہت اعتماد تھا اس لیے وہ اپنے ذاتی کام بھی ان سے کرواتے تھے۔ جیسے اپنے لیے کوئی خریداری کروانی ہو تو وہ احمر سے کہہ دیتے تھے، ڈاکٹر کے پاس جانا ہوتا تو وہ احمر کو ساتھ لے جاتے تھے اور اگر ان کی گاڑی میں کوئی مسئلہ ہوتا تھا، یا گاڑی کی ٹیوننگ کروانی ہوتی تھی تو وہ احمر سے ہی کہتے تھے، وہ فارغ اوقات میں اس کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھ کر شطرنج بھی کھیلتے تھے۔'' ظفر نے وضاحت کی۔

''اچھا اب تم اسی جگہ سے بات شروع کرو جہاں سے چھوڑی تھی۔'' انسپکٹر نے ایک بار پھر منظور خان کی طرف توجہ مبذول کی۔

''میں نے احمر صاحب کو دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ کیونکہ اس گھر کے افراد کے علاوہ باہر کے لوگوں میں سے ایک احمر صاحب ہی تھے جو کسی بھی وقت بغیر روک ٹوک کے اس گھر میں آسکتے تھے۔ یہ بڑے سیٹھ صاحب کا حکم تھا۔ احمر صاحب گاڑی اندر لے کر آئے، میں نے اسی وقت گیٹ بند کر دیا۔ احمر صاحب نے گاڑی سامنے کھڑی کی اور واپس میرے پاس آکر بولے، میں نے گاڑی کی ٹیوننگ کرا دی ہے۔ مجھے جانے کی جلدی ہے، میں جا رہا ہوں تم سیٹھ صاحب کو بتا دینا۔ ابھی وہ مجھے یہ کہہ ہی رہے تھے کہ سیٹھ صاحب نے بالکونی سے احمر صاحب کو اپنے کمرے میں آنے کے لیے کہا۔ سیٹھ صاحب کے لہجے میں غصہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں احمر صاحب سے کوئی شکایت ہو۔ میں نے اس سے پہلے کبھی سیٹھ صاحب کو احمر صاحب کے ساتھ اس لہجے میں بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، سیٹھ صاحب کا لہجہ بگڑا ہوا تھا۔''

منظور خان ایک لمحے کو چپ ہوا تو انسپکٹر نے کہا۔

''بولتے رہو اور اپنی بات مکمل کرو۔''

منظور خان نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''احمر صاحب اندر چلے گئے اور پندرہ منٹ کے بعد واپس آئے تو ان کا چہرہ غصے میں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی الجھن میں ہوں۔ انہوں نے مجھ سے آتے ہی پوچھا کہ لوہے کی سیڑھی کہاں ہے۔ میں نے .... اسٹور کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ اس جانب گئے اور اندر سے لوہے کی سیڑھی اُٹھا کر گھر کے پیچھے چلے گئے۔ میں حیران سب دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد احمر صاحب آئے تو وہ خالی ہاتھ تھے اور سیڑھی وہ پیچھے ہی چھوڑ آئے تھے۔ اس کے بعد وہ گھر کے اندر چلے گئے۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ سیٹھ صاحب کے کمرے کی کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے اور اندر سے مجھے کچھ آوازیں آنے لگیں، پھر اُن کے کمرے میں کچھ گرا۔ میں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ اچانک ہی وہ خوفناک منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ احمر صاحب نے بڑے سیٹھ صاحب کو اپنے دونوں بازوؤں سے اُٹھایا ہوا تھا پھر انہوں نے پوری قوت سے انہیں باہر پھینک دیا۔ وہ سر کے بل تیزی سے نیچے آئے ایک دھما کا سا ہوا اور وہ اسی جگہ ساکت ہو گئے۔ میں تیزی سے ان کی طرف بھاگا۔ وہ مر چکے تھے۔ میں نے اپنی بندوق سیدھی کی اور گھر کے اندر بھاگا، میں ابھی اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف گیا ہی تھا کہ مجھے چھوٹی بی بی کی آواز سنائی دی۔''

''چھوٹی بی بی کون؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''میری چھوٹی بہن ندا کی بات کر رہا ہے۔'' ظفر نے بتایا۔

''چھوٹی بی بی میرے پیچھے کھڑی تھیں اور اُن کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''منظور بابا کیا ہوا؟''

میں نے فوراً جواب دیا۔ ''احمر صاحب نے بڑے سیٹھ صاحب کو اوپر سے نیچے پھینک دیا ہے۔''

''چھوٹی بی بی چیخ کر بولیں۔ کیا...... ؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟''

میں نے کہا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اُن کی لاش باہر پڑی ہے اور احمر صاحب ابھی اُن کے کمرے میں ہی ہیں۔''

''میری بات سن کر فوراً چھوٹی بی بی نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''احمر تو اس دروازے سے باہر جا چکا ہے۔''

''اس دوران بڑی بی بی صاحبہ بھی آچکی تھیں اور انہوں نے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔'' منظور خان کی نگاہیں انسپکٹر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''بڑی بی بی صاحبہ کون؟'' انسپکٹر نے جاننا چاہا۔

''میری امی کے بارے میں کہہ رہا ہے۔'' ظفر نے بتایا۔

''پھر کیا ہوا؟'' انسپکٹر ایک بار پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

چوکیدار منظور خان بولا۔ ''چھوٹی بی بی کی بات سنتے ہی میں واپس پلٹا اور اس دروازے کی طرف دوڑا جو گھر کے

عقب کی طرف کھلتا تھا۔ میں بھاگتا ہوا دروازے کے پاس پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا سامنے دیوار پر وہ سیڑھی لگی ہوئی تھی جو احمر صاحب اسٹور سے اُٹھا کر لائے تھے۔ دیوار کے اوپر لگی خاردار تار بھی کاٹی ہوئی تھی، اس کا مطلب تھا کہ وہ اس جگہ سے فرار ہوگیا ہے۔''

''وہ پیچھے سے اس طرح کیوں بھاگا۔ وہ عقبی دروازے سے نکل کر گھوم کر پھر گیٹ کے پاس آسکتا تھا کیونکہ اس واقعے کے بعد تم گیٹ پر موجود نہیں تھے۔'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''بڑے سیٹھ صاحب کا حکم تھا کہ میں گیٹ کو تالا لگا کر رکھا کروں۔ یہ بات احمر صاحب کے علم میں تھی کہ وہ واپس گیٹ کے پاس آکر باہر نہیں جاسکتا۔ اس لیے پہلے انہوں نے اپنے باہر جانے کا انتظام کیا اور پھر وہ اپنا کام کرنے کے بعد اس طرف سے بھاگ گئے۔'' منظور خان بولا۔

''احمر نے ایسا کیوں کیا؟ کوئی وجہ آپ کی سمجھ میں آتی ہے؟'' انسپکٹر نے ظفر سے پوچھا۔

''اگر اجازت ہو تو میں اس سوال کا جواب دوں صاحب۔'' منظور خان نے ظفر کے بولنے سے قبل زبان کھولی۔

''ہاں بولو۔'' انسپکٹر اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''چند دن پہلے احمر صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ وہ اکتائے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے......'' منظور خان بولتے بولتے رک گیا اور ظفر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بات کرتے ہوئے کچھ ہچکچا رہا تھا۔

''کیا کہا تھا...... بولو۔'' ظفر نے کہا۔

''معاف کیجیے گا چھوٹے سیٹھ جی میں ان کے ہی الفاظ دہرانے لگا ہوں۔'' منظور خان کے چہرے پر ہلکا سا خوف عیاں تھا۔

''بول دو...... جو اُس نے کہا تھا وہ بول دو۔'' ظفر نے اجازت دی تو منظور خان نے کہا۔

''احمر صاحب نے کہا تھا کہ میں اس بوڑھے کے کاموں سے تنگ آگیا ہوں۔ مجھے تنخواہ دفتر کے کام کی ملتی ہے اور مجھ سے کام کسی گدھے کی طرح لیا جاتا ہے اور......''

وہ چپ ہوا تو انسپکٹر نے کچھ درشت لہجے میں کہا۔ ''تم کہتے کہتے چپ کیوں ہوجاتے ہو۔ تم اپنی بات ایک ہی بار مکمل نہیں کرسکتے۔ میں شام تک تمہاری بات سننے کے لیے فارغ نہیں ہوں۔''

منظور خان گھبرا گیا۔ ''احمر صاحب نے کہا تھا کہ مجھے سیٹھ صاحب کی فضول باتیں سننی پڑتی ہیں۔ مجھے شطرنج سے نفرت ہے اور مجھے وہ بھی ان کے ساتھ کھیلنی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ انہیں اُٹھا کر نیچے پھینک دوں اور آج انہوں نے ایسا کر بھی دیا۔''

انسپکٹر نے کہا۔ ''کوئی اور بات ہے؟''

''بس جی یہی بات تھی۔'' منظور خان نے ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کیے۔

''میں ابھی یہیں ہوں۔ کوئی بات یاد آئے تو مجھے فوراً بتانا۔'' انسپکٹر نے کہا اور ظفر کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔ ''مجھے ان کا کمرا اور اس جگہ جانا ہے جہاں وہ سیڑھی لگی ہے۔''

''میرے ساتھ آجائیے۔'' ظفر نے کہا۔ دونوں گھر کے اندر چلے گئے۔ دو اہلکار بھی ساتھ تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر گئے تو سامنے سیٹھ حاکم کا کمرا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر فنگر پرنٹ لینے کا کام ہو رہا تھا۔ انسپکٹر نے اندر جاتے ہی کمرے کا جائزہ لیا۔

وہ کشادہ کمرا تھا۔ کمرے کے ایک طرف لکھنے کی میز اور کرسی رکھی تھی۔ میز پر کچھ فائلیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے ساتھ ہی ایک شیلف تھا جس میں قرینے سے کتابیں تھیں۔ ساتھ ہی بیڈ تھا اور بیڈ کے سامنے دیوار پر ایل ای ڈی لگا تھا۔ دوسری طرف دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز تھی۔ ایک کرسی اور میز فرش پر الٹی ہوئی تھی اور کرسٹل کا گلدان فرش پر ٹوٹ کر بکھرا پڑا تھا، ساتھ ہی شطرنج کی بساط اور مہرے بکھرے ہوئے تھے۔ گری ہوئی کرسی کے پاس دیوار پر خون کا چھوٹا سا دھبا دکھائی دے رہا تھا اس سے صاف عیاں تھا کہ سیٹھ حاکم کا سر اس دیوار سے ٹکرایا گیا تھا اور پھر شاید سیٹھ حاکم کے نیم بے ہوش ہوجانے پر اسے اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا گیا تھا۔

ایک پولیس اہلکار جو پہلے سے کمرے میں موجود تھا، اس نے پلاسٹک کی تھیلی انسپکٹر کی نظروں کے سامنے کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ کمرے سے ملی ہے۔''

انسپکٹر نے دیکھا کہ پلاسٹک کی تھیلی میں نظر کی عینک تھی۔ اس کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور فریم بھی ٹیڑھا تھا۔ فریم کا رنگ بلیو تھا۔

''یہ تو احمر کی عینک ہے۔ ایک یہ فریم اور ایک اس سے مختلف فریم کی عینک اس کی آنکھوں پر دکھائی دیتی تھی۔ وہ عینکیں بدل کر استعمال کرتا تھا۔'' ظفر نے فوراً احمر کی عینک پہچان لی۔

''آپ کو یقین ہے کہ یہ احمر کی ہی عینک ہے؟'' انسپکٹر

نے پوچھا۔

''احمر میرے آفس میں کام کرتا۔ وہ ڈیوٹی کے دوران بیسیوں بار مجھ سے ملتا تھا، مجھے اس کی دونوں عینکیں ہی نہیں بھی پتا ہے کہ وہ ایک ہفتے میں سب سے زیادہ کس رنگ کی شرٹ اور پینٹ پہنتا ہے۔'' ظفر نے کہا۔ ''اس کے پاس میں نے دو عینکیں زیادہ دیکھی ہیں۔ ایک عینک کا فریم بلیو ہے اور دوسری کا پنک...... وہ اپنی شرٹس کے کلر کے حساب سے عینکیں بدل لیتا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ دونوں کے درمیان شاید مزاحمت بھی ہوئی اور اس مزاحمت میں احمر کی عینک نیچے گر کر کسی دباؤ میں آکر ٹوٹ گئی تھی۔ عینک کی حالت بتاتی ہے کہ اس پر کسی کا پیر آیا ہے۔'' انسپکٹر نے سوچتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''کچھ ایسا ہی لگتا ہے سر۔'' اہلکار نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اسے رکھو...... میں باہر کا جائزہ لے لوں۔'' انسپکٹر نے کہا اور ظفر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ دو اہلکار ان کے ساتھ تھے۔ دونوں گھر کے عقب میں چلے گئے۔ وہاں دیوار پر لوہے کی سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ اور اوپر سے خار دار تاریں بھی کسی تیز دھار آلے سے کاٹی ہوئی تھیں۔ انسپکٹر نے بغور جائزہ لیا۔

''سیڑھی پر ہاتھوں کے نشان ہوں گے۔ اس کے بھی پرنٹ لے لو اور یہ بھی دیکھو کہ دیوار پر پیروں کا کوئی نشان ہے۔'' انسپکٹر ہدایت دینے کے بعد خود بھی غور سے دیوار کی طرف دیکھنے لگا اور پھر وہ ظفر کے ساتھ ایک طرف چلا گیا۔

''میں آپ کی بہن سے ملنا چاہتا ہوں، کیا نام بتایا تھا آپ نے۔''

''اس کا نام ندا ہے۔'' ظفر نے بتایا اور اپنے ملازم کو آواز دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ندا سر جھکائے ڈری سہمی روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ان کے پاس آگئی۔ ظفر نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور حوصلہ دینے لگا۔

''ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صرف یہ پتا کرنا ہے کہ آپ نے کیا دیکھا تھا؟'' انسپکٹر نے اپنا لہجہ اور بھی نرم کر لیا۔

ندا سر جھکائے دھیمے لہجے میں بولی۔ ''میں اچانک کمرے سے باہر نکلی تو احمر بھائی تیزی سے اندر آرہے تھے اور پھر وہ سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر چلے گئے۔ مجھے حیرت تھی کہ کیا ہوا ہے۔ وہ اس سے پہلے کبھی اس طرح سیڑھیاں نہیں چڑھے تھے۔ میں ایک طرف بیٹھ گئی اور ٹی وی لگا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے اوپر سے آواز آئی جیسے کوئی چیز دھپ سے نیچے گری ہو۔ پھر میں نے کچھ اور آوازیں بھی سنیں لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ کیسی آوازیں ہیں۔ میرا دھیان پھر ٹی وی کی طرف مرکوز ہو گیا۔ اچانک احمر بھائی تیزی سے سیڑھیاں نیچے اترے وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے اور انہوں نے میری طرف توجہ دیے بغیر عقبی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئے، جبکہ میں حیرت سے کھڑی دیکھ اور سوچ رہی تھی کہ کیا ہوا ہے۔ پھر اچانک مین دروازہ کھلا اور ہمارا چوکیدار بھاگتا ہوا اندر آیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا تو میں نے پوچھا۔

''کیا ہوا ہے......؟''

''چوکیدار نے بتایا کہ احمر صاحب نے بڑے سیٹھ صاحب کو اوپر سے نیچے پھینک دیا ہے۔ میں یہ سنتے ہی سکتے میں آگئی اور چیخی کہ وہ اس طرف سے باہر گئے ہیں۔ چوکیدار پیچھے بھاگا اور پھر چوکیدار نے بتایا کہ وہ دیوار پھلانگ کر بھاگ گئے ہیں، فوراً پولیس کو فون کریں، میں نے اسی وقت پولیس کو فون کر دیا۔''

انسپکٹر نے ندا کے چپ ہوتے ہی سوال کیا۔ ''ان کے بولنے، چیخنے چلّانے کی آوازیں سنی تھیں آپ نے؟''

''نہیں ایسی کوئی آوازیں نہیں آئی تھیں۔ بس سامان وغیرہ گرنے کی آوازیں آئی تھیں۔'' ندا نے بتایا۔

''اس کے علاوہ کچھ اور دیکھا تھا؟'' انسپکٹر کی نگاہیں ندا کے جھکے ہوئے چہرے پر تھیں۔ وہ ابھی تک اپنے بھائی کے ساتھ چمٹی کھڑی تھی۔

''نہیں۔'' اس نے جھکی نظروں کے ساتھ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''کچھ یاد آئے تو مجھے بتانا۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا اور ندا تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

''اب کچھ سوال آپ سے ہو جائیں؟'' انسپکٹر، ظفر کی طرف متوجہ ہوا۔

''پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ۔'' ظفر جلدی سے بولا۔

''احمر کیا واقعی سیٹھ حاکم کے سارے کام کرتا تھا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''دادا ابو کا احمر کے ساتھ بہت لگاؤ تھا۔ وہ اس پر بہت

اعتماد کرتے تھے۔ اور وہ دونوں رات گئے تک شطرنج بھی کھیلتے تھے اور گھنٹوں آپس میں باتیں بھی کرتے تھے۔'' ظفر نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر کے پاس بھی وہی لے کر جاتا تھا؟''

''جی ہاں...... کیونکہ ڈیڈی کی وفات کے بعد مجھ پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس لیے دادا ابو، احمر کو بلا لیتے تھے اور ویسے بھی دونوں کی دوستی بھی تھی۔'' ظفر نے بتایا۔

''دوستی بھی اور پھر بھی احمر نے اتنا بڑا قدم اُٹھالیا؟ کیا آپ نے کبھی محسوس کیا کہ احمر اُن کے کاموں سے اُکتا گیا ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ دادا ابو کے کام کرتے ہوئے اکتا گیا ہو۔ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا، دادا ابو کی ایک عادت ایسی تھی کہ کوئی بھی اکتا جاتا تھا۔''

''وہ کیا عادت تھی؟''

''وہ بال کی کھال اتارتے تھے۔ بال کی کھال اتارتے ہوئے ان کے سوالوں کا جواب دینا ممکن نہیں رہتا تھا اور خواہ مخواہ غصہ بھی آجاتا تھا۔ تب تک جان نہیں چھوڑتے تھے جب تک ان کی تسلی نہیں ہوجاتی تھی۔'' ظفر نے کہا۔

''پھر تو آپ بھی ان کے سوالوں سے زچ ہوجاتے ہوں گے؟'' انسپکٹر نے اس کا جائزہ لیا۔

''یہ سچ ہے لیکن میں نے کبھی ان سے سخت الفاظ میں بات نہیں کی۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ میں اُن کے ہر سوال کا جواب تحمل سے دوں۔ میں ان کی اس عادت کو برداشت کرتا تھا۔ ان کے سوالوں کا غبار جو چڑھتا تھا، وہ میں اپنی ماں کے سامنے اتارتا تھا۔'' ظفر نے کہا۔ ''اب وہ چلے گئے ہیں اور مجھ سے کوئی پوچھنے والا نہیں رہا، مجھے کوئی مشورہ دینے والا بھی نہیں رہا، مجھے لگتا ہے کہ ان کی کمی سب سے زیادہ مجھے محسوس ہوگی۔'' ظفر کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

انسپکٹر نے بغور ظفر کو دیکھا اور پھر بولا۔ ''اب مجھے احمر کو تلاش کرنا ہے۔ پھر دیکھوں گا کہ پسِ آئینہ کیا ہے۔'' اچانک انسپکٹر کے موبائل فون پر بیل ہونے لگی اور وہ فون سنتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر پولیس کے ساتھ جب احمر کے گھر پہنچا تو دروازے پر تالا پڑا تھا۔ محلے دار احمر کے گھر کے باہر آتی پولیس دیکھ کر ڈر اور خوف میں مبتلا ہوگئے۔ اپنے تئیں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ ہر کوئی اپنا ہی قیافہ لگا رہا تھا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ پولیس احمر کے گھر کیا کرنے آئی ہے۔

انسپکٹر نے تالا دیکھا تو برابر والے گھر سے ایک مرد کو نکلتے دیکھ کر اسے اپنے پاس بلالیا۔

''یہ کہاں گئے ہیں؟''

''پتا نہیں جناب۔'' مرد نے فوراً نفی میں گردن ہلادی۔

''ان کو گئے کتنی دیر ہوگئی ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''میں تو ابھی کام کاج سے واپس آیا ہوں اس لیے مجھے پتا نہیں ہے کہ کب سے گئے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''اپنے گھر والوں سے پوچھ کر بتاؤ شاید انہیں پتا ہو۔'' انسپکٹر نے کہا تو وہ اندر چلا گیا۔

انسپکٹر اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ لوگ اپنے گھروں کی چھتوں اور دروازوں کے پیچھے سے اُن کو دیکھ رہے تھے۔ گلی میں کوئی راہ گیر بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی بھی پولیس کے معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اور پھر ایسی صورتِ حال میں جب انہیں پتا ہی نہ ہو کہ پولیس کیوں احمر کے گھر آئی ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ مرد باہر نکلا تو بولا۔ ''میرے گھر والے ابھی بازار گئے تھے کچھ خریداری کے لیے اس لیے انہیں بھی نہیں پتا کہ یہ لوگ کب گھر کو تالا لگا کر گئے ہیں۔''

انسپکٹر نے کہا۔ ''ان کا موبائل نمبر تو ہوگا تمہارے پاس۔''

''نہیں جی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔'' وہ مرد اس انتظار میں تھا کہ وہ جلدی سے ان کے سامنے سے چلا جائے۔

''کیسے لوگ ہیں یہ؟'' انسپکٹر نے اگلا سوال کردیا۔

''شریف اور اچھے لوگ ہیں۔ میں تو صبح سویرے کام پر چلا جاتا ہوں اور رات کو گھر واپس آتا ہوں۔ اس لیے زیادہ جانتا نہیں ہوں۔'' مرد اپنی جان کی خلاصی چاہتا تھا۔

''کتنا عرصہ ہوگیا ہے ان کو یہاں رہتے ہوئے؟''

''دو سال پہلے یہ آئے تھے۔ ان کا کرائے کا مکان ہے۔'' مرد نے بتایا۔

انسپکٹر نے دائیں بائیں جائزہ لیا...... کچھ فاصلے پر کریانہ کی دکان تھی جو اس نے اپنے گھر میں ہی بنائی ہوئی تھی، انسپکٹر وہاں چلا گیا۔ کریانہ کی دکان میں کوئی نہیں تھا۔ انسپکٹر نے آواز دی۔

''کوئی ہے اندر......''

آواز رعب دار تھی۔ فوراً ایک آدمی چادر لیے آگیا اور

مریل سی آواز میں بولا۔ ''جی صاحب۔''

''یہ دکان تمہاری ہے۔''

''ہاں جی۔'' اس نے مریل سے انداز میں اثبات میں گردن ہلائی۔

''احمر کے گھر والے گھر کو تالا لگا کر کب گئے تھے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

انسپکٹر کی بات سن کر دکان دار نے اپنی گردن نکال کر اس گھر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ان کے گھر کو تالا لگا ہوا ہے۔؟ مجھے تو نہیں پتا۔ میں تو بخار میں تپ رہا ہوں.... دکان چھوڑ کر اندر لیٹا ہوا تھا۔''

''دکان کھلی چھوڑ کر اندر لیٹے ہوئے تھے۔ اتنا بخار ہے کہ دکان کی پروا نہیں ہے۔'' انسپکٹر نے لہجے میں کچھ تغیر لاتے ہوئے کہا۔

''میری بیوی دروازے کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ آنے والوں کو سودا دے دیتی ہے۔'' اس نے پیچھے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو ایک عورت جس نے اپنے دوپٹے سے نقاب کیا تھا، انسپکٹر کے سامنے ہوئی اور پھر پیچھے ہٹ گئی۔

انسپکٹر نے کچھ دیر سوچا اور اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ اپنے اہلکار سے کہہ رہا تھا۔ ''ایس پی صاحب کا پریشر ہی اتنا ہے کہ مجھے اس طرح سے آنا پڑا۔ اگر پولیس کا رویہ اچھا ہو جائے تو ہر آدمی ان کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہو جائے۔ یہاں ہر کوئی اس بات سے ڈر رہا ہے کہ کہیں کچھ بتانے پر پولیس اسے ہی نہ دھر لے۔''

''یس سر۔'' اہلکار نے اثبات میں سر ہلایا۔

انسپکٹر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور پولیس وہاں سے رخصت ہو گئی۔ پولیس کے جاتے ہی سب لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ کریانے والے نے بھی اپنی چادر ایک طرف رکھ دی اور وہ بھی دوسروں کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر نے اپنی گاڑی کے بریک اس ورکشاپ کے سامنے لگائے جہاں سے احمر سیٹھ حاکم کی گاڑی ٹھیک کرایا کرتا تھا۔ ورکشاپ کے بارے میں معلومات انسپکٹر نے ظفر سے لی۔

ورکشاپ کا مالک چالیس سال کی عمر کا خوش مزاج شخص تھا۔ وہ انسپکٹر کو اپنے کیبن میں لے گیا۔

''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''آپ حکم کریں سر۔''

''سیٹھ حاکم کی گاڑیوں کا کام اسی ورکشاپ میں ہوتا ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''جی ہاں وہ ہمارے پرانے کسٹمر ہیں۔'' ورکشاپ کے مالک نے جواب دیا۔

''سیٹھ حاکم کی گاڑی کا کام کروانے کون آتا تھا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''سیٹھ حاکم کی گاڑی کا کام احمر صاحب کروانے آتے تھے۔ آج وہ ان کی گاڑی کی ٹیوننگ کروانے آئے تھے۔ احمر صاحب نے کہا تھا کہ ہم پہلے ان کا کام کر دیں کیونکہ ان کو کراچی جانا تھا۔ چار بجے کی ٹرین میں ان کی سیٹ بک تھی۔'' اس شخص نے بتایا۔

''یہ بات احمر نے بتائی تھی؟'' انسپکٹر نے جلدی سے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں...... تبھی پھر میں نے پہلے ان کی کار کی ٹیوننگ کی اور وہ جلدی سے چلے گئے۔''

انسپکٹر نے ایک بار پھر تصدیق کی۔ ''آج چار بجے کی ٹرین سے وہ کراچی جا رہا تھا۔ یہی بتایا تھا اُس نے۔''

''جی بالکل یہی بتایا تھا۔'' ورکشاپ کے مالک نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

انسپکٹر نے اپنے اہلکار سے کہا۔ ''جلدی سے پتا کرو کہ چار بجے کونسی ٹرین کراچی جاتی ہے اور اس ٹرین میں احمر نام کے کسی شخص کی بکنگ ہے؟''

وہ اہلکار سنتے ہی باہر نکل گیا۔ انسپکٹر نے اس شخص سے پوچھا۔ ''احمر کیسا لڑکا ہے؟''

''بہت ہی اچھا، پڑھا لکھا اور خوش مزاج۔'' ورکشاپ کے مالک نے بتایا۔

''کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ اکتایا ہوا نہیں رہتا تھا؟''

''میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اُس کے چہرے پر کوئی تھکن ہو۔'' اس نے کہا۔

''اپنے سیٹھ حاکم کے بارے میں اس کی رائے کیا تھی؟''

''وہ ان کی بہت تعریف کیا کرتا تھا۔ اور خاص طور پر جس دن دونوں کے درمیان شطرنج کی بازی لگتی تھی اور احمر جیت جاتا تھا تو وہ مزے لے لے کر مجھے بتاتا تھا۔ یہ بھی بتاتا تھا کہ اس نے کیسے اور کہاں شطرنج کی بازی میں بے

ایمانی کی تھی۔'' ورکشاپ کے مالک کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی آ گئی تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ احمر کھیل میں بے ایمانی بھی کرتا تھا۔ آپ سے بھی اس کی دوستی تھی؟''

''ہاں میری بھی اس سے دوستی ہوگئی تھی۔ وہ اکثر فارغ وقت میں آجایا کرتا تھا اور پھر ہم گپ شپ لگاتے تھے۔''

''اوکے...... شکریہ آپ نے مجھے وقت دیا۔'' انسپکٹر نے مصافحہ کیا۔

''ویسے سر بات کیا ہے؟'' ورکشاپ کے مالک نے پوچھ ہی لیا۔

''سیٹھ حاکم کا قتل ہو گیا ہے اور الزام احمر پر ہے۔'' انسپکٹر نے کہا اور کیبن سے باہر نکل گیا جبکہ ورکشاپ کا مالک دم بخود کھڑا رہ گیا۔

آدھے گھنٹے میں انسپکٹر کے پاس تمام معلومات تھیں۔ ٹرین چار بج کر دس منٹ پر روانہ ہوئی تھی۔ احمر کے نام کی فرسٹ کلاس میں ٹکٹ کی بکنگ دو دن پہلے ہوئی تھی۔ جس بات نے انسپکٹر کے جسم میں بے چینی بھر دی وہ یہ تھی کہ وہ ٹرین نوے کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انجن فیل ہونے کے باعث ایک ویرانے میں کھڑی تھی۔

انسپکٹر کو اس پر بھی حیرت تھی کہ اس بات کا ذکر ظفر نے کیوں نہیں کیا کہ وہ آج کراچی جا رہا ہے۔

انسپکٹر نے اپنے اہلکار کے ذریعے جس جگہ ٹرین کھڑی تھی، اس علاقے کے تھانیدار کو احمر کے بارے میں ساری معلومات پہنچانے کی ہدایت کی۔ اور اس کی اطلاع ایس پی صاحب کو بھی دے دی تاکہ اوپر سے متعلقہ تھانیدار کو ہدایت پہنچ جائے۔

اس کے بعد انسپکٹر نے ظفر کو فون کیا۔ جب انسپکٹر کی کال آئی تو اس وقت ظفر اپنی بہن ندا اور ماں کے پاس براجمان تھا۔ رابطہ ہوتے ہی انسپکٹر نے پوچھا۔

''ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔ آپ کی کمپنی کے کام کے سلسلے میں احمر... کراچی بھی جاتا تھا۔''

''احمر کمپنی کی طرف سے کراچی نہیں جاتا تھا۔'' ظفر نے بتایا۔

''تو پھر وہ کراچی کیوں جاتا تھا؟''

''ہمارے ماموں فالج کی وجہ سے کام کاج سے محروم ہو چکے ہیں۔ دادا ابو دو، یا تین ماہ کے بعد احمر کو کراچی بھیجتے تھے تاکہ وہ ان کا حال چال بھی پوچھے اور ان کی ضروریات بھی جا کر پوری کرے۔ ماموں کی اولاد نہیں ہے اس لیے دادا ابو کی ہدایت پر احمر خود جا کر ان کی خیر خیریت پوچھتا تھا، اور ڈاکٹر کے پاس بھی لے کر جاتا تھا۔ اور ان کے ضروری کام بھی کرتا تھا۔''

''آپ نے مجھے بتایا نہیں کہ آج اس کی ٹکٹ بک ہے اور وہ کراچی کے لیے روانہ ہو چکا ہوگا۔''

''میرے علم میں یہ بات ہی نہیں تھی کہ وہ آج کراچی جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ دادا جان کا فیصلہ اور ان کا حکم ہوتا تھا۔ مجھے خود آپ سے پتا چل رہا ہے۔'' ظفر نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اس نے پوری منصوبہ سازی کی تھی۔ پہلے اس نے دادا جان کو مارا اور کراچی فرار ہو گیا۔''

''میں .... آپ سے بعد میں بات کروں گا۔'' انسپکٹر نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور سوچنے لگا۔

☆☆☆

ایس ایچ او صداقت حسین تھانے میں اپنی کرسی پر دونوں ٹانگیں رکھے بیٹھا تھا۔ اس کی عمر پچاس سال کے قریب تھی اور چہرے کا رنگ کالا تھا جبکہ اس کی مونچھیں ایسی تھیں کہ اس کا اوپر کا ہونٹ بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی۔ اس کی توند باہر نکلی ہوئی تھی اور وہ عجیب سی شخصیت کا مالک دکھائی دیتا تھا۔

وہ ایک قصبہ تھا اور قصبے کے اس تھانے کا انچارج تھا۔ اس وقت اس کے پاس اس کا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

''میں جو رپورٹ دے رہا ہوں وہ بڑی پکی ہے۔ وہ لوگ اپنی زمین چھڑانے کے لیے آپ کو مارنے پر تُل گئے ہیں۔''

اس کی بات سن کر صداقت نے بے پروائی سے ایسے ہاتھ مارا جیسے وہ مکھی اُڑا رہا ہو۔ ''صداقت حسین کو مارنا آسان کام ہے؟ میں ہاتھوں میں چوڑیاں پہن کر گھومتا ہوں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن آپ احتیاط کر لیں۔ میری اطلاع کے مطابق وہ گھات لگائے بیٹھے ہیں۔'' اس نے پھر خبردار کیا۔

''ان میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ گھات لگا کر مجھ پر حملہ کر دیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں ڈر کر ان کی زمین کا قبضہ چھوڑ دوں گا۔ صداقت نے یہ کام پہلی بار نہیں کیا کہ ان کی دھمکیوں سے ڈر جائے۔'' صداقت نے کہہ کر سگریٹ نکالا اور اپنے ہونٹوں میں دبا کر ماچس تلاش کرنے لگا۔ پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے اپنی جیب سے ماچس نکال کر اس کا

سگریٹ سلگایا اور پھر بولا۔

''آپ جب باہر جائیں تو دو، چار پولیس والے ساتھ لے جایا کریں۔ اس تھانے کے باپ ہیں آپ۔ آپ نے کونسا بندے کہیں سے مانگنے جانا ہے۔ تحفظ رہے گا۔''

''او چھوڑ رہنے دے ان باتوں کو، مجھے کوئی پروا نہیں ہے اور صداقت حسین ڈرپورک چوہا نہیں ہے۔'' اس نے بے پروائی سے کہہ کر سگریٹ کا طویل کش لیا اور منہ سے دھواں چھوڑنے لگا۔

''جناب میں آپ کا خاص بندہ ہوں، مجھے جو خبر ملی میں آپ تک پہنچا رہا ہوں۔'' اس آدمی نے کہا۔

''ٹھیک ہے تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ میں خود ہی ان سے نمٹ لوں گا۔ جو مرضی کرلیں، ان کی زمین کا قبضہ نہیں چھوڑوں گا۔''

صداقت نے کہا اور اچانک اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے جیسے ہی فون کان سے لگایا وہ یکدم مؤدب ہو گیا۔ اس کے منہ سے مسلسل ''جی سر...... جی سر'' نکلنے لگا۔ اس کے بعد اس نے کاغذ اپنی طرف کھسکا کر اس پر لکھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد فون بند ہو گیا۔ اس نے کرسی سے اُٹھ کر سپاہی کو آواز دی۔ ایک سپاہی اندر آگیا۔

''گاڑی نکالو...... یہاں اپنے علاقے میں کوئی ٹرین خراب ہو کے کھڑی ہے؟''

''پتا نہیں سر جی۔''

''پتا کیا کرو۔ بڑے صاحب کا فون تھا۔ چلو جلدی نکلو۔'' صداقت نے وہ کاغذ جس پر اس نے کچھ لکھا تھا، اُٹھا کر اپنے ہاتھ میں پکڑا اور باہر جانے لگا تو وہ آدمی اُٹھ کر صداقت سے بولا۔

''دھیان سے۔''

''تم جاؤ یہاں سے اور گھر جا کر حقہ پانی پیو۔ زنانیوں کی طرح ڈرا رہے ہو۔'' صداقت بے پروائی سے بولا اور باہر نکل گیا۔

باہر جیپ تیار کھڑی تھی۔ صداقت آگے بیٹھ گیا اور اہلکار پھدک کر جیپ میں سوار ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی جیپ تھانے کی حدود سے باہر نکل گئی۔

وہ سنگل سڑک تھی جو جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ جیپ اس سڑک پر دوڑتی جا رہی تھی۔ صداقت اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑا وہ کاغذ پڑھ رہا تھا۔ اس پر احمر کا پورا نام، والدیت، ٹرین کا نام، ڈبا نمبر، سیٹ نمبر سب کچھ تفصیل سے لکھا تھا۔

جیپ آبادی سے باہر نکل گئی تھی اور ایک چوڑی سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ اس سڑک کی حالت بھی اتنی اچھی نہیں تھی۔ پندرہ منٹ کی مزید مسافت کے بعد میدانی علاقہ شروع ہو گیا اور دور سے ہی ریلوے پٹڑی پر ٹرین کھڑی دکھائی دینے لگی۔ اس ٹرین کے اردگرد مسافروں کا ہجوم تھا۔ ان میں سے کوئی ٹہل رہا تھا، کچھ ٹولی کی شکلوں میں باتیں کر رہے تھے اور کچھ بیزاری سے کھڑے تھے۔ ان میں خواتین بھی تھیں۔

صداقت کے کہنے پر ڈرائیور نے جیپ ایک جگہ روک دی۔ صداقت کے ساتھ پولیس اہلکار بھی باہر نکل آیا۔ صداقت نے اسی جگہ کھڑے ہو کر پہلے جائزہ لیا اور پھر کاغذ پر لکھا ٹرین کا ڈبا نمبر پڑھا اور اپنے اہلکاروں کے ساتھ اس طرف چل پڑا۔

وہ ٹرین کے اس ڈبے کے اندر چلے گئے۔ صداقت ایک ایک سیٹ کی طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ڈبا تقریباً خالی تھا۔ کچھ خواتین اور مرد ہی فاصلوں پر دکھائی دے رہے تھے جن کے چہروں سے اُلجھن اور بیزاری عیاں تھی۔

اچانک صداقت ایک سیٹ کے پاس رک گیا۔ وہی سیٹ نمبر تھی۔ وہ سیٹ خالی تھی اور اس کے سامنے ایک نوجوان بیٹھا کانوں میں ہینڈ فری لگائے میوزک سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ صداقت نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور اس کی نظروں کے سامنے چٹکی بجائی جیسے وہ اسے کہہ رہا ہو کہ وہ اپنے کانوں سے ہینڈ فری نکال کر اس کی بات پر توجہ دے۔ نوجوان نے جلدی سے ہینڈ فری نکالی اور صداقت کی طرف دیکھ کر بولا۔

''جی سر......؟''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' صداقت کا لہجہ روایتی پولیس والا تھا۔

''میرا نام اسلم ہے۔'' اس نے نام بتاتے ہوئے صداقت کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر کچھ گھبراہٹ عیاں ہو گئی۔

''تمہارے سامنے والی سیٹ پر کون بیٹھا ہے؟'' صداقت نے اس سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ کوئی نوجوان ہے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''مجھے پتا نہیں ہے شاید وہ باہر ہوگا۔ اس کا سامان پڑا ہے۔'' نوجوان نے بیگ کی طرف ایک نظر دیکھ کر کہا۔

''میرے ساتھ چلو اور دیکھ کر بتاؤ کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔'' صداقت بولا اور نوجوان گھبرائے انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اُن کے ساتھ ڈبے سے باہر نکلا اور متلاشی نگاہوں سے دور، نزدیک اور پھر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ اچانک اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''وہ کھڑا ہے...... ابھی اس نے منہ دوسری طرف کیا ہے۔''

''میرے ساتھ چلو۔'' صداقت نے کہا اور نوجوان اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ پولیس اہلکار بھی ساتھ تھے۔ رفتہ رفتہ وہ اس کے قریب ہوتے جارہے تھے جس طرف اس نوجوان نے اشارہ کیا تھا۔ وہ سامنے کھڑا تھا اور اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔

عین اس کے پیچھے پہنچ کر صداقت نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس نے فوراً چہرہ پھیر کر اپنے عقب میں دیکھا اور اپنے پیچھے پولیس کھڑی دیکھ کر وہ یکدم چونکا۔

وہ خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا چہرہ مونچھ داڑھی سے مبرّا تھا۔ اس نے بلیک پینٹ کے ساتھ ہلکی پنک کلر کی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں پر لگے چشمے کا فریم بھی پنک تھا۔

''جی ..... ؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا نام احمر ہے؟'' صداقت نے پوچھا۔

''جی میرا نام احمر ہے۔'' اس نے اپنا نام بتایا۔ وہ پولیس کو متوحش نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''پکڑو اِسے۔'' صداقت نے اپنے اہلکاروں کو اشارہ کیا اور پولیس نے فوراً اسے پکڑ لیا۔ احمر کے لیے بہت حیران کن بات تھی، اس نے جلدی سے کہا۔

''مجھے کیوں پکڑ رہے ہو۔ میں نے کیا کیا ہے؟''

''اِسے لے کر آؤ۔'' صداقت نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنے اہلکاروں کو حکم دیا اور واپس جیپ کی طرف چل پڑا۔ وہاں پر موجود مسافروں کی توجہ یکدم ان کی طرف ہوگئی تھی۔ سب اپنی باتیں اور بیزاری بھول کر اُن کو دیکھنے لگے۔

''مجھے کیوں لے جارہے ہو۔ میرا قصور کیا ہے؟'' احمر نے اس بار قدرے بلند آواز میں کہا۔

اچانک صداقت نے چلتے ہوئے رک کر اپنا رخ اس کی طرف پھیرا اور درشت لہجے میں بولا۔

''زبان کے بجائے صرف قدم چلاؤ اور ہمارے ساتھ چپ چاپ چلتے رہو۔''

''مجھے کیوں پکڑا ہے۔ میں نے کیا کیا ہے۔ مجھے بتاؤ تو۔'' احمر کی آواز اور بھی بلند ہوگئی تھی۔

''قتل کیا ہے تم نے اور مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میرا قصور کیا ہے؟'' صداقت نے یکدم انکشاف کیا تو احمر کے چہرے پر حیرت برسنے لگی۔ ''اب اگر سوال کیا تو اسی جگہ اپنے ہاتھوں سے جواب دینا شروع کردوں گا۔ میری بات کا مطلب سمجھ گئے ہو؟''

''میں نے قتل کیا ہے؟ کسے قتل کیا ہے؟'' احمر کی آواز میں اب حیرت کا انبار تھا۔

''ساری باتیں یہاں پوچھنی ہیں تو تمہارے لیے کرسی منگواؤں تاکہ تم آرام سے بیٹھ کر جو پوچھنا ہے، پوچھ لو۔'' صداقت کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''مجھے ابھی فون کرنا ہے۔'' احمر کے دونوں ہاتھوں کو دو پولیس اہلکاروں نے پکڑ رکھا تھا، اس لیے اس نے اپنے ہاتھ چھڑانے کے لیے اپنے جسم کو حرکت دی اور مزاحمت کرنے لگا۔

صداقت نے آگے بڑھ کر اس کی جیبوں کی تلاشی لی اور موبائل فون نکال کر اسے آف کرتے ہوئے اپنی جیب میں ڈال لیا اور اپنے اہلکاروں کو ڈانٹ کر بولا۔

''تم لوگوں کے ہاتھوں میں جان نہیں ہے۔ کھینچ کر لے چلو اسے۔'' صداقت نے کہتے ہی پھر چلنا شروع کردیا۔ اس بار احمر کے احتجاج پر کسی نے کوئی توجہ نہیں دی اور وہ اسے کھینچ کر چلتے رہے۔

پولیس والوں نے احمر کو جیپ میں سوار کرایا اور جیپ اسی راستے پر دوڑنے لگی جس راستے سے وہ اس جگہ تک آئے تھے۔ ٹرین اور مسافر پیچھے رہ گئے تھے۔ اچانک ایک گولی چلی اور جیپ کا ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا اور ڈرائیور سے جیپ بے قابو ہوگئی۔ پھر فائر ہوا اور گولی صداقت کے بازو پر لگ گئی۔ جیپ چل نہیں سکتی تھی، رک گئی تھی۔

صداقت کو فوراً اپنے آدمی کی بات یاد آئی جو اسے خبردار کررہا تھا کہ جن لوگوں کی زمین پر اس نے ناجائز قبضہ کیا ہے، وہ اسے مارنے کے لیے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ اس کی بات کی صداقت نے کوئی پروا نہیں کی تھی۔

صداقت نے اپنا پستول نکالا اور اس نے بھی فائر کرنے شروع کردیے۔ اس کے ساتھ اس کے اہلکاروں نے فائر

کھول دیے جبکہ احمر کو اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔

گولیاں دونوں طرف سے برسنے لگی تھیں۔ اس لڑائی میں احمر نے باہر چھلانگ لگا دی۔ ایک گولی اس سے پانچ انچ کے فاصلے پر لگی اور وہ فوراً دوسری طرف گھوم گیا۔

گولیاں ایسے برس رہی تھیں جیسے موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ احمر اپنی جان بچاتا ہوا ایک طرف بھاگ رہا تھا اور پھر کچھ فاصلے پر جا کر اس نے تیز رفتاری سے بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ تیز تیز بھاگتا اُن سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ گولیوں کی آواز پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ بھاگتے بھاگتے قریب آبادی میں داخل ہو گیا۔

احمر نے بھاگنا بند کر دیا اور پیدل چلنے لگا۔ اُس کا موبائل فون صداقت نے لے لیا تھا اور اسے ایک ضروری کال کرنی تھی۔

☆☆☆

انسپکٹر کو جو اطلاع ملی تھی، اس کے مطابق انہوں نے احمر کو گرفتار کر لیا تھا اور راستے میں اس کے ساتھی آکر اسے چھڑا کر لے گئے۔ جس کے نتیجے میں صداقت اور اس کے اہلکار شدید زخمی ہو گئے اور احمر ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

انسپکٹر کال سننے کے بعد سوچنے لگا کہ احمر کے ساتھ اس قتل کی واردات میں کچھ اور لوگ بھی شامل ہیں؟ اگر احمر نے سیٹھ حاکم کو قتل کیا ہے تو پھر اس قتل کے پیچھے اس کے کیا مقاصد ہیں؟ ذہنی تناؤ، یا پھر کچھ اور......؟

انسپکٹر ابھی سوچ رہا تھا کہ اس کے سامنے فنگر پرنٹ اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ فنگر پرنٹ کی رپورٹ پڑھ کر انسپکٹر کی تشویش دو چند ہو گئی تھی۔ کیونکہ قاتل کی انگلیوں کے نشان سیٹھ حاکم کے جسم کے کسی حصے سے نہیں ملے تھے بقول چوکیدار کے قاتل نے سیٹھ حاکم کو اُٹھا کر کھڑکی سے نیچے پھینکا تھا اور نیچے پھینکنے سے قبل دونوں کے درمیان مزاحمت بھی ہوئی تھی۔ جبکہ لوہے کی سیڑھی اور سیٹھ حاکم کے کمرے کے دروازے کے ہینڈل پر انگلیوں کے نشان تھے۔

انسپکٹر سوچنے لگا کہ اس کا مطلب ہے جب قاتل سیٹھ حاکم کو قتل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر اس نے انہیں اُٹھا کر نیچے پھینکا تھا تو اس نے ہاتھوں پر دستانے پہنے ہوئے ہوں گے۔

لیکن جب وہ کمرے کے اندر گیا اور باہر نکلا تو اس کے ہاتھوں پر دستانے نہیں تھے تب ہی وہ اپنے ہاتھوں کے نشان دروازے کے ہینڈل پر چھوڑ گیا تھا۔ اسی طرح اس کے نشان سیڑھی پر بھی تھے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ سیڑھی پر چڑھتے ہوئے بھی اس کے ہاتھوں پر دستانے نہیں تھے اور یہ بات اور بھی حیران کن تھی کہ خاردار تار پر بھی کسی کے ہاتھوں کے نشان نہیں تھے۔ جب احمر خاردار تار کاٹ رہا تھا تو اس وقت اس نے ہاتھوں پر دستانے چڑھا لیے تھے؟ کیسا قاتل تھا جو کہیں تو دستانے اتار لیتا تھا اور کہیں چڑھا لیتا تھا؟ اور اسے دستانے چڑھانے اور اتارنے کا موقع مل رہا تھا؟

انسپکٹر کے چہرے پر سوچ کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ انسپکٹر نے اپنے آپ سے کہا۔

''مجھے اس کیس کی تفتیش کچھ اور انداز سے کرنی ہوگی۔''

اچانک ایک اہلکار اندر آیا اور بولا ''سر رپورٹ ہے کہ صداقت کو احمر کے ساتھیوں نے چھڑاتے ہوئے زخمی نہیں کیا بلکہ یہ اس کی اپنی ذاتی دشمنی کا شاخسانہ تھا۔''

''پکی رپورٹ ہے؟'' انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھا۔

''جی سر...... آپ کی ہدایت پر وہاں سے خاص مخبر سے رپورٹ لی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اس کا فائدہ احمر نے اُٹھایا اور وہ بھاگ گیا۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''احمر کا کچھ پتا چلا۔''

''اس کی تلاش جاری ہے۔ اس علاقے میں پولیس جگہ جگہ احمر کو تلاش کر رہی ہے لیکن احمر فی الحال غائب ہے۔'' اہلکار نے بتایا۔

''کون تلاش کر رہا ہے۔ صداقت تو زخمی پڑا ہے۔''

''اسپیشل فورس اس کی تلاش میں ہے۔ امید ہے کہ وہ جلدی پکڑا جائے گا۔'' اہلکار نے کہا۔

''اس کا پکڑا جانا بہت ضروری ہے۔ تب تک مجھے قاتل تک پہنچنے کے لیے کچھ اور کرنا پڑے گا۔''

اچانک ایک دوسرا اہلکار اندر آیا اور بولا۔ ''سر احمر کے گھر کا تالا کھل گیا ہے۔ اس کا باپ گھر آ گیا ہے۔ وہاں پر موجود ہمارے مخبر نے مجھے اطلاع دی ہے۔''

''میں ابھی وہاں جا رہا ہوں۔'' انسپکٹر اسی وقت اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

احمر کے باپ کا نام نذیر احمد تھا۔ وہ شکل وصورت سے انتہائی شریف آدمی دکھائی دیتا تھا۔ جیسے وہ ہی اپنے گھر کے پاس پہنچا کئی لوگ اس کی طرف لپکے اور پولیس کے آنے کی اطلاع دی تو نذیر احمد پریشان ہو گیا۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

اس نے گھر کا تالا کھولا اور اندر جا کر سوچنے لگا کہ کیا ماجرا ہے کہ پولیس اس کے گھر آئی اور احمر کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

نذیر احمد کے پاس موبائل فون نہیں تھا اور نہ ہی اس کے گھر میں ٹیلی فون کی سہولت تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ باہر نکل کر کسی سے کہے کہ وہ احمر کو فون کرے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور اس نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

نذیر احمد نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو سامنے انسپکٹر کھڑا تھا۔ وہ پولیس کی وردی میں نہیں تھا اکیلا ہی آیا تھا۔

''جی فرمایئے۔'' نذیر احمد نے گھبرائی ہوئی آواز میں اپنے دروازے پر ایک اجنبی کو دیکھ کر پوچھا۔

''آپ احمر کے والد صاحب ہیں؟'' انسپکٹر نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔ اس کی نگاہیں نذیر احمد کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''جی......'' نذیر احمد کے منہ سے گھبراہٹ میں آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ ''احمر میرا بیٹا ہے۔''

''میرا نام اورنگزیب ہے اور میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں اندر آ سکتا ہوں؟''

''جی آیئے۔'' نذیر احمد نے بادلِ ناخواستہ دروازہ چھوڑ دیا۔ انسپکٹر اندر گیا تو نذیر احمد نے دروازہ بند کرتے ہوئے باہر دائیں بائیں دیکھا، اسے کوئی اور تو دکھائی نہ دیا البتہ گلی کے کچھ لوگ کھڑے اسی طرف دیکھ رہے تھے۔

نذیر احمد اور انسپکٹر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ وہ سادہ ڈرائنگ روم تھا جہاں صوفے اور کرسیاں پڑی تھیں۔ فرش صاف تھا۔

''مجھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں روایتی پولیس والا نہیں ہوں۔ چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں اور میرا آنے کا مقصد پورا ہو جائے گا۔'' انسپکٹر نے نذیر احمد کی گھبراہٹ اور خوف دیکھتے ہوئے تسلی دی۔

''جی میں حاضر ہوں۔'' نذیر احمد کی گھبراہٹ ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ ہاتھ لرز رہے تھے۔

انسپکٹر نے بلاتمہید کہا۔ ''دراصل آپ کے بیٹے احمر پر قتل کا الزام ہے۔''

''جی......؟'' نذیر احمد کا دم بخود منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''احمر اور قتل......؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''کیا احمر ایسا نہیں کر سکتا؟''

''وہ تو بہت نرم مزاج اور ہنس مکھ ہے۔ وہ کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔'' نذیر احمد کا جسم کانپنے لگا تھا۔

''جذبات، غصہ اور ذہنی تناؤ کسی کو بھی کوئی کام کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ خواہ وہ اپنی جان ختم کر لے، یا دوسرے کو جان سے مار دے۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''کچھ ایسا ہوگیا ہوگا۔''

''وہ ایسا نہیں ہے۔ اسے غصہ آتا ہی نہیں ہے۔ وہ ایسا قبیح کام نہیں کر سکتا۔'' نذیر احمد نے پھر صفائی دی۔

''وہ بھی انسان ہے، غصہ آنا فطری بات ہے۔''

''وہ انتہائی ٹھنڈے مزاج کا مالک ہے۔''

''مزاج بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بہرحال آپ اُس کے بارے میں صفائی دینے سے بہتر ہے کہ میرے سوالوں کا جواب دیں۔''

''لیکن مجھے یہ تو بتائیں کہ احمر پر کس کے قتل کا الزام ہے؟'' نذیر احمد کی سوالیہ نگاہیں انسپکٹر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''احمر پر سیٹھ حاکم کے قتل کا الزام ہے۔'' انسپکٹر نے انکشاف کیا تو نذیر احمد پر سکتہ طاری ہوگیا۔ پھر وہ بولا۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔''

''بہتر ہے کہ آپ میرے سوالوں کا جواب دیں۔ آپ نے پھر صفائی دینی شروع کردی ہے۔'' انسپکٹر نے نذیر احمد کی توجہ پھر اپنے سوالوں کی طرف دلائی۔

''پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔'' نذیر احمد کا لہجہ بے جان تھا۔ بے یقینی کی کیفیت اس کے چہرے سے عیاں تھی اور آنکھوں میں سوال تیر رہے تھے۔

''احمر جس کمپنی میں کام کرتا تھا۔ اس کمپنی کے کام کے علاوہ اس پر کمپنی کے سیٹھ کے کاموں کا بھی بہت بوجھ تھا۔ وہ شدید ذہنی تناؤ کا شکار تھا۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''احمر کو دوسری کمپنیوں کی طرف سے بہت اچھی آفرز تھیں۔ وہ چاہتا تو آٹھ گھنٹے کام کر کے اچھی تنخواہ لے سکتا تھا لیکن وہ اپنے اس کام سے خوش تھا۔ وہ سیٹھ حاکم کے ساتھ رہ کر اس کا کام کر کے، ان کے ساتھ شطرنج کھیل کر خوش ہوتا تھا۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ اپنے کام کی وجہ سے کسی تناؤ کا شکار ہے۔'' نذیر احمد نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''ہو سکتا ہے کہ ایسا آپ کے سامنے ہوا ور کسی کو اس نے اکتا کر کہہ دیا ہو کہ وہ تھک جاتا ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ

وہ اس بوڑھے کا قصہ ختم کر دے۔'' انسپکٹر بولا۔

''میں اس بات کو بالکل بھی نہیں مانتا۔ احمر اس نوکری اور سیٹھ حاکم کے ساتھ بہت خوش تھا۔ اور سیٹھ حاکم اس کے ساتھ خوش تھے۔ احمر اس نوکری اور سیٹھ حاکم کے ساتھ کام کر کے لطف اندوز ہو رہا تھا۔'' نذیر احمد نے زور دیا۔

''تو پھر احمر نے سیٹھ حاکم کا خون کیوں کیا۔ اس کے چشم دید گواہ اس گھر کا چوکیدار منظور خان اور سیٹھ حاکم کی پوتی ندا ہے۔ جنہوں نے خود احمر کو دیکھا تھا۔''

''میرا دل نہیں مانتا۔''

''آپ کا دل نہیں مانتا لیکن یہ حقیقت ہے۔ چشم دید گواہ موجود ہیں۔ شاید آپ لوگ اسی لیے گھر کو تالا لگا کر چلے گئے تھے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''یہ غلط ہے۔ میرے قریبی عزیز کے بیٹے کا آج دعوت ولیمہ ہے۔ میرے گھر والے وہاں موجود ہیں جبکہ میں کھانا کھا کر آگیا تھا۔'' نذیر احمد نے جلدی سے جواب دیا۔

''احمر کراچی کیوں جا رہا تھا؟''

نذیر احمد نے کہا۔ ''وہ اکثر سیٹھ حاکم کے کام کے سلسلے میں جاتا رہتا ہے۔''

''پولیس نے احمر کو پکڑ لیا تھا لیکن اس کے آدمی اسے چھڑا کر لے گئے ہیں۔'' انسپکٹر نے جان بوجھ کر یہ بات کی۔

''آپ کچھ بھی کہہ لیں، میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ میں اس کا باپ ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے بیٹے کی نس نس میں کیا بھرا ہے۔''

''آپ کے پاس اس کا موبائل نمبر تو ہوگا۔ ذرا اُسے کال تو کریں۔'' انسپکٹر نے کہتے ہوئے اپنا موبائل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ نذیر احمد نے پہلے ڈائری میں لکھا احمر کا موبائل فون نمبر دیکھا اور پھر انسپکٹر سے کہا کہ وہ یہ نمبر ملا دیں۔ انسپکٹر نے ...نمبر ملایا تو وہ مسلسل بند جا رہا تھا۔

''نمبر بند ہے۔ ایک بات یاد رکھیں۔ انسان کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہوتا ہے، اس کا پتا صرف اسے ہی ہوتا ہے۔ احمر ایک چالاک نوجوان ہے جس نے اپنے اندر کی بات آپ سب سے چھپائی اور سیٹھ حاکم کو قتل کر دیا اور اس نے سب کچھ طے شدہ منصوبے کے مطابق کیا۔ اِدھر اس نے قتل کیا اور اُدھر اس کی ٹکٹ بک تھی، وہ بھاگ کر ٹرین میں بیٹھ گیا اور بدقسمتی سے وہ ٹرین خراب ہو کر کھڑی ہوگئی اور احمر بروقت فرار نہیں ہو سکا۔ آپ ایک باپ کی حیثیت سے بیٹے کی صفائی میں ہر چیز کا انکار کرتے چلے جا رہے ہیں۔''

''چلیں ایک بات بتائیں، وہ سیٹھ حاکم کو کیوں قتل کرے گا؟'' نذیر احمد نے کہا۔

''اس کیوں کے پیچھے میں بھاگ رہا ہوں۔ اور سب کچھ سب کے سامنے لا کر ہی دم لوں گا۔'' انسپکٹر بولا۔ ''میں احمر کا کمرا دیکھنا چاہتا ہوں۔''

نذیر احمد اُسے اپنے ساتھ احمر کے کمرے میں لے گیا۔ احمر کے کمرے میں ایک پلنگ، ایک کرسی اور چھوٹی سی میز تھی۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کی الماری نصب تھی۔

انسپکٹر نے کمرے کی تلاشی لینی شروع کی اور الماری کی دراز سے اُسے ایک استعمال شدہ سم مل گئی۔ انسپکٹر نے وہ سم اپنی جیب میں ڈالی اور نذیر احمد کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔

''آپ کے تعاون کا شکریہ..... مجھے اُمید ہے کہ اگر احمر نے آپ کے ساتھ رابطہ کیا تو آپ مجھے ضرور بتائیں گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر احمر میرے پاس آیا تو میں اسے آپ کے سامنے پیش کردوں گا تاکہ دودھ کا دودھ ہو جائے۔''

انسپکٹر نے اپنا فون نمبر دیا اور چلا گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر نے احمر کے کمرے سے ملنے والی سم اپنے موبائل فون میں ڈالی اور آن ہوتے ہی وہ اُسے چیک کرنے لگا۔ موبائل فون میں چند موبائل فون نمبرز سیو تھے۔ میسج بکس میں ایک میسج تھا۔ مختصر لکھا تھا۔

''تم مجھے مسلسل نظر انداز کر رہے ہو۔''

وہ میسج تقریباً دو ماہ قبل لکھا تھا۔ جس نمبر سے میسج آیا تھا انسپکٹر نے ایک کاغذ پر نوٹ کیا اور اپنے اہلکار سے کہا کہ وہ پتا کرے کہ یہ نمبر کس کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔

انسپکٹر نے سب سے پہلے یہ پتا چلایا کہ احمر کے کمرے سے ملنے والی سم کس نام پر رجسٹر ہے۔ اور جس نمبر سے وہ میسج آیا تھا اس کے بارے میں بھی معلوم کیا تو واضح ہوا کہ وہ سم احمر کے نام پر اور جس نمبر سے میسج آیا تھا وہ نمبر ظفر خلیل کے نام پر رجسٹرڈ تھا۔ انسپکٹر سوچنے لگا کہ اگر یہ نمبر ظفر کے استعمال میں ہے تو اس نے اس نمبر پر یہ میسج کیوں بھیجا تھا کہ ''تم مجھے مسلسل نظر انداز کر رہے ہو۔''

انسپکٹر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نمبر سے ظفر کا نمبر ملایا اور فون کو کان سے لگا لیا۔ کچھ دیر بیل جاتی رہی لیکن آگے سے کسی نے کال ریسیو نہیں کی اور بیل جانا بھی بند ہو گئی۔ انسپکٹر نے پھر کال کی..... بیل جانے لگی۔ لیکن پھر کسی نے فون ریسیو نہیں کیا۔ انسپکٹر نے پھر کوشش کی اور پھر تیسری بیل پر نسوانی آواز آئی۔

''کیا بات ہے.....اور تم کہاں ہو؟'' نسوانی آواز دھیمی تھی جیسے وہ چھپ کر بات کر رہی ہو۔

انسپکٹر نے ایک لمحے کے لیے حیرت سے سوچا اور اپنی آواز کو دھیمار کھتے ہوئے بولا۔ ''تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''تم احمر نہیں ہو.....؟ تم کون ہو؟ تم نے آواز بدلی ہے؟'' دوسری طرف سے حیرت زدہ آواز آئی۔

''تم کون ہو؟'' انسپکٹر بولا۔

دوسری طرف سے فوراً فون بند ہو گیا۔ انسپکٹر سوچنے لگا کہ یہ کون لڑکی ہو سکتی ہے؟ اگر یہ سم ظفر کے نام پر مخصوص ہے تو کہیں اس سم کو اس کی بہن ندا تو استعمال نہیں کر رہی ہے؟ اس خیال نے انسپکٹر کو چونکا دیا۔

☆☆☆

ایک دن گزر گیا تھا۔

احمر کی گرفتاری کہیں سے بھی عمل میں نہیں آئی تھی۔ سیٹھ حاکم کی تدفین ہو چکی تھی اور ان کے گھر میں مہمان موجود تھے۔ انسپکٹر عام کپڑوں میں ملبوس مہمانوں میں شامل تھا اور وہ دائیں بائیں گہری نگاہوں سے جائزہ بھی لے رہا تھا۔ ایس پی صاحب، سیٹھ حاکم کے دوستوں میں سے تھے اس لیے انسپکٹر کو ہدایت تھی کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے قاتل کو گرفتار کر کے کٹہرے میں کھڑا کر دے۔

احمر کا پکڑا جانا اور پھر اسے بھاگنے کا موقع دینا یہ تاثر بھی دیتا تھا کہ احمر ہی قتل کر کے بھاگا ہے۔ لیکن جگہ جگہ چھاپے مارنے کے باوجود اس کا کہیں سراغ نہیں ملا تھا۔

انسپکٹر ایک طرف کھڑا چوکیدار کی طرف دیکھ رہا تھا جو انتہائی مغموم تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جس نے ایک شخص کے ساتھ پچیس سال گزارے ہوں اس کے لیے اپنے مالک کی جدائی غمناک ہی ہو سکتی ہے۔ چوکیدار کے پاس اسے حوصلہ دینے کے لیے دو افراد بھی کھڑے تھے۔

اچانک ظفر چلتا ہوا انسپکٹر کے پاس آ گیا۔ ''آپ کے علم میں ایک بات لانی تھی۔''

''ہاں بتائیں کیا بات ہے؟'' انسپکٹر فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''دادا ابو کی چیک بک غائب ہے۔ اب مجھے اندازہ نہیں ہے کہ اس چیک بک میں کچھ چیک دستخط شدہ تھے کہ

نہیں۔ کیونکہ ایک بار دادا جان نے کہا تھا کہ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے اس لیے میں نے کچھ چیک دستخط کر کے رکھے ہیں تاکہ میرے مرنے کے بعد تم لوگوں کو بینک سے رقم لینے میں دشواری نہ ہو۔'' ظفر نے بتایا۔

''آپ کو علم ہے کہ اُن کے اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہوگی؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''مجھے شک ہے کہ اُن کے ذاتی اکاؤنٹ میں دو، سے تین کروڑ روپے ہوں گے۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ اُن کی چیک بک غائب ہے؟'' انسپکٹر نے اپنی نگاہیں دائیں اور بائیں گھمائیں جیسے وہ کسی کو دیکھ رہا ہو۔

''میں نے کل رات اُن کے سیف کا خفیہ خانہ کھولا تھا۔ وہاں دوسرے کاغذات موجود تھے لیکن چیک بک نہیں تھی۔''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ کام احمر کا ہی ہوگا؟''

''بالکل اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ یہ کام احمر کا ہی ہے۔ کیونکہ وہی دادا ابو کے کمرے کی ہر چیز سے واقف تھا۔ اسی نے پیسوں کے لیے دادا ابو کو مارا ہوگا۔'' ظفر پُریقین لہجے میں بولا۔

''اگر اس نے چیک بک لے لی تھی اور بینک سے پیسا بھی نکلوا لیا تھا تو پھر سیٹھ حاکم کو مارنے کا مقصد کیا ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کام کر کے مکر بھی سکتا تھا۔'' انسپکٹر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''یقیناً دادا ابو نے اُسے پکڑ لیا ہوگا۔ اپنا جرم چھپانے کے لیے اس نے یہ کام کیا ہوگا۔''

انسپکٹر سوچنے لگا۔ ''کیونکہ وہ اکاؤنٹ سیٹھ حاکم کے نام پر ہے اس لیے آپ یہ بھی معلوم نہیں کرسکتے کہ ان کے اکاؤنٹ میں کتنا پیسہ ہے اور کوئی چیک کیش ہوا ہے کہ نہیں۔''

''اس بینک کا منیجر ہمارا دوست تھا، اس سے ہم معلوم کرلیا کرتے تھے لیکن اب وہ چلا گیا ہے اور ایک بار نئے بینک منیجر سے میری ایک بات پر تلخی ہوگئی تھی وہ بڑا اکڑ و قسم کا شخص ہے۔ مجھ سے تو خار کھاتا ہے کیونکہ میں نے اس سے تلخی کے بعد اپنا اکاؤنٹ بند کردیا تھا اور صرف دادا جان کا اکاؤنٹ رہ گیا تھا۔ اب اگر میں نے اس سے رابطہ کیا تو وہ قانون کا سبق پڑھانا شروع کردے گا۔'' ظفر بولا۔

''آپ اپنے وکیل سے اس بارے میں بات کریں اور براہِ مہربانی مجھے اپنے اپنے موبائل نمبر دے دیں۔ یعنی آپ کا، آپ کی والدہ صاحبہ کا اور بہن ندا کا۔'' انسپکٹر نے اپنی جیب سے چھوٹی ڈائری اور پنسل نکال لی۔

ظفر موبائل نمبر لکھوانے لگا۔ جب اس نے تینوں کے موبائل نمبر لکھوا دیے تو انسپکٹر نے اپنی آنکھوں سے چوکیدار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا چوکیدار بہت دکھی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ سیٹھ حاکم کے ساتھ اسے بہت پیار تھا۔''

''چوکیدار نے اپنی زندگی دادا جان کے ساتھ گزاری ہے۔ دکھی تو ہوگا۔'' ظفر نے کہا۔

''اچھا مجھے ندا سے بات کرنی ہے۔ کیا میں اُس سے علیحدگی مل سکتا ہوں۔'' انسپکٹر بولا۔

''ہاں کیوں نہیں آجایئے۔'' ظفر نے کہا اور اسے اپنے ہمراہ اندر...... لے گیا۔ ظفر نے جو موبائل نمبر انسپکٹر کو لکھوائے تھے ان میں وہ نمبر بھی تھا جس نمبر سے احمر کو میسج بھیجا گیا تھا۔ وہ نمبر ندا کے استعمال میں تھا۔

گھر کے اندر بھی مہمان موجود تھے۔ اس لیے انسپکٹر راہداری میں رک گیا اور ندا سے اسی جگہ بات کرنے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد افسردہ چہرے کے ساتھ ندا آگئی۔

''مجھے آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا بس دو چار مختصر سوال کرنے ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے احمر کو سیٹھ حاکم کے کمرے میں جاتے اور پھر آتے اور فرار ہوتے ہوئے خود دیکھا تھا۔''

''جی ہاں۔''

''آپ کے ساتھ احمر کے تعلقات کیسے تھے؟'' انسپکٹر نے اچانک سوال کیا۔

اس نے یکدم چونک کر انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیسا سوال ہے؟''

''یہ ایک عام سا سوال ہے۔''

''تعلق سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' ندا نے وضاحت چاہی۔ اُس کے لہجے میں تغیر آگیا تھا۔

''مطلب کہ اس کے ساتھ دوستی تھی یا دوستی کرنے کی کوشش تھی۔'' انسپکٹر نے سوال کرنے کے بعد اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کردیں۔ ندا کے چہرے کے اتار چڑھاؤ میں پل پل تغیر پیدا ہو رہا تھا۔

''انسپکٹر صاحب آپ اس کیس کی تفتیش کر رہے ہے کہ ایسے

سوال کر کے ہماری زندگیوں میں جھانکنے کی کوشش کررہے ہیں؟'' ندا بولی۔

''آپ میرے سوال کا غلط مطلب سمجھ رہی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ احمر کی توجہ چاہتی تھیں۔''

''اگر آپ کو ایسا لگ رہا ہے تو یہ غلط لگ رہا ہے۔'' ندا کا لہجہ اکھڑ سا گیا اور اس نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

''شاید احمر آپ کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا اور آپ نے اسی لیے اسے میسج لکھا تھا کہ تم مجھے مسلسل نظر انداز کررہے ہو۔'' انسپکٹر بولا۔

اس بات نے ندا کے چہرے کا رنگ تبدیل کر دیا۔ وہ انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگی اور پھر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''میں نے ایسا کوئی میسج احمر کو نہیں لکھا تھا۔''

''یہ بات ریکارڈ میں ہے۔ میں پوری تفصیل بتا سکتا ہوں کہ آپ نے وہ میسج کس دن، کتنے بجے کس نمبر پر بھیجا تھا۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''اس لیے بہتر ہے کہ آپ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں اور صاف صاف بتا دیں۔ مجھے یہ کیس حل کرنے میں آسانی رہے گی۔ میں ہر زاویے سے دیکھ سکوں گا کہ یہ قتل کیوں ہوا۔''

''ہمارے بیچ کچھ بھی نہیں تھا۔''

''لیکن آپ چاہتی تھیں کہ کچھ ہو۔''

''وہ میری بے وقوفی تھی۔''

''اور آپ کی بے وقوفی کو وہ مسلسل نظر انداز کرتا رہا؟'' انسپکٹر کی نگاہیں ندا کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''مجھے جلدی ہی احساس ہوگیا اور میں نے اس سے اپنی توجہ ہٹالی۔'' ندا نے کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ نے اس چیز کا بدلہ لینے کے لیے اس پر قتل کا الزام لگا دیا ہو۔'' انسپکٹر کے اس سوال نے گویا ندا کا منہ خار سے بھر دیا۔

ندا عام لڑکیوں سے مختلف تھی۔ اس نے جھٹ سے کہہ دیا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میرے دادا جان کی لوٹی ہوئی دولت سے احمر نے آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہو اور آپ اس کیس کو کسی طرح سے فائل میں بند کر دینا چاہتے ہوں۔ احمر کو پکڑا نہیں اور آپ کی قیاس آرائی کچھ اور ہی رخ اختیار کرتی جارہی ہے۔''

اس کی بات سن کر انسپکٹر مسکرایا۔ ''آپ کو کیسے پتا ہے کہ اس نے آپ کے دادا جان کی دولت بھی لوٹی ہے۔''

''بھائی بتا رہے تھے کہ اُن کی چیک بک غائب ہے۔''

''اور احمر قتل کرنے کے بعد میرے پاس آگیا اور اس نے ایک چیک مجھے تھما کر کہہ دیا کہ میں اپنی آنکھیں بند کرلوں۔'' انسپکٹر مسلسل اس کی بات پر مسکرا رہا تھا۔

''ممکن ہے۔''

''مس ندا میں نے اپنی زندگی میں کوئی کیس فائل میں بند کر کے اس پر گرد جمنے کے لیے نہیں چھوڑا۔ اچھا ہوتا کہ احمر مجھے مل جاتا تو آج کیس حل ہو چکا ہوتا۔ لیکن میں اس کیس کو حل کر کے چھوڑوں گا۔ مجھے امید ہے کہ آج شام تک احمر کو پولیس ڈھونڈ نکالے گی۔''

''اب مجھے جانے کی اجازت ہے؟'' ندا پر اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے روکھے لہجے میں جانے کی اجازت چاہی۔

''آپ جاسکتی ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا تو ندا غصے سے چلی گئی۔

انسپکٹر کچھ دیر گھر کے باہر ٹہلتا رہا۔ لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کی نظر کس طرف ہے اور وہ سوچ کیا رہا ہے۔ انسپکٹر کا یہی کمال تھا کہ وہ جو کرتا تھا، اس کا کسی کو پتا نہیں لگنے دیتا تھا اور جہاں اس کی نظر ہوتی تھی کوئی اس کی نظر کا تعاقب نہیں کرسکتا تھا۔ پھر وہ اپنی جیپ میں بیٹھا اور گھر سے چلا گیا۔

☆☆☆

سارا دن انسپکٹر اپنے کام میں مصروف رہا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو انسپکٹر نے اپنا کام ختم کیا اور گھر جانے کی راہ لی۔

وہ گھر پہنچا تو اس کا ذہن اس کیس میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی بیوی چند دنوں کے لیے میکے گئی ہوئی تھی جو اسی شہر میں تھا۔ گھر کی خاموشی اور اس کیس کی الجھن نے انسپکٹر کو مضطرب کر دیا اور وہ کچھ دیر باہر نکلنے کا سوچنے لگا۔

انسپکٹر گھر سے باہر نکل کر پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔ وہ خراماں خراماں چلتے ہوئے گلی سے باہر نکل کر سڑک پر آگیا اور فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ اس سڑک پر ٹریفک کا زیادہ رش نہیں ہوتا تھا۔ اچانک پیچھے سے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل آئی۔ موٹر سائیکل سوار کا چہرہ نقاب میں تھا۔ موٹر سائیکل کی رفتار غیر معمولی تھی۔ جیسے ہی وہ انسپکٹر کے پاس آئی، موٹر سائیکل سوار نے اپنی بغل میں دبائے موٹے ڈنڈے کو سیدھا کیا اور پوری قوت سے انسپکٹر کی کمر پر رسید کر دیا اور اس کے ساتھ وہ اسی رفتار سے آگے نکل گیا۔

انسپکٹر کے لیے یہ غیر متوقع تھا اور وہ اسی جگہ دہرا ہوگیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر سیدھا کیا

اور تیزی سے آگے جاتی ہوئی موٹر سائیکل کی طرف دیکھا۔

موٹر سائیکل زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ اچانک وہ پھسلی اور سڑک پر گر گئی۔ موٹر سائیکل اور اس کا سوار سڑک پر دور تک پھسلتے چلے گئے۔

انسپکٹر کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ وہ جلدی سے موٹر سائیکل کی طرف دوڑنے لگا۔

موٹر سائیکل سوار نے دیکھ لیا تھا کہ انسپکٹر بھاگتا ہوا اس کی طرف آرہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا، حالانکہ اس کی ٹانگوں پر اچھی خاصی خراشیں آئی تھیں، لیکن اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔

انسپکٹر برق رفتاری سے بھاگ رہا تھا۔ لیکن اس کی رفتار بھی کم نہیں تھی۔ اس نے بھاگتے ہوئے آتی ہوئی کار کے اوپر سے جست لگائی اور کار کی دوسری طرف چلا گیا۔ وہ بہت پھرتیلا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا بہت آگے نکل گیا۔

انسپکٹر کوشش کے باوجود اس تک نہیں پہنچ سکا۔ وہ رک گیا اور متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگا، لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

انسپکٹر واپس اس جگہ آیا جہاں اس کی موٹر سائیکل گری ہوئی تھی۔ اچانک اس کے موبائل فون پر میسج ٹون بلند ہوئی۔ اس نے موبائل فون کی اسکرین دیکھی تو پیغام لکھا تھا۔

''اس کیس سے دور رہو، اور جو ہوگیا اس کی فائل بند کردو ورنہ نتیجہ برا ہوگا۔ اگلی بار ڈنڈا کمر پر نہیں لگے گا۔''

انسپکٹر نے اس میسج کو دو بار پڑھا اور پھر تھانے فون کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد وہاں پولیس وین آ گئی۔ موٹر سائیکل لے کر وہ تھانے آئے تو انسپکٹر نے پہلا حکم یہ دیا کہ موٹر سائیکل اور جس نمبر سے اسے میسج موصول ہوا تھا، اس کے بارے میں معلوم کیا جائے کہ دونوں چیزیں کس کے نام پر رجسٹر ہیں۔

انسپکٹر اس بارے میں سوچتا رہا کہ وہ کون تھا جس نے اسے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ سیٹھ حاکم کا قتل کسی طاقتور گروہ کا کام ہو؟

کچھ ہی دیر میں رپورٹ آ گئی اور انسپکٹر کے لیے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ موٹر سائیکل اس واقعے سے کچھ دیر قبل ہی کسی سے چھینی گئی تھی اور موٹر سائیکل کے مالک نے تھانے میں رپورٹ بھی درج کرائی تھی جبکہ موبائل فون بھی اسی دوران ہی چھینا گیا تھا اور اس موبائل فون کے چھن جانے کی بھی تھانے میں رپورٹ درج تھی اور رپورٹ میں سم کا نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہے، اس نے اپنے آپ کو پوری طرح سے محفوظ رکھ کر یہ کام کیا ہے۔''

''آپ نے مجھ سے کچھ کہا سر؟'' پاس کھڑے سپاہی نے جلدی سے کہا۔

''تم نے کچھ سنا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''میں ٹھیک سے سن نہیں سکا سر۔ آپ نے مجھے کیا کہا تھا سر؟'' اس نے انسپکٹر اور تذبذب کی طرف دیکھا۔

''ایک بات بتاؤ۔ اگر تم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھو کہ تمہارے سامنے ایک شخص نے قتل کیا ہے۔ اور اس قتل کا گواہ ایک اور شخص بھی ہو۔ دونوں کے بیان ایک جیسے ہوں اور قاتل اتنا شاطر ہو کہ وہ اپنا کام کر کے ٹھیک وقت پر ٹرین میں بھی سوار ہو جائے تمہارے خیال میں وہ شخص کتنا پھرتیلا ہوگا؟'' انسپکٹر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

سپاہی نے پہلے تو غور سے انسپکٹر کو دیکھا اور پھر بولا۔ ''سر وہ پھرتیلا ہی نہیں بہت بڑا منصوبہ ساز بھی ہے۔''

''ہاں...... یہ تو تم نے ٹھیک کہا کہ وہ بہت بڑا منصوبہ ساز بھی ہے۔ اس نے ایک ایک منٹ کا حساب لگا رکھا تھا۔ کب وہ گھر کے اندر آئے گا، کتنی دیر میں قتل کرے گا اور فرار ہونے میں کتنا وقت لیتے ہوئے ٹرین میں سوار ہو کر وہاں سے چلا جائے گا۔'' انسپکٹر کہہ رہا تھا۔ ''اور آج مجھے خبردار کیا جا رہا ہے کہ میں اس کیس سے پیچھے ہٹ جاؤں اور وہ بھی اس طرح کے ہم اس تک پہنچ نہ سکیں...... واقعی وہ چالاک ہے۔''

''جی سر...... بالکل......'' سپاہی کو... کچھ بات سمجھ میں آئی تھی اور باقی باتوں کے لیے اس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنے ماتحت ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔

''اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' انسپکٹر نے سپاہی کی طرف دیکھا۔ سپاہی سوچنے لگا کہ وہ کیا جواب دے۔ انسپکٹر نے پھر پوچھا۔ ''کیا مجھے ڈر کر بیٹھ جانا چاہیے؟''

''نہیں سر...... آپ کو ڈرنا نہیں چاہیے۔''

''اگر میں ڈر کر نہ بیٹھا تو وہ مجھ پر اور شدت سے حملہ کرے گا۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''لیکن سر اگر آپ اپنے آپ کو تیار رکھیں گے تو کوئی شدت آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔''

اس کی بات سن کر انسپکٹر مسکرایا۔ ''بس میں یہی سننا چاہتا تھا۔ تمہاری بات نے میرے اندر ہمت بھر دی ہے۔ اگر وہ شدت سے حملہ کرے گا تو میں بھی چٹان بن کر اس کے

سامنے کھڑا ہو جاؤں گا۔''

انسپکٹر کا یہ انداز تھا کہ وہ بعض اوقات کسی نقطے کو پانے کے لیے اپنے سپاہیوں سے ایسی باتیں چھیڑ دیتا تھا۔ کوئی اہلکار ایسی بات کہہ دیتا تھا جس سے انسپکٹر کو ایک نیا خیال مل جاتا تھا، نئی سوچ جنم لے لیتی تھی اور نیا راستہ نکل آتا تھا۔ لیکن اس اہلکار کے ساتھ بات کر کے انسپکٹر کی سوچ میں اتنا اضافہ ہوا تھا کہ وہ شاطر منصوبہ ساز ہے۔ اس نے محض قتل ہی نہیں کیا بلکہ قتل کرنے کے بعد اس کی نظر انسپکٹر پر بھی تھی کہ وہ اس کیس کو حل کرنے کے لیے کیا کر رہا ہے۔

انسپکٹر کے جسم پر کچھ خراشیں آئی تھیں۔ وہ تھانے سے نکل کر پیدل ہی ڈاکٹر کی طرف چل نکلا۔ ابھی وہ کچھ دور ہی گیا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔

☆☆☆

ندا نے کمرے میں جھانکا تو سامنے ظفر کھڑا تھا۔ ظفر کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔ یکدم ندا کو دیکھ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کاغذات ایک طرف رکھ دیے اور پوچھا۔

''کیا بات ہے ندا؟''

''بھائی مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' ندا کمرے میں چلی آئی اور ظفر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''ہاں بولو کیا بات کرنی ہے؟'' ظفر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

ندا نے کچھ ثانیے کے لیے توقف کیا اور پھر بولی۔ ''دادا ابو کی وفات کے بعد اب اس ساری جائداد کے ہم دو وارث رہ گئے ہیں۔''

''بالکل.....'' ظفر کی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں۔

''ساری جائداد کے ہم دو ہی وارث ہیں۔''

''ہمیں زندگی کی حقیقت کو سامنے رکھ کر بات کرنی چاہیے۔ یہ گھر، کاروبار، بینک بیلنس سب آپ کے اختیار میں رہے گا۔ کیونکہ بزنس میں نہیں کر سکتی، اور یہ گھر چھوڑ کر مجھے ایک نہ ایک دن جانا ہی ہے۔'' ندا کے لہجے میں کوئی جھجک نہیں تھی۔

''شاید تمہارا اشارہ اپنی شادی کی طرف ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ تم اس گھر سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلی جاؤ گی۔'' ظفر اس کی بات کو سمجھتے ہوئے بولا۔

''اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ گھر میرا نہیں ہے، آپ کا ہے۔ آپ کی ہونے والی بیوی اور بچوں کا ہے۔''

''تم جو کہنا چاہتی ہو کھل کر کہہ دو۔'' ظفر اُس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ جبکہ ندا اسی جگہ کھڑی رہی۔

''مجھے جو بھی ملے گا، وہ کیش کی صورت میں ملے گا یا پھر وہ جائداد ملے گی جو اس گھر کے علاوہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے میرا حصہ دے دیں۔'' ندا نے دوٹوک کہہ دیا۔

''اس کے لیے ابھی کچھ قانونی مسائل ہیں، وہ دور ہوں گے تو ہم جائداد کی تقسیم کر سکیں گے۔'' ظفر نے کہا۔

''جو بھی قانونی مسائل ہیں، وہ آپ حل کریں اور جو میرا حصہ بنتا ہے وہ مجھے دے دیں۔''

''تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے ندا؟''

''کیونکہ میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''کیا.....؟ تم شادی کرنا چاہتی ہو؟'' ظفر چونکا۔

''اس میں اتنا حیران ہونے والی کونسی بات ہے۔ ایک نہ ایک دن تو مجھے شادی کرنی ہی ہے۔ پھر ابھی کیوں نہیں۔'' ندا بولی۔

''تم پاگل ہوگئی ہو ندا؟ ابھی تم پڑھ رہی ہو۔ تمہیں اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔ تمہاری شادی کرنا ہماری ذمّے داری ہے۔'' ظفر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''پڑھ لکھنے کے بعد بھی تو لڑکی کو شادی ہی کرنی ہوتی ہے۔ ویسے بھی مجھے پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں شادی کر کے دنیا گھومنا چاہتی ہوں۔ میرے حصے میں جو کروڑوں کی جائداد اور بینک بیلنس آئے گا، وہ مجھے دے دیں۔ میرا اور کوئی مطالبہ نہیں ہے۔'' ندا نے کہا۔

''میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ تمہاری ماں ابھی زندہ ہے۔ تمہاری شادی کا فیصلہ ہم کریں گے۔''

''جس سے مجھے شادی کرنی ہے، وہ فیصلہ میں کر چکی ہوں۔ آپ کو تردّد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ندا کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''کون ہے وہ؟'' ظفر نے پوچھا۔

''وقت آئے گا تو بتا دوں گی بلکہ آپ سے ملوا بھی دوں گی۔ پہلے آپ مجھے میرا حصہ دیں۔''

''تم بچپن سے ہی جذباتی ہو۔ تمہاری عادت ہے کہ تم جس بات پر جم جاتی ہو پھر تم کچھ نہیں دیکھتیں میرا مشورہ ہے کہ تم اب بچپنا چھوڑ دو۔'' ظفر اس کی بات سے زچ ہو کر بولا۔

''مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بالغ ہوں اور اپنے فیصلے خود کرنے کا اختیار رکھتی ہوں۔ وکیل صاحب کو بلائیں اور مجھے میرا حصہ دے دیں۔'' ندا کو بالکل بھی اپنے بھائی کا لحاظ نہیں تھا، اس کی ایک ہی رٹ تھی۔

''یہ بات تم نے امی سے کی ہے؟''
''ہاں کی ہے......''
''پھر انہوں نے کیا کہا......؟''
ندا نے ظفر کی طرف دیکھا اور پھر بے پروائی سے بولی۔ ''میں نے ان کو اپنی بات بتادی ہے۔ اب وہ میری بات اپنے دل کو لگا کر سکتے میں بیٹھی رہیں یا خاموش ہوجائیں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ندا یہ کہہ کر کمرے سے چلی گئی اور ظفر اس کے رویّے پر دم بخود کھڑا رہ گیا۔

جیسے ہی ندا کمرے سے باہر نکلی، کچھ قدم چلنے کے بعد رک گئی۔ اس نے اپنا موبائل فون کان سے لگایا اور کچھ دیر کے بعد بولی۔ ''میں نے بھائی سے بات کرلی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اسی ہفتے اپنی جائداد کا حصہ لے لوں گی...... اس کے بعد ہم شادی کرلیں گے۔'' ندا مسکرائی اور دوسری طرف سے کچھ سنتی رہی اور پھر اس نے فون بند کردیا۔ یہ بات عقب میں کھڑے ظفر نے سن لی تھی۔ ندا جانے لگی تو ظفر نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم کو جائداد میں سے اپنا حصہ مانگنے پر وہ اُکسا رہا ہے۔''

ندا نے پلٹ کر ظفر کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولی۔ ''وہ اکسا نہیں رہا، یہ میرا فیصلہ ہے۔'' ندا کہہ کر چلی گئی۔

ظفر ابھی اس جگہ کھڑا سوچ رہا تھا کہ اچانک اسے ندا کے چلاّنے کی آواز سنائی دی۔ وہ آواز کی سمت بھاگا تو ندا باہر چوکیدار منظور خان کو اپنے سامنے کھڑا کیے غصے سے کہہ رہی تھی۔

''کتنی بار کہا ہے کہ اب کُتوں کو باندھ کر رکھا کریں...... مجھے کتوں سے ہمیشہ سے نفرت رہی ہے لیکن میں دادا جان کی وجہ سے چپ رہتی تھی...... اسے باندھ کر رکھا کریں......''

''جی اب میں باندھ کر ہی رکھوں گا۔'' منظور خان نے کہا اور کتّوں کی طرف بھاگا۔ ندا پیر پٹخ کر اندر چلی گئی۔ جبکہ ظفر کے لیے ندا کا رویّہ حیران کن تھا۔

☆☆☆

کار کا ہارن سن کر منظور خان نے گیٹ کی چھوٹی کھڑکی سے باہر جھانکا تو کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر انسپکٹر بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔ دونوں نے پولیس کی وردی نہیں پہنی تھی۔

منظور خان کو کیونکہ ظفر کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ انسپکٹر کے لیے کسی بھی وقت گیٹ کھول سکتا ہے تو منظور خان نے گیٹ کھول دیا۔ انسپکٹر کار اندر لے گیا۔ انسپکٹر نے پہلے ہی ظفر کو اطلاع کردی تھی، وہ اس کے گھر آرہا ہے۔

جیسے ہی انسپکٹر اور وہ آدمی کار سے باہر نکلے، اندر سے ملازم آیا اور دونوں کو ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ظفر بھی آگیا۔ انسپکٹر نے ندا اور ظفر کی ماں کو بھی اس جگہ لانے کے لیے کہا۔ زیادہ دیر نہیں لگی اور ظفر کی ماں ڈرائنگ روم میں آگئیں جبکہ ندا نخرے سے وہاں آئی اور ایک طرف منہ بنا کر بیٹھ گئی۔

''میں کچھ چیزیں آپ کے سامنے بیان کرنے کے لیے آیا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا۔
''بالکل بتائیں۔'' ظفر بولا۔

''میں اس کیس کو حل کرنے کے لیے پوری کوشش کررہا ہوں۔ اس گھر کے چوکیدار اور آپ کی بہن ندا نے یہ دیکھا ہے کہ کس طرح سے احمر نے سیٹھ حاکم کو نیچے پھینکا اور وہ ندا کے سامنے باہر فرار ہوگیا۔ کچھ چیزیں بڑی عجیب ہیں۔'' انسپکٹر کہتا کہتا رک گیا۔ ظفر نے چونک کر انسپکٹر کی طرف دیکھا جبکہ ندا بے پروا سی بیٹھی رہی۔

''وہ کیا انسپکٹر صاحب؟'' ظفر نے پوچھا۔

''وہ یہ کہ قاتل کی انگلیوں کے نشان سیٹھ حاکم کے کمرے کے دروازے پر تو ہیں لیکن کہیں اور نہیں ہیں۔ اسی طرح سیڑھی پر ہیں لیکن خاردار تاروں پر، یا کسی دیوار پر نہیں ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ قاتل بار بار دستانے پہنتا اور اتارتا رہا تھا؟ اس کے علاوہ جو حیران کن بات ہے وہ یہ ہے کہ ایک اور بھی ہے جس کے ہاتھوں کے نشان سیٹھ حاکم کے کمرے کی مختلف جگہوں پر موجود تھے۔''

''وہ نشان کس کے ہیں؟'' ظفر نے چونک کر پوچھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی پریشانی عیاں ہوگئی تھی۔

انسپکٹر نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لیے مجھے آپ لوگوں کے فنگر پرنٹ لینے ہوں گے۔''

''ہمارے فنگر پرنٹ کیوں؟'' ظفر بولا۔

''تب ہی پتا چلے گا کہ وہ فنگر پرنٹ کس سے ملتے ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''اگر وہ فنگر پرنٹ آپ میں سے کسی کے ساتھ نہیں ملے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ احمر کے ساتھ کوئی اور بھی تھا لیکن احمر تو گھر سے فرار ہوگیا اور اکیلے احمر کو ہی ندا نے فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا، پھر وہ کہاں گیا؟'' انسپکٹر نے کہہ کر سب کی طرف دیکھا۔

ظفر اور اس کی ماں حیرت زدہ تھے لیکن ندا ایسی تھی کہ جیسے وہ یہاں زبردستی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اس کی اب ایک ہی چاہ تھی کہ اسے جائداد میں سے اس کا حصہ ملے اور وہ اس گرداب سے باہر نکل جائے۔

''وہ کون ہوسکتا ہے اور ندا نے اُسے کیوں نہیں دیکھا؟'' ظفر متحیر لہجے میں بولا۔

''اس سے پہلے کہ ہم یہ سوچیں کہ وہ کون تھا، اسے کس نے دیکھا، یا کس نے نہیں دیکھا، مجھے آپ سب کے فنگر پرنٹ لینے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو منظور خان کو بھی یہاں بلانا پڑے گا۔''

''ہاں آپ کی بات ٹھیک ہے۔''

''اس گھر میں نوکر کتنے ہیں؟''

''دو ہیں۔ ایک خانساماں اور دوسرا گھر کی دیکھ بھال کے لیے۔'' ظفر نے بتایا۔

''انہیں بھی بلالیں۔''

تھوڑی دیر میں سبھی اس کمرے میں جمع ہوگئے اور انسپکٹر کے ساتھ آئے ہوئے شخص نے سب کے فنگر پرنٹ لیے اور ملازموں کو جانے کی اجازت دے دی۔ اچانک انسپکٹر نے ندا سے کہا۔

''شاید آپ کو اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ میں یہ کیس حل کروں، یا نہ کروں۔ آپ کے دادا جان کا قاتل سامنے آئے یا نہ آئے، اسی لیے آپ کسی کو میسج کرنے میں مگن ہیں۔''

''میری دوست ہے۔ آپ میرا موبائل فون چیک کرسکتے ہیں۔ جو میسج میں نے کیا ہے وہ بھی محفوظ ہے۔'' ندا نے اپنا موبائل فون انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔

''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے میں آپ کی دلچسپی کی بات کررہا ہوں۔'' انسپکٹر بولا۔

''مجھے آپ کی سمجھ نہیں آتی۔ قاتل سامنے ہے۔ میں نے اُسے خود دیکھا ہے۔ دوسری گواہی چوکیدار کی ہے۔ آپ اسے گرفتار کرنے کے بجائے دوسرے معاملات کی طرف چل رہے ہیں۔ شاید آپ کو اس گھر کی چائے پسند آگئی ہے۔''

''چائے تو میں نے ایک دن بھی نہیں پی۔'' انسپکٹر کہہ کر مسکرایا۔

''ندا...... تم کو بات کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے۔'' ظفر نے اسے سرزنش کی۔

''کوئی بات نہیں، ندا کو بولنے کا پورا حق ہے۔ یہ میرا اعتراف ہے کہ ہم ابھی تک احمر کو گرفتار نہیں کرسکے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم نے اس کی گرفتاری کے لیے ہمت ہاردی ہو، یا کوتاہی سے کام لینا شروع کردیا ہو۔ وہ کام اپنی جگہ جاری ہے لیکن اس وقت ہمیں اسے تلاش کرنا ہے جس کے ہاتھوں کے نشان ہمیں ملے ہیں۔ میں نے آپ سب کے فنگر پرنٹ لے لیے ہیں آج ہی اس کا رزلٹ لے کر آؤں گا۔'' انسپکٹر نے کہا اور اپنے ساتھی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ظفر کا چہرہ مضطرب تھا اور وہ جلدی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر نے سب کے فنگر پرنٹ کی رپورٹ لی اور ایک بار پھر سیٹھ حاکم کے گھر کا رخ کیا۔ سب کو ایک جگہ پھر جمع کرلیا اور انسپکٹر حاکم نے منظور خان سے سوال کیا۔

''جب احمر کار لے کر آیا تھا تو تم نے غور سے دیکھا تھا کہ وہ اکیلا ہی آیا تھا؟''

''جی وہ اکیلے ہی تھے۔'' منظور خان نے بلا تامل جواب دیا۔

''اس دن کوئی اور اس گھر میں آیا ہو اور وہ سیٹھ حاکم کے کمرے میں گیا ہو؟''

''اور تو کوئی نہیں آیا تھا...... کوئی نہیں آیا تھا۔'' منظور خان نے سوچ کر پھر نفی میں گردن ہلادی۔

''تم پورے یقین سے کہہ رہے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''آپ سب کے ہاتھوں کے نشان اس نشان سے نہیں ملتے۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی اور بھی تھا۔'' انسپکٹر نے انکشاف کیا۔

''وہ کون ہوسکتا ہے؟'' ظفر نے پوچھا۔

''ابھی اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے لیکن آج میں ایک بات واضح کردوں۔ چوکیدار منظور خان اور ندا کے کہنے کے مطابق احمر نے سیٹھ حاکم کو قتل کیا اور پھر گھر کے عقب کی طرف سے سیڑھی پر چڑھ کر دوسری طرف کود کر فرار ہوگیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ احمر نے سیٹھ حاکم کو مارنے کے لیے انہیں کھڑکی سے باہر کیوں پھینکا؟ وہ اُن کا گلا دبا کر انہیں موت کی نیند سلا کر بڑی آسانی سے نیچے آتا، اور چوکیدار کے پاس سے ہوکر چلا جاتا۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوتی کہ احمر اپنا کام کرچکا ہے۔'' انسپکٹر نے کہا تو سب نے سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

کچھ توقف کے بعد انسپکٹر نے کہا۔'' مزید حیران کن

بات یہ ہے کہ جب ہم یہاں پہنچے اور میرے آدمیوں نے باہر کی طرف کا جائزہ لیا تو یہ انکشاف ہوا کہ گھر کے اندر سے کوئی بھی باہر کی طرف نہیں کودا۔''

انسپکٹر کے اس انکشاف نے سب کے چہروں پر سنسنی دوڑا دی۔ انسپکٹر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''گھر کے عقب میں ایک سڑک ہے۔ سڑک کی دونوں جانب کچی زمین ہے۔ اگر احمر دس فٹ کی دیوار سے سڑک کے اوپر چھلانگ لگاتا تو احمر کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ باہر محفوظ جانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ دیوار کے اوپر چڑھ کر دیوار کے ساتھ گھسٹتا ہوا نیچے اترتا، یا پھر وہ کچی زمین پر کودتا، لیکن کچی زمین پر کودنے کا کوئی نشان نہیں تھا، دیوار کے ساتھ جوتوں کے نشان موجود نہیں تھے اور سڑک پر کود کر وہ اپنی ہڈی نہیں تڑوا سکتا تھا۔ ہمیں کوئی ایسا نشان نہیں ملا۔''

''ہوسکتا ہے باہر اس کے ساتھی ہوں اور انہوں نے بھی وہاں سیڑھی لگائی ہوئی ہو۔'' ندا جلدی سے بولی۔

''ایسا کچھ نہیں تھا۔ منظور خان نے احمر کو خود دیکھا کہ اس نے سیٹھ حاکم کو کھڑکی سے نیچے پھینکا۔ ندا نے دیکھا کہ وہ گھر کے عقب سے فرار ہوا۔ جبکہ ہماری رپورٹ یہ کہتی ہے کہ وہ باہر نہیں کودا تو اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ وہ اس وسیع اور بڑے گھر میں ہی چھپا ہوا ہے۔'' انسپکٹر نے اپنی بات مکمل کر کے دم بخود ظفر کی طرف دیکھا۔

''وہ اس گھر میں ہے تو پھر آپ کا وہ کہنا کہ آپ نے احمر کو ٹرین کے ڈبے سے پکڑ لیا تھا اور وہاں ہنگامہ ہوجانے کی وجہ سے وہ بھاگ جانے میں کامیاب ہوگیا۔ تو وہ آپ کا دعویٰ جھوٹا تھا۔'' ندا تمسخر سے بولی۔

''ممکن ہے کہ احمر کی جگہ اس کی بکنگ پر کوئی اور سفر کر رہا ہو؟'' انسپکٹر بولا۔

''یہ تو بہت اُلجھا ہوا معاملہ ہے۔'' ظفر نے سوچتے ہوئے اپنی ٹھوڑی کھجائی۔

''اس سے بھی زیادہ الجھا معاملہ یہ ہے کہ وہ کون ہے جس کی انگلیوں کے نشان ہیں۔ اس قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ کیا اس کے پیچھے ظفر صاحب آپ کا ہاتھ ہے؟''

ظفر کی جان ہی نکل گئی۔ ''میرا ہاتھ؟''

''دیکھیں آپ کو بھی اپنے دادا جان سے بہت اختلاف تھا۔ جب حساب لیتے ہوئے وہ بال کی کھال اتارتے تھے تو آپ اکتا جاتے تھے۔ آپ اپنی مرضی کا فیصلہ نہیں کرسکتے تھے۔ آپ کو پوری طرح سے اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ سارے بزنس کا مالک ہونے کے باوجود آپ کی حیثیت ملازم جیسی تھی۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''لیکن......'' ظفر نے کہنا چاہا تو انسپکٹر نے اسے بولنے سے روک دیا اور بولا۔

''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے پیچھے ندا کا ہاتھ ہو۔''

''میرا ہاتھ کیسے ہوسکتا ہے؟'' ندا نے آنکھیں نکال کر انسپکٹر کی طرف دیکھا۔

''کیونکہ آپ نے اپنے دادا جان سے اپنے حصے کا مطالبہ جو کردیا تھا اور آپ کے دادا جان کو آپ کی وہ بات اتنی بری لگی تھی کہ انہوں نے آپ سے بات چیت بند کردی تھی۔'' انسپکٹر کی بات پر ظفر اور اس کی ماں نے بیک وقت ندا کی طرف دیکھا اور ندا نے اپنی آنکھیں چرالیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ بات ظفر اور اس کی ماں کو پہلی بار معلوم ہورہی ہو۔

''لیکن میری صلح ہوگئی تھی۔'' ندا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''میرا نہیں خیال کہ آپ کی صلح ہوئی تھی۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''وہ آپ سے سخت ناراض تھے۔''

''یہ محض آپ کا خیال ہے۔'' ندا نے اس کی بات کو رد کردیا۔

''خیر...... مجھے یہ بھی شک ہے کہ سیٹھ حاکم کو مسز خلیل نے قتل کرایا ہو۔'' انسپکٹر نے جیسے ہی یہ الفاظ کہے، ظفر اور ندا کی ماں مسز خلیل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جبکہ ندا اور ظفر کی بھی حیرت دوچند ہوگئی۔

''میں یہ کام کرواسکتی ہوں؟'' مسز خلیل کی سانس تیز ہوگئی۔

''دیکھیں مسز خلیل...... جب آپ بیوہ ہوئیں تو سیٹھ حاکم نے آپ پر گھر سے باہر جانے کی پابندی عائد کردی اور آپ کو اس گھر کی دیواروں میں دفن کردیا کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ آپ دوسری شادی کرلیں گی اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔''

''آپ کو یہ باتیں بتائی کس نے ہیں؟'' مسز خلیل حیرت زدہ تھیں۔ ان کی نگاہیں انسپکٹر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''دیکھیں میں اس کیس کی تفتیش کررہا ہوں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہوسکتا کہ میں کیسے کام کررہا ہوں۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ ابھی جو میں نے کہا ہے کیا وہ سچ ہے؟''

مسز خلیل نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں لے کر چبایا اور پھر بولیں۔ ''ان کے دادا کو عجیب وہم ہوگیا تھا۔ ان کے

دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ میں دوسری شادی کرلوں گی۔ انہوں نے میرا اس گھر سے نکلنا بند کردیا تھا۔ میں خاندان کی کسی شادی میں نہیں جاتی تھی۔ میرے لیے اس گھر کی چار دیواری قبر بن گئی تھی۔ میں بھول گئی ہوں کہ باہر کی دنیا کیسی ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میرے دل میں خلیل کے بعد کسی دوسرے کے ساتھ شادی کرنے کا تصور بھی نہیں تھا۔ میں نے کئی بار ان کے دادا کو یقین دلانے کی کوشش کی لیکن وہ میری بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھے۔''

''اور آپ کو اس بات سے نفرت ہونے لگی تھی۔ آپ اس گھر میں قید ہوکر ایک اذیت میں مبتلا ہوگئی تھیں۔''

''ہاں یہ سچ ہے۔''

''اور آپ ان کے دادا سے نفرت کرنے لگی تھیں؟''

''آپ اسے نفرت نہیں کہہ سکتے لیکن مجھے ان پر غصہ آتا تھا۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ خود جب گھر سے باہر جاتے تھے تو میرے کمرے کو لاک کردیا کرتے تھے۔ میں عجیب اذیت سے دوچار تھی اور اس قید سے نجات چاہتی تھی۔'' مسز خلیل کے لہجے میں متانت تھی۔

''آپ آزادی چاہتی تھیں؟''

''ہاں میں آزادی چاہتی تھی۔'' مسز خلیل نے اقرار کیا۔

''لیکن اُن کی زندگی میں یہ ممکن نہیں تھا۔'' انسپکٹر بولا۔

''یہ بھی حقیقت تھی۔'' مسز خلیل نے اس بات کو بھی مان لیا۔

''اور پھر سیٹھ حاکم کو کھڑکی سے باہر پھینک کر مار دیا گیا۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''میں ایسا قدم اُٹھانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی اور نہ میں نے ایسا کیا ہے۔'' مسز خلیل جلدی سے بولیں۔

''آپ تینوں اپنی اپنی جگہ اس شخص سے کسی نہ کسی طرح زچ تھے۔ جبکہ احمر تو ان کا دوست تھا۔ ان کے کام کرتا تھا۔ ان کے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا۔ خوب لطف اندوز ہوتا تھا۔''

''وہ آفس اور پھر دادا جان کی نوکری کرتے کرتے تنگ آچکا تھا۔'' ندا نے کہا۔

''لیکن وہ بہت ٹھنڈے مزاج کا نوجوان ہے۔ اس نے کبھی اس کام کو بوجھ نہیں سمجھا۔''

''احمر ایک بار دادا جان کے کمرے سے بڑبڑاتے ہوئے بھی نکلا تھا۔ اس نے جانے کیا کہا تھا لیکن وہ غصے میں تھا۔'' ظفر نے کہا۔

''سیٹھ حاکم کے قتل کے شک میں چوتھا آدمی احمر بھی شامل ہے اور اب مجھے اصل قاتل پکڑنا ہے۔''

''میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ آپ اب تک احمر کو پکڑ نہیں سکے ہیں اور ہم میں سے کسی کے گلے میں وہ پھندا ڈالنا چاہتے ہیں۔'' ندا پھٹ پڑی۔

''میں ایسا کیوں کروں گا؟''

''دادا جان کا قاتل پکڑ کر آپ کو شاباش بھی تو لینی ہے۔ بہتر ہے انسپکٹر صاحب کہ آپ احمر کو گرفتار کرکے ہمارے سامنے لائیں اور پھر اس سے یہ بات منوائیں جو ہم نے بتایا ہے۔ کیا اُس نے ایسا نہیں کیا۔''

''اگر ایسا کیا تھا تو پھر دیوار سے باہر کودنے کے نشان کیوں نہیں ملے، وہ فنگر پرنٹ کس کے ہیں؟ جب کوئی باہر کودا ہی نہیں تو پھر احمر اسی گھر میں موجود ہے۔'' انسپکٹر نے تیزی سے کہا۔

''تو اُسے تلاش کیجیے تاکہ ہم تو بے گناہ ثابت ہوسکیں۔'' ظفر نے کچھ بلند آواز سے کہا۔ پریشانی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

''آپ سب کو باہر لان میں جانا پڑے گا تب میں اپنے آدمیوں کے ساتھ پورے گھر کی تلاشی لوں گا۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''میرا شک ہے کہ وہ شخص جس کی انگلیوں کے نشان موجود ہیں، وہ اس گھر میں کہیں چھپ کر بیٹھا ہے۔''

ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور باہر جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ انسپکٹر کے کچھ آدمی گھر کے باہر موجود تھے جو اس کے کہنے پر اندر آگئے۔ ایک کے ہاتھ میں ایک بڑا بیگ بھی تھا۔

ظفر، مسز خلیل اور ندا کے ساتھ گھر کے ملازمین بھی باہر نکل گئے۔ وہ سب باہر لان میں بیٹھ گئے۔ جبکہ منظور خان کو ہدایت تھی کہ وہ گیٹ کو اندر سے مقفل کردے۔ کوئی باہر سے اندر اور اندر سے باہر نہ جائے۔

اس کے بعد انسپکٹر اور اس کے آدمی گھر کے اندر چلے گئے۔ انہوں نے مین دروازہ اندر سے مقفل کردیا۔ وہ سب گھر کے اندر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک رہے اور اس دوران وہ سب باہر لان میں بیٹھے مضطرب رہے۔ جب وہ باہر نکلے تو سب نے ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''کوئی ملا؟'' ظفر نے پوچھا۔

''کوئی نہیں ملا۔'' انسپکٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کا اندازہ غلط نکلا۔ وہ

بھاگ گیا تھا اور بھاگتے ہوئے اس نے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔'' ظفر کا لہجہ استہزائیہ تھا جسے انسپکٹر نے محسوس کیا لیکن اس پر کوئی تاثر نہیں دیا۔

''میرا اندازہ غلط نہیں ہوسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے راستے سے فرار ہوا ہو۔'' انسپکٹر اپنی بات پر قائم تھا۔

''پھر آپ کی تلاشی ٹھیک سے نہیں ہوئی ہوگی۔ وہ اندر ہی کہیں ہوگا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میں اپنے دوست کی طرف جارہی ہوں اور تب تک اسی کے پاس رہوں گی جب تک احمر، یا کوئی دوسرا گرفتار نہیں ہوجائے گا۔'' ندا تیز لہجے میں بولی۔

''ندا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اب مجھے بھی اس گھر میں رہتے ہوئے ڈر لگے گا۔ جانے وہ کہاں سے نکل آئے۔'' ظفر نے بھی ندا کی بات کی تائید کی۔

''کسی کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، کچھ نہیں ہوگا۔'' انسپکٹر نے ان کو تسلی دی۔

''میں جارہی ہوں۔'' ندا نے کہا۔

''اگر آپ لوگوں کو کوئی خوف ہے تو میرے آدمی یہاں گھر میں رہیں گے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''یہ لوگ کب تک رہیں گے؟'' ظفر نے پوچھا۔

''جب تک قاتل پکڑا نہیں جائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ بہت دن تک رہنے والے ہیں۔'' ندا تمسخر سے مسکرائی۔

''ایسا نہیں ہوگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ چوبیس گھنٹوں سے بھی کم وقت میں، میں قاتل آپ کے سامنے لے آؤں گا۔'' انسپکٹر نے مصمم ارادے سے کہا۔

''ہم گھر خالی کررہے ہیں۔ خوف کی اس کیفیت میں ہم نہیں رہ سکتے۔'' ظفر نے بھی اپنا فیصلہ سنادیا۔ ''چلیں امی آپ بھی چلیں۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔'' مسز خلیل نے صاف انکار کردیا۔ ''میں اپنا گھر چھوڑ کر نہیں جاؤں گی اور نہ تم دونوں کو جانے دوں گی۔''

''کیوں امی؟'' ظفر نے حیرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

''اس گھر میں کوئی نہیں ہے۔'' مسز خلیل نے متانت سے کہا اور چلتی ہوئی گھر کے مین دروازے کی طرف جانے لگیں۔ ظفر اور ندا ان کو جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

''مسز خلیل ایک بہادر خاتون ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا۔

کچھ دیر کے بعد ظفر بھی اندر چلا گیا اور پھر ندا کا رخ بھی گھر میں جانے کے لیے ہوگیا۔ انسپکٹر مسکراتے ہوئے دل ہی دل میں بولا۔

''اندر واقعی کوئی نہیں ہے۔''

انسپکٹر پھر مسکرایا اور اپنے آدمیوں کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ گیٹ کی طرف چلے گئے۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے انسپکٹر نے منظور خان سے کہا۔

''میں قاتل تک پہنچ گیا ہوں۔''

انسپکٹر کی بات سن کر منظور خان یکدم چونکا اور اس نے سوالیہ نگاہوں سے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ کوئی بات کیے بغیر باہر نکل گیا اور منظور خان نے جلدی سے گیٹ بند کردیا۔

☆☆☆

اسی رات کو جب انسپکٹر رات کا کھانا کھانے کے بعد گھر سے باہر چہل قدمی کے لیے نکلا تو ایک سایہ بھی اس کے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں میں بیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ تعاقب کرنے والے نے سر پر اونی ٹوپی پہنی ہوئی تھی جو اس کی گردن تک تھی اور آنکھیں، ناک اور منہ کی جگہ سوراخ تھے جس کی وجہ سے کوئی بھی اس کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

انسپکٹر دھیمی چال چلتا جارہا تھا۔ اچانک تعاقب کرنے والے نے اپنی رفتار تیز کردی اور چلتے ہوئے اپنی آستین سے ایک تیز دھار چاقو بھی نکال لیا۔ چاقو کا پھل چھوٹا تھا لیکن اس کی دھار بہت تیز تھی۔

تعاقب کرنے والے کی رفتار اور بھی تیز ہوگئی اور دونوں میں فاصلہ کم ہوکر محض دو فٹ رہ گیا کہ اچانک اس نے چلتے ہوئے اپنا ہاتھ گھمایا اور اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ میں پکڑا تیز دھار چاقو اپنا کام کرتے ہوئے انسپکٹر کی گردن کاٹتا، باخبر انسپکٹر برق رفتاری سے جھک کر گھوما اور اس کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جس میں تیز دھار چاقو تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی انسپکٹر نے پوری قوت سے اسے جھٹکا دے کر نیچے گرالیا۔

وہ بھی طاقتور جسم کا مالک تھا۔ اس نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور انسپکٹر کو ایک طرف دھکا دے دیا۔ انسپکٹر ایک جھٹکے سے پیچھے ہوا اور نیچے گرگیا۔

حملہ آور جان گیا تھا کہ وہ اپنا وار نہیں کرسکا اور انسپکٹر نے اپنا بچاؤ کرلیا ہے، اب اس سے لڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ انسپکٹر ایک ماہر اور تربیت یافتہ شخص تھا، اس پر قابو اسی صورت میں پایا جاسکتا تھا اگر اس کا وار اس کی گردن کاٹ

دیتا اور وہ آسانی سے بھاگ جاتا۔

اس لیے حملہ آور نے اپنے آپ کو چھڑایا اور ایک طرف بھاگنے لگا۔ انسپکٹر نے اپنی جیکٹ میں سے پستول نکالا اور اس کی ٹانگ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔

تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا تھا ورنہ بھاگتا ہوا وہ شخص اپنی ٹانگ پر گولی کھا کر نیچے گر چکا ہوتا۔ وہ اور بھی تیز بھاگنے لگا اور انسپکٹر نے ایک فائر اور کھول دیا۔ ٹھیک اسی وقت وہ بائیں جانب مڑ گیا۔ انسپکٹر کے لیے اب یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اسے گولی لگی ہے کہ نہیں۔

انسپکٹر جلدی سے اُٹھا اور اس سمت بھاگنے لگا جس طرف وہ مڑا تھا۔ اس جگہ پہنچ کر انسپکٹر نے جھک کر زمین پر دیکھا، اسے خون کے قطرے کہیں نظر نہیں آئے اس کا مطلب تھا کہ وہ بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا اور اس کی ٹانگ گولی کی زد میں آنے سے پھر بچ گئی تھی۔

انسپکٹر بھاگتا ہوا آگے تک چلا گیا لیکن اسے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ ابھی وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک اسے آہٹ سنائی دی۔ انسپکٹر نے فوراً اس جانب دیکھا تو ٹھیک اسی وقت وہ تیز دھار چاقو ہوا میں اُڑتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور عین وقت پر انسپکٹر نے اپنا چہرہ پیچھے کر لیا اور چاقو اس کے چہرے کے آگے سے اڑتا ہوا دوسری طرف جا گرا۔

انسپکٹر نے اسی وقت اپنا پستول تان لیا۔ اسے اندھیرے میں بھاگنے کی آواز آئی۔ وہ بھی اس جانب بھاگنے لگا۔ اسی اثنا میں انسپکٹر کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے بھاگتے ہوئے ایک ہاتھ سے موبائل فون نکال کر اپنے کان سے لگالیا، دوسری طرف سے ندا کی گھبرائی اور چیختی آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

''انسپکٹر بچاؤ...... کوئی ہے...... کوئی ہے جو ہمیں بھی مار دینا چاہتا ہے...... بچاؤ......''

فون بند ہو گیا اور انسپکٹر نے بھاگتے ہوئے رک کر دائیں بائیں دیکھا، اسے دور تک کوئی دکھائی نہیں دیا۔ حملہ آور بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ انسپکٹر نے غصے سے ہوا میں مُکا مارا۔ وہ جان بوجھ کر گھر سے نکلا تھا، اس نے خود موقع دیا تھا کہ اس پر حملہ ہو۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ قاتل اس تاک میں ہے کہ اس پر حملہ کر کے اسے ختم کر سکے۔

انسپکٹر نے فون ملایا اور رابطہ ہوتے ہی تیز لہجے میں بولا۔ ''فوراً سیٹھ حاکم کے گھر پر پہنچو...... اور دیکھو وہاں کیا ہو رہا ہے......''

انسپکٹر نے فون بند کرتے ہی ظفر کو کال کی اور بیل جانے لگی۔ جونہی رابطہ ہوا انسپکٹر نے کہا۔

''آپ ندا کے پاس ہو؟''

''نہیں، میں اپنے کمرے میں ہوں۔ کیوں کیا بات ہے؟'' ظفر نے جواب دیا۔

انسپکٹر نے بتایا۔ ''مجھے ابھی اس نے فون کیا ہے کہ گھر میں کوئی ہے۔''

''اس نے فون کیا ہے؟ میں ابھی دیکھتا ہوں۔'' ظفر کی آواز آئی۔

''میں نے اپنے اہلکار کو فون کر دیا ہے، وہ بھی پہنچ رہے ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''میں ابھی دیکھ کر آپ کو فون کرتا ہوں۔'' ظفر بولا اور انسپکٹر سڑک کے درمیان میں اکیلا ہی کھڑا متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھتا رہا۔

☆☆☆

ندا سہمی ہوئی کھڑی تھی اور ظفر کو بتا رہی تھی۔ جبکہ مسز خلیل بھی پاس ہی کھڑی تھیں۔ ''میں اپنے کمرے میں تھی تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر گھمایا ہو۔ میں یکدم ڈر گئی۔ میں نے فوراً انسپکٹر کو فون کر دیا۔''

''تمہیں فون مجھے کرنا چاہیے تھا۔'' ظفر بولا۔

''بس میرے دماغ میں اس وقت فوراً ان کا خیال آیا اور میں نے ان کو فون کر دیا۔'' ندا نے کہا۔

''ہم پورے گھر کی تلاشی لے چکے ہیں اور یہ بتا دیا تھا کہ اس گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔ میں نے مزید تسلی کر لی ہے۔'' انسپکٹر کا بھیجا ہوا اہلکار بولا۔

''شکریہ آپ کو تکلیف دی۔'' ظفر نے ممنون نگاہوں سے اہلکار کی طرف دیکھا۔

''دراصل اس سارے منصوبے کا جال ریت کے ٹیلوں پر پھیلایا گیا تھا۔ جیسے ہی تفتیش کی ہوا چلی اور ریت کے ٹیلے اُڑ کر بکھرنے لگے، منصوبہ ساز گھبرا گئے۔ ان کو معلوم ہونے لگا کہ قانون کا ہاتھ ان کی گردن تک پہنچ رہا ہے اس لیے وہ انسپکٹر کو ہٹانے کے لیے ان پر حملہ کر رہے ہیں تاکہ تفتیش رک جائے اور وہ محفوظ ہو جائیں۔'' اہلکار نے کہا۔

''کیا انسپکٹر کو مارنے کی کوشش کی جا رہی ہے؟'' ظفر نے پوچھا۔

''بالکل...... اور انسپکٹر جان بوجھ کر باہر نکل رہے ہیں

تاکہ وہ ان کے سامنے آئے۔ اب مجھے اجازت دیں۔'' اس نے کہا اور وہ گھر سے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی ندا پھٹ پڑی۔ ''میں اس گھر میں بالکل بھی نہیں رہنا چاہتی۔ میں صبح ہوتے ہی چلی جاؤں گی۔''

''تم کہاں جاؤ گی؟'' مسز خلیل نے پوچھا۔

''کہیں بھی چلی جاؤں گی۔ دنیا بہت بڑی ہے۔'' ندا کہہ کر ظفر کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''بھائی صبح سب سے پہلا یہ کیجیے کہ آپ میرے اکاؤنٹ میں بہت سے پیسے ڈال دیں۔ تاکہ میں سکون سے کہیں گھوم سکوں اور اس جھنجٹ سے دور چلی جاؤں۔''

''ظفر کوئی پیسہ نہیں دے گا۔'' مسز خلیل نے صاف منع کر دیا۔

''کیوں نہیں دے گا۔ اس جائداد میں میرا بھی حصہ ہے۔ میں بھی مالک ہوں۔'' ندا تن گئی۔

''ہم نے ابھی جائداد تقسیم نہیں کی ہے۔'' مسز خلیل نے بھی تیز لہجہ اختیار کر لیا۔

''تو کس کا انتظار کر رہے ہیں؟ جائداد تقسیم کریں اور اپنی اپنی زندگی جئیں۔ اس انسپکٹر کے جانے کیا ارادے ہیں۔ وہ دادا جان کے قتل میں ہمیں بھی ملوث کر رہا ہے۔'' ندا الجھن کا شکار تھی۔

''تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔'' مسز خلیل نے جانے کا اشارہ کیا۔

''میں بے سکونی کا شکار ہو گئی ہوں۔ وہ نالائق انسپکٹر اصل مجرم کو چھوڑ کر ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ جیسے ہم نے دادا جان کو مارا ہو۔ جیسے انہیں میں نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر کھڑکی سے نیچے پھینکا ہو۔ میرا سکون ختم ہو گیا ہے۔'' ندا چیخ رہی تھی۔

''وہ صرف تم پر نہیں، ہم پر بھی شک کر رہا ہے۔'' ظفر نے کہا۔

''تو پھر آپ کچھ کریں۔ پولیس کو لکھ کر دے دیں کہ جس نے قتل کیا ہم نے اسے معاف کیا اور خدا کا واسطہ ہے آپ ہمیں بھی چھوڑ دیں اور ہمیں سکون کا سانس لینے دیں۔'' ندا بولی۔

''میں تمہارے دادا کے قاتل کو نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ میرے شوہر کے باپ تھے۔ یہ میری ذمے داری ہے کہ میں پولیس کے ساتھ تعاون کروں اور قاتل کو گرفتار کراؤں۔'' مسز خلیل نے دوٹوک کہہ دیا۔

''آپ اپنی ذمے داری نبھائیں۔ انسپکٹر کو کوئی نہیں ملے گا تو وہ پھانسی کا پھندا ہم میں کسی کے گلے میں ڈال دے گا۔ میں اس گھٹن میں نہیں جی سکتی۔ کل آپ میرے اکاؤنٹ میں پیسہ ڈالیں گے، میں کل کی فلائٹ سے دبئی چلی جاؤں گی۔''

''تم کہیں نہیں جاؤ گی۔'' ایک بار پھر مسز خلیل نے اسی انداز میں کہا۔

''میں جاؤں گی۔'' ندا نے آنکھیں نکال کر اپنی ماں کی طرف فیصلہ کن انداز میں دیکھا اور تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دونوں ماں بیٹا ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر تھا جب ندا کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور اس نے جھانک کر باہر دیکھا۔ پھر اس نے بغیر آہٹ پیدا کیے دروازہ بند کیا اور دبے پاؤں اپنی ماں کے کمرے کی طرف چل دی۔ مسز خلیل کے کمرے کے پاس پہنچ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی چابی 'کی ہول' میں گھمائی اور لاک کھول کر آہستہ سے ہینڈل گھمایا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی اور مسز خلیل دوسری جانب کروٹ لیے سو رہی تھیں۔ کمبل اُن کے کندھوں تک تھا۔

ندا اندر گئی اور بغیر آہٹ پیدا کیے دروازہ بند کر دیا۔ اس کا رخ سیف کی جانب تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو چابیاں اور تھیں۔ اس نے پہلے ایک چابی لگائی اور سیف کا دروازہ کھول دیا۔ پھر اس نے دوسری چابی سے اندر کے خانے کا دروازہ کھولا تو سامنے مسز خلیل کے زیورات اور بہت سی نقدی پڑی تھی۔

ندا نے پہلے زیورات کے ڈبے خالی کیے اور اس کے بعد نقدی سمیٹ کر ایک کپڑا اُٹھا کر اس میں سب کچھ باندھا اور پھر سیف کو اسی طرح بند کر کے وہ کمرے سے باہر نکلی اور کمرے کو پھر سے لاک کر دیا۔ ندا نے پہلے ہی مسز خلیل کے کمرے اور سیف کی چابیاں بنوالی تھیں۔ وہ اس گھٹن سے فرار چاہتی تھی۔

اس کے بعد وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنے کمرے میں جاتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور سکون کی سانس لی۔

اس نے وہ کپڑا کھولا، زیورات اور نقدی دیکھی۔ پھر اس نے ایک چمڑے کا بیگ اُٹھایا اور اس میں زیورات اور

نقدی رکھ دی۔ ان کے اوپر اس نے اپنے کپڑے رکھے اور بیگ بند کر دیا۔

ندا نے الماری کھول کر اپنا پاسپورٹ نکالا اور اسے ایک پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر بیگ کی بیرونی جیب میں ڈال دیا۔ اب وہ اس گھٹن سے اس خوف کی کیفیت سے فرار ہونے کے لیے تیار تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ تب ہی واپس آئے گی جب اس کے دادا کا قاتل پکڑا جائے گا اور احمر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوگا۔ اس کے بعد وہ واپس آکر بھائی اور ماں سے اپنی جائداد کا مطالبہ کرے گی۔ ویسے بھی وہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جس سے وہ شادی کرنا چاہتی ہے شاید اس کے لیے وہ رضامند نہ ہوں اس لیے بہتر ہے کہ وہ خود ہی اُس سے شادی کر لے۔

☆☆☆

ظفر آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب ملازم نے اس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو ظفر نے کہا۔

''یس۔''

ملازم نے دروازہ کھول کر کہا۔ ''صاحب...... انسپکٹر صاحب آئے ہیں۔''

''اس وقت؟'' ظفر نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ ''انہیں بٹھاؤ میں آرہا ہوں۔''

ملازم چلا گیا۔ جب ظفر لاؤنج میں پہنچا تو مسز خلیل بھی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھیں جبکہ انسپکٹر اپنے دو اہلکاروں کے ساتھ ایک طرف کھڑا تھا۔ ظفر نے متحیر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''خیریت ہے انسپکٹر صاحب صبح صبح......''

''تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کے ملازم سے کہا تھا کہ وہ مس ندا کو بھی بلا لیں لیکن وہ ابھی تک نہیں آئیں۔ اگر آپ انہیں بلا لیں تو ہم سب کا وقت بچ جائے گا۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' ظفر کہہ کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے پیچھے ندا بھی تھی۔ ندا نے جینز اور لونگ شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کہیں جانے کی تیاری میں تھی، انسپکٹر نے آکر اس کے جانے میں مداخلت کر دی ہو۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں بات شروع کروں۔'' انسپکٹر نے سب کی طرف دیکھا۔

''جی ضرور۔'' ظفر نے کہا۔

جواب لاجواب

خواتین کا مجمع کافی بڑا تھا۔ تقریب کے ناظم نے حاضرین میں سے بارہ شادی شدہ خواتین کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ خواتین کی ایک بھیڑ لپکی اور پہلے آنے والی بارہ خواتین کو اسٹیج پر بٹھا لیا گیا۔ ناظم کے استفسار پر سب نے کہا کہ وہ نہایت خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں۔ ناظم نے ان سے کہا کہ وہ واٹس ایپ پر اپنے اپنے شوہر کو یہ پیغام بھیجیں کہ وہ ان سے محبت کرتی ہیں۔ آنے والے بہترین جواب پر خاتون کو ایک بڑا انعام دیا جائے گا۔

آنے والے جوابات کچھ یوں تھے:

1- کیا آج پھر گاڑی کہیں ٹھونک دی!
2- تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟
3- کیا کل پھر شاپنگ کا ارادہ ہے؟
4- شاید تمہیں میکے کی یاد ستا رہی ہے!
5- تمہیں کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟
6- پھر استری سے کوئی سوٹ جلا دیا!
7- تم نے غلطی سے یہ میسج مجھے بھیج دیا۔
8- کیا چابی گاڑی میں ہی لاک ہوگئی ہے؟
9- گھر پر تمہاری امی کے ساتھ اور کون آیا ہوا ہے؟
10- پیسے کپڑوں کی الماری کے پچھلے خانے میں پڑے ہیں۔ سب نہ نکال لینا۔
11- دفتر سے واپسی پر میں کوئی سامان نہیں لاؤں گا۔
12- آج کون سا کراکری سیٹ ٹوٹا ہے؟

ہر جواب لاجواب تھا۔ حاضرین کے شور پر ان سب کو انعام سے نوازنا پڑ گیا۔

کراچی سے عروج عارف کا تعاون

''دراصل میرے اتنی جلدی آنے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے سیٹھ حاکم کا قاتل گرفتار کر لیا ہے۔'' انسپکٹر کے اس انکشاف نے سب کو چونکا دیا۔ ندا نے بھی فوراً انسپکٹر کی طرف دیکھا اور بے اختیار بولی۔

''احمر پکڑا گیا؟''

انسپکٹر نے اطمینان سے بتایا۔ ''احمر تو دو دن سے میرے پاس ہے۔''

''کیا......؟ احمر دو دن سے آپ کے پاس ہے اور آپ اب بتا رہے ہیں کہ قاتل پکڑا گیا ہے۔'' ظفر کو حیرت ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مسز خلیل اور ندا کی حیرت بھی قابلِ دید تھی۔

''مجھے لگا کہ میں مناسب وقت پر ہی سب کچھ بتاؤں تو

اچھا رہے گا۔'' انسپکٹر بولا۔

''آپ کے اس مناسب وقت کی وجہ سے ہم جس اذیت سے دوچار ہیں، اس کا علم ہے آپ کو؟'' ندا تلخی سے بولی۔

''مجھے سب پتا ہے۔لیکن اصل قاتل تک پہنچنے کے لیے مجھے انتظار کرنا تھا اور اسے موقع دینا تھا کہ وہ سامنے آجائے۔ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ آپ گھر سے بھاگ کر شادی کرنے کی پوری تیاری میں ہیں۔'' انسپکٹر نے ندا سے کہا تو بیک وقت مسز خلیل اور ظفر نے ندا کی طرف دیکھا اور ندا کے پاس آنکھیں چرانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

''آپ کی قیاس آرائی نے مجھے ذہنی مریض بنا دیا ہے۔'' ندا نے انسپکٹر کی بتائی ہوئی حقیقت کو ہوا میں اُڑانے کی کوشش کی۔

''ایسا آپ کا خیال ہے جبکہ میری کہی ہوئی بات میں حقیقت ہوتی ہے۔'' انسپکٹر نے کہہ کر مسز خلیل کی طرف دیکھا۔''ذرا اپنے کمرے میں جا کر یہ تو دیکھیں کہ سیف میں آپ کے زیورات اور نقدی موجود ہے؟'' یہ سنتے ہی مسز خلیل دم بخود ندا کی طرف دیکھنے لگیں اور ندا کو اس حیرت نے گھیر لیا کہ انسپکٹر کو اس بات کا علم کیسے ہوا، اس نے تو وہ کام رات کے آخری پہر میں اس وقت کیا تھا جب کوئی جاگ نہیں رہا تھا۔

مسز خلیل بولیں۔''میرے زیورات اور نقدی......''

''جی ہاں...... رات کو جب آپ سب سو رہے تھے تو آپ کے سیف سے ندا نے زیورات اور نقدی نکال لی تھی۔ وہ بھاگ کر پہلے نکاح کرنا چاہتی تھیں اور پھر ملک چھوڑ کر جانا چاہتی تھیں۔لیکن ان کے ساتھ بھاگنے والا ان سے نکاح کرتا... بھی کہ نہیں، یا محض ان سے وہ زیورات اور نقدی لے کر فرار ہونے کے چکر میں تھا۔اس حقیقت سے میں بعد میں پردہ اُٹھاتا ہوں' پہلے آپ کو یہ بتادوں کہ احمر نے سیٹھ حاکم کا قتل کیسے کیا۔''

انسپکٹر کچھ دیر کے لیے چپ ہوا اور سب سوالیہ نگاہوں سے جاننے کے لیے مضطرب تھے۔

انسپکٹر نے کہا۔''احمر ورکشاپ سے کار لے کر آیا تو سیٹھ حاکم اوپر بالکونی میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے اوپر سے ہی پوچھا کہ گاڑی ٹھیک ہوگئی ہے۔ احمر نے جواب میں بتایا کہ گاڑی بالکل ریڈی ہوگئی ہے۔ احمر کو کیونکہ کراچی جانا تھا وہ بھی سیٹھ حاکم ...... کے کام سے اس لیے وہ اجازت لے کر چلا گیا اور سیٹھ حاکم اُٹھ کر اندر چلے گئے۔''

انسپکٹر نے چپ ہو کر اُن تینوں کی طرف دیکھا جو سکتے کے عالم میں سب سن رہے تھے۔ انسپکٹر پھر بولا۔

''ابھی احمر جانے ہی والا تھا کہ مس ندا نے آواز دی اور احمر کو ایک منٹ کے لیے اندر لے گئی۔ ندا اُسے گھر کے عقب میں لے گئی اور ایک طرف رکھی لوہے کی سیڑھی اُٹھا کر دیوار کے ساتھ لگانے کو کہا۔ احمر نے وہ کام کیا اور اجازت لے کر چلا گیا۔ احمر کی انگلیوں کے نشان اس سیڑھی پر لگ گئے۔ اس کے بعد خاردار تار کاٹے گئے اور اسی دوران میں سیٹھ حاکم کو ان کے کمرے کی کھڑکی سے نیچے گرا کر مار دیا اور کہانی یہ سنا دی گئی کہ یہ سب احمر کا کیا ہوا ہے۔ چوکیدار اور ندا کا بیان ایک ہی تھا۔''

مسز خلیل اور ظفر کا چہرہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا اور وہ ٹکٹکی باندھے انسپکٹر کی طرف دیکھتے رہے۔

''دادا ابو کو ندا نے چوکیدار سے مل کر کمرے سے گرایا تھا؟'' ظفر کی حیران کن آواز نے خاموشی توڑی۔

''بالکل بھی نہیں۔'' انسپکٹر نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''ندا نے چوکیدار سے مل کر سیٹھ حاکم کو نیچے نہیں گرایا۔''

''تو پھر کس نے انہیں مارا تھا؟'' ظفر جاننے کے لیے مضطرب تھا۔

''پہلے یہ سنو۔'' انسپکٹر نے کہا۔''جب احمر کو ٹرین سے پکڑا گیا تو تھانیدار کی ذاتی دشمنی کی وجہ سے وہ بھاگنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے اپنے ابو سے رابطہ کیا اور اس کے ابو سے کیونکہ میں مل چکا تھا انہوں نے فوراً مجھ سے بات کی اور میرے آدمی احمر کو اسی رات میرے پاس لے آئے اور اس نے مجھے ساری حقیقت بتادی کہ اس نے سیٹھ حاکم کو کھڑکی سے نہیں گرایا۔ میں نے جو باتیں مسز خلیل اور آپ سب کے بارے میں کی تھیں، وہ سب مجھے احمر نے بتائی تھیں۔''

''اور آپ نے اس کی بات مان کر اسے بے قصور قرار دے دیا۔'' ندا نے کہا۔

''ندا دراصل احمر کو پسند کرتی تھی۔ اس کی توجہ چاہتی تھی لیکن احمر، ندا کو مسلسل نظر انداز کرتا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جس گھر میں اس کا آنا جانا ہے وہاں وہ پیار محبت کا کھیل کھیل کر سیٹھ حاکم کے اعتماد کو مٹی میں ملا دے۔ اس کی بے رخی کا ندا کو دکھ بھی تھا لیکن پھر جلدی ہی ندا ایک دوسرے لڑکے کی طرف متوجہ ہوگئی اور دونوں کے درمیان عشق و محبت پروان چڑھنے لگی۔''

سب خاموشی سے...... انسپکٹر کی طرف متوجہ تھے۔

انسپکٹر پھر بولا۔

''سیٹھ حاکم کو قتل کر کے احمر پر الزام تو لگ گیا لیکن منصوبہ ساز یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ آج ہی کراچی جا رہا ہے۔ اس لاعلمی نے ان کا کھیل بگاڑ دیا۔ سیٹھ حاکم کا قاتل جان گیا تھا کہ میں اس کے قریب پہنچ رہا ہوں اور جو اس نے منصوبہ بنایا تھا، وہ بہت کمزور تھا اس لیے وہ مجھے کیس کی تفتیش سے ہٹانے کے لیے مجھ پر حملہ کرنے لگا اور پھر اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے آپ کو بچایا اور اس کے پیچھے بھاگا۔ اس نے بھاگتے ہوئے ندا کو فون کیا اور ندا نے مجھے کال کر کے یہ کہا کہ گھر میں کوئی ہے، میں اس کا تعاقب چھوڑ کر ندا کی جانب متوجہ ہو گیا اور وہ بھاگ گیا۔ قاتل نے اپنی جان بچانے کے لیے ندا کو مجھے فون کرنے کو کہا تھا۔ اس طرح وہ بچ گیا۔ اور اسی رات کو جب سب سو گئے تو وہ ندا سے ملنے گھر پہنچ گیا۔''

''او خدایا ندا اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ وہ گھر میں کیسے آسکتا ہے جبکہ چوکیدار موجود ہوتا ہے اور وہ کون ہے؟'' ظفر کے جسم میں اور بھی بے چینی دوڑنے لگی۔

''یہ بھی بتاتا ہوں کہ وہ کس راستے سے گھر میں آیا اور وہ کون ہے۔ ندا اور اس نے بھاگنے کا پروگرام بنایا۔ وہ جان گیا تھا کہ اب اس کا بچنا مشکل ہو گیا ہے۔ اسی نے ندا کو اکسایا کہ وہ اپنا حصہ مانگے۔ اسی نے ندا سے زیورات اور نقدی چوری کرائی اور جب ندا نے ماں کا زیور اور نقدی سمیٹ لی تو ندا نے اسے بتایا، اس نے کہا کہ وہ صبح دس بجے یہ گھر چھوڑ دیں گے۔ وہ رات جب اس گھر میں آیا تھا تو اس نے ندا سے زیورات اور نقدی لینے کا بھی مطالبہ کیا لیکن ندا نے انکار کر دیا کہ وہ کل صبح سب کچھ لے کر وہاں آجائے گی۔ اس نے اس لیے زیادہ تقاضا نہیں کیا کہ کہیں ندا کو شک نہ پڑ جائے۔ میں نے دن کا اجالا پھیلنے سے پہلے اُسے گرفتار کر لیا۔'' انسپکٹر نے بات ختم کی اور ندا کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بیٹھی تھی اور مسز خلیل اسے مسلسل گھور رہی تھیں۔

''وہ کون ہے؟'' ظفر نے پھر سوال کیا۔

''یہ بھی بتاتا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''پہلے یہ جان لیں کہ قتل کی وجہ کیا بنی تھی۔''

''ہاں قتل کی وجہ کیا بنی تھی؟'' ظفر نے بے قراری سے پہلو بدلا۔

''ہمیں جو آئینہ دکھایا گیا تھا، دراصل پسِ آئینہ کچھ اور تھا۔ ندا نے سیٹھ حاکم سے اس لڑکے کے ساتھ شادی کی بات کی تو سیٹھ حاکم اس بات پر بھڑک اُٹھے۔ ان کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ وہ اسی وقت ایک بڑا فیصلہ کرنے والے تھے کہ ندا نے اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی۔ اور منت کی کہ وہ یہ بات کسی سے نہ کریں۔ وہ اس کا خیال دل سے نکال دے گی۔ ندا محض کچھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اس دوران دونوں نے مل کر ایک منصوبہ بنایا اور یوں احمر کو انہوں نے پھنسانے کی کوشش کی۔ جو اُن کے ہی گلے میں پڑ گئی اور انہوں نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا جیسا ہو گیا۔''

''اب تو بتا دیجیے کہ وہ قاتل ہے کون؟'' ظفر بولا۔

''اس وقت وہ لاک اپ میں ہے۔'' انسپکٹر نے ظفر سے پوچھا۔ ''ذرا یہ یاد کر کے بتائیں کہ وہ کون ہے جو بڑا خوبصورت اور ہینڈسم ہے۔ جسے آپ کے دادا جان نے پڑھایا اور اپنی کمپنی میں نوکری بھی دی۔ جو اس گھر میں آتا جاتا تھا۔''

ظفر جھٹ سے بولا ''ہمارے چوکیدار منظور خان کا بیٹا انور خان۔''

''جی ہاں...... وہی انور خان آپ کے دادا جان کا قاتل اور ندا کا عاشق ہے۔ تبھی چوکیدار کا بیان بھی یہی تھا کہ اس نے خود احمر کو سیٹھ حاکم کو نیچے پھینکتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی بات پر سیٹھ حاکم بھڑک اٹھے تھے کہ ایک چوکیدار کے بیٹے کے ساتھ ندا شادی کرے گی۔ لیکن ندا تو اس کے عشق میں گرفتار تھی اور چوکیدار کا بیٹا بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھ چکا تھا۔''

''یہ تم نے کیا کیا۔ تم نے اپنے دادا کو مارنے کے لیے اُس کا ساتھ دیا۔ اب اپنے کیے کا خمیازہ بھگتو۔'' مسز خلیل کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

''یہ تو بھگتے گی ہی۔ کیا آپ یہ جاننا چاہیں گے کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ ندا سے انور کیسے ملنے آیا اور مجھے کیسے پتا چلا کہ ندا نے زیورات چوری کیے ہیں۔'' انسپکٹر نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔

''ہاں یہ سب آپ کو کیسے پتا چلا۔'' ظفر نے پوچھا۔

''اس دن میں نے جان بوجھ کر کہا تھا کہ کسی اور کی انگلیوں کے نشان بھی ہیں اور میں نے یہ جان بوجھ کر شوشہ چھوڑا تھا کہ قاتل اس گھر میں چھپا بیٹھا ہے اور ہم نے اس کی تلاش کے بہانے خفیہ کیمرے لگا دیے تھے۔ اور میرا آدمی اسی گھر میں ایک جگہ بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مجھے پل پل کی خبر دے رہا تھا۔''

ندا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ان آنکھوں میں اب صرف پچھتاوے کا سمندر تھا۔

سرورق کی دوسری کہانی

آخری خواہش

کبیر عباسی

"میں جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا" عدالت کا یہ حلف نامہ اس کی زندگی کا جزو خاص بن گیا... ایک ایسے معاشرے میں جس کا شعار جھوٹ ہے۔ بلا ملاوٹ کے سچ کم ہی چمک کر اردگرد کے ماحول کو روشن کرتا ہے... ہمہ جہت شخصیت کے مالک نوجوان کی زندگی کے ورق... جو ہر دور میں ایک نیا روپ اختیار کر لیتا۔ رفتہ رفتہ بدلتے بدلتے وہ ملک و قوم کو دشمنوں کی آویزشوں اور سازشوں سے بچانے والے محافظ کا روپ اختیار کر گیا... مگر وہ اس سچ سے کوسوں دور تھا... جو اس کی زندگی... اس کی روح اور جسم کو لمحہ بہ لمحہ گھائل کر رہا تھا۔

دلچسپ اور قابل رشک زندگی گزارنے والے شخص کی حادثات سے پر سرگزشت

میں نوید احمد، آج آپ کے سامنے ایک کہانی کے کردار کے طور پر موجود ہوں۔

دراز قد، کسرتی جسم، گہری بھوری آنکھیں، شانوں تک آتے لمبے گھنگھریالے بال مجھے ایک ہیرو جیسی شبیہہ دیتے ہیں مگر میں شاید اس کہانی کا ہیرو نہیں۔ ہیرو تو بلند کردار ہوتا ہے، قربانی دینے والا ہوتا ہے، ذاتی مفادات پر قومی مفادات کو ترجیح دینے والا ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے مجھ میں ایسی کوئی خصوصیت موجود نہیں۔

نہ ہی میں اس کہانی کا ولن ہوں۔ ولن تو پوری فلم یا کہانی میں ہیرو کے لیے مشکلات پیدا کرتا رہتا ہے۔ عام طور پر وہ پوری کہانی میں ثانوی کرداروں پر ظلم کرتا نظر آتا ہے۔ ہیرو اس کو للکارتا ہے تو وہ اس کی بھی 'ایسی کی تیسی' کر دیتا ہے مگر آخری سین میں بالآخر ہیرو یکدم ہی ولن پر غالب آجاتا ہے۔ میں نے ایسا بھی کچھ نہیں کیا۔

یوں تو وقت کے ساتھ ساتھ میرے کردار میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں مگر مجموعی طور پر میں ایک عام سا نفس کا مارا شخص ہی رہا جو ہمیشہ اپنی خواہشات کے دائرے میں قید رہتا ہے۔ مجھے ساری زندگی اپنی ذہانت پر ناز رہا مگر پھر کچھ ایسا ہوا کہ میرا اپنی ذہانت پر سے ہی اعتماد اٹھ گیا اور میں اپنے آپ کو مہا احمق کا لقب دینے پر مجبور ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ آپ کی الجھن اتنی بڑھ جائے کہ آپ کہانی پڑھنا ہی چھوڑ دیں، میں آپ کو اپنا تعارف کرا دیتا ہوں۔

میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس کی پورے علاقے میں بے انتہا عزت تھی۔ ہمارے خاندان کو محافظوں کا خاندان کہا جاتا تھا۔ ہم وطن کے محافظ تھے۔ میرے دادا فوج میں تھے۔ وہ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے اپنے دونوں بچوں کو فوجی بنا دیا۔ میرے ابو میجر جنرل کے عہدے تک پہنچے جبکہ تایا بھی دادا ابو کی طرح کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے

اپنے تینوں بیٹوں کو بھی فوج میں ہی بھرتی کرایا۔

میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ میرا بچپن عمرو عیار، ٹیمسن اور سند باد جیسے افسانوی کرداروں کی کہانیاں پڑھتے گزرا۔ کتابوں کے علاوہ اگر مجھے کسی چیز سے عشق تھا تو وہ پھول تھے۔ رنگ برنگے حسین پھول مجھے ایک دم سے اپنی طرف متوجہ کرلیتے تھے۔

میرے ابو نے دنیا جہاں کے پھول اپنے گھر کے لان میں جمع کررکھے تھے۔ میں کئی کئی گھنٹے اپنے گھر کے وسیع و عریض لان میں پھولوں کو دیکھتے ہوئے گزار دیتا۔ وہاں سے جی بھرتا تو اپنے گھر کے قریب ہی ایک پارک کا رخ کرلیتا۔ پھولوں کے بیچ اُڑتی رنگ برنگی تتلیاں ... مجھے انتہائی سحر انگیز لگتیں۔ میں کبھی انہیں پکڑتا نہیں تھا بلکہ انتہائی اشتیاق سے بغور دیکھتا رہتا تھا۔

ایک دن میں پارک میں بیٹھا تھا۔ میرے نزدیک تتلی ایک بڑے سے سرخ گلاب پر کافی دیر سے بیٹھی تھی۔ اب پتا نہیں وہ اس کا رس چوس رہی تھی یا اس کی خوشبو کے سحر میں گرفتار تھی۔ میں اس کے خوبصورت رنگوں میں کھویا ہوا تھا کہ میری اس حسین دنیا میں محب نے مداخلت کی۔ اس نے جھپٹ کے تتلی کو پروں سے پکڑ لیا۔ نازک سی تتلی اس کے ہاتھوں میں پھڑ پھڑانے لگی۔

وہ کب آیا تھا مجھے کچھ خبر نہیں ہوئی تھی۔ میں تو تتلی اور پھول کے فسوں خیز حسن میں گرفتار تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ''اپنی تتلی'' کو پھڑ پھڑاتے دیکھا تو میرا چہرہ رنگت میں اسی گلاب کا سا منظر پیش کرنے لگا جس پر وہ تتلی کچھ دیر پہلے بیٹھی تھی۔

وہ تتلی کو اپنے ہاتھ میں پھڑ پھڑاتے دیکھ کے خوش ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ تاثرات تھے۔ اس نے جیسے ایک نازک سی تتلی کو نہیں پکڑا تھا بلکہ پوری دنیا فتح کرلی تھی۔

میں نے ناپے تلے دو قدم اس کی طرف بڑھائے۔ اگلے ہی پل میرے زوردار مُکے نے اس کی نکسیر پھوڑ دی۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' میں زور سے چلایا۔

وہ حیران نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی ناک سے بھل بھل بہتے خون کو دیکھ رہا تھا۔ تتلی اس کی قید سے فرار ہو کے اپنی حسین دنیا کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکی تھی۔

جب میں نے دیکھا کہ میرے ''دفع ہو جانے'' کے حکم پر اس نے عمل نہیں کیا تو میں نے اسے دھکا دیا۔ ''سنا نہیں تم نے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' میں ایک بار پھر چیخا۔

میرے چلّانے پر اس کے چہرے پر بھی غصیلے تاثرات نمودار ہوئے۔ اس نے لپک کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ میری چیخ و پکار نے گھر

والوں کو بھی متوجہ کرلیا تھا۔ میری اور محب کی امی دوڑتی ہوئی ہماری طرف آئیں۔ محب کی امی اپنے بیٹے کی ناک سے خون نکلتا دیکھ کے چراغ پا ہوگئیں۔ انہوں نے ہم دونوں کو الگ کرتے ہی میرے رخسار پر ایک زوردار طمانچہ جڑدیا۔

مجھے تو کبھی میری اپنی ماں نے بمطابق محاورہ پھول کی چھڑی سے نہیں مارا تھا۔ میں کیسے کسی اور کا تھپڑ برداشت کر سکتا تھا۔ اُس دن میرا واویلا پورے محلے نے سنا تھا۔

میری امی نے مجھے چپ کرانے سے پہلے محب کی ماں کی کلاس لی تھی۔ وہ ان کی بہترین دوست تھیں مگر انہوں نے محب کی ماں کو اتنا بے عزت کیا کہ اس کے بعد میں نے کبھی محب اور اس کی ماں کی شکل اپنے گھر میں نہیں دیکھی۔

خیر یہ بات تو ضمناً بیچ میں آگئی۔ میں آپ کو اپنی پھولوں سے عشق کی داستان سنا رہا تھا۔ اس عشق میں، میں تنہا نہیں تھا بلکہ ایک اور ہستی بھی میری شریکِ سفر تھی۔ وہ تھی مجھ سے دو سال چھوٹی میری تایازاد بہن عینا۔

عینا خود بھی کسی خوبصورت پھول یا تتلی سے کم نہیں تھی۔ اس کی سرخ رنگت میں شاید قدرت نے گلابوں کی سرخی شامل کی تھی۔ اس کے سنہری مائل بال اسے کسی گڑیا کا سا روپ دیتے تھے۔ وہ عام طور پر فراک ہی پہنے رہتی تھی جن پر کبھی بڑے بڑے پھول بنے ہوتے تو کبھی ننھے ننھے پھولوں سے اس کا فراک سجا ہوتا۔ ایسے رنگ برنگے پھولوں سے سجی فراک میں اسے گھومتے پھرتے دیکھ کر مجھے ایسا لگتا جیسے پھولوں کے بیچ حسین تتلی اُڑ رہی ہے۔

ہمارے گھر ساتھ ساتھ تھے اس لیے ہمارا وقت اکثر ساتھ ہی گزرتا۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ پھولوں، تتلیوں اور کہانیوں کی باتیں کرتے رہتے۔

وقت پر لگا کے اُڑتا گیا اور ہم دونوں بڑے ہوگئے۔ بڑا ہونے کے بعد اس کا رنگ روپ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا مگر میرے لیے ابھی بھی وہ پہلے والی عینا ہی تھی۔ اب اس نے چادر اوڑھنا شروع کر دی تھی۔ رنگ برنگے پھولوں سے سجی چادر...... مگر اس میں ایک تبدیلی آگئی تھی۔

اب وہ مجھ سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگی تھی۔ اس کے رویے نے میرے دل میں دراڑ ڈال دی۔ میں اب بھی اسی طرح اس کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ مجھے کم ہی نظر آتی۔ زیادہ تر اپنے گھر میں ہی گھسی رہتی تھی۔

بڑا ہونے کے بعد پھولوں سے میرے عشق میں بھی کمی آگئی تھی۔ عمروعیار، سندباد اور ٹیمسن کی جگہ عمران سیریز، فرہاد علی تیمور، جلیل اور شامی تیمور نے لے لی تھی۔ ڈائجسٹ کے علاوہ میں ادبی کتب کا مطالعہ بھی کرتا۔ ہمارے گھر میں کافی بڑی لائبریری تھی۔ جس میں دنیا جہان کی کتابیں ''نمائش'' کے لیے رکھی تھیں۔ جی ہاں، صرف نمائش کے لیے۔ کیونکہ وہ کتابیں پڑھتا کوئی نہیں تھا۔ مہمانوں کو اسٹڈی کی خاص طور پر ''سیر'' کرائی جاتی۔ وہ اتنی بڑی اسٹڈی اور اس میں موٹی موٹی کتابیں دیکھ کے ہمارے ''ادبی ذوق'' سے کافی متاثر نظر آنے لگتے۔

پڑھائی میں، میں کافی اچھا تھا۔ مطالعے کی عادت نے میرے ذہن کو اتنا کھول دیا تھا کہ نصابی کتب ایک ہی بار پڑھنے سے مجھے سمجھ آجاتی۔ امتحانات میں اچھے مارکس کی وجہ سے کبھی کسی نے میرے مطالعے کی عادت پر قدغن لگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر ایسا کرتے تو شاید وہ ہنگامہ بہت پہلے رونما ہو جاتا جو میرے آئی سی ایس کرنے کے بعد ہوا۔

☆☆☆

مجھے لکھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ بچپن میں عمروعیار کے کردار سے متاثر ہو کے میں نے بھی ایک فرضی کردار ''مکار بے شمار'' کے نام سے تخلیق کیا تھا۔ یہ اور بات کہ وہ کردار میری ایک نوٹ بک کے صفحات میں ہی دفن ہو کے رہ گیا۔ دنیا اس سے متعارف نہیں ہو پائی نہ میں اسے دنیا سے متعارف کرا پایا۔ اس کی وجہ کوئی نہیں تھی بس مجھے ہی کبھی اس کردار کو دنیا سے متعارف کرانے کا خیال نہیں آیا تھا۔

اس لیے جب میرے ابو نے انٹر کے بعد مجھے کمیشن کے لیے اپلائی کرنے کا کہا تو میرا جواب خود میرے لیے حیران کن تھا۔

ہم اس وقت اسٹڈی میں ہی بیٹھے تھے۔ ابو نے لیو ٹالسٹائی کا مشہور زمانہ ناول ''وار اینڈ پیس'' کی ایک جلد اٹھا رکھی تھی۔ پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ وہ اس کے اوپر ایک صفحہ رکھ کے کچھ لکھنے میں مشغول تھے۔ ساتھ ہی وہ مجھ سے باتیں بھی کیے جا رہے تھے۔ انہوں نے جب مجھے کمیشن کے ٹیسٹ کے لیے اپلائی کرنے کا کہا تو میں احتجاجی انداز میں بولا۔

''ابو میں فوج میں نہیں جانا چاہتا۔''

انہوں نے بھویں اچکا کے مجھے دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں مجھے حیرانی کا سمندر موجزن نظر آیا۔

''کیوں؟'' حیرانی کی وجہ سے شاید وہ یک لفظی

سوال ہی کر سکتے تھے۔

''مجھے نہیں پسند فوج۔ اپنے جیسے انسانوں کو ہی بغیر جان پہچان کے بلاوجہ مارنا۔ مجھ سے نہیں ہوگا یہ سب۔'' میں نفرت انگیز لہجے میں بولا۔

اُن کے چہرے پر سرخی نمودار ہونے لگی مگر جب وہ بولے تو ان کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ ''اچھا! تو پھر کیا کرنے چاہتے ہو تم؟''

اس سوال کا جواب میں نے سوچ نہیں رکھا تھا۔ پتا نہیں کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔

''میں مصنف بننا چاہتا ہوں۔'' یہ جواب میرے لیے بھی حیران کن تھا۔

''ہماری سات پشتوں میں کبھی کوئی مصنف نہیں بنا۔ نہ میں تمہیں اس کی اجازت دے سکتا ہوں۔ تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں چاہتا ہوں۔'' وہ الفاظ چبا چبا کے بولے۔ ان کے چہرے کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔

''ہماری سات پشتوں میں کوئی فوجی بھی نہیں تھا۔ یہ تو دادا جان کو پتا نہیں کیا پڑی تھی کہ زمینداری چھوڑ کے انگریزوں کی چاکری کرنے کے لیے فوج میں بھرتی ہو گئے۔'' میں ان کے تاثرات سے انجان، اپنے ایک پڑوسی کی فراہم کردہ معلومات کو جھاڑنے لگا۔

میرا یہ جملہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔ اگلے ہی پل وہ اٹھے اور انہوں نے ایک زناٹے دار تھپڑ میرے گال پر جڑ دیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ میں اپنا ایک ہاتھ گال پر رکھے بے یقینی سے انہیں گھور رہا تھا۔

''بند کرو اپنی بکواس۔ یہ کتابیں پڑھ پڑھ کے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' مجھے تھپڑ مار کے شاید ان کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ وہ ''وار اینڈ پیس'' کو زمین پر مار کے دہاڑے۔

میری آنکھوں سے دہری تکلیف کی وجہ سے آنسو بہنے لگے۔ ایک تکلیف تو تھپڑ کی تھی اور دوسری تکلیف اس بات کی تھی کہ تھپڑ میرے ابو نے مجھے مارا تھا۔ میرے ذہن میں بغاوت کی تیز لہر اٹھی۔ میں دروازہ کھول کے لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

میں چلتا جا رہا تھا۔ مجھے کوئی خبر نہیں تھی کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ آنسو میرے رخساروں پر بہہ بہہ کے جانے کب کے جم چکے تھے۔ اچانک ایک تیز ہارن کی آواز مجھے حواس میں لے آئی۔ میں نے ہڑبڑا کے سامنے دیکھا۔ ایک گاڑی مجھ سے چند قدم کے فاصلے سے میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں روڈ کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بریک کی سمع خراش چرچراہٹ بلند ہوئی۔ اگلے ہی پل مجھے زوردار دھکا لگا۔ میں اُڑتا ہوا فٹ پاتھ پر جا گرا۔ میرا سر زمین سے ٹکرایا۔ میری آنکھوں کے آگے نیلے پیلے تارے ناچے جو چند لمحوں میں ہی اندھیرے میں گم ہو گئے۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میری نظر ایک گھومتے پنکھے پر پڑی۔ میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا مگر وہ کہانیوں میں لکھے جانے والا روایتی سا سوال یعنی ''میں کہاں ہوں'' نہیں تھا۔ اس کے بجائے میرے ذہن میں جو سوال ابھرا، وہ یہ تھا۔

یہ جو گھوم رہا ہے۔ اسے کیا کہتے ہیں؟ اس آسان سوال کا جواب میرے ذہن میں کافی دیر کے بعد آیا۔

آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہونے لگے۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں غصے کے عالم میں گھر سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ پھر مجھ سے شاید گاڑی ٹکرائی تھی۔ اس کے بعد...... اس کے بعد میرا ذہن کچھ بتانے سے قاصر تھا۔

کچھ دیر کے بعد میری حالت بہتر ہوئی تو میں نے اپنا جائزہ لیا۔

فرش پر ایک میٹرس بچھا تھا جس پر میں لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں اس بستر کے علاوہ صرف ایک پلاسٹک کی میز تھی۔ میز پر ایک جگ اور گلاس رکھا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو سر سے درد کی ٹیس اٹھی۔ میری آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا۔ چند لمحے اسی طرح بیت گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا چھٹا تو میں نے اپنے سر کو ٹٹولا۔ میرے ہاتھ نے سر پر دائیں جانب ایک گومڑ محسوس کیا۔ میں نے ہاتھ دیکھا۔ اس پر خون کا نشان نہیں تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

بڑی مشکل سے میں گھسٹ کر پانی کے جگ تک پہنچا۔ گھسٹتے ہوئے میری بائیں ٹانگ میں بھی تکلیف ہو رہی تھی لیکن یہ تکلیف قابلِ برداشت تھی۔ پانی پی کے میری حالت مزید بہتر ہوئی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ اگر مجھ سے گاڑی ٹکرائی تھی تو مجھے اس وقت کسی اسپتال میں ہونا چاہیے تھا جبکہ یہ کمرا کسی اسپتال کا تو ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔

تو کیا میں کسی جرائم پیشہ شخص کے ہتھے چڑھ چکا ہوں؟ اپنے ذہن میں ابھرنے والے اس سوال نے میری پریشانی

میں یک لخت اضافہ کر دیا۔
میں نے ہراساں نظروں سے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ دیواروں پر سفید چونا کیا گیا تھا جو کافی جگہوں سے اکھڑا ہوا تھا۔ میری نظر دیوار گیر گھڑی پر پڑی تو میں چونک گیا۔ وہ سوا گیارہ بجا رہی تھی۔ مجھے یاد آیا۔ جب میں گھر سے نکلا تھا تو مغرب ہونے والی تھی۔ گاڑی سے ٹکراتے وقت اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ گویا اس وقت اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اُس وقت آٹھ بجے کا وقت ہوگا اور اب سوا گیارہ بج رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا، میں کم از کم تین گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔
کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا جہاں سے باہر کا منظر دیکھا جا سکتا۔ لے دے کے صرف ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ میں نے اٹھ کے اسے کھولنے کی کوشش کی تو توقع کے مطابق اسے باہر سے بند پایا۔ میں نے دروازہ بجانا شروع کر دیا۔
مجھے توقع تھی کہ دروازہ بجاتے ہی کوئی شخص دروازہ کھول دے گا مگر کافی دیر دروازہ بجانے کے باوجود کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔
''کوئی ہے؟'' میں بلند آواز میں کافی دیر تک چلاتا رہا مگر بے سود......
میں تھک ہار کے واپس آ کے میٹرس پر بیٹھ گیا۔ مجھے پڑھی گئی ایسی لاتعداد کہانیوں کی یاد آئی جن میں کوئی کردار میرے جیسے حالات کا شکار بنتا تھا۔ گویا آج میں بھی کسی کہانی کا کردار بن چکا تھا مگر پریشانی کی بات یہ تھی کہ کہانیوں کی طرح کوئی ہیرو مجھے بچانے آنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

کیا میں کسی بردہ فروش گروہ کے ہاتھ چڑھ چکا ہوں؟ یہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ اب مجھے پتھر توڑنے پڑیں گے یا کوئی اور سخت کام کرنا پڑے گا؟ میرے ذہن میں ایسے ہی لاتعداد سوال چکرانے لگے۔
مجھے اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ اس خیال نے مجھے توانائی بخشی اور میں کمرے کا جائزہ ایک نئے زاویے سے لینے لگا مگر کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے دروازہ توڑا جا سکتا۔
میں نے دروازے کا جائزہ لیا۔ یہ پلائی ووڈ کا بنا ایک نازک سا دروازہ تھا جو کسی کہانی کے ہیرو کے ایک کندھے کی مار تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں پیچھے گیا اور دوڑتا ہوا آیا اور دروازے کو اپنے کندھے سے زوردار ضرب لگائی مگر یہ کیا دروازہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا الٹا میرا کندھا جھنجھنا اٹھا۔ بھاگنے سے میری ٹانگ کی تکلیف میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔
تکلیف کی وجہ سے میں دروازے کو دوسری ٹکر مارنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ اچانک میری نظر پانی کے جگ پر پڑی تو میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔
میں نے جگ اٹھا کے اس کا جائزہ لیا۔ یہ اسٹیل کا جگ تھا جو کسی کے سر پر لگتا تو اس کے بے ہوش ہونے کے کافی چانس تھے۔ کہانیوں میں کئی دفعہ میں نے گلدان یا جگ جیسی چیز سے بھاری بھرکم بندوں کو بھی بے ہوش ہوتے دیکھا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میری آنکھوں میں امید کا دیا ٹمٹمانے لگا۔
میں دروازے کے پیچھے جگ اٹھا کے کھڑا ہو گیا۔ اب جوں ہی کوئی دروازہ کھولتا میں اس کے سر پر جگ مار کے بھاگ جاتا مگر یہاں پر بھی میرے ساتھ ویسا نہیں ہوا جیسا کہانیوں میں ہوتا ہے۔ دروازے کے پیچھے کھڑے ہو کے میری ٹانگیں شل ہو گئیں مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔
آخر کار میں مایوس ہو کے میٹرس پر آ کے بیٹھ گیا۔ میٹرس پر بیٹھے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ میں لپک کر جگ کی طرف بڑھا۔ ابھی جگ اٹھایا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ دروازے پر کھڑا شخص مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

☆☆☆

وہ مناسب قد و قامت کا چالیس پینتالیس سالہ شخص تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ سفید رنگ کا کاٹن کا شلوار قمیص اس پر جچ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا شاپر تھا۔ اپنے حلیے سے وہ خاصا مہذب لگ رہا تھا۔ میں نے اس کے اوپر سے باہر جھانکنے کی کوشش کی تو میری نظر ایک بغیر پلاستر کی چھت سے پھسلتی ہوئی تاروں بھرے آسمان پر پڑی۔
میرے پاس اب موقع نہیں تھا کہ میں اس کے سر پر جگ مارتا۔ مجھے اور کچھ سمجھ نہیں آئی تو میں اس سے گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔ وہ مجھے گلاس میں پانی انڈیلتے دیکھ کے مطمئن انداز میں اندر آ گیا۔
''شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا'' وہ دروازہ بند کرتے ہوئے نرم سے انداز میں بولا۔
میری آنکھوں میں اُلجھن تیرنے لگی۔ پہلے تو اس

کا حلیہ میری توقع کے خلاف نکلا تھا اور اب اس کا نرم انداز بھی میری توقع کے خلاف تھا۔ میں تو توقع کر رہا تھا کہ وہ کوئی بڑی بڑی مونچھوں یا داڑھی والا خوفناک سا شخص ہوگا جو مجھے اغوا کر کے لے آیا ہوگا اور وہ مجھ سے پھاڑ کھانے والے انداز میں بات کرے گا مگر یہاں ماجرا ہی الٹا تھا۔

''آؤ بیٹھو۔'' اس نے میٹرس پر بیٹھتے ہوئے نرم لہجے میں مجھے کہا۔

''آپ کون ہیں اور مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟'' میں نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے سوال کیا۔

''بتاتا ہوں۔ پہلے یہ تو کھا لو۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔'' اس نے شاپر میں سے برگر نکالتے ہوئے کہا۔

برگر کی خوشبو سے مجھے احساس ہوا کہ میں دن بھر کا بھوکا ہوں۔ میں اُس کے قریب آ کے بیٹھ گیا۔ اس نے ایک برگر میری طرف بڑھایا اور دوسرا خود کھانے لگا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے لے کے برگر تھام لیا۔ میں نے برگر کا نوالہ لیا۔ وہ دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اپنے انداز سے وہ ہرگز جرائم پیشہ نہیں لگ رہا تھا مگر میں اس پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میرا علم کہانیوں تک محدود تھا۔ اپنی تنہائی پسند طبیعت کی وجہ سے میں دنیا کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میں نے تو اپنی ایک الگ ہی دنیا بسائی ہوئی تھی جس میں، میں رہ رہا تھا مگر وقت نے مجھے حقیقی دنیا کے سامنے لا پھینکا تھا۔ حقیقی دنیا کا ہر کردار کئی کئی رنگ لیے ہوئے تھا۔ کسی کو محض دیکھ کے اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ کہانیاں پڑھ پڑھ کے میں... کم از کم حقیقی دنیا کے بارے میں اتنا تو جانتا تھا۔

''آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟'' اسے خاموشی سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کے میں نے سوال کیا۔

''بھئی تم میری گاڑی سے ٹکرا کے بے ہوش ہو گئے تھے۔ تمہاری جیبوں میں کوئی ایسا شناختی کاغذ نہیں تھا جس سے مجھے تمہارے گھر کا پتا چلتا۔ اس لیے میں تمہیں یہاں لے آیا۔'' وہ مطمئن انداز میں بولا۔

''آپ مجھے اسپتال لے کے کیوں نہیں گئے؟'' میرے لہجے میں شک نمایاں تھا۔

''تمہیں اسپتال لے کے جاتا تو لمبے ہی چکر میں پھنس جاتا جبکہ اُس وقت مجھے ایک انتہائی ضروری کام کرنا تھا۔ ویسے بھی تمہیں کوئی خاص چوٹ تو آئی نہیں تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ تم خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے ہو۔ اس لیے میں تمہیں یہاں چھوڑ کے اپنا کام کرنے چلا گیا۔'' وہ اسی انداز میں بولا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''اس جگہ کے قریب ہی ہے جہاں تم بے ہوش ہوئے تھے۔'' وہ مبہم انداز میں بولا۔ اس کے جواب سے میرا کوئی بھلا نہیں ہوا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کس جگہ بے ہوش ہوا ہوں۔

''ہوش میں آنے کے بعد میں دروازہ کافی دیر تک بجاتا رہا اور زور زور سے آوازیں بھی دیتا رہا۔ لیکن کوئی بولا نہیں۔'' میں شکوہ کناں انداز میں بولا۔

''یہ گھر دراصل الگ تھلگ سا ہے۔ اس لیے کسی کو آواز ہی نہیں گئی ہوگی۔ ویسے بھی یہاں لوگ جلدی سو جاتے ہیں۔'' اس نے اپنے طور پر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''مجھے ابھی گھر چھوڑ آئیں۔ میرے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' میں نے اس کی نیت جاننے کے لیے اس سے تقاضا کیا۔

''تم کدھر رہتے ہو؟''

میں نے اسے اپنا ایڈریس بتایا تو وہ بولا۔ ''یہ تو کافی پوش علاقہ ہے۔ تمہارے ابو کیا کرتے ہیں؟''

''وہ فوج میں کرنل ہیں۔'' میں فخریہ انداز میں بولا تو اس کے چہرے پر فکر و تردد کے تاثرات نمودار ہو گئے۔

''ابھی تو رات بہت ہو گئی ہے میں تمہیں صبح چھوڑ آؤں گا۔'' اس کا یہ جواب سن کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی نیت ٹھیک نہیں۔

''میرے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے پولیس میں رپورٹ بھی درج کرا دی ہو۔'' میں فکرمندی سے بولا۔

''میں جانتا ہوں وہ پریشان ہو رہے ہوں گے مگر اس وقت تمہیں گھر چھوڑنا ممکن نہیں۔ وہ گاڑی میں نے اپنے ایک جاننے والے سے مستعار لی تھی۔ اپنا کام کر کے میں ابھی اس کے ساتھ ہی یہاں تک آیا تھا۔ وہ مجھے یہاں چھوڑ کے واپس جا چکا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ اتنی رات گئے میں کیسے تمہارے گھر چھوڑوں؟'' اس نے آخر میں گھڑی کی طرف دیکھا۔

میں وقت دیکھ کے چونک گیا۔ ایک بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔

''تو پھر میرے گھر والوں سے فون پر میری بات ہی کرا دیں۔''

”ہاں، یہ ہوسکتا ہے۔ اپنے گھر کا نمبر بتاؤ۔“ اس نے ”تینتیس دس“ نکالا اور منتظر نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

اس وقت موبائل اتنا عام نہیں تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس کے پاس موبائل ہوگا۔ کم سے کم یہ توقع تو ہرگز نہیں تھی کہ وہ میرے گھر والوں سے میری بات کرادے گا۔ اگر اس کے پاس موبائل تھا اور اس نے میرے گھر والوں سے میری بات کرانا ہی تھی تو یہ کام تو اسے سب سے پہلے کرنا چاہیے تھا۔

میں اُلجھن بھرے انداز میں اسے اپنے ابو کا نمبر بتانے لگا۔ وہ ساتھ ساتھ نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ موبائل کے بٹن دبا رہا تھا۔ کی پیڈ کی ”ٹوں ٹوں“ کی آواز سن کے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جارہی تھی۔

نمبر ملانے کے بعد اس نے موبائل کان کے ساتھ لگا لیا۔ میں بے چینی سے اسے دیکھنے لگا۔ ”آپ کا بیلنس یہ کال ملانے کے لیے ناکافی ہے۔“ مدھم سی یہ آواز سنتے ہی میرے ارمانوں پر اوس پڑگئی۔

اس نے بھی چہرے پر مایوسانہ تاثرات طاری کر لیے۔ ”اوہ، اس کا تو بیلنس ہی ختم ہوگیا ہے۔“ وہ افسوس بھرے انداز میں بولا۔

”تم فکر مت کرو۔ صبح ہوتے ہی میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔

میں سوچ میں پڑگیا۔ یہ تو میں نے اپنے دل میں طے کرلیا تھا کہ آج رات یہاں نہیں گزارنی۔

”مجھے واش روم جانا ہے۔“ مجھے واش روم کی حاجت تو محسوس نہیں ہورہی تھی تاہم میں اس گھر کو باہر سے دیکھنا چاہ رہا تھا۔ باہر نکل کے شاید مجھے فرار کا موقع بھی مل جاتا۔

”یہاں تو واش روم ہے ہی نہیں۔ تم صبر کرو۔ ویسے بھی اب تھوڑا ہی وقت رہتا ہے صبح ہونے میں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”مجھے شدت سے ضرورت محسوس ہورہی ہے۔ میں باہر جاکر کرلوں گا۔“ اس کے چہرے پر پُرسوچ تاثرات ابھرے۔

”چلو ٹھیک ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔“ کچھ لمحات سوچنے کے بعد اس نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھے اس کی پشت نظر آرہی تھی۔ اٹھتے ہوئے میری نظر جگ پر پڑی۔ میرے لیے اس پر قابو پانے کا یہ سنہری موقع تھا۔ میں نے اپنے اندر ہمت مجتمع کی اور جگ اٹھالیا۔ جگ پانی سے آدھا بھرا ہوا تھا اور کافی بھاری لگ رہا تھا۔ اگر میں اس کے سر پر زوردار وار کرنے میں کامیاب رہتا تو امید تھی کہ وہ بے ہوش نہ بھی ہوا تو کم سے کم مجھے بھاگنے کا موقع مل جائے گا۔

وہ دروازہ کھول رہا تھا کہ میں نے اس کی کنپٹی پر زور سے جگ دے مارا۔ جگ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کے منہ سے تکلیف دہ آواز نکلی۔ اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ اٹھا کے کنپٹی پر رکھا۔ میں نے اسے دھکا دیا تو وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔

میں تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ وہ سنبھل کے میری طرف بڑھا۔ میں کھلے دروازے میں کھڑا تھا۔ میں نے دروازے کی اوٹ میں ہوکے پوری قوت سے دروازہ اسے دے مارا۔ وہ کافی تیزی سے میری طرف لپکا تھا۔ دروازے اور اس کا زوردار تصادم ہوا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے جاگرا۔

اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا لیکن وہ ابھی تک بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک بار پھر جگ اٹھا کے اس کی پیشانی پر دے مارا۔ اس کے منہ سے تکلیف دہ آواز برآمد ہوئی اور اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑگئے۔

آخر کار کہانیوں کا علم میرے کام آہی گیا تھا۔

☆☆☆

اُسے بے دم ہوتا دیکھ کے میں تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ برآمدے کے پختہ فرش سے آگے کھلا صحن تھا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل زیر تعمیر گھر تھا۔ صحن میں ریت اور بجری کے ڈھیر پڑے تھے۔ صحن سے گزر کے میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ کافی دور تک کوئی گھر نظر نہیں آرہا تھا۔

کافی دور ٹمٹماتی روشنیاں دیکھ کے مجھے اندازہ ہوا کہ میں اپنے گھر سے بہت زیادہ دور نہیں۔

ہمارا گھر اسلام آباد کے نواح میں واقع ایک وادی میں ہے۔ وہ وادی یہاں سے نظر آرہی تھی۔ یہ گھر دراصل ایک پہاڑی پر بنا ہوا تھا جہاں سے پورے اسلام آباد کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ مکان کے آگے سے ایک کچا راستہ نیچے جارہا تھا۔ میں سنبھلتے ہوئے نیچے جانے لگا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں اس ڈھلوانی راستے پر بہت احتیاط سے اتر رہا تھا۔ اچانک میں نے خود کو ایک روڈ پر پایا۔ وہاں میری نظر ایک گاڑی پر پڑی۔ یہ گاڑی شاید اسی شخص کی تھی کیونکہ آس پاس کوئی اور گھر تو تھا نہیں۔ گویا اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔

گاڑی لاک تھی۔ اگر اس کی چابی مل جاتی تو میں بغیر کسی دقت کے گھر پہنچ سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ چابی اس شخص کی جیب میں ہی ہو سکتی تھی۔ واپس اس کے پاس جانے کے خیال سے ہی میرے دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔ دوسری طرف اندھیری تاریک رات میں پیدل گھر تک پہنچنا انتہائی مشکل نظر آرہا تھا۔ چند لمحات کی سوچ بچار کے بعد میں نے واپس اوپر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میرا یہ فیصلہ ٹھیک تھا یا غلط اس کا فیصلہ وقت نے کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ شخص ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی پیشانی سے نکلنے والا خون چہرے پر جم چکا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی سائڈ پاکٹ میں ہاتھ ڈالا۔ میرے ہاتھ نے ایک پرس کو چھوا۔ میں نے وہ باہر نکال لیا۔

پرس میں دو ہزار کے لگ بھگ رقم کے علاوہ اس کا شناختی کارڈ موجود تھا۔ اس شخص کا نام سعید ستی تھا۔ کارڈ پر درج پتا اسلام آباد کے ایک نواحی علاقے کا ہی کا تھا مگر وہ پتا اس گھر کا نہیں تھا، جس میں اس وقت میں موجود تھا۔

میں نے پرس اپنی جینز کی جیب میں ٹھونس لیا۔ دوسری کوشش میں اس کی جیب سے چابیاں برآمد ہوگئیں۔ ایک کی چین میں لگی چابیاں تو اسی گھر کی لگ رہی تھیں۔ جبکہ دوسری چابی گاڑی کی تھی۔

چابی حاصل کرتے ہی میری آدھی پریشانی کم ہوگئی۔ اس بار باہر نکلتے ہوئے میں نے باہر سے کنڈی بھی لگا دی۔ گاڑی میں آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ چکا تھا۔ میں اپنے گھر کی گلی میں داخل ہوا ہی تھا کہ گیٹ سے ابو کی گاڑی اندر جاتے دیکھی۔

میں نے گاڑی گیٹ سے باہر ہی روکی۔ گیٹ بند کرتے ہوئے چوکیدار کی نظر مجھ پر پڑی تو بھونچکا رہ گیا۔ میں اسے حیران چھوڑ کے اس کے پاس سے گزر گیا۔

''کیا ہوا؟ نہیں ملا نوید؟'' میرے کانوں میں امی کی پریشان آواز پڑی۔

جواب میں مجھے ابو کی آواز نہیں سنائی دی۔ انہوں نے شاید نفی میں سر ہلایا تھا۔

سب لوگ لان میں جمع تھے۔ میرے امی ابو کے علاوہ تایا تائی اور عینا بھی ادھر ہی موجود تھے۔ سب سے پہلے عینا کی نظر مجھ پر پڑی۔

''نوید......!'' اس کی متحیر آواز سن کے سب لوگ چونک گئے۔ امی مجھے دیکھتے ہی میری طرف بھاگیں۔

''نوید تم آگئے۔'' وہ مجھے گلے سے لگا کے چومنے لگیں۔ ماں کی آغوش میں پہنچ کے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میں نے گھر سے بھاگ کے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔

☆☆☆

سعید ستی گرفتار ہو چکا تھا۔ میری کہانی سنتے ہی ابو نے تھانے کال ملا کے تھانیدار کو سارا پتا سمجھایا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی اس کی گرفتاری کی اطلاع ہمیں مل گئی۔ ابو کے رویے سے اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ میں نے ان سے کوئی بدتمیزی بھی کبھی کی تھی یا انہوں نے کبھی مجھے تھپڑ بھی مارا تھا۔ ان کا انداز بالکل نارمل تھا۔

امی کے بعد انہوں نے بھی مجھے گلے سے لگا لیا تھا۔ مجھے دیکھ کے اُن کے چہرے پر جو سکون بکھرا تھا، وہ دیکھ کے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔

سعید نے تھانیدار کے تشدد سے گھبرا کے سچ اُگل دیا تھا۔ اس نے اپنے بیان میں پولیس کو بتایا تھا کہ وہ مجھے اس لیے اس ویران گھر میں لے گیا تھا کہ میرا تاوان وصول کر سکے، لیکن بقول اس کے، اسے جب یہ پتا چلا تھا کہ میں ایک کرنل کا بیٹا ہوں تو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ صبح ہوتے ہی مجھے گھر چھوڑ دیتا۔ اس کی یہ کہانی قابل یقین نہیں تھی۔ اسے اگر مجھے گھر چھوڑنا ہی تھا تو وہ رات کو بھی چھوڑ سکتا تھا۔

وہ گھر اس کے کسی جاننے والے کا تھا اور سعید کے بقول اس نے اسے ایک جھوٹی کہانی سنا کے اس سے چند دنوں کے لیے چابی حاصل کی تھی۔ پولیس نے اس شخص کو بھی گرفتار کرلیا۔ اس سے تفتیش کے دوران پولیس کو پتا چلا کہ وہ شخص بھی میرے اغوا میں ملوث تھا۔ سعید مجھ سے پوچھ کے میرے گھر کا نمبر اُسے بھیجتا اور وہی میرے گھر رابطہ کرتا۔

بہر حال جو بھی تھا، وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور میں بخیریت گھر پہنچ چکا تھا۔

اس واقعے نے میری زندگی یکسر تبدیل کر کے رکھ دی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری زندگی کی کہانی میں میرا کردار اتنا کمزور بھی نہیں۔ میں اگر تتلیوں کے لیے اپنے جیسے لڑکے سے لڑ سکتا تھا تو اپنے لیے خود سے کئی گنا طاقتور دشمن کو بھی اپنی ذہانت سے زیر کر سکتا ہوں۔ اس واقعے نے.... مجھے پُراعتماد بنا دیا تھا۔

اب میں نے ایک نیا شوق اختیار کرلیا تھا۔ وہ شوق تھا لوگوں کے چہرے پڑھنے کا۔ میں جہاں بھی ہوتا اپنے

اردگرد لوگوں کا بغور مشاہدہ کرتا۔ اُن کے چہرے، ان کی حرکات و سکنات دیکھ کے ان کی فطرت کے بارے میں اندازے لگانے کی کوشش کرتا۔ اس وقت اپنے ان اندازوں کو درست ہی سمجھتا تھا مگر وقت نے احساس دلایا کہ آپ جن لوگوں کے ساتھ ساری زندگی گزار دیتے ہیں ان کے کردار کے متعلق بھی بعض اوقات درست اندازہ نہیں لگا پاتے۔ بہرحال میں اپنے نئے مشغلے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بس ایک بات کی کمی تھی کہ اس بار اس کھیل میں میرے ساتھ کوئی شریک نہیں تھا۔

عینا تو اب مجھ سے مکمل پردہ کرنے لگی تھی۔ وہ میرے سامنے جب بھی آتی اس کا چہرہ نقاب سے ڈھکا ہوتا۔ میں اسے دیکھ کے سرد آہ بھر کے رہ جاتا۔

گھر واپسی کے بعد ابو نے بھی مجھے کمیشن کے لیے اپلائی کرنے کا پھر نہیں کہا تھا۔ جب کمیشن کے لیے اپلائی کرنے کی تاریخ گزر گئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

چند دن بعد میں نے ابو سے بی ایس میں داخلہ لینے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے میری خواہش کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ یونیورسٹی لائف نے مجھے کچھ مزید تبدیل کر دیا۔ اب میں تنہائی پسند نہیں رہا تھا۔ اسکول اور کالج لائف میں، میں نے زیادہ دوست نہیں بنائے تھے۔ یہ کسر میں نے یونیورسٹی میں آ کے پوری کر دی۔ میرے دوستوں کی لسٹ میں صرف لڑکے نہیں تھے بلکہ بہت سی لڑکیاں بھی شامل تھیں۔

خوبصورتی میری بہت بڑی کمزوری تھی۔ میں جس بھی حسین لڑکی کو دیکھتا اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیتا۔ اکثر لڑکیوں نے میری پذیرائی کی، لیکن کوئی لڑکی بھی میرے دل کو نہیں چھو سکی۔ اس میں بھی شاید میرا ہی قصور تھا کیونکہ میں ہر لڑکی میں عینا کو ڈھونڈ رہا تھا۔ عینا تو اوپر والے نے ایک ہی بنائی تھی۔ وہ مجھے کسی اور میں بھلا کیسے مل سکتی تھی؟

☆☆☆

میرا سیکنڈ لاسٹ سیمسٹر چل رہا تھا کہ مجھ پر ایک نیا بھوت سوار ہو گیا۔ کہانیاں پڑھتے پڑھتے میں نے کہانی لکھنے کی ٹھان لی۔ میں نے بڑی محنت سے ایک کہانی لکھ کے ایک ڈائجسٹ میں بھیج دی۔ کہانی میل کرتے ہی میں نے ایڈیٹر کو کال کی۔ بڑی مشکل سے میرا ایڈیٹر سے رابطہ ہو سکا۔ اس نے مجھے بتایا کہ پندرہ دن کے اندر وہ میری کہانی پڑھ کے مجھے اس کے بارے میں بتا دے گا کہ وہ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں۔

میرا خیال تھا کہ میری کہانی پڑھتے ہی ایڈیٹر پھڑک اٹھے گا۔ میں نے کہانی کے ساتھ اپنا موبائل نمبر بھی لکھ دیا تھا۔ جب بھی فون بجتا میرے ذہن میں ایک ہی خیال آتا کہ ایڈیٹر کی کال ہو گی مگر پندرہ دن کا میرا انتظار رائگاں گیا۔ ان پندرہ دنوں میں، میں نے کئی بار ادارے کو میل کر کے بھی اپنی کہانی کے بارے میں استفسار کیا مگر جواب ندارد۔

پندرہ دن بعد میں نے پھر ایڈیٹر کو کال کرنے کی کوشش کی۔ تین دن کی مسلسل کوشش کے بعد میری اُس سے بات ہو سکی مگر اس کے جواب نے میرے ارمانوں پر اوس ڈال دی۔

’’سوری، میں مصروفیت کی وجہ سے ابھی تک آپ کی کہانی نہیں پڑھ سکا۔ آپ ایک ماہ کے بعد رابطہ کیجیے گا۔‘‘ اس نے سپاٹ انداز میں اتنا کہتے ہی فون رکھ دیا۔ میں ایک بار پھر انتظار کی سولی پہ چڑھ گیا۔

ایک ماہ بعد میرے سیکنڈ لاسٹ سیمسٹر کے فائنل ٹرم ہو رہے تھے۔ امتحانات کی مصروفیت کی وجہ سے میں وقتی طور پر کہانی کو بھول ہی گیا۔ امتحانات کے بعد میں نے پھر رابطہ کیا۔

’’جی، آپ کی کہانی پڑھ لی میں نے۔‘‘ کہانی کے بارے میں پوچھنے پر ایڈیٹر کے جواب نے میرے دل کی دھڑکن بڑھا دی۔

’’پھر......‘‘ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

’’آپ کی کہانی قابلِ اشاعت نہیں۔ آپ اپنا مطالعہ وسیع کریں۔‘‘ ایڈیٹر کے اس ایک ہی جملے نے میرے اندر کے مصنف کا گلا گھونٹ دیا۔

☆☆☆

میرا کردار ایک ایسا کردار تھا جس میں ہمت اور حوصلہ تھا مگر صبر اور برداشت نہیں تھی۔ کہانی کے ناقابلِ اشاعت قرار دینے کے بعد مجھے اپنے کردار کے بارے میں یہ اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے کبھی کہانی لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں ایک وقت ایسا آیا کہ میں اپنے ساتھ بیتے واقعات کہانی کی صورت میں دنیا کے سامنے لانے پر مجبور ہو گیا۔

اس بار میں نے ایک سچی کہانی لکھی تھی۔ اپنی سچی کہانی...... لیکن اس بار میں نے ایک ایسا بندوبست کیا تھا کہ میری کہانی کا شائع ہونا کافی حد تک یقینی تھا۔ میں کہانی کار تو نہیں بن سکا تھا۔ ہاں کہانی کا کردار ضرور بن گیا تھا۔

اب میں آپ کو اپنی زندگی کے اس حصے کے بارے میں بتاتا ہوں جس نے مجھے کہانی کے کردار کی صورت میں آپ کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

بی ایس کے آخری سمسٹر کا رزلٹ قریب تھا کہ میری نظر ایک اشتہار پر پڑی۔ یہ اشتہار ایک انٹیلی جینس ایجنسی کی طرف سے تھا۔ ایجنسی کو مختلف پوسٹس کے لیے لوگ درکار تھے۔ یہ آسامیاں مختلف قسم کی تھیں۔ فیلڈ ورک سے متعلق بھی اور آفس جاب سے متعلق بھی۔

میرے اندر کا مصنف تو مر چکا تھا سو اب میں اپنے لیے کوئی نیا شعبہ دیکھ رہا تھا۔ میرا بی ایس کمپیوٹر سائنسز میں تھا مگر اس میں بھی مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ایک جگہ بیٹھ کر پورا دن کمپیوٹر کے ساتھ کھپانے کے خیال سے ہی میری جان جاتی تھی۔ اب میں کوئی سنسنی خیز اور تھرلنگ سی جاب کرنا چاہ رہا تھا۔

میرا کردار آپ کو شاید عجیب سا لگ رہا ہو۔ کہاں تو میں پھولوں اور تتلیوں کے عشق میں گرفتار تھا پھر میرے اندر ایک کہانی کار انگڑائی لے کے بیدار ہو گیا۔ چلیں یہ دونوں شوق تو ملتے جلتے تھے مگر میرا نیا شوق شاید آپ کو میرے کردار کے ساتھ میچ کرتا نہ لگ رہا ہو۔

مجھے بھی اپنا یہ شوق شروع میں عجیب سا لگا۔ میں نے اردگرد کے لوگوں کا مشاہدہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ تقریباً ہر شخص میں ہی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے مشاغل، ان کا زندگی گزارنے کا طریقہ، ان کے نظریات سب وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

اگر کرداروں کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہر کردار میں کئی کئی کردار چھپے ہوتے ہیں جو وقت اور حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ آپ اپنی زندگی پہ نظر دوڑائیں تو شاید آپ کو اپنے کردار میں ہونے والی تبدیلیاں حیران کن لگیں۔

خیر میں آپ کو انٹیلی جینس ایجنسی کے اشتہار کی بابت بتا رہا تھا۔ اشتہار دیکھ کے اس بار میرے اندر جس کردار نے انگڑائی لی وہ ایک جاسوس کا تھا۔ وطن کی محبت تو خیر کبھی میں نے دل میں محسوس نہیں کی تھی تاہم کہانیاں پڑھ پڑھ کے غیر محسوس انداز میں میرے اندر جاسوس بننے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی جو اس اشتہار کو دیکھ کے بیدار ہو گئی تھی۔

میں نے اس جاب کے متعلق ابو سے مشورہ کیا تو اُن کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ تو چاہتے تھے کہ میں بھی اپنے دیگر خاندان کے افراد کی طرح وطن کی حفاظت کا کام سرانجام دوں۔ فوج نہ سہی انٹیلی جینس ایجنسی ہی سہی۔

رزلٹ آتے ہی میں نے جاب کے لیے اپلائی کر دیا۔ گوکہ میری ڈگری کے ساتھ تو آفس ورکر کی جاب زیادہ موضوع تھی مگر میں نے فیلڈ ورکر کی جاب چنی تھی۔

کچھ میری قابلیت اور کچھ ابو کی سفارش...... مجھے جاب کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ ڈی ایس آئی اے (ڈیفنس سروس انٹیلی جنس اکیڈمی) میں چھ ماہ کی تربیت نے میرے کردار میں کچھ اور تبدیلیاں رونما کر دیں۔

ٹریننگ کے بعد مجھے وزارت خارجہ میں کمپیوٹر آپریٹر کی جاب دی گئی۔ تاہم یہ میرا ''کور'' تھا۔ میری اصل جاب کچھ اور تھی۔ اس جاب کے دوران میں جو ٹاسک میں سرانجام دیتا رہا وہ خفیہ نوعیت کے تھے سو وہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔

مجھے جاب کرتے ہوئے دو سال ہوئے تھے کہ گھر میں میری شادی کا ذکر چل نکلا۔ مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب رات کے کھانے پر میری امی نے، میری شادی کا ذکر چھیڑا تھا۔

''بیٹا، ماشاءاللہ سے اب تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ہو۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ اب تمہارا کہیں رشتہ طے کر دیں۔'' انہوں نے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد یکدم ہی یہ بات کر دی۔ میں پانی پی رہا تھا۔ مجھے ٹھسکا لگا۔

ابو بھی کھانے کی ٹیبل پر موجود تھے۔ وہ خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے، پہلے میں امی ابو کے سامنے ہر بات کر دیا کرتا تھا مگر وقت کے ساتھ مجھ میں ایک یہ تبدیلی بھی رونما ہو گئی تھی کہ اب میں ابو کے سامنے خاص طور پر باادب رہتا تھا۔ امی کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ میں ان کی بات کے جواب میں کیا کہوں۔

مجھے خاموش دیکھ کے وہ پھر گویا ہوئیں۔

''تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہے تو بتاؤ۔ نہیں تو ہم خود ہی کوئی لڑکی دیکھ لیں۔'' وہ شریر سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

میں سنجیدہ انداز میں بولا۔ ''آپ لڑکی دیکھ کے بتائیں۔ میری مرضی ہوئی تو اوکے کر دوں گا۔''

میرا جواب ان کی منشا کے مطابق تھا۔ انہوں نے نیپکن سے منہ صاف کیا اور بغور مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''لڑکی تو ہے ایک ہماری نظر میں، مگر پتا نہیں تم اس سے شادی پر راضی ہوتے ہو یا نہیں۔''

میں نے بھویں اچکا کے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے پر اکتفا کیا۔ وہ کچھ دیر کے بعد پھر گویا ہوئیں۔ ''عینا کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

عینا کا نام سنتے ہی... میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

''نیک خیال ہے۔'' میں دھیمے سے لہجے میں بولا۔ بے اختیار ہی میرے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ ابو بھی میرا جواب سن کے زیرِ لب مسکرانے لگے۔

خیر قصہ مختصر ایک ہفتے بعد میری عینا کے ساتھ منگنی ہو گئی۔ اس وقت تو میں بہت خوش تھا مگر بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اس دن میں نے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔

☆☆☆

پانچ سال بعد...... جی ہاں پانچ سال بعد میری زندگی میں ایک بھونچال آ گیا۔ بھونچال تو ان پانچ سالوں میں اور بھی بہت سے آئے تھے مگر وہ بھونچال موجودہ کے مقابلے میں کچھ نہیں تھے۔

اُن دنوں میری ڈیوٹی لاہور میں تھی۔ میں ایک ماہ دبئی میں گزارنے کے بعد ایک دن پہلے ہی لوٹا تھا۔ اس وقت میں آفس تھا جب مجھے ''واٹس ایپ'' پر ایک میسج موصول ہوا۔

میسج بھیجنے والے کا نمبر میرے سیل میں محفوظ نہیں تھا۔ مختصر سا میسج تھا۔ ''میں تمہیں کچھ تصاویر سینڈ کر رہا ہوں۔ دیکھ کے رائے دو کہ کیسی آئی ہیں۔''

میرے چہرے پر اُلجھن کے تاثرات نمودار ہوئے۔ میں نے میسج بھیجنے والے کا نمبر ''ایڈ ٹو کونٹیکٹ'' کیا اور اس کی ''پروفائل'' چیک کرنے لگا۔ اس کی ''پروفائل پکچر'' میں ایک سایہ سا بنا تھا۔ اس کے اسٹیٹس میں ایک جملہ درج تھا۔ ''کوئی دیکھے نہ دیکھے میں تو دیکھوں گا۔''

اس کی پروفائل پکچر اور اسٹیٹس دیکھ کے میری اُلجھن سوا ہوگئی۔ میسج کے بعد کافی دیر گزر گئی تھی مگر ابھی تک اس نے تصاویر نہیں بھیجی تھیں۔ میں صبر سے تصاویر کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک مجھے اس کے نمبر کی ملکیت جاننے کا خیال آیا۔ انٹیلی جینس ایجنسی میں جاب کی وجہ سے کسی بھی نمبر کی ملکیت جاننے کا اختیار میرے پاس تھا۔

نمبر کسی ''اسحاق مندری'' کے نام تھا۔ یہ عجیب و غریب سا نام دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی۔ پتا اسلام آباد کے ایک مضافاتی علاقے کے پوسٹ آفس کا تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش سے پتا چلا کہ اس کی عمر چالیس سال ہے۔ میں نے ''نادرا'' کے ریکارڈ میں محفوظ اس کی آئی ڈی کارڈ کی کاپی نکالی۔ اس کی تصویر دیکھ کے میں چونک گیا۔ اُلجھی ہوئی داڑھی اور بکھرے بالوں سے وہ کوئی پاگل لگ رہا تھا۔

اسی لمحے میرے سیل پر واٹس ایپ کی ٹون پھر بجی۔

یہ تین تصاویر تھیں جنہوں نے میرے پاؤں کے نیچے سے یک لخت جیسے زمین کھینچ لی تھی۔ ڈی ایس آئی اے کی ٹریننگ نے میرے اعصاب انتہائی مضبوط کر دیے تھے مگر اس کے باوجود اُن تصاویر کو دیکھ کے مجھے جھٹکا لگا تھا۔

ان تین تصاویر میں کل چار کردار موجود تھے اور چاروں ہی میرے جاننے والے تھے۔ یہ تینوں تصاویر ''قابلِ اعتراض'' حالت میں تھیں۔ تینوں میں مرد مختلف تھے مگر عورت ایک ہی تھی۔ وہ عورت کوئی اور نہیں...... میری بیوی تھی، میری ''تتلی''۔ میں ہکا بکا ان تصاویر کو دیکھ رہا تھا۔ اپنی بیوی کے اس روپ سے تو میں ہمیشہ بے خبر رہا تھا۔ میرا غم و غصے سے برا حال ہو گیا۔

میں نے تو بچپن میں ''اپنی تتلی'' کو چھونے پر اپنے بہترین دوست کو نہیں بخشا تھا۔ ان تینوں کو میں کیسے بخش سکتا تھا مگر اس سے پہلے یہ تصاویر بھیجنے والے کو پکڑنا ضروری تھا۔

میں نے ''ٹریکنگ ڈیوائس'' نکالی اور اس نمبر کی لوکیشن چیک کرنے لگا۔ یہ نمبر اسی جگہ ایکٹو تھا جو اسحاق مندری کے پتے پر درج تھی۔ میں نے ٹریکنگ ڈیوائس گاڑی میں رکھی اور روانہ ہو گیا۔

میری جاب کی نوعیت ایسی تھی کہ ٹریکنگ ڈیوائس اور اس جیسے دیگر بہت سے آلات میری کسٹڈی میں ہوتے تھے۔ گاڑی میں بھی ایسے بہت سے آلات موجود تھے جن کی ضرورت مجھے کسی بھی وقت پڑ سکتی تھی۔

میں نے طوفانی ڈرائیونگ کی اور آدھے گھنٹے میں ہی مطلوبہ علاقے میں پہنچ گیا۔ ٹریکنگ ڈیوائس سے مجھے پتا لگا کہ وہ نمبر ابھی اسی جگہ ایکٹو ہے جہاں وہ آدھا گھنٹا پہلے موجود تھا۔ وہ علاقہ ''جھگیوں'' والوں کی آماجگاہ تھا۔ ہر طرف خیمے لگے تھے اور پھٹا لباس کے میلے کچیلے بچے گھوم رہے تھے۔

میں نے گاڑی سائڈ پر لگائی اور نیچے اتر آیا۔ بہت سے بچے رک کے اشتیاق بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

''جاؤ یہاں سے۔'' میں دہاڑا۔ بچے سہم کے بھاگ کھڑے ہوئے۔

میری دہائی سن کے خیمے سے ایک شخص باہر نکلا۔
''کون ہے بے......''
اُس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ ٹھٹک کے رک گیا۔ میں بھی اسے دیکھ کے چونک سا گیا۔ اس کی شکل مجھے جانی پہچانی لگی۔ مجھے لگا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی تلاش میں، میں اِدھر آیا تھا۔
اس کے ہاتھ میں ایک اسمارٹ فون تھا جو اس کے میلے کچیلے حلیے کے ساتھ میچ نہیں کررہا تھا۔
''جی صاب جی۔'' وہ عاجزی سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے ہراس نظر آیا۔
میں اُسے دیکھ کے اُلجھن میں مبتلا ہوگیا۔ اسے دیکھ کے ہرگز نہیں لگ رہا تھا کہ اس شخص نے مجھے واٹس ایپ کیے ہوں گے۔
''یہ موبائل کس کا ہے؟'' میں درشت لہجے میں بولا۔
''میرا اپنا ہے جی......'' خوفزدہ انداز میں بولتے ہوئے اس نے سیل اپنے عقب میں چھپالیا۔
''تم اسحاق مندری ہو نا؟''
میرا اگلا سوال سن کے اس کی آنکھوں میں حیرت جھلکی۔ ''جی صاب، مگر آپ مجھے کیسے جانتے ہو؟'' وہ اُلجھن بھرے انداز میں بولا۔
اتنے میں اردگرد کے خیموں سے کافی مرد و زن نکل کے ہمارے پاس پہنچ چکے تھے۔ وہ سب عداوت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ایسے حالات دیکھ کے پہلے میں نے گھی کو سیدھی انگلی سے نکالنے کی کوشش کی۔
''مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔ آؤ، گاڑی میں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔'' اس بار میں ملائمت سے بولا۔
''نہیں صاب، آپ کو جو بات کرنی ہے۔ اِدھر ہی کرو۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔
''بھئی، بات تمہارے فائدے کی ہے۔ جو اِن سب کے سامنے کرنا مناسب نہیں۔'' میں نے جیب سے پرس نکال کے ہزار ہزار کے نوٹوں کی نمائش کی۔ پیسے دیکھ کے اس کی آنکھوں میں لالچ ابھرا۔ اس نے مشورہ طلب نظروں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔
''صاب، آپ مجھے بتاؤ۔ میں آپ کا ہر کام کردوں گا۔'' پیسے دیکھتے ہی ایک بیس بائیس سالہ لڑکا آگے آ کے بولا۔
''چل پیچھے ہٹ تُو......'' اسحاق نے اسے پیچھے دھکیلا۔
''چلو صاب۔'' وہ اس لڑکے کو...... نفرت سے دیکھتا ہوا میری طرف بڑھا۔
اسے اپنی طرف آتا دیکھ کے میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پسنجر سیٹ کا دروازہ بھی میں نے ہاتھ بڑھا کے کھول دیا۔ وہ جھجکتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔
میں نے اگنیشن سوئچ کے ساتھ لگا ایک بٹن دبایا۔ ڈیش بورڈ میں پسنجر سیٹ کے سامنے ایک چھوٹا سا سوراخ موجود تھا۔ اس سے ایک گیس کی پھوار نکلی۔ اگلے ہی پل اسحاق اپنی سیٹ پر جھولنے لگا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھادی۔
گاڑی چلتے دیکھ کے عورتوں نے شور مچانا شروع کردیا مگر اب مجھے ان کے واویلے کی کوئی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

یہ معاملہ چونکہ میرا ذاتی تھا اس لیے میں اسحاق کو اپنے ایک ٹھکانے پر لے آیا تھا۔ یہ علاقہ تیزی سے آباد ہو رہا تھا۔ تاہم اس مکان کے ساتھ والے پلاٹ ابھی خالی تھے۔ مکان میرے ایک دوست کا تھا۔ اس کی ٹرانسفر دوسرے شہر ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے ایک چابی دے رکھی تھی کہ اگر مکان کرائے پر لگے تو لگادوں۔ ابھی تک کوئی کرائے دار تو نہیں ملا تھا تاہم چابی پاس رکھنے کا آج مجھے ایک فائدہ ہوگیا تھا۔
مکان میں اس کا سامان جوں کا توں موجود تھا۔
اسحاق کو ایک کرسی کے ساتھ باندھ کے میں نے اُس کی تفصیلی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے سیل فون کے علاوہ سولہ سو کے لگ بھگ رقم اور چند مڑے تڑے سے سگریٹ نکلے۔ اس رقم میں ایک کڑکڑاتا ہزار کا نوٹ بھی شامل تھا۔ میں وہیں بیٹھ کے اس کے سیل کا جائزہ لینے لگا۔
سیل کی اسکرین کو ان لاک کرتے ہی میری نظر ایک واہیات ویڈیو پر پڑی۔ میں جب اُدھر گیا تھا وہ شاید سیل پر یہ ویڈیو ہی دیکھ رہا تھا۔ سیل میں اس طرح کی لاتعداد ویڈیوز محفوظ تھیں۔
میں نے ان سے صرف نظر کرتے ہوئے واٹس ایپ کھولا۔ کال اور میسج دونوں ریکارڈز خالی تھے۔ ''گیلری'' کو اچھی طرح کھنگالنے کے بعد بھی مجھے وہ تصاویر کہیں نہ ملیں۔ اس نے شاید مجھے تصاویر بھیجنے کے بعد ڈیلیٹ کردی تھیں۔ وہ سایہ نما تصویر جو اس کی پروفائل پکچر کے طور پر لگی تھی وہ ''ڈاؤن لوڈز'' میں محفوظ تھی۔
اسحاق کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ

تصاویر اس نے بھیجی ہوں گی۔ اب اسے ہوش میں لانا ضروری تھا۔

میں نے اس کے بال پکڑ کے کھینچے تو وہ کراہنے لگا۔ دو تین زناٹے دار تھپڑ اسے مکمل ہوش میں لے آئے۔ اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی باچھوں سے رستا خون صاف کیا اور خوفزدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''تم نے یہ فون کہاں سے لیا؟'' میں نے اس کا فون اس کے سامنے لہرایا۔

''صاب، یہ مجھے کہیں سے ملا تھا۔'' وہ خوفزدہ انداز میں بولا۔

''کب؟''

''آج ہی......'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

''تمہارے نمبر سے مجھے کچھ میسج ملے ہیں۔ وہ میسج تم نے کیے تھے؟'' میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

میسجز کا سن کے اس کی آنکھوں سے جھانکتا خوف مزید بڑھ گیا۔

''نہیں صاب، مجھے تو یہ موبائل آج ہی ملا تھا۔ مجھے تو یہ چلانا بھی نہیں آتا۔''

میں نے اسے زوردار تھپڑ رسید کیا۔ وہ کرسی سمیت زمین پر الٹ گیا۔ میں نے کرسی سیدھی کی۔

''تمہیں چلانا نہیں آتا تو کیا تمہاری سم تمہارے باپ نے اس میں ڈال کے مجھے میسج کیا؟'' میں دہاڑا۔

''صاب مجھے مت مارو، میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ باقاعدہ رونے لگا۔

''میں پولیس والا ہوں۔ جس نمبر سے مجھے میسج ملے وہ تمہارے نام پر ہے۔ میں نمبر کو ٹریس کرتا ہوا تم تک پہنچا۔ تم اپنی جھوٹی کہانیاں سنا کے مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ صاف صاف بتادو کہ وہ میسج تم نے ہی کیے یا نہیں۔ تم نے سچ بولا تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ نہیں تو بھوکے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔'' میں نے اس کے بال کھینچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا تو اس کے ہراس میں اور اضافہ ہو گیا۔

پولیس کا نام سنتے ہی وہ لائن پر آ گیا۔ اس نے ٹکڑوں میں مجھے جو کچھ بتایا، وہ کچھ اس طرح تھا۔

''صاب، میں آج اپنے جھونپڑے کے سامنے بیٹھا موبائل پر فلم دیکھ رہا تھا تو آپ کی طرح کا ایک گاڑی والا شخص میرے پاس رکا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہی مجھے اشارہ کر کے بلایا۔ میں اس کے پاس گیا تو وہ بولا میرا بیلنس ختم ہو گیا ہے مجھے ایک انتہائی ضروری میسج کرنا ہے۔ اس نے مجھے ہزار روپیا دیا تو میں نے اپنا موبائل اسے دے دیا۔ وہ کچھ دیر میرے موبائل کے ساتھ لگا رہا۔ اس نے اپنا موبائل نکال کے اس پر بھی کچھ کیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے موبائل مجھے واپس کر دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ صاب، مجھے معاف کر دو۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ میرے موبائل سے کسی کو غلط میسج کرے گا۔ میں نے تو اس کی مجبوری سمجھتے ہوئے اسے اپنا موبائل دے دیا تھا۔''

اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اس کی جیب سے جو کڑکڑاتا ہوا ہزار کا نوٹ برآمد ہوا تھا، وہ بھی اس کی کہانی کی تصدیق کر رہا تھا۔

میں نے اسحاق کے سیل پر ''ڈیٹا مینیجر'' چیک کیا۔ اس سے مجھے پتا چلا کہ اس موبائل پر سات ایم بی ڈیٹا بذریعہ ''وائی فائی'' استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ڈیٹا اسی وقت استعمال کیا گیا تھا جب...... مجھے وہ تصاویر ملی تھیں۔ اس وقت کے علاوہ اس موبائل میں انٹرنیٹ ڈیٹا کبھی استعمال ہی نہیں کیا گیا تھا۔ یہ چیز بھی اسحاق کے سچا ہونے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے...... اسحاق سے سیل لے کے اس کے نمبر پر واٹس ایپ کا اکاؤنٹ بنایا تھا۔ پروفائل پکچر اور اسٹیٹس کہ ''کوئی دیکھے نہ دیکھے میں تو دیکھوں گا'' پُراسرار بننے یا مجھے الجھانے کے لیے لگایا تھا۔ اکاؤنٹ بناتے ہی اس نے مجھے میسج بھیجا اور پھر اپنے سیل سے اس کے سیل میں تصاویر منتقل کرنے کے بعد وہ تصاویر مجھے بھیج دیں۔ میسج کے بعد شاید اسی لیے تصاویر اس نے کچھ دیر کے بعد مجھے بھیجی تھیں کہ اس دوران اس نے وہ تصاویر اپنے سیل سے اس میں منتقل کی تھیں۔ تصاویر مجھے بھیجنے کے بعد شاید اس نے ڈیلیٹ کر دی تھیں۔ مجھ سے رابطے کے لیے شاید اس نے اپنے سیل کا انٹرنیٹ ڈیٹا ہی استعمال کیا تھا۔ اس نے اپنا موبائل ہاٹ سپاٹ آن کر کے بذریعہ وائی فائی اس سیل پر انٹرنیٹ استعمال کیا تھا۔ اتنی زحمت شاید اسے اس لیے کرنا پڑی تھی کہ اب بغیر نام کے سم لینا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے کڑی سے کڑی جوڑی۔

اسحاق کا اس معاملے میں صرف نمبر استعمال ہوا تھا۔ اس لیے میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا مگر اس سے پہلے اس سے چند مزید معلومات لینا ضروری تھا۔

☆☆☆

میں اس وقت بائک پر تھا۔ یہ بائک ابھی کچھ دیر

پہلے ہی میں نے ایک پارکنگ لاٹ سے اٹھائی تھی۔ بائک کو لاک کیا گیا تھا مگر یہ لاک میرے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک پراڈو جارہی تھی۔ میری نظر اس پر تھی۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح اسے کراس کر لوں مگر اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ سڑک پر اِکا دُکا گاڑیاں ہی رواں دواں تھیں۔

پراڈو میں دو افراد سوار تھے۔ ایک تو ڈرائیور تھا۔ جبکہ دوسرا شخص میرا شکار تھا۔ یہ کوئی عام شخص نہیں تھا۔ یہ ایک آرمی آفیسر تھا۔

کرنل مجاہد...... اس کے متعلق جو معلومات میں نے جمع کی تھیں، ان سے پتا چلا تھا کہ یہ انتہائی عیاش قسم کا شخص ہے۔ میری بیوی سے جانے کب اس نے تعلقات استوار کیے تھے۔ اس کا یہ جرم میرے نزدیک قابلِ معافی نہیں تھا۔

یہ ان دنوں چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ چند دن سے میں اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کے گھر میں تو سیکیورٹی کے ٹھیک ٹھاک انتظامات تھے تاہم جب وہ باہر نکلتا تو اس کے ساتھ کوئی گارڈ نہیں ہوتا تھا۔

میں اس کو شکار کرنے کے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا اور آج وہ موقع مل گیا تھا۔ میں اس کی کالز ٹیپ کررہا تھا۔ اس نے ایک شخص سے ایک ریسٹورنٹ میں ملاقات کا وقت طے کیا تھا۔ وہ ریسٹورنٹ میرا دیکھا بھالا تھا۔ اس کی پارکنگ لاٹ اوپن تھی اور وہاں سے فرار کے بہت سے راستے بھی تھے۔

میرے پاس وقت کم تھا، میں اسی وقت اپنے دفتر سے نکل آیا۔ دفتر کے قریب ہی ایک جگہ سے بائک اٹھائی اور ریسٹورنٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں اس ریسٹورنٹ سے ابھی کچھ ہی فاصلے پر تھا کہ کرنل مجاہد کی پراڈو نے مجھے کراس کیا۔ میں نے بائک کی رفتار تیز کی اور اس کے پیچھے لگ گیا۔

ریسٹورنٹ تک مجھے اسے کراس کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ ہم ساتھ ساتھ ہی ریسٹورنٹ پہنچے۔ پراڈو رک چکی تھی۔ میں نے بھی بائک کو سائڈ پر لگایا۔ ریسٹورنٹ کی ایک طرف سے ایک بغلی گلی نکل رہی تھی۔ یہ گلی کافی کشادہ تھی۔ تھوڑا ہی...... آگے رہائشی علاقہ شروع ہوجاتا۔ وہاں پُرپیچ گلیاں تھیں۔ ان میں غائب ہوجانا مشکل نہیں تھا۔

میں نے بائک گلی کے سرے پر ہی کھڑی کردی تھی۔ یہاں سے پراڈو اور میرے بیچ چند فٹ کا ہی فاصلہ تھا۔

ڈرائیور نے اتر کے دوسری سائڈ کا دروازہ کھولا۔ میں نے اپنے سائیلنسر لگے پستول پر گرفت مضبوط کرلی۔

کرنل مجاہد گاڑی سے اتر آیا۔ وہ سیل فون پر کسی سے بات کررہا تھا۔ ڈرائیور پیچھے ہٹ کے مؤدب کھڑا ہوگیا۔ میں نے پستول نکال کے سیدھا کیا مگر ابھی میرے سامنے ڈرائیور تھا۔

مجاہد نے ریسٹورنٹ کی طرف چلنا شروع کیا۔ میرے پستول سے ایک گولی نکلی جو سیدھا اس کے بھیجے کے پار ہوگئی۔ ڈرائیور کو ابھی صورت حال کا ادراک نہیں ہوا تھا کہ میرے پستول سے نکلی دوسری گولی اس کی کنپٹی کے آرپار ہوگئی۔

میں نے فوراً پستول جیب میں ڈالا اور بائک کو گلی میں دوڑا دیا۔ کچھ ہی دور ایک ویران گلی میں بائک روک کے میں نے ہیلمٹ اور دستانوں سے پیچھا چھڑایا اور نپے تلے قدموں سے چل پڑا۔ باہر روڈ پر آتے ہی میں نے ایک ٹیکسی پکڑلی۔

تین چار ٹیکسیاں تبدیل کرنے کے بعد میں اپنے دفتر پہنچ گیا۔ اس وقت تک ہمارے دفتر میں چھٹی ہوچکی ہوتی تھی۔ میں نے گاڑی نکالی اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے ٹی وی لگایا۔ تمام نیوز چینلز پر ایک ہی خبر نشر ہورہی تھی۔

''ٹارگٹ کلنگ کی واردات میں کرنل مجاہد اپنے ڈرائیور کے ساتھ جاں بحق۔ قاتل فرار...... عینی شاہدین کے مطابق قاتل ایک موٹر سائیکل پر سوار تھا......''

اس کے علاوہ میڈیا کو کوئی خاص بات معلوم نہیں تھی۔ میرے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ آج میں نے اپنی ''تتلی'' کو چھونے کے جرم میں پہلے شخص کو جہنم واصل کردیا تھا۔ اب دو افراد باقی تھے۔ میں تصور میں ایسی ہی مزید دو خبروں کو ٹی وی پر چلتے دیکھنے لگا۔

☆☆☆

میرا ایک شکار جہنم واصل ہوچکا تھا مگر دو ابھی تک باقی تھے۔ میں جب تک انہیں مار نہ لیتا مجھے سکون نہیں مل سکتا تھا۔ وہ دونوں افراد اسی انٹیلی جینس ایجنسی کے ملازم تھے جس میں، میں کام کرتا تھا۔ ارشاد کی ڈیوٹی کنٹرول روم میں تھی۔

ایجنسی کے جو لوگ کسی خاص مشن پر ہوتے تھے، وہ ان کی اور گاڑیوں کی نقل و حمل سے ہر پل آگاہ رہتا تھا۔ گاڑیوں میں ٹریکنگ ڈیوائسز لگی ہوتی تھیں۔ وہ کنٹرول روم

میں بیٹھ کے کسی بھی گاڑی کی لوکیشن چیک کر سکتا تھا۔ کس گاڑی کو کب اور کہاں بھیجنا ہے۔ اس میں کون کون سے افراد ہوں گے۔ یہ سب اس کی مشاورت سے ہی ہوتا تھا کیونکہ ملازمین اور گاڑیوں کا ریکارڈ اسی کے پاس محفوظ ہوتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی اس حوالے سے انتہائی حساس تھی۔

اسے شکار کرنا مشکل نہیں تھا مگر بدقسمتی سے وہ ان دنوں چھٹی پر تھا۔ اس کی شادی تھی اس لیے اس نے پورے ماہ کی چھٹی لے رکھی تھی۔ اب اس کی واپسی میں چند دن ہی باقی تھے۔ میں بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

میرا دوسرا شکار انیس فیلڈ ورکر تھا۔ وہ مجھ سے بھی سینئر تھا۔ ایک مشن میں نے اس کے انڈر رہ کے بھی سرانجام دیا تھا۔ وہ ان دنوں ایک خصوصی مشن پر تھا۔ اس کی واپسی کا کچھ پتا نہیں تھا۔

آخر ارشاد کی واپسی کا دن آ گیا۔ مجھے اپنے ذرائع سے پتا چل گیا کہ وہ آج ...شام پانچ بجے اپنے گھر پہنچے گا۔ وہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں تنہا رہتا تھا۔ میں ایک دفعہ اس کے گھر جا چکا تھا اس لیے اس کے محل وقوع سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ میں نے اس کو شکار کرنے کا منصوبہ ذہن میں ترتیب دے لیا۔ اب بس اس پر عملدرآمد باقی تھا۔

اس دن چھٹی تھی۔ میں شام کو میں اپنے گھر سے روانہ ہونے لگا تو میری بیوی لگاوٹ سے بولی۔

''کہاں کی تیاری ہے؟''

''ہے ایک بہت ضروری کام۔'' میں اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

اس نے اپنے مخصوص اسٹائل میں کندھے اچکائے۔ اس کا یہ انداز مجھے بہت پیارا لگتا تھا۔ میرے دل میں کچھ کا سا لگا۔ یہ بھی وہ خوبصورت بلا جس کو اپنانے کے لیے میں نے کیا نہیں کیا تھا مگر یہ بھی بے وفا نکلی تھی مگر عجیب بات تھی کہ مجھے اس کی اس حرکت سے دکھ تو ہوا تھا مگر میرے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں اب بھی اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جس شخص سے تعلقات قائم کرتی، میں اُسے صفحہ ہستی سے مٹا دیتا، آخر اسے لوٹ کے میرے پاس ہی آنا پڑتا۔

یہی سب سوچتے ہوئے میں ارشاد کے گھر پہنچ گیا۔ یہ ایک نئی رہائشی عمارت تھی۔ اس کے زیادہ تر اپارٹمنٹ ابھی خالی تھے۔ ارشاد کا اپارٹمنٹ دوسرے فلور پر تھا۔ اس فلور پر تین مزید اپارٹمنٹس بھی تھے مگر وہ سب خالی تھے۔ اس کے گھر داخل ہونے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

اندر اندھیرا پھیلا تھا۔ میں نے ٹارچ جلالی۔ یہ ایک کمرے اور لاؤنج پر مشتمل اپارٹمنٹ تھا۔ لاؤنج کے ساتھ ہی اوپن کچن تھا۔ باتھ کے دو دروازے تھے، ایک کمرے میں کھل رہا تھا جبکہ دوسرا لاؤنج میں۔

کمرے کا دروازہ لاک تھا۔ مجھے اندر جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں لاؤنج کا جائزہ لیا۔ لاؤنج میں بس ایک صوفہ سیٹ لگا تھا۔ اس کے پیچھے ایک کھڑکی تھی جس کے آگے پردہ لگا تھا۔ چھپنے کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ میں نے صوفے کو ذرا سا آگے دھکیلا اور پردے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ پردے کے جوڑ سے میں لاؤنج کا سارا منظر دیکھ سکتا تھا۔

مجھے کھڑے دس منٹ کے لگ بھگ وقت ہوا تھا کہ دروازے پر آہٹ کی آواز ابھری۔ میں چوکنا ہو گیا۔

ارشاد نے اندر آ کے لائٹ جلائی۔ میں اُسے دیکھ کے چونک گیا۔ ارشاد ایک فیشن ایبل اور ہینڈسم نوجوان تھا۔ اس نے اس وقت ارغوانی ٹی شرٹ کے ساتھ کالے رنگ کی جینز زیب تن کی ہوئی تھی۔ اس کی ایک عجیب عادت تھی کہ وہ اکثر اوقات بالوں کو مختلف اور عجیب وغریب قسم کے کلرز میں ڈائی کیے رکھتا تھا۔ آفس میں اس کی اس عادت کے باعث اکثر لوگ اس پر جملے کستے رہتے تھے مگر وہ ہنس کے ٹال دیتا تھا۔ اس وقت اس نے بالوں کو سفید رنگ کیا ہوا تھا۔ لوگ سفید بالوں کو کالا کرتے تھے وہ عجیب نوجوان تھا جس نے کالے بالوں کو سفید کیا ہوا تھا۔ حیران کن طور پر سفید رنگ کے بال اس کی گوری رنگت پر بھلے لگ رہے تھے۔ میں نے آج تک سفید رنگ کا ہیئر کلر نہیں دیکھا تھا پتا نہیں اس نے بال کیسے سفید کیے تھے۔

اس نے ہاتھ میں ایک بیگ اٹھا رکھا تھا۔ اس نے بیگ کو اُدھر ہی پھینکا اور دھڑام سے آ کے میرے آگے ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے اتنے قریب تھا کہ میں ہاتھ سے اسے چھو سکتا تھا۔

اس نے صوفے پر بیٹھ کے بازو اور ٹانگیں پھیلا دیں۔ سر اس نے پیچھے کی طرف کر کے آنکھیں موند لی تھیں۔ اس کے چہرے پر تھکن کے سے تاثرات تھے۔

میں آسانی سے اس وقت اسے نشانہ بنا سکتا تھا۔ اسے خبر تک نہ ہوتی اور زندگی اس کے وجود سے نکل جاتی مگر میں اسے اتنی آسان موت دینا نہیں چاہتا تھا۔ اسے کم از کم اپنی موت کی وجہ تو پتا چلنی چاہیے تھی۔ کچھ پل تو اسے بھی وہ

تکلیف محسوس کرنی چاہیے جس سے میں اتنے دن سے دوچار تھا۔

میں آہستگی سے پردے کے پیچھے سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہوئے کوئی آہٹ پیدا نہیں ہوئی تھی مگر اس نے کسی نامعلوم حس کی بنا پر میری موجودگی محسوس کرلی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ہاتھ میں پستول اٹھا رکھا تھا۔ پستول کا رخ اس کے سینے کی طرف تھا۔

''تم......'' اس نے تھوک نگلا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ خوف کی آمیزش تھی۔

''ہاں میں۔ تم میرے گھر میری غیر موجودگی میں چھپ کے جاسکتے ہو تو کیا میں تمہارے گھر میں، تمہاری غیر موجودگی میں چھپ کے داخل نہیں ہوسکتا۔'' میں نے چبا چبا کے لفظ ادا کیے۔ میرے انداز میں طنز نمایاں تھا۔

اُس کی آنکھوں سے جھلکتے ہراس میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''میں تمہارے گھر کبھی چھپ کے نہیں گیا۔'' اس نے کمزور لہجے میں اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

''میری غیر موجودگی میں تو جاتے رہے ہونا؟'' میرا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

''میں کبھی تمہارے گھر تمہاری غیر موجودگی میں نہیں گیا۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے...... یہ پستول تو رکھ دو آؤ بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔'' وہ پستول کی طرف دیکھتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بولا۔

''یہ پستول تو میں اپنا کام کر کے ہی اپنی جیب میں رکھوں گا۔'' میں سرد لہجے میں بولا تو اس کے چہرے کی رنگت مزید پھیکی پڑ گئی۔

''میرا قصور تو بتاؤ۔'' وہ رو دینے والے انداز میں بولا۔

''قصور...... قربان جاؤں اس معصومیت پر۔ دوسروں کی بیویوں کے ساتھ گل چھرے اڑانے کے بعد بھی تم اپنا قصور پوچھ رہے ہو۔'' میری آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ اس بار وہ اپنی جگہ پر اچھل پڑا تھا۔

''اس میں مجھ سے زیادہ تمہاری بیوی کا قصور ہے۔ تم بتاؤ، کوئی حسین عورت خود تم پہ فدا ہو جائے۔ خود روز تمہارے گھر آدھمکے تو تم کب تک اس سے اپنی جان بچا پاؤ گے؟'' اس بار وہ قدرے جارحانہ انداز میں بولا۔

میری برداشت کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ بے اختیار ہی ٹریگر پر میری انگلی کا زور بڑھتا چلا گیا۔

''ایک منٹ......'' اس نے ہاتھ اوپر کیا مگر اتنی دیر میں پستول سے ایک خاموش گولی چل چکی تھی۔ گولی اس کے ہاتھ پر لگی۔ اس کے ہاتھ سے خون کے چھینٹے اڑ کے اس کے چہرے پر پڑے۔ اس کے سفید بالوں میں خون کی سرخی شامل ہوگئی۔ تکلیف کی شدت سے اس کا پورا منہ کھل گیا تھا۔ میرے پستول نے ایک اور گولی اگلی۔ اس بار میرا نشانہ اس کا کھلا ہوا منہ تھا۔ گولی اس کے حلق کے پار ہوگئی۔ اس کے حلق نے خون اگلا۔ اسے ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ صوفے پر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کے گلے سے خرخراہٹ کی آواز نکل رہی تھی جیسے کسی جانور کو ذبح کرتے ہوئے نکلتی ہے۔ یہ خرخراہٹ مجھے عجیب سا سکون پہنچا رہی تھی۔

☆☆☆

واپسی پر میں پُرسکون تھا۔ میرا دوسرا شکار بھی اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکا تھا۔ اب مجھے تیسرے کا انتظار کرنا تھا مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس بار مجھے انتظار کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی۔ کوئی مجھ سے بھی بڑے شکاری مجھے شکار کرنے کے لیے میری راہ تک رہے تھے۔

میں بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی چونک گیا۔ میرا تیسرا شکار میرے ہی بیڈ پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ واش روم کی لائٹ روشن تھی۔ میری بیوی شاید واش روم میں تھی۔

میرے ذہن میں بگولے اٹھنے لگے۔ میں نے لمحے سے بھی کم وقت میں اپنا پستول نکالا اور گولی چلا دی۔ گولی سیدھی اس کی پیشانی پر لگی تھی۔ میں نے اسی پر بس نہیں کیا۔ میں اس پر گولیاں چلاتا چلا گیا جب تک کہ پستول خالی نہیں ہوگیا۔ اس کا چہرہ گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ اچانک میری نظر سامنے فرش پر بنے ایک ایک سائے پر پڑی۔ میرے عقب میں کوئی موجود تھا۔ ٹریننگ نے میری حسیات بہت تیز کردی تھیں۔ میں بے اختیار ہی بیٹھ گیا۔

بیٹھتے ہی مجھے ٹھک کی آواز آئی۔ میرا رخ سامنے کی طرف تھا۔ واش روم کے دروازے میں، میں نے ایک سوراخ نمودار ہوتے دیکھا۔ یہ نشان گولی کا تھا۔ اس گولی سے مجھے نشانہ بنایا گیا تھا۔ میں ایک لمحے سے بھی کم وقت میں پلٹا۔ میرے سامنے ایک سیاہ سوٹ پہنے ایک دبلا پتلا سا ادھیڑ عمر شخص دروازے میں کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کے میں چونکا۔ اس کا حلیہ ویسا ہی تھا جیسا مجھے اسحاق نے بتایا تھا۔

بس اس کا گنجا سر اس حلیے سے میچ نہیں کر رہا تھا۔ شاید جب وہ اسحاق سے ملا تھا تو اس نے وگ پہن رکھی تھی۔

اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کی آنکھوں میں حیرت۔ میں نے اس کی حیرت کا فائدہ اٹھایا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ میرے سر کی ٹکر اس کے پیٹ میں لگی، وہ ڈکراتا ہوا پیچھے جا گرا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

وہ گرتے ہی ناقابلِ یقین پھرتی سے پھر اٹھا۔ اٹھتے ہی اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔

اس شخص سے اتنی پھرتی کی توقع مجھے ہرگز نہیں تھی۔ میں نیچے گر گیا۔ وہ میرے اوپر سوار ہو کے میرا گلا دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنی دیر میں، میں سنبھل چکا تھا۔ میں نے اپنی ٹانگیں موڑ کے اسے اپنے اوپر سے پیچھے اچھال دیا۔

میں تیزی سے اٹھا۔ وہ بھی سیدھا ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی پشت پر ایک زوردار لات رسید کی۔ وہ واش روم کے دروازے سے جا ٹکرایا۔ دروازہ کھل گیا۔

میں نے اسے گردن سے پکڑ کے پوری طاقت کے ساتھ اندر اچھال دیا۔ وہ اڑتا ہوا اندر گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سامنے پھیلا لیے تھے مگر اس کے باوجود اس کا گنجا سر واش روم کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ تصادم زوردار تھا۔ وہ پٹ سے نیچے گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے واش روم میں جھانکا مگر واش روم کسی اور کے وجود سے خالی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ واش روم کی لائٹ غلطی سے روشن رہ گئی تھی۔

میری بیوی کہاں ہے؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔

اچانک مجھے موبائل کی رنگ ٹون کی آواز آئی۔ آواز سوٹ پوش کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات جیسے منجمد ہو کے رہ گئے تھے۔ میں نے اس کی جیب سے موبائل نکال لیا۔ اسکرین پر جگمگاتا نمبر دیکھ کے میں شاک رہ گیا۔ یہ میری بیوی کا نمبر تھا۔

میں نے کال ریسیو کر کے سیل کان سے لگا لیا۔

''کدھر رہ گئے ہیں؟ جلدی آئیں نا۔'' وہ کال ریسیو ہوتے ہی جلدی سے بولی۔ میں اپنی جگہ سن ہو کے رہ گیا۔ گویا، میری بیوی اس شخص کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے قتل کرنے کے لیے اسے اندر بھیجا تھا۔ میں اس کے لیے آسان ترین شکار تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں بچ سکتا ہوں۔

''آ رہا ہوں۔'' میں سکتہ زدہ آواز میں بولا۔ مجھے اپنی آواز خود بھی اجنبی لگی۔

دوسری طرف سے فوراً ہی کال بند کر دی گئی۔ اچانک میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ میں تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ دروازے میں سوٹ پوش کے پستول پر میری نظر پڑی تو میں نے وہ اٹھا لیا۔ لاؤنج کا دروازہ کھولتے ہی میری نظر اپنی بیوی پر پڑی۔ وہ اپنی ''کلٹس'' میں بیٹھ رہی تھی۔ تیزی سے بیٹھتے ہوئے اس نے پلٹ کے مجھے دیکھا۔ اس کے بوائے کٹ سنہری مائل بھورے بال ہوا میں لہرائے۔ میرے ہاتھ میں پستول دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں حیرت و خوف کے ملے جلے تاثرات نمودار ہوئے۔ اگلے ہی پل وہ گاڑی میں بیٹھ کے طوفان کی سی رفتار سے گیٹ پار کر گئی۔

گیٹ پہلے سے کھلا تھا۔ میں بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ مجھے گاڑی گیٹ سے باہر نکالنے کے لیے موڑنی پڑی۔ ایک گلی گیٹ کے بالکل سامنے کی طرف نکلتی تھی۔ وہ گلی کافی طویل تھی۔ جب میں گیٹ سے باہر نکلا تو دوسری گاڑی اس گلی سے مڑ رہی تھی۔ میں ایکسلیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔

میرے لب بھینچے ہوئے تھے اور دماغ جیسے سن ہو کے رہ گیا تھا۔ میری بیوی بے وفا تھی، یہ صدمہ ہی کم نہیں تھا مگر اس کے باوجود میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھے قتل بھی کرا سکتی ہے۔ آج پہلی بار اس کے لیے اپنے دل میں نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

روڈ پر پہنچتے ہی مجھے اس کی گاڑی نظر آ گئی۔ کلٹس رفتار میں میری جی ایل آئی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی مگر روڈ پر کافی رش تھا۔ میں تیزی سے گاڑی کو اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے رستہ نکال رہا تھا۔ میرا ہاتھ مسلسل ہارن پر تھا۔ میں کئی دفعہ کسی گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ روڈ ہارن اور بریکوں کی چرچراہٹ سے گونج رہا تھا۔ میں اس کی گاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے رفتار تھوڑی اور بڑھائی اور گاڑی اس کے برابر لے آیا۔ میں اس کی گاڑی کو ایک طرف دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ اب اسے گاڑی روکنی ہی تھی مگر یہ کیا؟

اچانک ہی اس نے گاڑی تیزی سے ایک طرف موڑ دی۔ بریکوں کی چرچراہٹ کی آواز بلند ہوئی۔ روڈ کے ساتھ ہی ایک لنک روڈ نکل رہا تھا۔ اس نے گاڑی اس پر موڑ دی تھی۔

میں نے اپنی گاڑی روکی۔ اس کی گاڑی کچے میں اتر چکی تھی مگر اس نے تیزی سے گاڑی سنبھالی اور پھر روڈ پر لے آئی۔ میں اس موڑ سے آگے نکل چکا تھا۔ میں ریورس میں گاڑی پیچھے لایا۔ میرے عقب میں گاڑیوں کے ہارن بجے مگر اس وقت مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں نے حتی الامکان تیزی سے گاڑی لنک روڈ پر موڑ لی لیکن جتنی دیر مجھے گاڑی لنک روڈ پر موڑنے میں لگی، اتنے میں اس کی گاڑی میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

یہ ایک ویران روڈ تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں جلد ہی اسے جالوں گا مگر تھوڑا آگے پہنچ کے مجھے گاڑی روکنا پڑی۔ اس لنک روڈ سے بھی ایک اور روڈ نکل رہا تھا۔ پتا نہیں وہ سیدھی آگے نکل گئی تھی یا دوسری طرف مڑ گئی تھی۔ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ میرا سیل بجنے لگا۔ سیل کی اسکرین پر جگمگاتا نام دیکھ کے میں چونک گیا۔ یہ میری بیوی کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کر کے سیل کانوں سے لگا لیا۔

''تم میری گرد کو بھی نہیں چھو سکتے۔ بہتر ہوگا کہ میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ اس کے اس لہجے سے میرا دل کٹ کے رہ گیا۔

''تم کہاں تک بھاگو گی؟ میں دنیا کے آخری کونے تک تمہارا پیچھا کروں گا۔'' میرے لب بھینچے ہوئے تھے اور لہجے سے آہنی عزم جھلک رہا تھا۔ وہ میری بات سن کے ہنسی۔

''اچھا! مطلب مجھے ایک کال اور کرنی ہوگی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب؟'' اس کا انداز مجھے اُلجھن میں مبتلا کر گیا۔

''مطلب تو تمہیں خود سمجھنا ہوگا مگر چلو کیا یاد رکھو گے، میں تمہیں سب بتا ہی دیتی ہوں۔ مجھے پتا تھا کہ آج تم... ارشاد کو قتل کرنے جا رہے ہو۔ میں نے اُدھر ایک آڈیو ویڈیو کیمرا چھپا دیا تھا۔ تم لوگوں کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو میرے باس نے سن لی تھی۔ ہمارا پروگرام تو کچھ اور تھا۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے انیس کو بلا لیا تھا۔ تم جب گھر کے پاس پہنچے تو میں باہر نکل آئی۔ واش روم کی لائٹ میں نے جان بوجھ کے جلتی چھوڑ دی تھی تاکہ تم یہی سمجھو کہ میں واش روم میں ہوں۔ مجھے پتا تھا تم انیس کو دیکھتے ہی قتل کر دو گے۔ میرا باس تمہیں قتل کر دیتا اور پستول انیس کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ پولیس والے بھی نتیجہ اخذ کرتے کہ تم دونوں ایک دوسرے کی گولی سے ہلاک ہوئے ہو۔ ہم دونوں فرار ہو جاتے مگر تمہاری ہوشیاری سے ہمارا سارا منصوبہ تلپٹ ہو کے رہ گیا۔ بہرحال ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میری ایک کال سے پولیس والے ارشاد کے گھر پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے میری نشاندہی پر وہ کیمرا بھی دریافت کر لیا ہے۔ اب مجھے بس ایک اور کال کر کے پولیس کو تمہاری لوکیشن بتانی ہے۔ تم پکڑے جاؤ گے اور میں تمہاری پہنچ سے دور نکل جاؤں گی۔'' وہ ہذیانی انداز میں ہنسنے لگی۔ اس کا یہ روپ میرے لیے بالکل نیا تھا۔ میں سکتہ زدہ رہ گیا۔ میرے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

''تم نے یہ سب کیوں کیا؟''

''اب سب کچھ تمہیں میں ہی بتاؤں۔ انٹیلی جینس ایجنسی میں ہو کچھ تو اپنی 'انٹیلی جینس' خود استعمال کرو۔'' وہ ہنس رہی تھی اور میرا دل صدمے سے چور ہو رہا تھا۔

''میں تو تم سے اتنی محبت کرتا تھا تم پہ اتنا اعتبار کرتا تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم میرے ساتھ ایسا کر سکتی ہو۔'' میں بڑی مشکل سے اپنے آپ پہ قابو رکھے ہوئے تھا ورنہ میرا دل کر رہا تھا کہ میں دہاڑیں مار مار کے روؤں۔

''تمہاری غلطی یہ تھی کہ تم نے مجھ سے محبت کی۔ میں تو اپنے وطن کی محبت میں سرشار ہوں۔ میں نے جو کچھ... بھی کیا، اپنے وطن کی محبت میں کیا۔ یہ سب میری ڈیوٹی کا حصہ تھا۔'' میں اس کی بات سن کے ہکا بکا رہ گیا۔

''کیا مطلب؟'' میرے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی۔ اس کا اور میرا وطن تو ایک تھا۔ وہ جانے کس وطن کی بات کر رہی تھی۔

''مطلب کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم میرا پیچھا چھوڑ رہے ہو یا نہیں؟''

''ایک شرط پر میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا۔ تم مجھے سب سچ سچ بتاؤ کہ تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

''چلو کیا یاد کرو گے تم بھی۔ میں تمہیں سب بتا دیتی ہوں۔ میں نے تم سے شادی صرف اس لیے کی تھی کہ تم انٹیلی جینس ایجنسی میں تھے۔ تم لوگ ہمارے خلاف جو کر رہے تھے مجھے اس کی جانکاری چاہیے تھی۔ میں تمہارے ذریعے سے خفیہ معلومات حاصل کرتی رہی اور اپنی ایجنسی کے لوگوں تک پہنچاتی رہی۔ تمہارے بہت سے مشن صرف اس لیے ناکام ہوئے۔ انیس، ارشاد اور مجاہد سے بھی میں نے اسی لیے تعلقات قائم کیے تھے مگر وہ سب بڑے پکے لوگ نکلے۔ وہ میرے جسم سے تو کھیلتے رہے مگر کبھی کوئی خاص معلومات مجھے فراہم نہیں کیں۔ الٹا وہ مجھ پر شک کرنے لگے تھے۔ اس سے پہلے کہ ان کا شک یقین میں بدلتا، میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

نے فرار کا فیصلہ کرلیا۔ ویسے بھی میرا کام اِدھر مکمل ہو چکا تھا۔ اب جاتے جاتے ان کا پتا کاٹنا بھی ضروری تھا، اس لیے میرے باس نے تم تک وہ تصاویر پہنچا دیں۔ تم تو کبھی مجھے نہیں جان سکے مگر میں تمہارے بارے میں بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ تم ان تینوں کو قتل کردو گے مگر مجھ سے بھی اس بارے میں نہیں پوچھو گے۔'' وہ انکشاف در انکشاف کیے جارہی تھی۔ میں حیرت زدہ سا سنتا جارہا تھا۔

''تمہارا تعلق کس ایجنسی سے ہے؟'' میرے لبوں سے سرسراتی سی آواز خارج ہوئی۔

''ہاہاہا، تم تو نرے بدھو ہو۔ پتا نہیں انٹیلی جینس ایجنسی میں کیسے بھرتی ہوگئے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

''بدھو نہ ہوتا تو تم تمہارے چنگل میں پھنستا۔ بہرحال جہاں تم نے اتنا بتایا ہے وہاں یہ بھی بتادو۔'' میرے حلق میں نمی گھلنے لگی تھی۔

''تمہیں ابھی تک نہیں پتا چل سکا؟ میں نے ابھی ایک ایسا لفظ جان بوجھ کے بولا تو تھا جس سے تم میرے وطن اور میری ایجنسی کے بارے میں جان جاتے۔'' وہ حیران کن انداز میں بولی۔

''تم انڈین ایجنٹ ہو؟ میں بے یقینی سے بولا۔

''کیا اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

''ہاہاہا، تمہیں اب بھی یقین نہیں آرہا۔ جبکہ میں تو اتنے عرصے اس خوف کا شکار رہی کہ جانے کب تم میری اصلیت جان جاؤ۔''

''میں نے تو تم پر کبھی شک ہی نہیں کیا۔'' میرا دل غم سے پھٹا جارہا تھا۔

''یہ تو تمہارا قصور ہے۔ حالانکہ تم سے پہلی ملاقات سے لے کر اب تک بے شمار مواقع ایسے آئے جب تم مجھ پر شک کرسکتے تھے۔''

میرے ذہن میں گویا اس کے ساتھ گزارے وقت کی فلم سی چلنے لگی۔

☆☆☆

میری اس سے پہلی ملاقات ایک شادی کی تقریب میں ہوئی تھی۔ یہ وزیر خارجہ کے بیٹے کے ولیمے کی تقریب تھی۔ وہاں میں بطور مہمان مدعو تھا مگر دراصل میری ذمے داری سیکیورٹی سے متعلق تھی۔ اس پارٹی میں بہت سے وزرا بھی شریک تھے۔

مجھ سمیت بہت سے سیکیورٹی اہلکار سادہ لباس میں موجود تھے۔ ہمارا کام لوگوں پر نظر رکھنا اور کسی بھی مشکوک سرگرمی کو روکنا تھا۔ میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے اپنا کام سرانجام دے رہا تھا کہ میری نظر ایک لڑکی پر پڑی اور میں اپنا کام ہی بھول گیا۔

تقریب مخلوط تھی۔ ایک سے ایک حسین چہرہ یہاں وجود تھا مگر اس لڑکی کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ میں یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔

وہ چہرے سے انگریز مگر لباس سے مقامی لگ رہی تھی۔ اس نے کالے رنگ کی ساڑی زیب تن کی ہوئی تھی۔ ساڑی سے جھلکتے عریاں بازو سیاہ و سفید کا حسین امتزاج پیدا کررہے تھے۔ اس نے اپنے سنہری مائل بھورے بالوں کا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی لمبی گردن نمایاں

ہورہی تھی۔اس کے گلے میں بڑے بڑے موتیوں کی سیاہ و سفید کی ایک مالا تھی جو کسی حد تک اس کی ''ستر پوشی'' کا کام بھی سرانجام دے رہی تھی۔ میری نظر اس کی گردن سے ہوتے ہوئے اس کے جسم کے نشیب و فراز میں الجھ کے رہ گئی۔اس نے ہاتھ میں ایک مشروب کا گلاس اٹھایا ہوا تھا۔ وہ تتلی کی طرح اِدھر اُدھر منڈلاتی پھر رہی تھی۔

میری نظر اس پر پڑی تو پلٹنا بھول گئی۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ میں یہاں کس مقصد کے لیے موجود ہوں۔اس نے بھی میری نظروں کے ارتکاز کو محسوس کرلیا۔ اس نے نظریں اٹھا کہ مجھے دیکھا، نگاہوں سے نگاہیں چار ہوئیں۔ وہ مسکرادی اور میرا دل جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا۔ وہ سیدھا چلتی ہوئی میری طرف آئی۔

میرے قریب پہنچ کے اس نے اپنا نازک سا ہاتھ ایک ادا سے میری طرف بڑھایا۔

''ہائے، آئی ایم نشا۔'' وہ انگریزی میں بولی مگر اس کا لہجہ مقامی ہونے کی چغلی کھارہا تھا۔

میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔گو کہ وہ اپنے حلیے سے کافی بولڈ لگ رہی تھی مگر پھر بھی مجھے اس سے یہ توقع نہیں تھی۔

میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔اس کا ہاتھ روئی کے گالوں سے بھی نرم تھا۔ میں اپنا تعارف تک کرانا بھول گیا۔ کاش یہ ہاتھ سدا یوں ہی میرے ہاتھ میں رہے۔ میرے دل میں بے اختیار ہی یہ خواہش پیدا ہوئی۔

وہ ایک ادا سے مسکرائی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔''کیا آپ کا نام آپ کی طرح خوبصورت نہیں جو آپ بتا رہے نہیں ہیں۔'' اس کے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔

میں جھینپ کے بولا۔''نوید......نوید احمد۔''

''اچھا نام ہے مگر آپ کی خوبصورت شخصیت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ اس کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ نہ اس نے چھڑانے کی کوشش کی تھی نہ میں نے چھوڑنے میں پہل کی۔ میں تو یہ ہاتھ ساری زندگی کے لیے تھام لینا چاہتا تھا۔ ایسے کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

''نام تو آپ کا بھی بہت خوبصورت ہے مگر آپ خود اتنی خوبصورت ہیں کہ کوئی بھی نام آپ کی خوبصورتی کو بیان نہیں کرسکتا۔'' میں مسکراتے ہوئے بولا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''آئیں بیٹھ کے بات کرتے ہیں نا۔'' وہ میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے ایک خالی میز کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

میں اس کے ساتھ کھنچتا چلا گیا۔

☆☆☆

آج پھر ویسا ہی منظر تھا۔ابو اسٹڈی میں بیٹھے تھے۔ آج بھی ان کے سامنے ایک کتاب رکھی تھی، مگر بند حالت میں۔میری نظر اس کے ٹائٹل پر پڑی۔''کچے رشتے'' اس کا عنوان تھا۔

انہوں نے ایک ملازم سے کہلوا کے مجھے اسٹڈی میں بلوایا تھا۔

''میں اگلے مہینے تمہاری شادی کرنا چاہ رہا ہوں۔'' وہ چند اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بولے۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

مجھے وہ وقت یاد آیا جب انہوں نے مجھے کمیشن میں اپلائی کرنے کے لیے کہا تھا۔

''ابو، میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' میں اُن سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

''کیوں؟'' انہوں نے بھویں اچکا کے اپنے مخصوص انداز میں سوال کیا۔ میں نے جب کہا تھا کہ میں آرمی میں نہیں جانا چاہتا اس وقت بھی اسی انداز میں انہوں نے سوال کیا تھا۔

''در اصل میں...... میں عینا سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' میں یہ بات کہتے ہوئے اُن سے نظریں چرانے پر مجبور ہوگیا۔

ان کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت نمودار ہوئی مگر وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں مختصراً بولے۔''کیوں؟''

''وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ وہ دراصل کسی اور کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں کئی مرتبہ اسے ایک لڑکے کے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔'' عینا جیسی پاکباز لڑکی پر اتنا بڑا الزام لگاتے ہوئے مجھے شرمندگی تو ہورہی تھی مگر وہ کہتے ہیں نا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔تو میں بھی نشا کی محبت میں یہ سب کہہ گزرا تھا۔

اس بار وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکے۔ وہ کرسی سے ایسے اچھلے جیسے کرسی میں اچانک سے کرنٹ دوڑنے لگا ہو۔

''کیا بکواس کررہے ہو تم؟'' وہ دہاڑے۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں ابو......اب آنکھوں دیکھی مکھی تو میں نہیں نگل سکتا۔'' میں پُرسکون انداز میں بولا۔

''بکواس کر رہے ہو تم۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ میں نے تمہیں کل ایک واہیات سی لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا۔ تم اگر اس سے شادی کرنا چاہ رہے ہو تو کر لو مگر عینا پر ایسے گھٹیا الزامات مت لگاؤ۔'' وہ اس بار اپنے آپ پر قابو پا کے آہستہ آواز میں بولے مگر ان کے لہجے میں شعلوں کی سی لپک تھی۔

میں ان کی بات سن کے چونکا۔ گویا کل انہوں نے مجھے نشا کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔ میں خود چند دن میں اسے ابو سے ملواتا مگر ذرا بہتر انداز میں۔

''وہ میری کولیگ ہے، آپ میری اس سے شادی کرانا چاہیں تو میں اس سے شادی کر لوں گا مگر میں عینا سے شادی نہیں کر سکتا۔'' میں نے جیسے بات ہی ختم کر دی۔

''ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ تمہیں جو کرنا ہے کرلو مگر اس گھر میں تمہاری کوئی گنجائش نہیں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے ابھی اور اسی وقت۔'' وہ دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ان کا لہجہ سپاٹ اور سرد تھا مگر ان کی آنکھوں میں مجھے نمی کی جھلک نظر آئی۔

ہمارا رشتہ اتنا کچا کہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ پچھلی بار کی طرح اس بار بھی وہ خود مجھے قبول کر لیتے۔ میں اطمینان سے چلتا ہوا اسٹڈی سے باہر نکل آیا۔

کچھ دیر کے بعد میں دوسری دفعہ گھر چھوڑ رہا تھا۔ امی گھر پر نہیں تھیں ورنہ وہ مجھے جانے ہی نہ دیتیں۔ بہرحال مجھے یقین تھا کہ میرے والدین میرے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ وہ چند دن مجھ سے ناراض ہوتے پھر مجھے واپس بلا لیتے۔

میں نے اسی اطمینان کے ساتھ گھر کا دروازہ پار کیا تھا مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ ان کی زندگی میں، میں کبھی اس گھر میں واپس داخل نہیں ہو سکوں گا۔

☆☆☆

نشا سے پہلی ملاقات میں ہی میں اس کے بارے میں کافی کچھ جان گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ پانچ چھ سال پہلے ایک حادثے میں فوت ہو چکے ہیں۔ اس کا ایک بڑا بھائی ہے جو انگلینڈ میں رہتا ہے۔ وہ شادی شدہ ہے۔ شادی سے پہلے تو وہ پھر بھی نشا سے کبھی کبھار بات کر لیتا تھا مگر شادی کے بعد اس نے یہ رابطہ بالکل ہی ختم کر دیا تھا۔ اپنے ماں باپ کی موت کے بعد وہ کبھی پاکستان نہیں آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک پرائیویٹ فرم میں سیکریٹری کی جاب کر رہی ہے۔ جب اس کے والدین کا انتقال ہوا تھا تو وہ بی اے کے رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔ والدین کی موت کے بعد اسے گھر خالی کرنا پڑا۔ اس نے ایک گرلز ہوسٹل میں رہائش حاصل کر لی اور ساتھ ہی جاب کرنے لگی۔ یہ جاب اُسے اپنی ایک کلاس فیلو کے توسط سے ملی تھی۔

اس تقریب میں وہ اپنے باس کے ساتھ آئی تھی۔

''میں دنیا میں بالکل اکیلی ہوں۔ بس اپنی تنہائی بانٹنے کے لیے کسی اچھے سے دوست کی تلاش میں ہوں۔'' وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ بولی۔ اسے روتے دیکھ کے مجھے بے پناہ تکلیف ہوئی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''تم فکر مت کرو۔ میں ہوں نا۔'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

''پتا نہیں کیوں تمہیں دیکھتے ہی مجھے لگا تھا کہ یہی ہے وہ جس کی میں راہ دیکھ رہی ہوں۔ تمہارے ساتھ باتیں کر کے بہت اچھا لگا۔ لگ ہی نہیں رہا کہ ہم آج پہلی بار مل رہے ہیں۔''

مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔ اس سے ملنے کے بعد میں اپنا کام تو بھول ہی چکا تھا۔ سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مگن تھے۔ کسی کو ہماری طرف دھیان دینے کی فرصت نہیں تھی۔

ہم دونوں تقریب کے اختتام تک ساتھ رہے تھے۔

مجھے اس کے باس سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ میں نے جتنی کہانیاں پڑھی تھیں ان میں باس اور سیکریٹری کے رشتے کو بڑا مشکوک سا رشتہ سمجھا جاتا تھا اس لیے میں اس کے باس سے مل کے ان دونوں کے تعلق کے بارے میں اندازہ کرنا چاہ رہا تھا۔

میں نے نشا سے اس کے باس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے مجھے اپنے باس سے ملوایا۔

سفیان ہاشمی پچاس کے پیٹے میں تھے۔ وہ بہت مہذب سی شخصیت کے مالک لگ رہے تھے۔ نشا سے بہت شفقت سے پیش آ رہے تھے۔ ان کے درمیان باس اور سیکریٹری کے روایتی سے تعلق جیسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ان سے مل کے میرے سارے خدشات دور ہو گئے۔

اس ملاقات کے بعد ہماری ملاقاتیں کثرت سے ہونے لگیں۔

نشا سے ملاقات کے بعد میں عینا کو تو جیسے بالکل بھول ہی چکا تھا۔ اپنے شریکِ سفر کے طور پر جب بھی میرے ذہن

میں کوئی چہرہ آتا تو وہ نشا کا ہوتا۔ ایک دن میں نے اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے ہاں کر دی۔

میں جانتا تھا کہ ابو اس سے میری شادی پر کبھی رضامند نہ ہوتے کیونکہ دوسری طرف اُن کی بھتیجی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں نشا کو حاصل کرنا چاہتا ہوں تو مجھے اپنے والدین کے خلاف جانا پڑے گا مگر اس سے پہلے میں اپنی طرف سے ایک کوشش کرنا چاہتا تھا۔

میں نشا کو اپنے گھر والوں سے پہلے ملانا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ہی میرے ابو نے اسے میرے ساتھ دیکھ لیا۔ ہمارا گھرانا کافی مذہبی ہے۔ خواتین عام طور پر پردے کی پابند ہوتی ہیں۔ عینا منگنی کے بعد بھی مجھ سے کبھی تنہا نہیں ملی تھی۔ ملنا تو درکنار اس نے کبھی فون پر بھی مجھ سے بات نہیں کی تھی۔

نشا عام طور پر جس طرح کے لباس میں ہوتی تھی، گو کہ موجود زمانے کے اعتبار سے وہ عام تھا مگر ہمارے گھرانے میں اس طرح کے لباس کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے ابو پر اس کا پہلا تاثر ہی صحیح نہیں پڑا۔ انہوں نے عینا پر لگائے گئے میرے الزامات پر بھی اعتبار نہیں کیا اور یوں میں ایک بار پھر گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔

میں نے ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کر لیا اور نشا سے شادی کر لی۔ شادی میں میرے کچھ دوست شریک ہوئے۔ میں نے اپنی امی کو بھی کال کر کے اپنی شادی کا بتا دیا۔ وہ مجھ سے پہلے سے خفا تھیں۔ ان کی خفگی اور بڑھ گئی۔

نشا سے شادی کر کے میں بہت خوش تھا۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی جاب سے پندرہ دن کی چھٹی لی اور شمالی علاقہ جات کی سیر کو نکل گئے۔ یہ دن میری زندگی کے خوبصورت ترین دن تھے۔

واپسی کے بعد ہم ایک روٹین میں آ گئے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اب جاب نہ کرے مگر اسے پورا دن اکیلے گھر میں رہنے کے خیال سے وحشت ہوتی تھی۔ چار و ناچار مجھے اسے جاب کی اجازت دینا پڑی۔

بعض اوقات مجھے کسی مشن کی تکمیل کے لیے کئی کئی دن گھر سے غائب رہنا پڑتا۔ نشا کے بغیر یہ وقت کاٹنا میرے لیے مشکل ہو جاتا۔ اب میں اس وقت پر پچھتا رہا تھا جب میں نے انٹیلی جینس ایجنسی جوائن کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہماری شادی کو چھ ماہ ہو چکے تھے مگر میرے والدین نے اس عرصے میں ایک بار بھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ میں نے امی کو چند بار کال کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے کال ریسیو ہی نہیں کی۔ ایک بار میں نے انہیں دوسرے نمبر سے کال کی تو انہوں نے میری آواز سنتے ہی کال کاٹ دی۔

میں صبر سے ان کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ ہو گیا جس کے بارے میں، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

اُس دن میں صبح صبح دفتر جانے کا انتظار کر رہا تھا کہ مجھے ایک میسج ملا۔ یہ اجنبی نمبر تھا۔ میں نے میسج چیک کیا تو میرے پاؤں کے نیچے سے گویا زمین ہی نکل گئی۔ اس میں لکھا تھا۔

''انکل اور آنٹی قتل ہو گئے ہیں۔ عینا۔''

اگر کسی نے میرے ساتھ مذاق کیا تھا تو یہ انتہائی گھٹیا قسم کا مذاق تھا۔ میں نے دھڑکتے دل سے اس نمبر پر کال کرنے کی کوشش کی تو کسی نے کال ریسیو ہی نہیں کی۔

میں نے امی کا نمبر ٹرائی کیا مگر وہ بند جا رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے ابو اور اپنے چچا کا نمبر ملانے کی کوشش کی مگر کسی سے رابطہ نہیں ہو پایا۔ نشا مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ آپ بہت پریشان لگ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

میں کچھ نہیں بولا بس میسج کھول کے سیل اس کی طرف بڑھا دیا۔

میرا خیال تھا وہ میسج پڑھ کے اچھل پڑے گی مگر وہ نارمل انداز میں بولی۔ ''ہو سکتا ہے کسی نے مذاق کیا ہو۔ آپ جا کے چیک تو کریں۔''

''ہاں، مجھے جانا پڑے گا۔'' میرا خیال تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے گی مگر اس نے ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔

میں آندھی طوفان کی طرح اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اپنے گھر کی گلی میں گھستے ہی مجھے لوگوں کا ہجوم نظر آ گیا۔ میں جو سارے راستے اس خبر کے غلط ہونے کی دعا مانگتا آیا تھا بالکل ڈھے کے رہ گیا۔

گاڑی میں نے باہر گلی میں ہی روکی اور دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے میری نظر اپنے چچا پر پڑی۔ اُن کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے اپنا چہرہ پھیر لیا۔

میں نے اپنے ایک پڑوسی سے پوچھا۔

''کیا ہوا ہے؟ آپ سب لوگ اِدھر کیوں جمع ہیں۔ خیریت تو ہے نا؟'' سب لوگوں کو دیکھ کے بھی مجھے اس خبر کی

صداقت پر شک تھا۔ میرے دل کے کسی نہاں گوشے میں یہ امید اب بھی باقی تھی کہ ہوسکتا ہے وہ میسج جھوٹا ہو۔ یہ لوگ اور کسی غرض سے یہاں جمع ہوں مگر میرا پڑوسی جب بولا تو میرے دل میں بسی نیم مردہ سی امید بالکل ہی دم توڑ گئی۔

اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

''بس جی اللہ کی یہی مرضی تھی۔''

''ہوا کیا ہے آخر؟'' میں چیخا۔ مجھے چیختے دیکھ کے اور لوگ بھی میری طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے ہمدردی تھی۔

''آپ کے والدین کو رات ڈاکوؤں نے قتل کر دیا۔ وہ کافی چیزیں بھی لوٹ کر لے گئے ہیں۔'' وہ شخص دھیمے لہجے میں مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

''ڈیڈ باڈیز کہاں ہیں؟'' میں اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نیم مردہ لہجے میں بولا۔

''وہ پوسٹ مارٹم کے لیے گئی ہوئی ہیں۔''

اسی وقت ایمبولینس کے سائرن کی آواز آنے لگی۔

''جنازے آگئے ہیں۔'' کوئی شخص بولا تھا۔ مجھے اس کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

شام تک ان کی تدفین ہوگئی۔ پولیس نے بھی کچھ عرصہ تفتیش کے بعد فائل بند کردی۔ اکثر وارداتوں کی طرح اس بار بھی پولیس قاتلوں کو تلاش نہیں کر سکی تھی۔ پولیس کیا، میں بھی قاتل کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا پایا تھا حالانکہ وہ میرے سامنے ہی موجود تھا۔

میرے والدین کے قتل سے چند دن پہلے ہی ایک اور اہم واقعہ بھی رونما ہوا۔ ان کے قتل میں اس واقعے کا اہم... کردار تھا مگر اس وقت میں یہ نہیں جان سکا تھا۔ آج مجھے وہ واقعہ یاد آرہا تھا اور مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ میرے والدین کے قتل کی وجہ وہی واقعہ تو نہیں تھا۔

☆☆☆

اُن کے قتل سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے ہی میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ نشا بھی میرے ساتھ تھی۔ ہم ایک ریسٹورنٹ میں ڈنر کرنے کے بعد باہر نکلے ہی تھے کہ میری نظر اپنے والدین پر پڑی۔

وہ گاڑی سے اتر رہے تھے۔ میں نشا کا ہاتھ پکڑ کے ان کی طرف بڑھ گیا۔

''السلام علیکم ابو!'' میری آواز سن کے انہوں نے چونک کے دیکھا مگر مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی نمودار ہوگئی۔ امی میری طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔ پل بھر میں ہی ان کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔

''نشا، یہ میرے والدین ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے نشا سے کہا۔

وہ مسکراتی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔ ''ہائے آنٹی، کیسی ہیں آپ؟'' اس نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔

اسے اپنی طرف آتا دیکھ کے امی کی آنکھوں میں نفرت نمودار ہوئی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''اپنا غلیظ ہاتھ پیچھے کرو۔'' وہ انتہائی نفرت سے بولی تھیں۔ میں نے نشا کے چہرے کی رنگت متغیر ہوتے دیکھی۔

مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہیں مگر اتنی نفرت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

''چلو نوید۔ تمہاری ماں تو انتہائی جاہل عورت ہے۔ اسے تو کسی سے بات کرنے کی تمیز ہی نہیں۔'' وہ میرا بازو پکڑ کے کھینچتے ہوئے بولی۔

میں سکتہ زدہ سا اُس کے پیچھے چل پڑا۔

میرے ابو یہ سن کے گھوم کے ہمارے سامنے آئے۔ وہ نشا کے سامنے رکے اور ہاتھ اٹھا کے بولے۔ ''آج تو میں نے تمہاری یہ حرکت برداشت کر لی۔ آئندہ تم کبھی مجھے نظر بھی آئیں تو وہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔'' وہ یہ کہہ کے رکے نہیں تھے۔ مجھ پر انہوں نے ایک نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ نشا کی آنکھوں میں غصے کے تاثرات ابھرے تاہم وہ بغیر کچھ کہے مجھے کھینچتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھنے لگی۔ میں سکتہ زدہ سا اُس کے پیچھے کھنچتا چلا گیا۔ اپنے والدین کی طرف سے اتنی نفرت کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے طے کرلیا کہ اب زندگی بھر اُن سے کوئی رابطہ نہیں کرنا اور میں واقعی ان کی زندگی میں ان سے دوبارہ رابطہ نہیں کر پایا تھا۔

☆☆☆

اپنے والدین کی موت کے بعد میں ان کی دی ہوئی ساری نفرت بھول چکا تھا ایسے ہی جیسے میں نے نشا کی محبت میں، ان کی تمام عنایتیں و محبتیں بھلادی تھیں۔ میں نے انہیں بہت دکھ دیا تھا۔ اُن کی یاد میرے دل سے نکل ہی نہیں رہی تھی۔ اس کڑے وقت میں نشا نے مجھے سہارا دیا۔ میں آہستہ آہستہ سنبھلنے لگا۔

نشا کے کہنے پر میں نے اپنا تبادلہ لاہور کرا لیا۔ میں نے اپنا گھر بھی بیچ دیا تھا۔ اس گھر سے جڑی یادیں اتنی تکلیف دہ بن چکی تھیں کہ میں اس میں واپس جا ہی نہیں سکتا

تھا۔

لاہور میں، میں نے ایک گھر خرید لیا۔ نشانے نے یہاں بھی ایک جاب کر لی تھی۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ میری جاب اس طرح کی تھی کہ اکثر مجھے گھر میں بھی کسی سے رابطہ کرنا پڑتا تھا۔ میں جب کسی سے فون پر بات کرتا تو وہ میرے آس پاس ہی موجود ہوتی تھی۔ میں نے کبھی اس سے رازداری نہیں برتی تھی۔ میرے لیپ ٹاپ اور موبائل کے پاس ورڈز تک اسے معلوم تھے۔

آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں اس پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرتا رہا تھا۔ وہ مجھ سے نجانے کون کون سی خفیہ باتیں اپنے انداز میں اگلواتی رہی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ وہ فطری تجسس کے تحت مجھ سے ایسی باتیں پوچھتی رہتی ہے مگر آج مجھے پتا چلا تھا کہ وہ تو اپنی ڈیوٹی پوری کر رہی تھی۔

میں تو مہا احمق تھا جو... کبھی اس پر شک ہی نہیں کیا تھا۔ اس نے تو جن تین افراد سے تعلقات قائم کر رکھے تھے، وہ بھی کسی خاص مقصد کے تحت تھے۔ میں اتنا احمق تھا کہ اسے صرف بے وفا ہی سمجھتا رہا تھا۔ یہ خیال تک بھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ اس نے ان لوگوں سے تعلقات کسی خاص مقصد کے تحت رکھے ہوں گے حالانکہ یہ سامنے کی بات تھی۔ تین حساس اداروں اور پوسٹس پر کام کرنے والے لوگوں سے بیک وقت تعلقات بلاوجہ تو نہیں ہو سکتے تھے؟

یہ سب اب میرے ذہن میں آ رہا تھا جب میں اس کی اصلیت جان چکا تھا۔ یہ خیال تو کبھی میرے ذہن کے آخری گوشے تک میں نہیں آیا تھا کہ وہ دشمن ملک کی ایجنٹ ہو سکتی ہے۔ پتا نہیں وہ بہت اچھی اداکارہ تھی یا میں اتنا بڑا احمق تھا کہ اُس کے چہرے کے پیچھے چھپے اصلی چہرے کو کبھی جان نہیں پایا تھا۔

☆☆☆

''کن سوچوں میں گم ہو؟'' فون کے اسپیکر سے اس کی آواز ابھری تو میں حال میں واپس آ گیا۔

''تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔'' میرے لہجے میں صدیوں کی تھکن تھی۔

''پھر تو مان گئے ہوگے میری ہوشیاری کو۔'' وہ مجھے چھیڑنے والے انداز میں بولی۔

''میں تم سے محبت کرتا تھا اس لیے کبھی تم پر شک ہی نہیں کیا۔ تم بھی میری محبت کو مان گئی ہوگی۔'' میں اداسی سے بولا۔

''محبت تو میں بھی کرتی ہوں مگر اپنے وطن سے، اپنے فرض سے۔ تم بھی یہ مان گئے ہوگے۔'' وہ ہنسی۔ میں یہ واقعی مان گیا تھا۔ وہ تو صرف اپنے فرض سے محبت کرتی تھی جبکہ میں نہ اپنا فرض ادا کر سکا تھا نہ اس کے دل میں اپنے لیے محبت پیدا کر سکا تھا۔

''میرے والدین کو بھی تمہی نے مروایا تھا نا؟'' گوکہ مجھے اس کا یقین تھا مگر پھر بھی میں چاہتا تھا کہ وہ خود اعتراف کرے۔

وہ ہنسی۔ ''مجھے افسوس ہے اس کا۔ تمہارے ملک میں رہتے ہوئے یہ واحد کام ہے جو میں نے اپنی ذات کے لیے کیا۔''

''ان کا کیا قصور تھا؟'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''انہوں نے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔ میں نے عمل کرا دیا۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''تم نے اپنے جرائم میں ایک اور جرم کا اضافہ کر لیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم کہاں تک بھاگتی ہو۔ میں پاتال کی گہرائی تک تمہارا پیچھا کروں گا۔'' اس بار میں آہنی عزم کے ساتھ بولا تھا۔

''ہاہاہا، دیکھ لیں گے تمہارے دعوے کو مگر اس سے پہلے میری طرف سے ایک آخری جھٹکا برداشت کر لو۔ اگر کر سکو تو......'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''بولو، جہاں اتنے جھٹکے برداشت کیے وہاں ایک اور سہی۔''

''میں نے جو یہ سب تمہیں اتنی وضاحت اور تفصیل سے بتایا اس کی وجہ تمہاری الجھن دور کرنا نہیں تھا۔ نہ میرے پاس اتنا فالتو وقت ہے کہ تمہاری الجھنیں سلجھاتی پھروں۔''

''پھر؟'' وہ رکی تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''میں بس کچھ وقت حاصل کر کے تمہیں ایک ہی جگہ روکنا چاہتی تھی۔ تم آج پھر میرے ہاتھوں بے وقوف بن گئے۔'' وہ ہنسی۔

اس کی بات سن کے میں اپنی جگہ پر اچھل پڑا۔ معاً مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو میرا دل جیسے اچھل کے حلق میں آ گیا۔ یہ ایک گاڑی تھی جو میری طرف ہی بڑھ رہی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ واضح نظر نہیں آ رہی تھی۔

''اوکے میں تو کچھ دیر میں دبئی فلائی کر جاؤں گی تب تک امید ہے تم بھی اوپر کا ٹکٹ کٹوا چکے ہو گے۔ بیسٹ آف لک اینڈ گڈ بائے۔'' وہ گنگناتی ہوئی آواز میں بولی۔

میرے پاس اب اسے جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔ میں گاڑی کا دروازہ کھول کے آہستگی سے باہر نکل آیا۔ میری گاڑی اس زاویے پر کھڑی تھی کہ پیچھے آنے والوں کی نظر مجھ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ میں جھکے ہوئے انداز میں چلنے لگا۔ کچھ لمحوں میں ہی میں ایک درخت کے پیچھے چھپ چکا تھا۔

وہ گاڑی، میری گاڑی کے پاس آ کے رک گئی۔ اس سے پولیس اہلکار چھلانگیں مار کے اترے۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں میری گاڑی کے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

''اس میں تو کوئی نہیں ہے۔'' ایک پولیس اہلکار کی آواز ابھری۔ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''اردگرد دیکھو۔ وہ یہیں کہیں ہوگا۔'' ایک اور پولیس اہلکار بولا تو وہ ٹارچ لائٹس لے کے اِدھر اُدھر پھیلنے لگے۔ میں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ مجھے درختوں کی آڑ میسر تھی اس لیے کسی پولیس والے کی نظر ابھی تک مجھ پر نہیں پڑی تھی مگر کب تک؟ کوئی لمحہ جاتا تھا اور میں پکڑا جاتا۔ وہ لمحہ آنے سے پہلے میں بھاگنے لگا۔

ایک پولیس اہلکار ٹارچ ..... لیے سیدھا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کے وہ بلند آواز میں بولا۔

''رک جاؤ۔''

رکنے کا مطلب موت تھا۔ میں نے رفتار مزید بڑھا دی۔ پولیس اہلکار کی ٹارچ کی روشنی سے کسی حد تک مجھے راستہ نظر آ رہا تھا۔

اچانک فضا میں فائر کی آواز بلند ہوئی۔ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ بہت سی لائٹس میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ مجھ پر اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے۔

گولیاں میرے اردگرد سے گزر رہی تھیں مگر میری خوش قسمتی کہ ابھی تک مجھے کسی گولی نے نہیں چھوا تھا۔ اس میں میری خوش قسمتی کے علاوہ دو وجوہ کا دخل تھا۔ ایک تو میرے اردگرد جھاڑیوں اور درختوں کی بہتات تھی، دوسرا وہ اندھا دھند فائر کر رہے تھے۔

میں حتی الامکان تیزی سے بھاگ رہا تھا مگر میرا ان کے بیچ فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ ان کے پاس لائٹس تھیں جبکہ میں اندھیرے میں بھاگ رہا تھا۔

میرا سیل میرے ہاتھ میں تھا مگر اس کی لائٹ روشن کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل گر گیا۔ میرا سیل میرے ہاتھ سے چھوٹ کے دور جا گرا۔

میں سیدھا ہو کے بیٹھا ہی تھا کہ میں نے اپنے عقب میں ایک آہٹ سنی۔ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ ایک درخت کے عقب سے ایک پولیس والا برآمد ہو رہا تھا۔ میں جلدی سے ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ اس نے شاید مجھے گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں ٹارچ پکڑے وہ محتاط قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں دبے پاؤں گھوم کے اس کے عقب میں پہنچا۔ باقی لائٹس کچھ فاصلے پر تھیں۔ میں نے عقب سے اس کی گردن کو اپنے بازو سے جکڑ کے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ کڑک کی آواز کے ساتھ ہی وہ میرے بازو میں جھولنے لگا۔ میں نے اسے احتیاط سے نیچے رکھا۔ اس کے ہاتھ سے پستول اور ٹارچ لی اور ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔

پیچھے آتے پولیس والے اب لائٹ کی روشنی سے اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ یہ میں ہوں۔ میں پولیس والے کی لاش دریافت ہونے سے پہلے اُن کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ کچھ دور جا کے میں نے پلٹ کے دیکھا۔ میرے عقب میں اندھیرا تھا۔

مجھے بھاگتے نجانے کتنی دیر گزر چکی تھی۔ اب میں تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کچھ دیر کہیں بیٹھ کے ستا لوں کہ میں نے سامنے متحرک روشنی دیکھی۔ یہ کسی گاڑی کی روشنی تھی۔ میری آنکھوں میں امید کا دیا ٹمٹمایا۔

کچھ ہی دیر میں، میں روڈ پر پہنچ چکا تھا۔ روڈ دیکھ کے میں نے اندازہ لگایا۔ یہ روڈ ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف جا رہا تھا۔ اس پر اکا دکا گاڑیاں چل رہی تھیں۔

میں نے پستول جیب میں ڈال لیا تھا۔ کوئی گاڑی جب میرے پاس سے گزرتی تو میں اسے ہاتھ کا اشارہ کرتا مگر کوئی گاڑی رک نہیں رہی تھی۔

میں اپنا موبائل کھو چکا تھا۔ مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے طور پر حساب لگانے کی کوشش کی۔ میں لگ بھگ چھ بجے کے قریب گھر پہنچا تھا۔

اس حساب سے اب دس بجنے والے تھے۔ اس بار آنے والی گاڑی نے دور سے ہی ہارن دیا۔ اس کی رفتار میرے قریب پہنچ کے سست ہو گئی۔ میں نے اسے اشارہ کیا

تو وہ رک گئی۔ یہ ایک ایف ایکس تھی۔ میں نے ڈرائیور کو مطلوبہ پتا بتایا۔

''بیٹھیں۔'' وہ بولا۔

کچھ دیر کے بعد میں اپنے مطلوبہ ٹھکانے پر پہنچ چکا تھا۔ یہ وہی ٹھکانا تھا جس پر میں اسحاق کو لایا تھا۔ راستے سے میں نے کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھی لے لی تھیں۔

میرا بھوک سے برا حال تھا۔ پہلے میں نے پیٹ پوجا کی۔ بھاگ دوڑ.... کے دوران میں نشا کو بھول چکا تھا۔ اب کچھ سکون میسر آیا تو مجھے اس کا خیال آیا۔

اس نے جو میرے ساتھ کیا تھا، وہ ہرگز قابلِ معافی نہیں تھا۔ اس نے نہ صرف مجھ سے میرے ماں باپ چھینے تھے بلکہ مجھ سے میری زندگی چھیننے کی کوشش بھی کی تھی۔ میرا وقت پورا نہیں ہوا تھا اس لیے میں اب تک سانس لے رہا تھا مگر میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ کم از کم چار قتل تو میرے کھاتے میں درج ہو چکے تھے۔ میں اگر پکڑا جاتا تو میرے مقدر میں پھانسی کا پھندا تھا۔

میں موت سے خوفزدہ نہیں تھا۔ میرے تو جینے کی وجہ ہی ختم ہو چکی تھی۔ میں تو خود موت کو گلے لگا لینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے نشا کو اس کے کیے کی سزا دینا ضروری تھا۔ وقت نے میرے ساتھ ایسا کھیل کھیلا تھا کہ کل تک میں جس کے لیے جیتا تھا آج اس کی موت ہی میری زندگی کا مقصد تھا۔

اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کچھ دیر میں دبئی فلائی کرنے والی ہے۔ پتا نہیں اس نے سچ بولا تھا یا نہیں۔ بہرحال یہ جاننا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔

فروری کا مہینہ تھا۔ شام کو اچھی خاصی ٹھنڈ ہوتی تھی۔ میں نے ایک مفلر اچھی طرح چہرے کے گرد لپیٹا اور باہر نکل آیا۔ ویسے تو اس علاقے میں مجھے کم ہی لوگ جانتے تھے مگر میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے کی پیدل واک کے بعد میں ایک مارکیٹ میں داخل ہوا۔ میری توقع کے مطابق موبائل کی دکانیں کھلی تھیں۔ میں نے ایک اے ٹی ایم سے پچاس ہزار رقم نکلوائی اور ایک اچھا سا اسمارٹ فون اور سم کارڈ خرید لیا۔

فون کے ذریعے میری مطلوبہ معلومات مجھے کچھ ہی دیر میں مل چکی تھیں۔ میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

ٹیکسی میں نے اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر رکوالی۔ میں نے اسے ادھر ہی رکنے کا کہا اور اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ گلیاں ویران نظر آ رہی تھیں۔ میں اپنے گھر کی گلی میں مڑا ہی تھا کہ میں نے سامنے سے ایک گاڑی آتے دیکھی۔ میں نے اپنے چہرے پر مفلر سیدھا کیا۔ گاڑی میرے پاس پہنچ کے دوسری طرف مڑ گئی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اپنے گھر کا گیٹ مجھے کافی دور سے نظر آ گیا تھا۔ میں جس افراتفری میں گھر سے نکلا تھا اس میں گیٹ بند کرنے کا مجھے وقت ہی نہیں ملا تھا مگر اس وقت گیٹ بند تھا۔

کیا پولیس کو میرے گھر میں ہونے والی قتل کی اطلاع مل چکی ہے؟ میں نے تشویش سے سوچا۔

ہمارا گھر جس علاقے میں تھا وہاں پڑوسیوں سے تعلقات رکھنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ لاشیں اندر پڑی تھیں اس لیے اس کا چانس کم ہی تھا کہ کسی پڑوسی کو لاشوں کے متعلق پتا چلتا۔

دوسری طرف بقول نشا کے اس نے ارشاد کے قتل کے متعلق پولیس کو بتایا تھا۔ وہ اگر گھر میں ہونے والے قتل کے متعلق بھی پولیس کو بتا دیتی تو اس کے باس کی لاش بھی... برآمد ہو جاتی۔ اس کی لاش کے متعلق تفتیش سے پولیس اس کی تنظیم تک پہنچ سکتی تھی۔ اس لیے اس کی طرف سے پولیس کو اطلاع دینے کا چانس بھی کم ہی تھا۔

میں حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے دھیرے دھیرے اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھر کی بیرونی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ میں نے گیٹ کے پاس پہنچ کے آہستگی سے گیٹ دھکیلا۔ میری توقع کے مطابق وہ کھلا ہوا تھا۔

میں دبے پاؤں چلتا ہوا لاؤنج کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا۔ میں چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ میری تمام حسیات بیدار تھیں۔

لاؤنج کی لائٹ روشن تھی۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا اپنے بیڈروم میں داخل ہوا۔ انیس کی خونچکاں لاش بیڈ پر اسی طرح پڑی تھی جس طرح میں چھوڑ کے گیا تھا۔ واش روم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے وہ کھول کے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔

میں جب یہاں سے گیا تھا تو سیاہ پوش کی لاش اُدھر ہی موجود تھی مگر اب خالی واش روم میرا منہ چڑا رہا تھا۔ میں نے اس کی ٹوٹی ہوئی گردن اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ وہ سو فیصد مر چکا تھا۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ اس کی تنظیم کے بندے لاش اٹھا کے لے گئے تھے۔ مجھے اپنے اردگرد

خطرے کا احساس ہوا۔ میں انیس کی لاش کہیں ٹھکانے لگانا چاہتا تھا مگر اب لگتا تھا کہ اس کا موقع نہیں ہے۔

میں نے الماری کھول کے اپنی ضرورت کی تمام چیزیں نکالیں اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ باہر سارا علاقہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاید لائٹ چلی گئی تھی۔ یو پی ایس کی وجہ سے میرے گھر کی اندرونی لائٹس ابھی تک روشن تھیں۔

میں نے گیٹ ذرا سا کھولا ہی تھا کہ چونک گیا۔ سامنے سے ایک گاڑی آرہی تھی۔ میں نے گیٹ کو پیچھے سے کنڈی لگادی اور ایک جھری سے گاڑی کو دیکھنے لگا۔

وہ گاڑی گیٹ کے پاس آ کے رکی۔ اس کی ہیڈ لائٹس آف ہوئیں تو میرا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔ وہ پولیس کی گاڑی تھی۔ میں تیزی سے پلٹا اور اندر داخل ہو گیا۔ اپنے عقب میں، میں نے گیٹ کے دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سنی۔

میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر آگیا۔ چھت پر چار دیواری تھی۔ اس لیے نیچے سے دیکھے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا چھت کے عقبی حصے میں آیا۔ اس طرف دوسرے گھر کی چھت جڑی ہوئی تھی۔ میں دیوار پہ چڑھ کے اس چھت پر کود گیا۔

اس گھر کا شیڈ گلی تک بڑھا ہوا تھا۔ میں اس سے لٹک کے نیچے اتر گیا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ میں گلیوں میں گھومتا ہوا اس گلی تک جا پہنچا جہاں میں نے ٹیکسی کھڑی کی تھی مگر وہ گلی مکمل ویران نظر آرہی تھی۔ ٹیکسی والا شاید میرا اتنی دیر تک انتظار نہیں کر سکا تھا۔ میں نے موبائل پر وقت دیکھا۔ فلائٹ پکڑنے کے لیے میرے پاس بس ایک گھنٹا باقی تھا۔

مین روڈ یہاں سے پیدل کم از کم پندرہ منٹ کی مسافت پر تھا۔ مجھے وہیں سے ہی کوئی گاڑی مل سکتی تھی۔ اگر مجھے بروقت گاڑی مل جاتی... تبھی میرا وقت پر ائیرپورٹ پہنچنا ممکن تھا۔

میں نے دوڑ لگادی۔ اندھیری رات کے سناٹے میں بس میرے قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی۔ کچھ گھروں کے اندر سے کتّے بھونکنے لگے مگر میں بھاگتا چلا گیا۔

دس منٹ میں، میں مین روڈ پر پہنچ چکا تھا۔ روڈ پر اکا دُکا گاڑیاں چل رہی تھیں۔ میں اشارے سے انہیں روکنے کی کوشش کرنے لگا مگر آج کے دور میں رات کے اس پہر لفٹ ملنا تقریباً ناممکن ہی تھا۔

میں بار بار اپنے عقب میں بھی مڑ کے دیکھ رہا تھا۔ کسی بھی وقت پولیس کی گاڑی... واپس آسکتی تھی۔

میں نے موبائل کی اسکرین پر کوئی دسویں بار وقت دیکھا۔ وقت تھا کہ تیزی سے میرے ہاتھ سے پھسلتا جارہا تھا۔ اچانک میں نے اپنے عقب سے ایک گاڑی نمودار ہوتے دیکھی۔ میں روڈ کے ساتھ بنے ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔

گاڑی جب مین روڈ پر چڑھنے لگی تو میری اس پر نظر پڑی۔ یہ پولیس کی گاڑی نہیں تھی۔ میں تیزی سے واپس روڈ پر آکے اسے رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔

اس کی رفتار کم تھی۔ وہ میرے پاس آکے رک گئی۔ میں نے تیزی سے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور ایک پینتیس چالیس سالہ شخص تھا۔ اس نے لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔

''کہاں جانا ہے آپ نے؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''ائیرپورٹ۔ آدھے گھنٹے میں میری فلائٹ نکلنے والی ہے۔ آپ پلیز مجھے ائیرپورٹ پہنچا دیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔'' میں تیزی سے بولا۔

اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ''اس وقت آپ یہاں کھڑے ہو کے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے جبکہ آپ کی آدھے گھنٹے میں فلائٹ نکلنے والی ہے۔ جسٹ امیزنگ۔'' وہ کندھے اچکا کے حیرانی سے بولا۔

''میری گاڑی اچانک خراب ہوگئی تھی۔ مجبوراً مجھے لفٹ مانگنا پڑی۔'' میں نے بہانہ بنایا۔

''آپ کے پاس تو میں نے کوئی گاڑی کھڑی نہیں دیکھی۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

عجیب آدمی تھا مجھ پر شک بھی کر رہا تھا اور مجھے لفٹ بھی دے دی تھی۔ ''گاڑی پیچھے ایک گلی میں خراب ہوگئی تھی۔ وہاں سے روڈ تک میں پیدل چلتا ہوا آیا تھا۔'' میں نے بات بنائی۔

''اوکے، ویسے جا کہاں رہے ہیں آپ؟''

''ائیرپورٹ۔ بتایا تو ہے آپ کو۔'' میں اپنی جھنجلاہٹ چھپاتے ہوئے بولا۔

''اوہ وہ تو آپ نے بتا دیا۔ میرا مطلب تھا آپ فلائٹ کے ذریعے کہاں جارہے ہیں؟''

''دبئی۔'' میں شرمندگی سے بولا۔

''دبئی کیوں جارہے ہیں آپ؟'' وہ تو میرا پورا انٹرویو لینے کے لیے تلا ہوا تھا۔

''جاب کرتا ہوں وہاں۔ آپ پلیز تھوڑی اسپیڈ اور بڑھادیں۔''میں نے موبائل پر ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

''او جی۔''اس نے ایکسلیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا۔

''آپ فکر نہ کریں' میں وقت سے پہلے ہی آپ کو، آپ کی منزل پر پہنچا دوں گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ جانے کیوں مجھے اس کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز سی لگی۔ میں چونک کے اُسے دیکھنے لگا۔ کلین شیو چہرے کے ساتھ وہ عام سا نظر آنے والا شخص تھا۔ اچانک اس نے اسٹیئرنگ سے ایک ہاتھ اٹھا کہ اگنیشن سوئچ کے ساتھ لگا ایک بٹن دبایا۔ مجھے ہلکی سی ''بھس'' کی آواز آئی۔ تربیت نے میری حسیات کو بہت تیز کر دیا تھا۔ مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے بے اختیار سانس روک لی لیکن سامنے ڈیش بورڈ سے نکلنے والی گیس کے چند مالیکیولز سانس کے راستے میرے پھیپھڑوں میں داخل ہو چکے تھے۔ مجھے غنودگی سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے آنکھیں موند کے سیٹ کے پشتے کے ساتھ ٹیک لگا لی۔

میں نے سانس روک رکھی تھی۔ میں نے نیم وا آنکھوں سے اس شخص کو دیکھا۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ مجھے آنکھیں موندتے دیکھ کے اُس کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔

اس نے سیل فون جیب سے نکال کے ایک نمبر ڈائل کیا۔ چند لمحوں بعد وہ کسی سے باتیں کرنے لگا۔

''میں آرہا ہوں اور ساتھ ایک سرپرائز بھی لا رہا ہوں۔'' وہ ''سرپرائز'' شاید مجھے ہی قرار دے رہا تھا۔

''نوید......'' وہ ہنسا۔

''بس، مل گیا نا...... پتا نہیں کیسے وہ پولیس سے بچ گیا تھا۔ باس کی لاش راجو لے گیا تھا۔ میں وہاں سے تمام شواہد مٹا کے باہر گلی میں نکلا ہی تھا کہ مین روڈ پر وہ مجھے مل گیا۔''

میں آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ وہ کسی دوسرے شخص کو تمام باتیں گوش گزار کر رہا تھا مگر اسی بہانے میں بھی سب جان گیا تھا۔ آج کے دن مجھے جھٹکے پہ جھٹکے لگ رہے تھے۔ مجھے اپنی بدقسمتی پر حیرت ہوئی۔

''کہاں لاؤں اُسے۔'' اب وہ اُس شخص سے پوچھ رہا تھا۔

''اوہ، میں تو آگے نکل آیا ہوں۔ چلو میں گاڑی موڑتا ہوں...... پندرہ منٹ میں، میں پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے فون رکھ کے گاڑی روک لی۔ یہ سنگل روڈ تھا۔ وہ شاید گاڑی واپس پیچھے موڑنا چاہتا تھا۔

یہ میرے لیے سنہری موقع تھا۔ میری حالت اتنی دیر میں کافی سنبھل چکی تھی۔ میرا طوفانی مُکا اس کی کنپٹی پر پڑا۔ وہ گاڑی کے شیشے سے جا ٹکرایا۔ تڑاخ کی آواز کے ساتھ گاڑی کا شیشہ ٹوٹ کے بکھر گیا۔

میں نے اس کا معائنہ کیا، وہ بے ہوش لگ رہا تھا۔

میں نے اس کی گردن اپنے بازو میں لے کے ایک جھٹکے سے توڑ دی۔ یہ سب نہ صرف میرے دشمن تھے بلکہ میرے وطن کے بھی دشمن تھے۔ میں اُن کے ساتھ کوئی رعایت کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ میں نے گاڑی سے اتر کے اسے گھسیٹ کے باہر نکالا۔ روڈ کے کنارے اس کی لاش ڈالنے کے بعد میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔

فلائٹ نکلنے میں بیس منٹ تھے۔ روڈ ویران تھا۔ میں نے آندھی طوفان کی طرح گاڑی اُڑائی۔ میں جب ائرپورٹ پر پہنچا تو اس فلائٹ کے مسافروں کو بلایا جا رہا تھا۔

میں اگر چند منٹ بھی لیٹ ہو جاتا تو فلائٹ نکل چکی ہوتی۔ کچھ دیر کے بعد جہاز نے ٹیک آف کیا۔

''نشا میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ میں دنیا کے آخری کونے تک تمہارا پیچھا کروں گا۔ میں آرہا ہوں۔'' میں نے تصور میں اُسے مخاطب کیا۔

میری زندگی کے پچھلے کچھ گھنٹے انتہائی ہنگامہ خیز رہے تھے۔ اس دوران میں میری کہانی نے بہت سے موڑ لیے تھے۔ ہر لمحے میں سچویشن بدلی تھی۔ چند گھنٹوں میں، میں کئی بار جان سے جاتے جاتے بچا تھا مگر ہر بار خوش قسمتی نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

اپنی جاب کے دوران بارہا مجھے زندگی اور موت کی آنکھ مچولی کھیلنا پڑی تھی مگر وہ واقعات میں منظرِعام پر نہیں لا سکتا تھا۔ ہاں، یہ کہانی میری ذاتی زندگی پر مشتمل تھی۔ یہ میں ضرور لوگوں کے سامنے لا سکتا تھا مگر یہ کہانی ابھی ادھوری تھی۔ اس کے مکمل ہونے کا مجھے بھی اتنی ہی بے چینی سے انتظار تھا جتنا آپ کو ہے۔

☆☆☆

دبئی ائرپورٹ پر بہت رش تھا۔ میں اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھتا ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر اپنے مطلوبہ شخص پر پڑی۔ وہ مجھے دیکھ کے ہاتھ ہلا رہا تھا۔

میرے پاس پہنچتے ہی وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد اس نے میری مطلوبہ

معلومات مجھے گوش گزار کرنا شروع کر دیں۔ میں توجہ سے سب سن رہا تھا۔

باہر نکل کے اُس سے بولا۔ ''او کے، تم اب جاؤ۔ اگر زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔''

''خیریت تو ہے نا؟ تم مجھے بہت بدلے بدلے لگ رہے ہو؟'' وہ تشویش سے مجھے دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں بولا۔

''ہاں خیریت ہی ہے۔ نشا مجھ سے ناراض ہو کے آئی ہے۔ میں اُسے منا کے تم سے رابطہ کرتا ہوں۔'' میں نے مسکراہٹ سے اسے بہلانے کی کوشش کی۔

''ایسی بھی کیا ناراضی کہ وہ یہاں آگئیں اور تم بھی اُن کے پیچھے دوڑے آگئے؟'' وہ حیرانی سے بولا۔

''میں اس سے مل لوں پھر بتاتا ہوں تمہیں سب۔ ہو سکتا ہے اس سے مل کے آج ہی تمہارے پاس آجاؤں۔''

وہ میرے ساتھ چلنے کی ضد کرنے لگا مگر میں نے اسے زبردستی واپس بھیج دیا۔ اب میں ٹیکسی سے اس ہوٹل کی طرف جا رہا تھا جس میں نشا ٹھہری ہوئی تھی۔

☆☆☆

موبائل خرید کے میں نے ائرپورٹ پر اپنے ایک دوست کو کال کی تھی۔ اس سے مجھے کنفرم ہو گیا کہ نشا دبئی روانہ ہو چکی ہے۔ اس کی فلائٹ دس منٹ پہلے ہی نکلی تھی۔

میں نے اُس سے دبئی جانے والی اگلی فلائٹ کا پوچھا۔ اگلی فلائٹ تین گھنٹے بعد تھی۔ مجھے اپنی جاب کی وجہ سے مختلف ممالک میں جانا پڑتا تھا۔ اس لیے بہت سے ممالک کا ویزا میرے پاس تھا۔ دبئی کا ویزا ابھی میرے پاس تھا۔ بس سیٹ بک کرانا تھی اور پھر میں نشا کے پاس ہوتا۔

رات کو جانے والی اس فلائٹ میں اکثر سیٹیں خالی ہوتی تھیں۔ میں نے اس فلائٹ میں اپنی سیٹ بک کرا لی مگر مسئلہ یہ تھا کہ میرا پاسپورٹ گھر میں تھا۔ میں پاسپورٹ لینے کے لیے ہی اتنے خطرات کا سامنا کرتے ہوئے گھر گیا تھا۔

میں نے دبئی میں موجود اپنے ایک دوست فراز کو کال کر کے نشا کی فلائٹ کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ خاموشی سے اس کا پیچھا کر کے معلوم کرے کہ وہ کہاں جاتی ہے۔

فراز میرا کالج کے دور کا دوست تھا۔ اس سے میرے خاندانی مراسم تھے۔ میں جب بھی دبئی آتا اسی کے پاس ٹھہرتا تھا۔ وہ سافٹ ویئر انجینئر تھا اور ایک پرائیویٹ فرم میں بطور سافٹ ویئر ڈویلپر جاب کر رہا تھا۔ اس نے ایک کمرے کا ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے رکھا تھا اور اکیلا ہی رہتا تھا۔ وہ نشا کو میری بیوی ہونے کے ناتے جانتا تھا۔ میں نے اسے ایک جھوٹی کہانی سنا کے مطمئن کر دیا تھا۔ اس نے میرے کہنے پر نشا کا پیچھا کر کے اس کا ٹھکانا معلوم کر لیا تھا۔ وہ ایک ہوٹل میں ٹھہری تھی۔ اس نے اس کا کمرا نمبر بھی معلوم کر لیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد... ٹیکسی نے مجھے میرے مطلوبہ ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ ہوٹل میں داخل ہوتے ہی سامنے نظر پڑی۔ ریسپشنسٹ نے مسکرا کر میرا استقبال کیا۔

خوش قسمتی سے مجھے نشا کے ساتھ والا کمرا مل گیا۔ وہ میرے ہاتھ میں ''اوپر'' کی فلائٹ کا ٹکٹ تھما کے آئی تھی مگر اب اس کا ''اوپر'' کا ٹکٹ کٹنے والا تھا۔ میں اتنے کم وقت میں اس کے اتنے قریب پہنچ چکا تھا کہ ہم میں بس ایک دیوار کا فاصلہ تھا۔

اپنے کمرے میں داخل ہوتے وقت میں نے اُس کے دروازے پر ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کی تختی لگی ہوئی دیکھی۔ وہ شاید سو رہی تھی۔ میں نے اسے آخری نیند پوری کرنے کا موقع دیا۔ آج کے بعد ویسے بھی اُسے ہمیشہ کی نیند سونا تھا۔

اپنے بیڈ پر لیٹ کے میں اُس سے نمٹنے کا طریقہ سوچنے لگا۔ مجھے دیکھ کے اس کی کیا حالت ہوگی؟ میں نے تصور میں اس کی حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھیں دیکھیں اور میرے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونک گیا۔ میں نے اٹھ کے دروازہ کھولا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دروازے پر نشا کھڑی تھی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا رہی تھی۔

''ہائے۔'' اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

میں نے سکتہ زدہ انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ آج بھی روزِ اول کی طرح نرم تھا۔ روئی کے گالوں سے بھی زیادہ نرم۔

''اندر آنے کو نہیں کہو گے؟'' وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے ہمارے درمیان کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

میں نے اسے اندر کھینچ لیا۔ وہ میرے سینے کے ساتھ آ لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ مسکرائی۔

میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔

''دروازہ تو بند کر دو۔'' وہ میری آنکھوں میں بڑھتی پیاس دیکھ کے بولی۔

میں نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ بیڈ کے سامنے کھڑی منتظر نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے پاس آیا تو اس نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔

''تم سے دور آ کے مجھے احساس ہوا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ میں پگھلنے لگا۔ میں اس پر جھک کے اسے چومنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے اپنی کمر میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ اس نے ایک جھٹکے سے مجھے چھوڑ دیا۔ میں نیچے گر گیا۔

''آؤ نشا۔ یہ تو گیا۔''

ایک مردانہ آواز میرے کان میں پڑی۔ میں نے پلٹ کے اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ ایک خون آلود چاقو اٹھائے بے پروائی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ نشا چلتی ہوئی اس کے پاس گئی۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے وہ مڑی۔

''بائے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

میں اسے باہر جاتا دیکھتا رہا۔ چند سیکنڈ میں یہ کیا ہوا تھا، میں سمجھنے سے قاصر تھا۔

میں نے اپنے اطراف میں پھیلتا خون دیکھا۔ میرے وجود سے زندگی آہستہ آہستہ خارج ہو رہی تھی۔ میرے ذہن پر غنودگی گہری ہونے لگی۔ میں نے سر فرش کے ساتھ ٹکا دیا۔

اچانک میرے کانوں نے دستک کی آواز سنی۔ یہ آواز مجھے بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کے دروازے کی طرف حسرت سے دیکھا۔ شاید باہر کوئی موجود تھا۔ میں گھسٹ کے دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنے لگا مگر میرے وجود نے میرے ذہن کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میرا جسم پسینے سے شرابور تھا۔

اوہ، تو یہ خواب تھا۔ میرے دل سے شکر کا کلمہ نکلا۔ میں نے وقت دیکھا۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ معاً مجھے دروازے پر مدھم سی دستک سنائی دی۔ شاید یہی دستک میں نے خواب میں بھی سنی تھی۔

میں نے اٹھ کے دروازہ کھولا۔ ویٹر ساتھ والے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ناشتے کا سامان اٹھا رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔

''سوری، میں واش روم میں تھی۔'' میں نے نشا کی آواز سنی۔ وہ شاید دیر سے دروازہ کھولنے کی وجہ بیان کر رہی تھی۔

''اِٹس او کے میم۔'' ویٹر شائستگی سے مسکرایا۔

اس کے جانے کے بعد میں اندر آ کے آگے کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔

☆☆☆

پانچ منٹ بعد میں نشا کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں اس کی گردن دبوچ کے اسے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ اپنے عقب میں دروازہ میں نے لات مار کے بند کر دیا تھا۔

اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ اس حالت میں بھی اس کی آنکھوں میں پھیلی حیرت مجھے صاف محسوس ہوئی۔

''لگا نا جھٹکا؟'' میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سفاکی سے مسکرایا۔

اس کی آنکھوں میں مجھے خاموش التجا نظر آئی مگر میں اب اسے معاف کرنے والا نہیں تھا۔ میں اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ وہ میری بانہوں میں تتلی کی طرح... پھڑپھڑانے لگی۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں نے اس کے سر کو اپنے بازو میں جکڑا اور ایک ہی جھٹکے میں اس کی گردن توڑ دی۔

اس کی لاش کو میں نے واش روم میں دھکیل کے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ کھول کے میں باہر نکلا ہی تھا کہ ویٹر کو لفٹ سے نکلتے دیکھا۔ میں پُرسکون انداز میں چلتا ہوا نیچے پہنچا۔ ریسپشنسٹ کو چابی تھما کے میں نے بل اور بقایا کی رقم وصول کی۔ اسی وقت میری نظر ایک اسکرین پر پڑی۔ اس اسکرین پر ہوٹل کی مختلف جگہوں کی سی سی ٹی وی فوٹیج دکھائی جا رہی تھی۔ میری نظر اس ویٹر پر پڑی جو نشا کے کمرے میں ناشتا دینے آیا تھا۔ وہ لفٹ میں داخل ہو رہا تھا۔

میرے دل میں چور تھا۔ میں تیزی سے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ باہر پہنچ کے میں نے ایک طرف کو پیدل چلنا شروع کر دیا۔ کافی دور جا کے میں نے ایک ٹیکسی بک کرائی اور اسے ایک شاپنگ سینٹر چلنے کا کہا۔ شاپنگ سینٹر کے سامنے سے میں اندر داخل ہو کے عقبی راستے سے باہر نکل

گیا۔ وہاں سے کچھ دور جا کے میں نے پھر ٹیکسی بک کرالی۔ اسی طرح تین چار ٹیکسیاں تبدیل کرنے کے بعد میں فراز کے گھر پہنچ گیا۔

فراز نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔

''امید تو نہیں تھی کہ تم اتنی جلدی واپس آ ؤ گے۔ لگتا ہے بھابی نہیں مانیں۔ تبھی تم واپس آ گئے؟'' وہ شریر سے انداز میں بولا۔

میں جواب میں کچھ نہیں بولا۔ وہ میرا بجھا ہوا انداز دیکھ کے شک میں پڑ گیا۔

''خیریت تو ہے نوید؟'' وہ تشویش سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے نشا کو قتل کر دیا ہے۔'' میں اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ انداز میں بولا۔

''مذاق کر رہے ہو نا؟'' وہ آنکھیں پھاڑ کے بے یقینی سے بولا۔

''نہیں یہ سچ ہے، بیٹھو میں تمہیں سب تفصیل سے بتاتا ہوں۔'' وہ تذبذب کے عالم میں بیٹھ گیا۔ میں اُسے سارے واقعات تفصیل سے بتانے لگا۔ وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔

آخر میں، میں اس سے کہہ رہا تھا۔

''نشا کی لاش جلد ہی دریافت ہو جائے گی۔ سی سی ٹی وی فوٹیج کے ذریعے مجھے اس کے کمرے میں جاتے ہوئے بھی دیکھ لیا جائے گا۔ میں وہاں سے فرار ہو چکا ہوں سو قاتل مجھے ہی ڈکلیئر کیا جائے گا۔ میں نے تمہیں اس لیے یہ سب بتا دیا ہے کہ تم دھوکے میں نہ رہو۔ میں ایک قاتل اور مفرور ہوں۔ مجھے پناہ دینے کے جرم میں تم پر بھی حرف آ سکتا ہے۔'' میرا انداز سپاٹ تھا۔

''بکواس مت کرو۔ تمہارے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''تمہیں دیکھ کے مجھے اندازہ تو ہوا تھا کہ تم کسی مسئلے سے دوچار ہو مگر میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہارے ساتھ اتنا بڑا دھوکا ہوا ہے۔ نشا سے میری اتنی بار ملاقات ہوئی۔ وہ تو مجھے ہمیشہ بہت فرینڈلی اور خیال رکھنے والی لگی۔ توبہ ہے، کیسے کیسے بہروپ لوگوں نے بنا رکھے ہیں۔'' اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ نفرت بھی تھی۔

''نصیب اپنے اپنے......'' میں اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

کچھ دیر کی گفت و شنید کے بعد وہ میرے لیے ناشتا بتانے چلا گیا۔

میں تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کے گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ ایک ہی دن میں میری زندگی کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ میں نے نشا کو مار دیا تھا۔ ایک طرح سے میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا تھا مگر خلافِ توقع مجھے سکون نہیں ملا تھا۔ میرے احساسات جیسے سو چکے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں اندر سے مر چکا ہوں۔ میں نے عینا جیسی پاکباز لڑکی پر تہمت لگائی تھی شاید اسی وجہ سے میرے ساتھ اتنا برا ہوا تھا۔

میں نے سوچا تھا کہ نشا کو مارتے ہی میں خود بھی خودکشی کر لوں گا کیونکہ اب جینے کا کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہا تھا۔ اُدھر پاکستان میں پولیس مجھے ڈھونڈ رہی تھی اور اِدھر اب دبئی کی پولیس بھی میرے پیچھے پڑ جاتی۔ پکڑے جانے سے بہتر تھا کہ میں خود اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں مگر اس سے پہلے میں ایک اور ضروری کام کرنا چاہتا تھا۔

میری زندگی کی کہانی عام نہیں تھی۔ اس میں ہر وہ چیز تھی جو کسی دلچسپ کہانی میں ہو سکتی ہے۔ یہ کہانی نہ صرف لوگوں کی دلچسپی کا باعث بن سکتی تھی بلکہ اس میں لوگوں کے لیے سبق بھی تھا۔ مرنے سے پہلے میں یہ کہانی منظرِ عام پر لانا چاہتا تھا۔ میں کہانی کار تو نہیں بن سکا، کہانی کا کردار بن کے ہی امر ہو جانا چاہتا تھا۔

میں نے ایک بار ایک کہانی ایک ڈائجسٹ میں بھیجی تھی تقریباً سال بعد مجھے پتا چلا تھا کہ وہ ڈائجسٹ کے معیار کے مطابق نہیں۔ میں اگر اپنی کہانی خود کسی ڈائجسٹ میں بھیجتا تو مجھے غیر معینہ مدت کے لیے انتظار کرنا پڑتا اور اس کے بعد بھی اس کا شائع ہونا یقینی نہیں تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد مجھے اس مسئلے کا ایک ہی حل نظر آیا تھا۔

فیس بک پر ایک لکھاری کے بارے میں پتا چلا تھا، میں نے اسے اپنی کہانی میل کر دی۔ اب یہ اس کی ذمے داری تھی کہ کہانی کو کہاں شائع کرواتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ وہ ایک مرتے ہوئے شخص کی آخری خواہش ضرور پوری کریں گے۔ بہرحال میری تحریر شائع ہو یا نہ ہو یکم اپریل کو میں نے دنیا کو الوداع کہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب میرے دل میں ایک ہی حسرت باقی ہے کہ میں اپنی زندگی کی کہانی کو ڈائجسٹ کے صفحات پر دیکھ سکوں۔ اب میں اس انتظار میں ہوں کہ میری زندگی کی آخری خواہش پوری ہوتی ہے یا نہیں؟